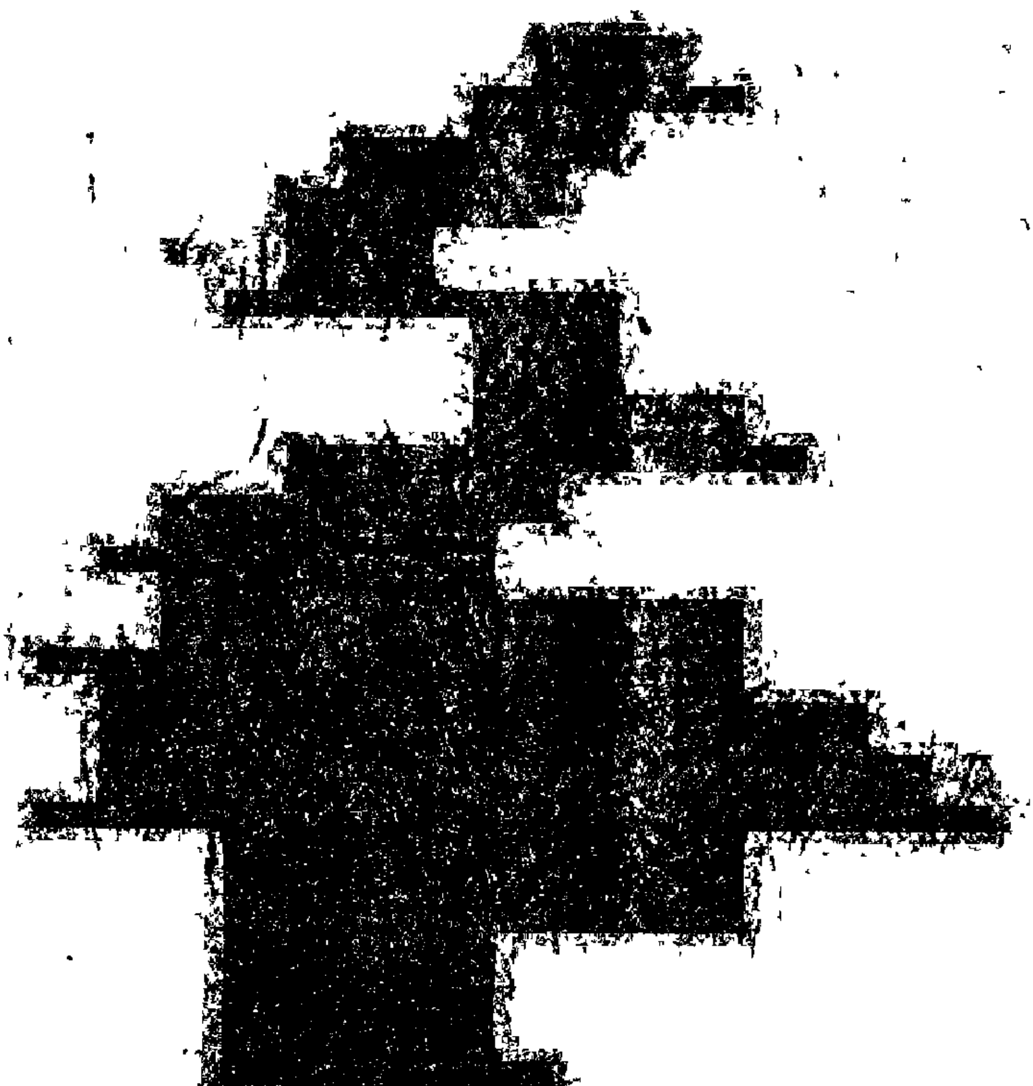
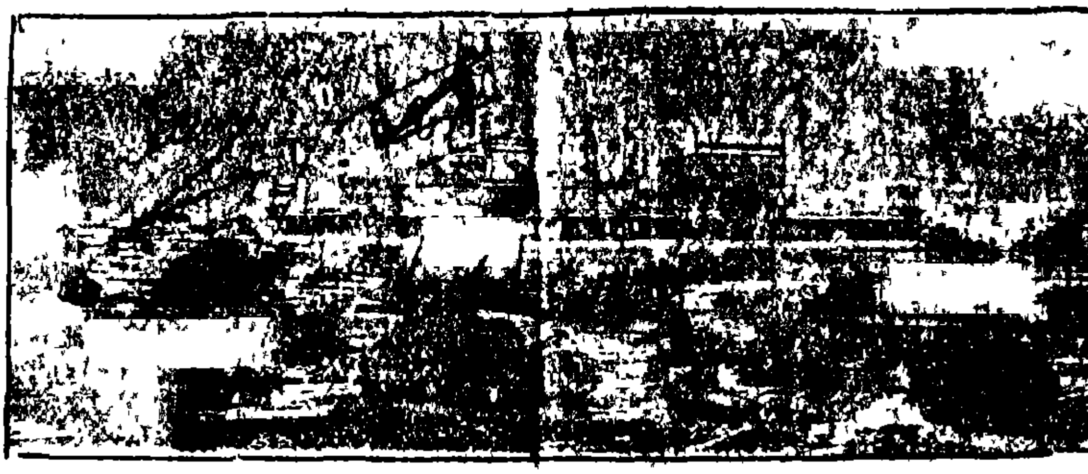


Registered No. L. 1462.



SALA-I-AM, DELHI.

A high class Monthly Magazine devoted to the cause of Urdu literature, the preservation of the old Indian, especially Mohammadan culture and refinement, and the assimilation of the best features of the new civilization.

حسب الارشاد ناصر علی ... رہنما کار پریس دار المطبع واقعہ ... اور ... چھاپا گیا

دہلی

جلد ۱۳　　　　نمبر ۱

فہرستِ مضامین

بابت ماہ جنوری سنہ ۱۹۲۵ع مطابق جمادی الثانی سنہ ۱۳۴۳ ہجری

پیرایۂ آغاز

اس سال کے پہلے پرچہ کا حجم معمول سے زیادہ ہوگیا۔ اس پر بھی سارے مضامین پورے نہ آسکے۔ اب ضرور ہے کہ صلائے عام کا حجم بڑھتا رہے

کچھ بھی جو روزِ حشر بڑھایا نہ جائیگا ۔ قصہ تمام ہم سے سُنایا نہ جائیگا

نظم ونثر کی بحث کے مضامین زیادہ دھرے رہ گئے۔ یہ بحث واقعی زیادہ تحقیق طلب ہے اور تحقیق کے لئے جلدی مُضر ہے ۔ نظم کی تعریف میں تو شعرا کو لکھنے کا حق حاصل ہے مگر شاعری میں جنہیں کمال ہوتا ہے نثر کی طرف بہت کم متوجہ ہوتے ہیں۔ بلکہ نثر لکھنے والوں میں چند اصحاب نثر لکھتے لکھتے نظم زیادہ لکھنے لگے ۔ میں اس مسئلہ میں قولِ فیصل لکھنے کا مرتبہ نہیں رکھتا۔ اِتنا جانتا ہوں کہ اگر زبان کو مُلک کی جان سمجھئے تو زبان کے لئے نظم ونثر "ایک جان دو قالب" کی تمثیل کہنی چاہئے: میرے نزدیک نظم ونثر دونوں ضروری ہیں ؎

کچھ عشق میں مجنوں ہی سوا ہے نہ تو فرہاد ۔ لیلیٰ ہی نہ چھوٹی ہے نہ شیریں ہی بڑی ہے

مجھے شعروسخن میں دخلِ مُطلق نہیں اپنا مطلب نثر میں جس طرح بن پڑتا ہے ادا کرلیتا ہوں کہ نثر میں آسانی زیادہ ہے۔ بقول حکیم نصر اللہ خاں دمکال ؎

پھر تو قفس ہی خوب ہے اے مرغِ ناتواں ۔ پرواز جب کہ ہو نہ سکے آشیاں تلک

اِس مضمون کو شیخ بلاقی نے جس خوبی سے ادا کیا مجھ سے اس طرح ادا ہو نہیں سکتا ؎

دل میں جگر میں سینہ میں یکساں ہے درد آج ✤ اے چارہ گر بتاؤں کدھر کم کدھر بہت

جناب حمید کا شعر ہے ؎

حمید جیسا قیامت کا روز ہے دشوار ✤ اسی قدر ہے جدائی کی سخت بھاری رات

میرے لئے نظم ناممکن اور نثر کم و بیش مشکل ہے۔ اپنی کم بضاعتی کا حال میں کسی مضمون میں علیحدہ عرض کردوں گا ✤ یہاں مجھے اور مضامین کا فکر کرنا ہے ✤ اس پرچہ کا پہلا مضمون صلائے عام آغاز سال (صفحہ ۴ - ۶) آپ چاہے پڑھیں یا نہ پڑھیں معمولی ہے۔ اس مضمون سے میری غرض یہہ نہیں کہ آپ کو صلائے عام کی قدر نہیں۔ صلائے عام کی قدر از روے واہ واہ ضرورت سے زیادہ ہے۔ مگر اور اخبار و رسالوں کی طرح اس کے خرچ اخراجات سے غفلت ہے ؎

ناشکر ہم نہیں ہیں اِدھر کو نگاہ ہے ✤ پر وہ نگاہ جس سے عنایت عیاں نہیں

میں بنائے جہاں سہی لیکن

جب کہ ناپائدار ہوں کیا ہوں

اِس پرچہ میں (صفحہ ۲۳-۲۲) جناب مرزا عرفان علی بیگ صاحب نے نظم و نثر کے متعلق دو مضمون لکھے ہیں۔ مگر ابھی بہت گنجائش ہے ✤

جناب مرزا محمد علی خاں صاحب کا مضمون اخیتہ الفتیان (صفحہ ۷-۱۰) مورخانہ ہے۔ اکثر سلطنتوں میں خفیہ سازشوں کا پتہ قدیم سے چلا آتا ہے۔ سیاسی حکمت

سے زیادہ اندیشہ خفیہ سازشوں کا ہوتا ہے +

صلائے عام کی ڈاک (صفحہ ۱۰-۱۲) اب کی دفعہ زیادہ دلچسپ ہے
اس کے ساتھ ایک پاکیزہ پوسٹ کارڈ (صفحہ ۱۲) بھی پڑھنے کے لایق ہے
ہماری زبان کی دلچسپ حکایت (صفحہ ۲۶-۳۰) حضرت صفیر بلگرامی کے
تذکرہ جلوۂ خضر سے لی گئی ہے۔ یہہ تذکرہ بہت اچھا ہے جس میں مصنف نے زبان
اردو کی تاریخ و تحقیق نہایت عمدہ طرز پر لکھی ہے۔ یہہ مضمون اسی تذکرہ سے جابجا
سے اختصار کرکے لکھا گیا ہے +

شور صاحب کی مثنوی میں جو صاحب موصوف کی سوانح عمری ہے (صفحہ)
دو خوبیاں ہیں کہ اول تو اس سے ۱۸۵۷ء کے مفسدہ کے حالات پر روشنی پڑتی ہے۔
دوسرے باوجود ہندوستانی نہ ہونے کے صاحب مثنوی کی لیاقت شعر و سخن بہت
اچھی ہے ؛

افادات مہدی (صفحہ) کا ریویو میں نے محبت سے لکھا ہے کہ
اس باکمال انشا پرداز کو صلائے عام سے بہت محبت تھی ؛ ریویو میں دیر ہو جانے
کی وجہ یہہ ہے کہ افادات کی ایک جلد مجھے دیر سے وہ بھی اتفاق سے مل گئی ہے
خموش ہو کے بھی گویا کہ ہم نہیں خاموش ؛ یہہ دل نغل ہے موجود گفتگو کے لئے

آفریں اے دست گستاخ محبت آفریں
یہہ گریباں ایک مدت سے گلے کا ہار تھا

صلائے عام

"آغاز سال کا مضمون"

رسالوں اور اخباروں کو آپ زمانہ حال کی سوانح عمری سمجھیں جن میں ماہ وسال کی شادی وغم کے سہرے اور مرثیے۔ پیدائش وموت کے مبارکباد اور نوحے نشر میں گائے جاتے ہیں۔ ۲۴ھ کا رونا پچھلے مہینہ میں ہوچکا اب ۲۵ھ کا دور ہے۔ اس دور میں جو کچھ ہونے والا ہے معمولی طور پر آپ جانتے ہیں اور میں بھی جانتا ہوں یہی نا۔ کہ دن کو یہی آفتاب جو ازل سے مشرق سے نکلتا ہے۔ وہیں سے نکلیگا اور مغرب میں ڈوب جاتا ہے۔ اوسی جگہ اوسی طرح ڈوبا کرے گا ✤ پھر دوسرے دن اوسی وضع سے نکلے گا۔ مرغان سحر چہچہے لگائیں گے۔ کافوری شمعیں ٹھنڈی کردی جائینگی۔ نہانے والیاں جمنا کے اشنان سے گھروں کو پھرینگی۔ شیخ وزاہد نماز صبح پڑھ کر مسجدوں سے نکلیں گے۔ دن بھر ہر شخص اپنے اپنے کام میں مصروف رہے گا ✤ رات کو سارے زمانہ کی آنکھوں پر غفلت کے پہرے پڑ جائیں گے ہاں مگر تارے زمین کی پاسبانی میں ساری رات آنکھوں میں کاٹ دیں گے ✤ جا

ہر مہینے نیا نکلے گا اور دنیا کے عروج و زوال کی طرح جتنے دنوں بڑھے گا۔ اوتنے ہی دنوں گھٹیگا + گرمی جاڑا برسات اپنے اپنے موسم میں آئیں گے اور جائیں گے۔ ظاہر کسی بات میں بہت فرق نہ آئے گا، دام اشیاء یہ سارا حساب از روئے اوسط کے ٹھیک رہے گا + خداوند دوعالم کی نظر میں جیسا پچھلا سال گذرا ویسا ہی اگلا سال سمجھ لیجئے۔ اوس کی نگاہ میں گذشتہ اور آیندہ یکساں ہے۔ وہاں ماضی و حال و استقبال میں فرق نہیں، فرق ہے تو ہماری سمجھ میں ہے +

مجھے معلوم نہیں کہ آپ اس سال اپنی زبان کی ترقی کے لئے کیا کریں گے کیا نہ کریں گے؟ کیا نہ کریں گے؟ کا حال تو پچھلے تجربہ سے ظاہر ہے کہ آپ کی زبان کے رسالے اور اخبار آپ کی طرف سے بیقدری کے نالاں رہے۔ جو آپ کو کرنا چاہیئے وہ یہہ ہے کہ آپ اپنی زبان کے رسالوں اور اخباروں کو ان کے اخراجات کی زیرباری سے مستغنی کر دیں +

یہ ذکر میں آغاز سال میں اس لئے چھیڑتا ہوں کہ ولایت میں ہر سال کے شروع میں اکثر نیک ارادوں کا تہیہ کرتے ہیں۔ آپ بھی اس سال کے آغاز میں اپنی زبان کی ترقی کا پکا ارادہ کرلیں + اس فکر کے جواب میں کہ ملک و قوم کی بہبودی کے لئے کس بات کی ضرورت ہے؟ اسکا بڑا اگر اپنی زبان کی ترقی کے سوا اور کچھ نہیں۔ ابتک اور جھگڑوں میں پھنسے رہنے سے بہت وقت بیکار نکل گیا۔ اور نکل جانے کا اندیشہ ہے +

اپنی زبان کی ترقی کی تدبیریں تو شاید اور بھی ہوں مگر سب سے زیادہ کارگر اردو رسالوں اور اخباروں کی قدردانی ہے۔ ان کے لکھنے والوں کو آپ ان کے جاری رکھنے کے اخراجات سے زیربار نہ ہونے دیں تو آپ کی زبان کی پاکیزہ بیانیاں اور نازک خیالیاں آپ کو اور آپ کے ملک کو فنا ہونے سے بچالیں گی۔ جب تک جس قوم و ملک کی زبان زندہ رہے وہ قوم فنا نہیں ہوسکتی +

از روئے عقاید جس طرح انسان کی روح انسان کی زندگی کا باعث ہے اور روح کو فنا نہیں۔ اسیطرح اُس ملک اور قوم کو غیر فانی سمجھنا چاہیے جس کی زبان دنیا میں باقی ہے؛ ہر قوم و ملک کی جان زبان میں ہے ✦ آپ کی زبان کی تعریف آپ سے بیکار ہے کہ شیر مادر کیطرح آپ نے اپنی زبان میں پرورش پائی ہے جسکو آجکل کے لب و لہجہ میں زبان مادری کہتے ہیں ✦

صلائے عام کے قدر دانوں نے مجھے صلاح دی ہے کہ آغاز سال حال سے صلائے عام کی سالانہ قیمت بڑھا دی جائے۔ اس میں مجھے یہ اندیشہ ہے کہ اسی قیمت کے وصول ہونے کا رونا رہتا ہے جو عرصہ سے مقرر ہے۔ زیادہ کی بہت اُمید نہیں۔ لیکن ہاں چند علم دوست اپنی زبان کی قدر شناسی کی طرف اگر متوجہ ہوں تو میں اسکے اخراجات سے کم و بیش سبکدوش ہو سکتا ہوں ✦

غزل جناب سید معین الدین احمد صاحب قیس رضوی (عظیم آبادی)

جھلّتوں میں تجھے میرے گھر دعا لائی ✦ سحر کو ساتھ اپنے بندش قبا لائی ✦ میں تری آنکھوں کی گردش کے صدقے ادا تری نگاہ تو جام جہاں نما لائی ✦ جہاں امید نہ حسرت نہ آرزو کا پتا ✦ وہیں یہ کھینچ کے تقدیر نارسا لائی ترے تبسم معصومیت ادا کی قسم ✦ بنا کے بات تو گھتی ہوئی حنا لائی ✦ بتا تو پردہ خلوت کے بیٹھنے والے ہجوم حشر میں کیوں کر تجھے حیا لائی ✦ مریض خوش ہوا تھا ابھی آرزو نجات ہوئی ✦ نئی اُمید کو کمبخت پھر لگا لائی تو صبا نے چھیڑ جو کی بھی تو خاکسار رہے ✦ کہاں کی خاک تھی دیکھو کہاں اُڑا لائی ✦ بتا دے چشم تغافل خطائے نظارہ سوائے حسرت دیدار اور کیا لائی ✦ شب فراق امیر صدقہ ترے گھر گیا ✦ کہاں سے یار کی تصویر تو اٹھا لائی تو کسی کی حسرت و ارمان کا خون کیوں ہو گیا ✦ شب فراق جھری زہر میں بجھا لائی کو ✦ جہاں کی بھول بھلیاں کا عقل و عشق ہے نام اسی غور سے یہ دشت مجھے لگا لائی ✦ دعا صبح تلاش میں اثر میں نکلی تھی ✦ امید جتنی تھی اُس سے کہیں سوا لائی ازل میں روح پہ غم کا پہاڑ جب ٹوٹا ✦ بسا دکھ بھی نہیں تھی مگر اٹھا لائی ✦ کوئی تھا حجلۂ دل میں مرے تبسم ریز قلب "حرم میں جو مجکو یہ دعا لائی ✦ چمن میں یار نہ غنچہ دہن ہے گل ای قیس ✦ خدا وہ پھر نہ دکھائے جو تو دکھا لائی ✦

"اخیۃ الفتیان"

عیسائیوں میں رہبان وہ لوگ کہلاتے تھے کہ جو دنیا اور دُنیا کے کاموں کو چھوڑ کر یادِ خدا
ئی تمام عمر گزار دیتے تھے۔ اُن کی زندگی گویا دنیا کے واسطے نہ تھی بلکہ خالص دین کے واسطے۔ مذہب
تو یہہ دل دادہ ہمیشہ سے تھے۔ مگر صلیبی لڑائیوں کے لگ بھگ ان میں ایک عجیب روح پھونکی
ں۔ پیٹر دی ہرمٹ اور سینٹ برنارڈ کے جوشِ مذہبی نے اس رہبانیت کو آخر سپہ گری کا
پہنایا اور شہ سواروں کے چند دستے مثل نائٹس ٹمپلرز اور نائٹس آف سینٹ جان کے نام سے قائم
ے جن کا قدم حمایت صلیب میں ہمیشہ سب سے آگے رہا اور مذہبی لڑائیوں میں انہوں نے سب
۔یادہ حصہ لیا۔

گویا یہہ فرقہ مجاہدین اسلام کی تقلید میں جس کو ہمیشہ نام رکھا جاتا تھا اور آج کل بھی بعض ناواقف
اسلام کو نام رکھتے ہیں تیار کیا گیا تھا۔ یہہ بھی تھا کہ زمانہ امن میں یہہ لوگ بہت سے نیک کام بھی کیا
تے تھے۔ راستوں کی حفاظت لوگوں کی بھلائی مفلسوں کی دستگیری بیماروں کی تیمارداری وغیرہ۔
ہ اس کے اُسی زمانہ میں مسلمانوں میں ایک فرقہ تھا اُس کو اخیۃ الفتیان کہتے تھے اضلاع شام
یشیائے کوچک کے چھوٹے بڑے شہروں میں یہہ لوگ زیادہ پائے جاتے تھے۔ ابن بطوطہ
اپنے روم شام کے سفر میں انکا تذکرہ کیا ہے۔ روم سے مراد ابن بطوطہ کی ایشیائے کوچک سے
ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ عیسائیوں کی مذہبی سرگرمیاں دیکھ کر ان نوجوان مجاہدین نے اپنے کو مذہبی کاموں
ے واسطے خاص کر لیا ہوگا ۵۸۰ھ ہجری کے بعد کا یہہ معاملہ ہے کیونکہ علامہ ابن جبیر اندلسی نے اپنے
شرق کے سفر میں ان کا تذکرہ نہیں کیا اور ابن بطوطہ نے ۷۲۵ھ ہجری میں اپنا سفر شروع اور ان کا
رہ کیا ہے [illegible] لکھا ہے کہ اخی وہ شخص کہلاتا ہے کہ جو اپنے ہم پیشہ لوگوں کو جمع رکھتا ہے یہہ نوجوان مجرد

شیخ سے کچھ کہنے لگا۔ شیخ نے ابن بطوطہ سے کہا کہ تم سمجھے یہہ کون ہے اور کیا کہتا ہے۔ اس نے کہا کہ میں ترک کی زبان نہیں جانتا شیخ نے کہا کہ یہہ نوجوان گروہ اخیتہ الفتیان سے ہے تمہاری مہمانی کرنا چاہتا ہے۔ ابن بطوطہ نے شیخ سے کہا کہ ایسے مفلس آدمی کو میں مہمانی کرا کے زیر بار نہیں کیا چاہتا۔ شیخ نے ہنسکر کہا کہ ایسا نہیں ہے جو تم سمجھے ہو۔

غرض کہ ابن بطوطہ معہ ہمراہیان اُس کے ہمراہ ہوا۔ دیکھا کہ عالیشان مکان ہے جو خانقاہ کے نام سے مشہور ہے اور عمدہ فرش اور دوسرے اسباب سے بہت آراستہ۔ اور بہت سے نوجوان ایک خاص لباس میں صف بستہ بیٹھے ہیں کمر میں پیٹی ہے اور ایک ایک چُھرہ لگا ہوا ہے وہ سب مہمانوں کی تعظیم کو کھڑے ہوئے عمدہ سے عمدہ مقام پر بٹھایا۔ حمام کرایا خوشبو سے لباس کو بسایا پھر دستر خوان بچھایا اور عمدہ عمدہ کھانے اور میوے اور مٹھائیاں اُس پر چُنی گئیں بڑے اخلاق اور منت سے ان سب کو کھانا کھلایا۔

ہم نے اِس مختصر قصہ کو دو وجہ سے یہاں بیان کیا ہے ایک یہہ کہ اُس زمانہ کا تو کہنا ہی کیا ہے جو کمال خیر و برکت کا خیر القرون کے نام سے پکارا گیا ہے۔ مگر اُس کے بعد بھی سات آٹھ سو برس تک مسلمانوں کی ہمدردی اور باہمی سلوک کا یہہ ہی اہتمام تھا جو بیان ہوا۔ اور آج وہ ہی مسلمان اور اسلام کے نام لیوا ہیں کہ جن سے مسلمانوں کو وہ نقصان اور تکلیف پہونچ رہی ہے کہ جو دوسری قوم سے اِتنی تکلیف ہرگز نہیں پہونچتی۔

دوسری بات یہہ دکھلانی ہے کہ اسلام کی جس بات پر اعتراض کیا گیا اور کیا جاتا ہے وہ ہی باتیں دوسرے مذاہب والوں کو مسلمانوں کی تقلید میں کرنا لابد ہی ہوئیں۔ خواہ عیسائی ہوں یا آریہ ہوں یا موسائی ہوں۔ مگر اعتراض کے کرتے وقت اپنی حالت کو سب بھول جاتے ہیں اِس کا افسوس ہے کہ ہماری طبیعت نادرست ہے ورنہ ان امور کو کسی قدر تفصیل سے لکھتے۔

مرزا محمد علی

(المخاطب بہ خاں صاحب رئیس دہلی)

صلائے عام دہلی

صلائے عام کی ڈاک

اوّل اوّل جب میں آپ سے ملنے گیا تو آپ کی بذلہ سنجی نے مجھے اپنا گرویدہ بنا لیا۔ میں مسئلہ تناسخ کا قائل نہیں ورنہ شاید خیال کرتا کہ حضرت **غالب** مرحوم کی روح آپ کے جسم میں آ گئی ؛ **غالب** نے نظم میں وہ فلسفۂ حکمت کوٹ کوٹ کر بھرا ہے جس کے بعد میدان شاعری میں مشرق و مغرب کا کوئی سخنور پیش نہیں کیا جا سکتا۔ آج آپ نے فلسفۂ یونان و مصر کو جس لطیف پیرایہ میں پیش کیا ہے "اُردو ادب" ابد تک اس کے احسان سے سبکدوش نہیں ہو سکتا ؛ میں آپ سے عمر خیام کے فلسفہ پر لکھنے کی باادب درخواست کروں گا[1]۔ بلکہ مہدی حسن گورکھپوری کے مندرجۂ ذیل فقرات کی طرف آپ کی التفات خاص طور پر مبذول کرانا چاہتا ہوں :-

× × × × × × × × "یہہ لکھ رہا ہوں اور سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کے قدردان کہاں سے آئیں گے ؟ موجودہ نسل آپ کو نہیں جانتی یا کم سے کم میری طرح نہیں جانتی - اور یہہ آپ ہی کا قصور ہے لیکن ہر فعل خود اپنی مکافات ہے ؛ دُنیا میں رہنے اور اچھی طرح رہنے کا اس قدر حق ہے کہ جس طرح ہو اپنی مستقل یادگار چھوڑ جائے۔ اس کی چلتی ہوئی ترکیب یہہ ہے کہ جس طرح ہو سکے **تیرھویں صدی** اور متفرق پرچوں میں جو کچھ آپ نے لکھا ہے اپنے اہتمام سے جلد شایع کر دیجئے" ؛ × × × × × × ×

مہدی حسن مرحوم کی جو کچھ اُمیدیں آپ سے وابستہ تھیں وہ ہنوز روز اول کی مصداق ہیں۔ خدا کرے میری یہہ تحریک آپ کی طبیعت کو اس جانب مائل کرنے میں کامیاب ہو جائے تو میں نے بھر پایا × × × × × × × × × × × × ×

(از مسلم یونیورسٹی علیگڈھ)

[1] صلائے عام کے دَور اوّلے میں عمر خیام کی فلاسفی کی نسبت لکھا جا چکا ہے کہ عمر خیام کو نہ فلاسفی کا دعوےٰ تھا نہ شاعری کا۔ نہ مستند فلاسفر نہ ذی کمال شاعر۔ عمر خیام کو اس نگاہ سے دیکھتے ہیں : ہاں مگر اپیی کیوریَن فلاسفی (Epecurian) اس لائق ہے کہ اس کی تحقیق میں بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے ؛

صلائے عام۔ اس کا جواب خطوں اور خطوں کے جواب میں ادا کرنا مشکل ہے۔ اس کے لئے علیحدہ مضمون درکار ہے مجھے اندیشہ ہے کہ اپنا حال مضمون میں بھی مشکل سے لکھا جاسکے گا لیکن بقول جناب داغؔ واعظا توبہ کی عادی کیا ہے؟

× × × × × × × × × × × × ×

"چند روز ہوئے کہ رسالہ صلائے عام کسی دوست سے مجھے دستیاب ہوا۔ یوں بطور شغل ورق گردانی چند مضامین پر نظر نے گہری روشنی ڈالی۔ ایک ایک لفظ اور عبارت آرائی نے خدا جانے دل پر کس بلا کا اثر کیا۔ میری ناقص عقل میں صلائے عام کی زبان اساتذہ کی اردو کا مرقع نظر آتا ہے۔ میں کہاں تک تعریف کے گھوڑے دوڑاؤں اور کیا کیا خوبیاں بیان کروں۔ میں نے تو رسالہ کو ہر پہلو سے عمدہ پایا۔" × × × × × × ×

"جناب والا۔ بعد آداب وتسلیم گزارش اینکہ: بندہ کو آپ کے رسالہ صلائے عام کی خریداری کا شرف حاصل ہے۔ مگر معلوم نہیں کہ رسالہ کب سے جاری کیا گیا اس کا پتہ نہیں: اس کا پتہ دفتر سے معلوم ہوجائے گا۔ جب میعاد چندہ ختم ہوجائے تو پہلا پرچہ بذریعہ وی۔ پی روانہ فرمائیے۔" × × × × × × × × × × "میری رائے ناقص یہ رسالہ کا حجم اور مضامین زیادہ کئے جاویں جس سے اخراجات ضرور بڑھ جاویں گے اور سالانہ چندہ بڑھانے کی ضرورت پیش آئے گی۔ بندہ تو اس زیادتی کے لئے تیار ہے اور یہ فقط رسالہ کی خوبی کی کشش ہے" × × × × × × × × × × ×

× × × × × × × × × × × × ×

سالِ نو کی مبارکباد دینے کا یہ پہلا موقعہ مجھے آج ملا ہے۔ خداوندکریم آپ کو آپ کے

جمیع احباب کو سالِ حال مبارک فرماوے۔ آمین۔

مجھے خود از بس مصروفی رہی جس کی وجہ سے یہ بھی لکھنے کی نوبت نہیں آئی کہ صلائے عام ماہ نومبر مجھے نہیں پہونچا اور قرینہ یہ کہتا ہے کہ پریس سے نکلا ہی نہیں۔ واللہ اعلم۔

صلائے عام ماہ دسمبر میں جناب مرزا محمد علی خاں صاحب نے بمضمون تحبیتِ نظم و نثر میری جانب بھی خطاب فرمایا ہے حالاں کہ میں تو کسی میں بھی نہیں ہوں اور لائق و بہترین سخن والوں کے آگے جیسے کہ ماشاءاللہ خود بدولت ہیں میری کیا حقیقت ہے اور لکھوں تو اس مصرعہ سعدی رح کا مصداق بنوں کہ ع خجل شد چو پہنائے دریا بدید۔

بہر حال محض تعمیل ارشاد کو ذریعہ تحریر سمجھ کر ایک مختصر سا مضمون نظم و نثر نذر کرتا ہوں اور جو سمجھ میں آیا وہ لکھتا ہوں۔

جی چاہتا ہے کہ بعض مضامین کے متعلق کچھ کہوں کیوں کہ اچھی چیز پاکر واہ واہ کرنے کو ضرور جی چاہتا ہے اور یہہ انسانی بیساختہ پن ہے۔

"مزیل الاغلاط" محمد جمشید علی خاں صاحب نے صحت اغلاط پر جو مسودہ بھیجا ہے اگر اس کو خانہائے صحیح اور غلط میں ایک نقشہ کے طور پر ترتیب دیں تو بالیقین بہت ہی سودمند ہوگا اور شعرا کے واسطے عمدہ رہنما ہوگا۔

"اُردو بمقابلہ ہندی" یہہ مضمون بہت ہی مدلّل اور پاکیزہ ہے امید ہے کہ جناب مرزا محمد علی خاں صاحب حسب وعدہ ضرور اس کی آئندہ پرچوں میں توسیع فرمادیں گے۔

"قلبِ انسانی" یہہ مضمون بڑا پرلطف ہے اور اس چھوٹی سی شئیں کا ذکر خداشناسی کا رہنما ہے حق بات یہہ ہے کہ عارف ہی کا کام اس کا سمجھنا ہے اور پیرزادہ خان بہادر محمد حسین صاحب کے اہلِ دل ہونے کی شہادت اس سے پیدا ہے جس کو کوئی دل چھپا نہیں سکتا۔ جو خدا کے دل دادہ ہیں وہ اسی طرح سے حق نمائی کرتے ہیں ورنہ ہمارا تو یہہ حال ہے ؎

اے دل بہرزہ دانش و دینت زدست رفت ❊ صد مایہ داشتی و نکردی کفایتے۔

آپکا نیازمند فرمان علی (اکلاس اسسٹنٹ)ریری مجسٹریٹ گڑگاؤں

نظم و نثر

(پہلا مضمون)

جناب مرزا محمد علی خانصاحب رئیس دہلی نے صلائے عام ماہ دسمبر میں ابوالفضل و فیضی کی نثر و نظم کا حوالہ اپنے بیش بہا مضمون میں دیتے ہوئے مجھ جیسے ہیچمدان کو بھی جناب خان بہادر میر ناصر علی صاحب سخن ور اور مولوی سید بشیر الدین احمد صاحب سخن گستر کے اسمائے گرامی کے ساتھ محض اپنے حسن ظن و اخلاق سے مخاطب فرمایا ہے حالاں کہ میرا شمار اُن میں ہے جو الف کے نام بے نہیں جانتے۔

جو مسئلہ کہ متنازعہ فیہ قرار دیا ہے وہ تو ایک بات کی بات ہے مگر اس کا حل کر دینا بحر عمیق سے موتی نکالنا ہے۔ بات تو صرف اتنی ہے کہ نظم کلام مشکل ہے یا کلام۔ اس موقع پر میں نے نثر کے لفظ کو دانستہ چھوڑ دیا ہے اور محض کلام کے لفظ پر اکتفا کیا ہے اس کا سبب یہہ ہے کہ کلام ہی تو نظم کیا جاتا ہے اب بولنے والے آپ سمجھ جائیں گے کہ وہ ہماری بولی ہی تو ہے جس کے ٹکڑے ٹکڑے جوڑ کر نظم کر لیتے ہیں اور یہہ ظاہر ہے کہ جب ہمارا کلام بکھرا ہوا ہے تو اس کو جا بجا سے لا کر جمع کرنا اور اپنے اپنے محل پر لگانا اور پھر وزن کرنا ایک اور ہی محنت و جانفشانی کا کام ہے جو کلام کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ ابھی جب کسی دوکاندار سے غلہ خریدنے جاتے ہیں تو سب سے پہلے وہ اپنی ترازو ہاتھ میں لیتا ہے اور تولنے والا ڈنڈی کی خدکشی پر جس طرح نظر جمائے رہتا ہے خریدار بھی دونوں پلّوں پر آنکھ لگائے رہتا ہے اِدھر تو دکان دار کو یہہ خیال دامن گیر رہتا ہے کہ غلہ زیادہ نہ چڑھ جائے اور ڈنڈی جھک نہ جائے اُدھر خریدار جھک جھک کرتا کرتا ہے کہ

کہیں غلہ کم نہ ہو جائے اور ڈنڈی اُدپر نہ چڑھ جائے۔ اس پر بھی یہہ بحث بعد میزان کے باقی رہ جاتی ہے کہ ترازو میں پاسنگ تو نہ تھا اور دکاندار اطمینان دلاتا ہے کہ دیکھو میں نے پہلے ہی بات رکھنے سے پہلے پاسنگ کر لیا تھا اور یہہ پتھر رکھ دیا تھا۔

خریدار کی نظر سب سے پہلے اس پر پڑتی ہے کہ غلہ میں ملونی تو نہیں ہے گیہوں اگر درکار ہیں تو اس میں جو۔ چنے۔ تو نہیں ملے وہ تو خالص گیہوں خریدنا چاہتا ہے۔ اب اگر جو۔ چنے ملے ہیں تو دکاندار کہتا ہے کہ اجی ابھی چھاں پھٹک کر تولے دیتا ہوں ذرا صبر تو کیجیے۔ اور اگر خالص گیہوں موجود ہیں تو بھی بکھرے بکھرائے گیہوں سمیٹ سماٹ کر تیں بھر بھر کر پلہ پر چڑھانا پڑتے ہیں۔

میں اس سوداسلف کو چھوڑتا ہوں اب سیدھی بات کرتا ہوں کہ کلام کرنے کا انداز تو ماں کی گود ہی میں اُس کی باتوں سے سنکر اور لبوں کی جنبش کو دیکھکر آجاتا ہے اور تھوڑے دنوں میں تتلا تتلا کر اللہ اللہ کہہ اُٹھتے ہیں اور پھر بات کرنے کا سلیقہ آجاتا ہے۔ عمر گھٹتی ہے مگر قوت تکلم بڑھتی ہے حتےٰ کہ اچھے خاصے بولنے چالنے لگتے ہیں۔ اس محل پر یہہ بے ساختہ کہنے کو جی چاہتا ہے کہ ہماری بولی کے توابع مہمل جن کو اکثر اس مضمون میں میں دانستہ لایا ہوں ہمارے حسن زبان کو بڑھاتے ہیں اور اپنے محاورات پر ہم کو پورا پورا قابو دیتے ہیں مگر نثر کو چھوڑ کر نظم میں حشو کے مرتبہ سے آگے نہیں بڑھتے غلہ کی تمثیل میں نے محض نثر کی پراگندگی کی وجہہ سے دی ہے تاکہ سمجھنے میں آسانی ہو۔ ہمارا کلام ہم چاہے جس طرح سے بولیں بے تکلف ہوتا ہے اور یہہ ظاہر ہے کہ ہم اپنی زبان وہی بہترین زبان جانتے ہیں۔ جو ہم بولتے چالتے ہیں اور ہم کو یقیناً اسی میں آسانی ہے اور ایسی آسانی ہے کہ مشکل کا نام نہیں چاہیں جس پہلو سے بولیں ہیں نہ تو وزن کا کھٹکا رہتا ہے نہ باٹ کا اور نظم کو ہم کھینچ کھانچ کر پاسنگ لگا لگو کر میزان میں تولتے ہیں تو یہہ بالکل مشکل کا سامنا ہے۔ پس حاصل کلام یہہ ہے کہ نثر تو مشکل ہی ہی نہیں اور نظم واقعی مشکل ہے۔

میں فصاحت اور بلاغتِ کلام کو صنعت میں داخل سمجھتا ہوں اور وہ بیشک نظم سے زیادہ مشکل ہیں اس وجہہ سے کہ وہ حشو کو۔ غیر مانوس الفاظ کو۔ نوک دم بریدہ لفظوں کو اور کسی قسم کے پاسنگ کو

روا نہیں رکھتیں مگر نظم محض اپنے وزن کے لحاظ سے اُسے جائز اور روا رکھے گی۔ خان بہادر صاحب نے تو اپنے ریمارک میں دعوے سے دست برداری کی مگر جہاں تک کہ فصاحت و بلاغت کا نثر سے تعلق ہے میں اُن کی تائید کروں گا کہ نثر مشکل ہے۔

میں مضمون کے ختم کرنے سے پہلے یہ عرض کر دوں کہ فیضی اور ابوالفضل نے فارسی میں کلام کیا ہے اور میں اُردو لکھ رہا ہوں فقط

راقم مرزا عرفان علی بیگ۔ آئی ایس او۔ از آگرہ

نظم و نثر

(دوسرا مضمون)

نظم و نثر کی نسبت یہ دوسرا مضمون جناب مرزا عرفان علی بیگ صاحب نے اس خط کے ساتھ بھیجا ہے جس کا اقتباس ذیل میں لکھا جاتا ہے:۔

× × × × × × × × × × × × × × ×

"اجی حضور اس کو باور فرمائیے کہ آپ کی قلم میں قدرتی زور ہے اور ہر عبارت ایسی ہوتی ہے کہ پھول جھڑی چھوڑتی چلی جاتی ہے۔ میں بلا مبالغہ عرض کرتا ہوں کہ آپ میں مادہ مضمون آفرینی اور سخنوری خدا داد ہے اور آمد ہے نہ کہ آورد۔ میں ہزار کوشش کروں گا آپ کی سی نہ نازک خیالیاں سوجھیں گی نہ لطفِ زبان ہوگا۔ ہندوستان میں بہت سے مضمون نگار ہیں اور بڑے بڑے صاحبِ لیاقت ہیں مگر وہ بات نصیب نہیں جو آپ کو خدا نے بخشی ہے۔ خدا جانے کہاں سے آپ یہ نازک خیالیاں پیدا کرتے ہیں۔ مجھے تو ہر مضمون آپ کا حیرت میں ڈال دیتا ہے۔

خان بہادر صاحب آپ کے سامنے کوئی کیا قلم اٹھا دے گا۔ آپ نے نومبر کے پرچہ میں نئے رسالوں کے "ریویو" کس خوبی کے ساتھ اور حق بجانب بیان کیا ہے کہ سبحان اللہ سارے ریویوں کی روح کہوں تو بجا ہے۔ اسی طرح سے "امثال" "سیر دریا" "مضمون پریشان" سب مضامین فی الحقیقت لاجواب ہیں اور آپ ہی کا حصہ ہیں۔

جناب مرزا محمد علی خانصاحب نے جو وزن متناسبہ کا نتیجہ تحریر فرمایا ہے وہ نہایت کار آمد و مفید مضمون ہے فقط زیادہ کیا عرض کروں۔ آپکا نیازمند عرفان علی

(مرزا عرفان علی بیگ آئی ایس او۔ آنریری مجسٹریٹ آگرہ)

نظم و نثر

جناب خان بہادر میر ناصر علی صاحب کا ارشاد ہے کہ میں اس مضمون کو وسعت دوں کیوں کہ جو میں قبل ازیں نذر صلائے عام کر چکا ہوں وہ میری کوتاہ قلمی پر دلالت کرتا ہے۔ یہہ امر حق ہے کہ میں نے ہمہ داشتہ قلم جہاں تک کاغذ میں گنجایش پائی لکھہ مارا اور دوسرا ورق سیاہ کرنے کو جی نہیں چاہا مگر اب چار و ناچار خان بہادر صاحب کے ارشاد کی تعمیل بہ تسلسل مضمون ماسبق اس معروض سے کرتا ہوں کہ۔

تمہید نظم و موسیقی — نظم تو محدود خیالات کو اُن چند بحور میں ختم کر لیتی ہے جو انگلیوں پر گن لی جاتی ہیں اور ہم کو تو خالق ارض و سماء نے میں انگلیاں دی ہیں نظم تو زیادہ سے زیادہ اُنیس بحور سے آگے نہیں بڑھنے پاتی اور پھر بھی شاعر یا ناظم اُسی بحر پر طبع آزمائی کرتا ہے جس میں قدرت نے اس کو موزونی بخشی ہے اور یہہ کچھہ ذاتی و شخصی حالت پر کسی ناظم کے موقوف نہیں ہے بلکہ سرزمین میں بھی اس کا کچھ نہ کچھ حصہ ضرور ہے چنانچہ عرب بلحاظ ارکان اور نیز بلحاظ بحور تخصیص رکھتا ہے اور فارس بھی اپنے اوزان خاص اختیار کرتا ہے۔ جیسے کہ ایک کم بیس پر گیارہ بڑھا کر تیس بحور پورے کرتا ہے لیکن عرب کے مخصوص بحور کو ہاتھ نہیں لگاتا۔ ہندوستان

جس کو مخلوط الزبان کہنا اس موقع پر بیجا نہ ہوگا۔ اہل فارس کا تتبع کرتا ہے۔ ہرچہ باشد مقصود تو نظم کا صرف
اسی قدر ہے کہ ناموزوں کو موزوں بنا دے اور اُس سے کہنے اور سننے والوں کو دونوں کو ایک لطف
پیدا ہوتا ہے جو فی الحقیقت موسیقی سے جا کر ٹکراتا ہے۔

میں نے موسیقی کو اس وجہ سے درمیان میں ڈالا کہ بعض انسان قدرت سے موزوں
طبیعت لیکر دنیا پر پاؤں دہرتے ہیں اور بے ساختہ موزوں کلام اُن کی زبان سے نکلتے ہیں۔
ہرچند کہ جو بالقصد نہ کہا جاوے وہ شاعری سے خارج سمجھ لیا جاوے مگر میں نے خود بوندیلکھنڈ
کے ناخواندہ دہقانیوں کو اپنے اپنے خیالات دف پر گاتے سُنا ہے اور وہ خیال اس لحاظ سے
ضرور بالقصد کہے جا سکتے ہیں کہ دار و مدار اُن کے کلام کا کسی نہ کسی راگ پر ہوتا ہے۔ یہہ تو ظاہر
ہے کہ راگنی وقت کی سہاونی ہوتی ہے اور بے وقت کا راگ روح کا خلجان ہو جاتا ہے پس
جب وہ اپنے طرز کے وزن پر راگ و راگنی کو ٹھیک گاتے ہیں تو ہمیں اُن کے خیالات کو نظم کہنے دینے
میں کیا دریغ ہے۔

لیکن ہم انصاف سے باہر نہیں جانا چاہتے بلکہ یہہ بھی بالیقین ہے کہ فیصدی نہیں بلکہ
فی ہزار معدودے چند نکلینگے میں جو اس طرح سے اپنے خیالات کو موزوں راگ میں گا لیتے ہیں
اور وہ لوگ جو موزوں طبیعت بھی نہیں رکھتے۔ سکھانے پڑھانے پر بھی بے راگ الاپ اُٹھتے
ہیں اور اسی محل سے مشکل کا سامنا نظم کو پیش آتا ہے۔ جیسا کہ میں اوپر عرض کر چکا ہوں نظم محض
معدودے چند بحور میں محدود ہے مگر بقول شعراء اُردو کے لحاظ سے نظم کو مشکل پر مشکل پیش آتی ہے اور
آمد میں بہ لحاظ موزوں طبیعت پانے کے ضرور آسانی نظر آتی ہے۔ لیکن ایک بحر سے نکل کر دوسری
بحر میں غواصی کرجانا شاعر کو پھر دقت کا اُٹھانا ہے۔ بالکل ایسا ہی سمجھئے کہ چاشت کے
وقت کی بھیرویں (رہاوی) جو کہ راگنی بھیروں راگ کی ہے۔ اگر اس کو دیسی راگنی (جینی) یعنی دیپک
والی کے وقت دس گیارہ بجے دن کو گا دیں تو گانے والے کا بھی قافیہ تنگ ہو جاوے گا اور
سُننے والوں کا بھی جی جل جاویگا اور سارا لُطف ملیا میٹ ہو جاویگا۔

اس قدر تمہید کے بعد میں نثر و نظم کی آسانیاں اور مشکلات کو اپنی سمجھ کے موافق حسب ذیل عرض کرتا ہوں۔

نثر ہم جو بات چیت کرتے ہیں وہ نثر ہی تو ہے عام اس سے کہ کوئی اس کا فقرہ موزوں ہو یا غیر موزوں، اور جو ہماری گفتگو ہے وہ ہمارے خیالات کا اظہار کرتی ہے مگر ہمارے خیالات ہماری عقل کے حدود کے اندر ہوتے ہیں جیسا کہ مقولہ عرب ہے کہ تکلم الناس علیٰ قدر عقولھم۔

نثر میں آسانی ہم اپنے خیالات کا اظہار بے تکلف اپنی زبان اور اپنے لب و لہجہ میں کیا کرتے ہیں اور گو خیالات کے پیدا کرنے میں ہم کو تفکّر پیدا ہو مگر اُن کو زبان سے ادا کر دینے میں ہمیں کسی دِقت کا سامنا پیش آتا ہے نہ کچھ دیر لگتی ہے عام اس سے کہ وہ خیالات کیسے ہی رکیک ہوں یا کیسے ہی نازک و سنجیدہ و بلند ہوں۔ ہم کو زبان سے بیان کر دینے میں اس وجہ سے آسانی ہوتی ہے کہ وہ زبان ہماری ہے جس کو ہم ابتدا سے اس وقت تک بولتے رہتے ہیں جب تک کہ اظہار خیالات کا موقع ہمارے ہاتھ آتا ہے۔

نثر میں مشکل یہہ پہلے بیان کر دیا گیا ہے کہ تکلم الناس علےٰ قدر عقولھم۔ ماہ اکتوبر کے پرچہ صلائے عام میں ناظرین نے "ولگرزم" کا مضمون ملاحظہ فرمایا ہوگا یہہ ولگرزم نثر ہی کے لکھنے والے صاحب کے جواب میں ایک لایق و فایق مہذب اہل زبان اور نثار زماں جناب مولوی بشیر الدین احمد صاحب کی جانب سے شایع ہو چکا ہے۔ یہہ ولگرزم کا لفظ ایسا ثقیل ہے جس کے ترجمہ کرنے میں میری زبان نہیں کھلتی آخرش یہہ اُسی نثر کے واسطے مستعمل ہوا جس کا لکھنا "جھانپلزم" کے لکھنے والے صاحب کو بالیقین مشکل تھا اور اگر وہ مہذب الفاظ میں ہوتا تو ہنسنے والے کیوں قہقہہ لگاتے صرف یہی ایک مشکل نہیں ہے جو نثر لکھنے والے کو پیش آتی ہے کہ اپنی زبان کو تہذیب کا مقید کر دیوے بلکہ اور بھی مشکلات ہیں جو آئندہ بیان ہوں گی۔

خیالات کا اظہار نثر میں مشکل ہے نثر تو ایک دریائے بے پایاں ہے جس کا اور نہ چھور ایک ایک خیال کو جانیے جس قدر وسعت دیتے چلے جاویں یہہ دل و دماغ کی قوت پر اور علمی لیاقت پر موقوف ہے اور ہر علم کے واسطے دس دس گونہ عقل درکار ہے۔ جن لوگوں میں قوت متخیلہ اور قوت دماغی

اصلیت علمی اور نصیحت حقیقی نہیں وہ کسی خیال کا اظہار بوجہ احسن نہیں کرسکتے اور یہہ ناقابلیت نثر کے لکھنے میں مشکل ہی نہیں ڈالتی بلکہ ناممکن کردکھاتی ہے۔

نثر میں الفاظ برجستہ و معنی خیز نہ ہونا مشکل ڈالتے ہیں نثر کے لکھنے میں اگر وہ الفاظ جن سے کہ عبارت نثر مرتب ہے برمحل و برجستہ نہیں ہوتے تو وہ معنی خیز بھی نہیں ہوتی اور اُس کا اثر کسی کے ذہن میں نہیں جمتا گو کاغذ پہ سطور سیاہ نظر آویں اور ایسی ہی نثر و نثار کے کلام بے معنی سمجھ کر اہلِ خرد خاموشی اختیار کرلیتے ہیں ع بس جواب احمق اولی تر سکوت۔

نثر میں سلاست مشکل ہے نثر لکھنے میں سلاست زبان اور روانی قلم دونوں کا ہونا مشکل ہے میں دونوں اس وجہہ سے کہتا ہوں کہ بعض اشخاص طبائع علم مجلسی کے واسطے خداداد رکھتے ہیں مگر لکھ نہیں سکتے اور بعض اہل قلم روانی قلم پر قادر ہوتے ہیں مگر زبان سے ادا کرنے میں قاصر ہوتے ہیں

فصاحت نثر میں مشکل ہے یہ تو روزمرہ دیکھنے میں آتا ہے کہ نثر میں وہ الفاظ دانستہ بھر دئے جاتے ہیں جو غیر مروج۔ غیر مانوس اور غیر زبان کے ہوتے ہیں اور آج کل کی اردو میں تو غیر مُلک کی زبان جان بوجھ کر ملادی جاتی ہے۔ پھر کیوں کر کوئی اہل زبان ایسی اردو نثر کو فصیح ہونے کی سند دے سکتا ہے۔ فصاحت کی خوبی صرف اسی میں نہیں ہے کہ سلاست ہو بلکہ فی الواقع ایسی زبان ہو کہ جس کو ہر کہ و مہ آسانی کے ساتھ سمجھ جاوے اور غلط فہمی کا گمان اُس سے دور ہو لیکن یہہ ایک آدھ فقرہ ہو تو آسان کہا جاسکتا ہے ایک آدھ صفحہ ہو تو آسان سمجھا جاسکتا ہے ایک آدھ جزو ہو تو بھی آسان ہوسکتا ہے مگر جب نثار کا میدان تحریر و تقریر حدِ نگاہ سے بھی آگے بڑھتا چلا جاتا ہو تو نثر کا لکھنا اور اس تمام تحریر یا سبق کی انشا پردازی کا دفتر کا دفتر یاد رکھنا فی الواقع مشکل ہے

تکرارِ کلام کی وجہہ سے نثر مشکل ہے اکثر ناظرین کی نظر سے گزرا ہوگا کہ الفاظ و جملے در کنار خیال کے خیال بعض نثار مکرر سہ کرر بیان کرتے اور لکھتے چلے جاتے ہیں آگے پیچھے کا خیال ذہن سے مفقود ہوتا ہے یہہ فصاحت سے بعید ہے اور نثر کا اس سے پاک رکھنا مشکل ہے۔

بلاغت نثر میں مشکل ہے جس طرح سے فصاحت مشکل ہے بلاغت اس سے بھی زیادہ مشکل ہے کیونکہ

بلاغت

بلاغت کی شان انشا پرداز کے قلم کو ہیرے کا چاہتی ہے کیوں کہ الماسی جڑاؤ سے وہ اپنی نثر کو جگمگا
چاہتی ہے اور ہر اہل علم اُس پر جس قدر غور کرتا ہے اُسی قدر لُطف اٹھاتا ہے۔ بلاغت اپنے ساتھ ساتھ
فصاحت کو ضرور لئے رہتی ہے کیوں کہ بلا فصاحت کے تو کام ہی نہیں چلتا۔ خوبی و لُطف بلاغت
یہہ ہے کہ طوالت مطلق نہو جو مضمون کہ چار سطر گھیرتا ہو وہ ایک سطر میں آجاوے اور پھر حسب حال
جس سے کہ ذہن پڑھنے والے اور سُننے والے کا اصل مقصود کو پہونچتا چلا جاوے مگر جہاں عبارت
سے ایک لفظ بھی کم ہو جاتا ہے وہاں مطلب بھی سمجھ سے باہر ہو جاتا ہے۔ اشارات متناسبہ کیا
امر کی خبر دیتے رہتے ہیں کہ نثار کا مدعا کیا ہے اور ایسی نثر کا لکھنا بالیقین مشکل ہے۔

عبارت آرائی | مُقفہ اور رنگین عبارتیں نثر کی نثاروں کی لیاقت علمی ذکاوت و شوق پر موقوف ہیں
اور یہہ عبارتیں گو طول نہیں ہو سکیں مگر اُن کا لکھنا بالیقین مشکل ہے نہ ہر شخص نثار اس کا شوق
رکھتا ہے نہ ہر ذہن میں اس کی گنجائش ہے۔

نظم | ہم جو کلام کرتے ہیں وہ فطرتاً ہرگز نظم نہیں اور اگر کلام موزوں زبان سے یا قلم سے بے ساختہ
نکل جاوے تو وہ شاعری سے معمولاً خارج سمجھا جاتا ہے اور اُس کا سبب ظاہر ہے کہ کلام کا نظم کرنا
ایجاد نثاران ہے نہ ناظمان کیوں کہ ہم قدرتاً شاعر بنکر دنیا میں نہیں آئے۔ پس نظم محتاج نثر واقع
ہے تا وقتیکہ نثر سے ہم الفاظ کو اپنے حسب مراد منتخب نہ کرلیں نظم کا دم نہیں بھر سکتے۔

نظم میں جو آسانیاں اور جو دشواریاں ہیں وہ اپنی سمجھ کے مطابق حسب ذیل عرض کرتا ہوں۔

نظم آسان ہے | جہاں تک تجربہ میں آیا نظم کی آسانی دو طرز سے پائی جاتی ہے اوّلاً فطرتاً طبع موزوں
کا پایا جانا۔ دوم واقعات کا فی الذہن جم جانا۔ میں نثر میں تو کوئی بھی نظیر آسانی کلام کی نہ دے سکا مگر
نظم کے لحاظ سے میں حافظ شیرازی رحمتہ اللہ علیہ کے چند شعر ایک غزل منتخب کرکے پیش کرتا ہوں
جس سے یہہ واضح ہوگا کہ وہ ناظم طبیعت خداداد اور واقعہ پیش نظر رکھتے تھے۔
شارحان دیوان حافظ نے ایسا بیان کیا ہے کہ:۔

سلطان[1] غیاث الدین تغلق نے جب بنگالہ میں عنسلِ صحت فرمایا تھا تو اُن تین پرستاروں سے از بس خوش ہوا تھا جنہوں نے خدمتِ غسل انجام دی تھی اور جب وہ مبارکی دینے حاضر ہوئیں تو بادشاہ کی زبان سے یہ مصرعہ نکل گیا ع ساقی حدیثِ سرو و گل و لالہ میرود - اور یہہ خطاب اُن تینوں کنیزوں کی طرف تھا - بادشاہ کو جب مصرعہ ثانی کی فکر ہوئی تو وقت پیش آئی اور شعرائے وقت سے ارشاد فرمایا کہ اس کا مصرعہ ثانی کہدو مصرعہ لگانے میں تو شعرا کو تامل نہ ہوا ہوگا مگر حسبِ دلخواہِ شاہ جب نہ بن پڑا تو بمشورتِ شعرا حافظ شیرازؒ سے فرمایش کی گئی -

حافظ صاحب کی طبیعت تو حاضر ہی تھی اور واقعات بھی پیش نظر تھے لہذا اُس مصرعہ کو صرف مطلع ہی نہیں بنایا بلکہ ایک ہی شب کی فکر میں پوری غزل کہہ کر بھیج دی - میرا مقصود ان چند اشعار سے یہہ ہے کہ یہ واقعہ کا بیان ہے جس نے غزل کے انداز کو آسان کر دکھایا - وہ شعر یہ ہیں

ساقی حدیثِ سرو و گُل و لالہ می رود ❊ وین بحث با ثلاثۂ غسالہ می رود
شکر شکن شوند ہمہ طوطیانِ ہند ❊ زین قندِ پارسی کہ بہ بنگالہ می رود
طے مکاں بہ بین و زمان در سلوکِ شعر ❊ کاں طفل یک شبہ رہ یکسالہ می رود

حافظ ز شوقِ مجلسِ سلطان غیاث دیں
خامش مشو کہ کارِ تو از نالہ می رود

نظم اوزان کی وجہ سے آسان ہے | شعر امیں یا آمد ہے یا آورد کا مادہ ہے - اور آمد بھی خاص مناسبت طبیعتِ شاعر کے ساتھ رکھتی ہے اور وہ صرف ایک دو یا چند بحور پر عبور کر سکتی ہے نہ کہ زائد پر اور جو بحر کہ دل پسند شاعر کے ہو جاتی ہے اُسی میں اس کو آسانی نظر آتی ہے - شعرائے ہند میں معمولاً رمل - رجز - ہزج و تقارب کے اوزان کا زیادہ رواج ہے اور اس کا سبب ربط زبانِ ہندوستان ہے - اکثر ان بحور کو سالم یا بزحافات کے ساتھ زیادہ استعمال کرتے ہیں - رجز میں مثنوی کمتر نظر آئی ہیں

[1] سلطان غیاث الدین تغلق بن ملک تغلق ۷۲۰ھ میں تختِ شاہی دہلی پر جلوہ گر ہوا تھا - بڑا عادل و مدبر بادشاہ تھا - چار سال و چند ماہ سلطنت کی تھی بعد فتح قلعہ ترہت جب دہلی کو نہضت فرمائی تو چار ہی منزل چل کر افغان پور میں خیمہ زن ہوا وہاں شاہزادہ الغ خاں نے ایک نو تعمیر عمارت میں دعوت طعام دی لیکن محل نے ایسا پیچا کیا کہ بعد فراغ طعام اس پر چھت گر پڑی اور ۷۲۵ھ میں دنیا سے رخصت ہو گیا

اُردو میں طو

آور دہ میں محض طرح کی بنا پر (معاف فرمائیے گا) من گھڑت ہوتی ہے جو شاعری تو ضرور ہے مگر عالی طبیعت سے نہیں بلکہ تکلف اور استکراہ کے ساتھ ہوتی ہے۔

نثر عبارت کو نظم کرنا آسان ہے ایک نثر عبارت کا نظم کر دینا تو یقیناً بہت آسان ہے اور اس کی آسانی کی وجہ یہ ہے کہ خیالات منضبط اور الفاظ حسب حال ملتے چلے جاتے ہیں شاعر کو ان کا محض وزن کر دینا ہوتا ہے۔ مجھے خود اس کا تجربہ ہے اور میں نئی فکر پیدا کرنے سے آسانی اُس مضمون کے نظم کرنے میں پاتا ہوں جس کے واسطے فکر درکار نہیں ہوتی۔

نظم مشکل ہے نظم اس وجہ سے مشکل ہے کہ وہ تمام تر نثر کے خیالات کو ایک محدود اور کوتاہ دائرہ میں نہیں لا سکتی اور یہ ظاہر ہے کہ نثر بہت وسیع پیمانہ پر چلی جاتی ہے اور نظم اُس کی وسعت کو کسی عنوان پا نہیں سکتی اور جو ناظم ہے وہ یہ چاہتا ہے کہ سب کچھ نظم کر ڈالوں مگر اُس کے امکان سے یہ امر بالکل باہر ہے نظم تو سارے خیالات کو جو نثر ظاہر کرتی ہے اپنے کوتاہ دائرہ میں نہیں بھر سکتی۔

نظم غیر موزونی طبیعت کے واسطے مشکل ہے جن کی طبیعت موزوں نہیں واقع ہوئی وہ ایک ایک مصرعہ کے واسطے جاں کاہی کے ساتھ غور و فکر میں مبتلا ہوتے ہیں اور پھر بھی اکثر اوقات اُسے بھاری پتھر سمجھ کر چھوڑ بھاگتے ہیں۔

نظم کا قافیہ تنگ ہے قافیہ کے ڈھونڈھنے میں شاعر کو جو دقت پیش آتی ہے وہ موزوں اور غیر موزوں طبیعتوں کو دونوں کو مشکل میں ڈال دیتی ہے اور چوں کہ قافیہ بہت ہی محدود ہوتا ہے لہذا نظم وہیں تک چلتی ہے جہاں تک قافیہ ملتا جلتا چلا جاتا ہے۔ مجھے ایک بات ہنسی کی یاد آگئی وہ یہ کہ ایک صاحب قفس میں لہو اور عدس میں کہو کے قافیہ اور ردیف پر غزل لکھنے لگے اور جب کوئی مضمون معقول اور قافیہ موزوں ڈھونڈھنے سے نہ ملا تو ایک شعر کے مصرعۂ ثانی میں فرمایا کہ ع لگا دیجیے قافیہ سرس میں لہو

نظم و نثر کی مشکلات کا موازنہ

نثر بہت بڑی چیز ہے اور اس کی مشکلیں بھی بڑی ہیں اور نظم چوں کہ چند بحور پر اپنے ناظم کو ختم کر دیتی ہے

لہذا بمقابلہ نثر کے شکلیں بھی اتنی ہی محدود رکھتی ہے اور پھر بھی عیوب ساتھ رکھتی ہے مثلاً کسی خاص لفظ کا کسی خاص بحر میں لانا بالیقین ناممکن ہوجاتا ہے ایک ادنے سی تمثیل مثنوی مولینا روم کی ہے جس میں صدہا الفاظ مولانا کو قطع وبرید کرنے پڑے ہیں جب بحر رمل مسدس محذوف کے اوزان پورے ہوئے ہیں اور بعض الفاظ تو فی الواقع ملیا میٹ ہوگئے ہیں لیکن ایسے عالم کو بھی ایسے الفاظ کی قطع وبرید بلکہ مسخ کر دینے سے ہرگز مفر نہ تھا اور یہ محض نظم کے محدود اوزان کے باعث سے تھا ورنہ یہ ظاہر ہے کہ مثنوی ایک عمیق اور ناپیدا کنار ہے۔ اور اپنی خوبیوں میں لاثانی ہے اب میں مضمون کو کہاں تک طوالت دوں اور یہہ کہہ کر خاموش ہوتا ہوں کہ خان بہادر میر ناصر علی صاحب کا فرمانا بالکل حق بجانب ہے کہ نثر ہی مشکل ہے جس سے رات دن ہم کو پالا پڑتا ہے فقط

(راقم مرزا عرفان علی بیگ۔ آئی۔ ایس۔ او۔ از آگرہ)

ایک پاکیزہ پوسٹ کارڈ

یہہ اپنے چاہنے والوں سے آپکا برتاؤ ہ یہاں تک آتی ہے آواز لنترانی کی

میر صاحب قبلہ × × × × × × × × × × × ۔ غریب صفدر کو آپ ترسا کے کیا پائیں گے جب تک گونڈہ میں رہا کبھی کبھی "صلائے عام" کی زیارت ہوجاتی تھی۔ اب تو یہ بیرخی کا عالم ہے کہ "دیدار می نمائی و پرہیز می کنی" ے چھ مہینے نہ دیکھے جب گل کو وہ حال کیا ہو بتاؤ بلبل کا۔

اُردو کی عزت پائیداری آپ کے دم سے ہے۔ خاص کر ان آنکھوں میں جو میری آنکھوں کی پتلی ہیں اور میرے سر کی زیب۔ بلا مبالغہ عرض کروں گا گویا میں دیکھتا رہتا ہوں۔ غالب۔ سرسید۔ محسن الملک۔ حالی۔ آرزو۔ نذیر احمد۔ مہدی مرحوم کی روحیں اور روحانیتیں چکور کی طرح آپ کے گرد چکر لگاتی رہتی ہیں۔ اور آپ کی مبارک ہستی میں ان تمام ان تمام ہستیوں کی نمود نمایاں ہے ع انچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری۔ دعا ہے کہ آپ کے دامن کا سایہ مدتوں تک زبان اُردو پر قائم رہے ع میں اس زمانہ میں مرقع ادب حصہ دوم کی کنگھی چوٹی میں ایسا منہمک

قطعہ از جناب نواب صاحب بہادر فرمانفرمائے ریاست لوہارو

مے خانے شوقِ بادہ میں اک روز میں گیا ٭ کنڈی تھی بند پیرِ مغاں کی خبر نہ تھی
پایا نہ جب کسی کو تو مجبور یاس سے ٭ پھرتا تھا اس اثنا میں آواز سی سنی
دروازے سے جو کان لگایا تو کیا سنا ٭ ساغر سے تھی صراحی یہ غصے میں کہہ رہی
مے مجھ سے لیکے لیتا ہے ساقی کے بوسے تو ٭ نعمت نہ آج تک جو میسر مجھے ہوئی
کیا تجھ میں ایسی بات ہے کیا ہے وہ امتیاز ٭ عزت جو بزمِ یار میں ایسی تجھے ملی
نقش و نگار میں نہیں کچھ مجھ سے تو سوا ٭ شیشے کا تو اگر ہے تو میں ہوں بلور کی
پیتی ہوں گھونٹ خون کے یہ روز دیکھ کر ٭ کھاتی ہوں طیش دور کی آتی ہے جب گھڑی
چھوڑوں گی تجھ کو توڑ کے پھوڑوں گی اپنا سر ٭ معقول وجہ اس کی بیاں تو نے گر نہ کی
پہلے تو چپکا سنتا رہا جام یہ کلام ٭ پھر بولا اے بہن مجھے اس کی خبر نہ تھی
تو یوں کرے گی رد و قدح اور بے سبب ٭ سن مجھ سے تا کہ تجھکو بھی ہو جائے آگہی
کچھ راز یہ نہیں ہے اگر جانتی اسے ٭ مجھکو یقین ہے کہ بگڑتی نہ تو کبھی
مے پیرِ میکدہ کی ہے تیری کہاں سے ہے ٭ مالک جو پھر بھی تو بنے اچھا یہی سہی
قُل قُل مگر شراب کے دینے میں کرکے تو ٭ احسان میکشوں پہ جتاتی سدا رہی
مجھ کو تو دیکھ رہتا ہوں چکر میں او جھوش ٭ ساقی کو کیوں نہ بھائے مری ایسی جاں کری
ملتے لبوں کے بوسے ہیں اس واسطے مجھے ٭ جس آرزو میں ہو گی تری ختم زندگی تک
ساقی کو دیکھ لیتی ہے بے پردہ بزم میں ٭ یہ بھی نصیب کی ہے بڑی تیرے یاوری

اعظم یہ سن کے میں نے کہا دل میں سچ ہے یہ
احسان جو جتائے نہیں ہے وہ آدمی تو

صلائے عام۔ شاعری میں غزلوں قصیدوں۔ واسوختوں۔ مثنویوں یہاں تک کہ رباعیوں کی بھی کمی نہیں۔

کمی تھیں قطعوں کی طرف توجہ کم ہوئی : فارسی میں صرف قطعات ابن یمین مشہور ہیں اور اُردو ایک ایک دو دو قطعات استادوں کے دیکھنے میں آئے اصناف سخن میں ہمارے ہاں کے شعرا قطعوں کی طرف بہت کم متوجہ ہوئے : حالانکہ یورپ کے قدیم و جدید شاعروں نے قطعہ کے طرز پر زیادہ لکھا : قطعہ کا طرز مجھے اس لئے زیادہ پسند ہے کہ مسلسل مضمون کی اس میں بہت گنجائش ہے۔ غزل میں ایک ہی شعر میں سارا مضمون محدود کرلینے کی شرط ہے۔ قطعہ میں وسعتِ مضمون کا آرام ہے : آپ یہہ کہیں گے کہ قصیدہ میں بھی یہہ بات موجود ہے لیکن قصیدے میں ضرورت سے زیادہ اشعار ہوتے ہیں کہ پڑھتے پڑھتے اجیرن ہو جاتے ہیں : خیر الامور اوسطہا کے لحاظ سے غزل اور قصیدہ کے درمیان قطعہ کا طرز بہت مناسب ہے :

اس قطعہ میں شاعرانہ خیال کے ساتھ زبان و بیان کی بھی خوبیاں ہیں۔ یہہ میں اس لیے عرض کرتا ہوں کہ بقول حضرت سفیر دلی والوں کے کلام میں مضمون کی تعریف ہے اور لکھنؤ والوں میں زبان کی خوبی کی۔ جب دونوں باتیں جمع ہو جائیں تو کلام لاجواب سمجھا جاتا ہے : نواب صاحب ممدوح نے اس قطعہ میں دونوں خوبیاں جمع کر دیں کہ مضمون کے ساتھ طرز بیان بھی شاعرانہ اور پاکیزہ ہے : شعراء دہلی میں جناب بیخود کا مرتبہ بڑا سمجھا جاتا ہے۔ آپ نے بھی اس قطعہ کی تعریف کی :

تحفہ۔ اس نام کا ایک رسالہ حیدرآباد دکن سے ریویو کے واسطے آیا ہے۔ مضمون خاصے سنجیدہ اور ٹھوس ہوتے ہیں۔ شکر کا مقام ہے کہ دکن میں رسائل کے ذریعہ اُردو علم ادب کی خدمت کرنے کی تحریک پیدا ہو گئی۔ "نئی زبان" کی بحث مجھے پسند آئی۔ خصوصاً اس وجہ سے کہ اس میں انجمن ترقی اردو کی خدمات پر کسی قدر روشنی پڑتی ہے۔ گو ہمیں اصطلاحات علمیہ کی تحقیق میں زیادہ دخل نہیں مگر اس بارے میں اربابِ اُردو کی کوششوں کو ضرور قدر کے قابل سمجھتے ہیں اس قسم کی بحثیں ہمیشہ فیصلہ کن اور زبان و ادب کے لئے فائدہ مند ہوا کرتی ہیں۔ رسالہ ہر ماہ تین جزو پر نکلتا ہے۔ لکھائی چھپائی ابھی سے امید ہے آئندہ کلام پاک کی کتابت صحت کا خاص لحاظ رکھا جائے گا۔ معتمد اعزازی انجمن ارباب اردو عنبر نگر حیدرآباد دکن کے پتہ پر مبلغ صہ پانچ روپیہ

ہماری زبان کی دلچسپ حکایت

حضرت صفیر بلگرامی نے تذکرۂ جلوۂ خضر میں اُردو کو لاوارث چھوکرے سے تشبیہ دی ہے جس کا کوئی پوچھنے والا نہیں۔ اس تشبیہ کو بطور حکایت کے بہت دور تک پہونچایا: لکھتے ہیں کہ شروع میں جب عرب سندھ میں پہونچے تو سندھی و گجراتی زبانوں میں عربی زبان کے الفاظ شیر و شکر کی طرح مل گئے۔ "گویا اُردو کا حمل قرار پایا" ؛ اس کے بعد تُرکیوں کی آمد سے فارسی زبان کا میل شروع ہوا کہ ناصر الدین سبکتگین کو جب شکست ہوئی تو راجہ جیپال لاہور سے خراسان پہونچا۔ خراسان کی زبان فارسی تھی: یہہ لوگ جو ہندوستان سے وہاں پہونچے تو روزمرہ کے فارسی الفاظ سے کچھ کچھ آشنا ہوگئے ؛ جب محمود غزنوی پے در پے گیارہ دفعہ ہندوستان آیا تو روزمرہ کی ضرورتوں میں فارسی و ہندی زبانوں کا اختلاط خود بخود ہندو مسلمانوں میں پیدا ہوگیا۔ اب زمانہ حمل چھوکرے (اُردو) کی ولادت کا قریب ہے : نواں مہینہ آدھا گزر چکا ہے ؛ ۵۸۷ھ میں شہاب الدین غوری کو ہندوستان کا حوصلہ ہوا : اور گو یہہ خود یہاں نہیں ٹھیرا مگر اپنی جگہ قطب الدین ایبک کو چھوڑ گیا ؛ قطب الدین کی یادگار قطب مینار موجود ہے جو کھڑے ہوکر بلند آواز سے پکار رہا ہے کہ لیجئے اُردو نے ولادت پائی۔ تمام مُلک میں اس کی دُہائی

پڑ گئی

پڑ گئی اور روزمرہ میں اپنے دین کی وجہ سے ہندو مسلمانوں میں میل جول ہوگیا ؛ مگر یہہ بچہ (اردو) ایسے وقت پیدا ہوا ہے کہ بسبب مہمات ملکی کے کسی کو اس کی پرورش پر توجہ نہیں کہ اس کی غور پرداخت کی جائے۔ یونہیں مارا مارا پھرتا ہے ؛

غضب یہہ ہے کہ اس کے ماں باپ کو اپنی ہی جانوں کی پڑ رہی ہے۔ رات دن لڑائیاں ہیں۔ ایک دوسرے پر چڑھائیاں ہیں۔ مگر یہہ لڑکا اپنے قوتِ روزافزوں سے روز بروز طاقت پکڑتا جاتا ہے ؛ نہ اس کے لئے کنار دایہ ہے نہ آغوشِ مادر نہ دوشِ پدر۔ مگر خدا کی قدرت سے دودھ ملتا چلا جاتا ہے اور ہر روز ایک نیا وسیلہ دودھ ملنے کا ہاتھ آتا ہے (مختلف ملکوں سے عربی فارسی ترکی مغل پٹھان ایرانی کابلی لشکر کے لشکر چلے آرہے ہیں)۔ لیکن کم خوری کے سبب سے بچہ بڑھتا کم ہے۔ اندیشہ ہے کہیں بونا تو نہ رہ جائے" ؛ مختلف نئے لوگوں کے آنیکا یہہ حال ہے کہ غیاث الدین بلبن کے زمانہ میں پچیس بادشاہ اور شاہزادے اپنا ملک چھوڑ کر دلی میں آبسے تھے۔ جن کے نام سے دلی کے بہت محلے آباد تھے مثلاً سمرقندی۔ کاشغری۔ ختائی۔ رومی۔ غوری۔ خوارزمی وغیرہ ؛

پٹھانوں کی سلطنت میں اس لڑکے کی طرف زیادہ توجہ نہیں ہوئی۔ یوں ہی لشکر بلشکر بازار دربازار مارا پھرا۔ دلی کے گلی کوچوں میں آوارہ پھرتا رہا ؛ صرف حضرت امیر خسرو نے اسے ذرا منہہ لگایا: امیر خسرو کی خالق باری جو قدیم تعلیم کی مستند تصنیف ہے اس لڑکے کے لوریوں کی طرح بہلانے کے اسباب میں

[illegible]

پٹھانوں کے بعد سلاطین مُغلیہ کے زمانہ میں اکبر کو ایسی بات سوجھی جو اس لڑکے کے اقبال کا سبب ہوگئی۔ اکبر نے ہندوستان کے راجاؤں سے شادی بیاہ کی تجویز کی: یہاں اُردو کی رونمائی اکبر کے محل میں دیکھنے کے لایق ہے - یہہ بجنسہ "تذکرہ جلوہ خضر" سے نقل کی جاتی ہے :-

اُردو کی رونمائی اکبر کے محل میں

ہاں دوست تو یہہ تماشا دیکھنے کے قابل ہے۔ اکبر نے جے پور کے راجہ کی بیٹی سے شادی تو کی ہے مگر مشہور ہے کہ باہم عہد و پیمان ہوگیا ہے کہ آئندہ جو کوئی تخت پر بیٹھے وہ اُسی رانی کے بطن کی اولاد ہو[1]۔ اور ہمارے مُلک کی عورتیں سہیلیوں کی طرح محلِ شاہی میں خدمت کے لئے رہا کریں۔ اکبر کو تو تالیف قلوب بلکہ یک جہتی منظور ہے سب کچھ قبول سب کچھ منظور۔ چشمِ ما روشن دلِ ما شاد۔ یہی تو مطلب یہی تو مراد ہے لیجئے بادشاہ کی شادی ہو گئی سسرال سے دولہن کا محافہ جس کے ساتھ سیکڑوں سہیلیاں[2] زربفت اور کمخاب کے لہنگے بھڑکاتی تاش بادلہ دارائی کی اوڑھنیوں سے اپنی چھب تختی دکھاتی محافہ کو گھیرے چلی آتی ہیں اور آگے آگے فوج شاہی خوشی کا باجا پیچھے پیچھے جہیز کا اسباب ساز سامان ہاتھی گھوڑے پالکی نالکی اونٹ بہل رتھ گاڑی چھکڑا اسباب سے لدا لدایا چلا آتا ہے عجیب سامان اور عجیب

[1] درعہد سلطنت جلال الدین محمد اکبر بادشاہ نوبت مصاہرت با راجگان ہند بداں شرط رسید کہ تخت سلطنتِ ہندوستان و ولیعہدی بنام ہماں شاہزادگان قرار یافتہ باشد کہ از بطن دختران راجگان ہند باشند۔ ظہیرالانشام [2] قریب پانصد زنان ہندو ہمراہ دختران راجگان در زمرہ خواصان مصاحبان و ملازمان و پیش خدمتان محلات شاہی برفاقت و مصاحبت ہمراہ عروس ہندی می آمدند۔ ظہیرالانشا۔

دولہن

رنگ - لیجیئے دولہن کی سواری محل میں داخل ہوئی۔ اکبر کا محل سُنہرے پن سے دلہن خود بنا ہوا تھا اُس میں ہندوستان کی لڑکی شرم و حیا کی تپلی بقول مولف سہ ۵ نیچی نگاہ کم سخن آہستہ گفتگو * خوبانِ ہند جتنی ہیں پُتلی حیا کی ہیں * محاذہ آرسی کیا اُتاری گئی ۵ شرمناک آنکھیں بند مُنہ پر گھونگھٹ - لہنگے کا دور اعضا کی ہیئت کو چھپائے مگر اوڑھنی کا کھچاؤ کچھ بغلوں میں دبائے دوسرے کے ہاتھوں نہیں دوسرے کے پاؤں چلی تو چلتے چلتے دو چار قدم پر ایوان میں داخل ہوئی۔ نزاکت تو یہاں کی جان ہے اتنے ہی چلنے میں دم چڑھنے اختلال بڑھنے لگا۔ پنکھی کی ہوا دی گئی حواس ٹھکانے ہوئے - ہندی عورتوں نے چاروں طرف اپنا تسلط کیا پہلے سے جو اکبر کے محل کی اہلِ خدمت وغیرہ تھیں وہ بھی آکر اُن میں مل گئیں۔ جیسے دال میں نمک یا پانی میں شکر۔ اکبر نے گوہرِ مراد حاصل کیا۔ اب محل میں ہندی عورتوں کا دورہ دورہ ہوا اور اُن کے ساتھ ہی غیر ملکوں کی اور اور قوموں کی عورتیں خدمت کو مقرر ہوئیں۔ ناگاہ اُن میں وہی لڑکا۔ امیر خسرو کا نظر کردہ کھیلتا کودتا آنکلا اور بقول شخصے مُنہ در مُنہ باتیں کرنے لگا۔ اکبر کی بھی نگاہ تربیت اُس پر پڑی تھی کہ اتنے میں جودھپورہ کے راجہ کی بیٹی بھی محلِ شاہی میں تشریف لائیں۔ اُن کے ساتھ بھی سیکڑوں سہیلیاں آئیں۔ اب تو محل میں چہل پہل ہو رہی ہے۔ اکبر کو ضرورت ہوئی کہ ہندی بول چال کو اختیار کرے اور رانی صاحبہ بیگم لقب۔ کہ اکبر کی اور اکبر کے ملک کے لوگوں کی بولی سیکھیں۔ جبھی تو کارروائی ہوتی ہے اور سہیلیوں اور پیش خدمتوں کو تو فرض ہوگیا۔ لیجیئے اب کیا ہے غلط سلط اناپ شناپ جو جس سے سُنا اور جیسا سمجھ میں آیا بولنے لگیں۔ اگر ولایتی خواجہ سرا میاں عنبر نے ہندی محلدار سے کہا کہ اسی پر کیا منحصر ہے۔ لیجیئے انہوں نے اس فقرہ کو سیکھ لیا اور منحصر کو منتصر بنا دیا مگر ذرا رانی صاحبہ بیگم القاب کو دقت زیادہ ہونے لگی۔ تو اکبر نے ایک زنانہ بازار قلعہ میں تیار کیا۔ جس کی خبر ابوالفضل نے دی ہے۔ اس بازار میں سب اہلِ پیشہ اور اہلِ حرفہ کی عورتیں۔ عربی۔ عجمی۔ ترکی - ہندی اپنی اپنی دکانیں لاکر بیچتی ہیں۔ اور محلاتِ شاہی اور اُمرا کی بیبیاں۔ اور سب محل کے لوگ آکر اپنے ہاتھوں سے خرید و فروخت کرتی ہیں۔

۵ و ۵ اس طرزِ بیان کا کیا کہنا -!

کرتی ہیں۔ آٹھویں روز یہ بازار لگا یا جاتا ہے۔ اور ہر طرح کی چیزیں آتی ہیں اور بکتی ہیں تو ہندی عورتوں کو ولایتی عورتوں سے اور ولایتی عورتوں کو ہندی عورتوں سے بات چیت کرنے کا خوب موقع ملتا۔ اب محلات میں بال بچے جو ہوئے انہوں نے محل میں پل کر اپنی ماں اور انّا چھوچھو دادا کی زبان جو کہ کھچڑی ہو رہی تھی سیکھی۔ اور باہر جو آئے تو ارکانِ دولت شاہی سے کہ فارسی سے محاورے سُنے۔ اُردو کی صورت اُن کی زبان پر موجود ہو گئی۔ اب اکبر نے آگرہ کو درست کر کے اکبرآباد لقب دیا ہے اور وہیں یہہ کھیل تماشا ہوتا ہے۔ بادشاہی بازار بادشاہی لین دین روز بروز ترقی پر ترقی ہونے لگی۔ اِدھر کا یہہ حال تھا اُدھر بادشاہ کے دربار میں اگرچہ زبان فارسی تھی مگر راجگان اولوالعزم اور ارکان دولت ہر قسم کے اور ہر زبان کے تھے۔ اُن میں بھی باہمی بول چال نے ایک طرح کی صلاحیت پیدا کی۔ فوج کی بازار میں جس کا نام اُردو ہے الگ میل ملاپ ہوتا رہا۔ آخر بادشاہ نے علمائے ولایتی کو ہنود کی کتابوں کے ترجمہ کا حکم دیا۔ ابوالفضل نے اُس کی تفصیل لکھی ہے۔ ملا فتح اللہ شیرازی صاحب تفسیر منہج الصادقین وغیرہ میں مصروف ہوئے" +

اکبر کے بعد شاہجہاں کے عہد میں یہہ لڑکا پل پلا کر تیار ہو گیا: لیکن بازار و لشکر میں سودا سُلف کے سوا کوئی اور کام اس سے نہ لیا گیا ÷ اس لڑکے کی خوش نصیبی تھی کہ حکام انگریزی کو اس کی تربیت کی طرف توجہ ہوئی اور اس کی تعلیم کا خیال ہوا۔ سلطنتِ انگریزی کے سایۂ عافیت میں لڑکے نے دن دونی رات چوگنی ترقی کی ÷ یہہ لڑکا اب جوان ہو رہا ہے اور سرکار انگریزی کے دولت و اقبال کا ثنا خواں ہے کہ سرکار کی پرورش سے اس عمر کو پہونچ گیا +

اس مضمون کا ماخذ تذکرہ "جلوۂ خضر" مصنفہ حضرت صفیر بلگرامی ہے جنکی تحقیق و تحریر اس بارہ میں لاجواب سمجھنی چاہیئے۔ یہہ مسالہ[1] ان کی تصنیف سے اقتباس کیا گیا ÷

[1] تذکرۂ جلوہ خضر مصنفہ حضرت صفیر بلگرامی۔ مطبوعہ مطبع نور الانوار۔ آرہ ۱۸۸۴ء

شور صاحب کی مثنوی

(یعنی اُن کی سوانح عمری)

اپنے حال کی مثنویوں میں حضرت واجد علی شاہ بادشاہ لکھنؤ کی مثنوی بہت مشہور ہے کہ من و عن جو کچھ اُن پر گزرا تھا لکھ دیا۔ اسی طرح شور صاحب نے اس مثنوی میں اپنی سوانح عمری لکھی ہے: انکا حال ان کی زبانی سُننے کے لایق ہے +

شور صاحب گو یورپین خاندان سے ہیں مگر ان کی بود و باش عرصہ سے ہندوستان میں نواحِ دہلی سے علاقہ رکھتی ہے۔ اور مذہب عیسائی کے نہایت پابند معلوم ہوتے ہیں: مناجات میں فرماتے ہیں ؎

محشر میں عصیاں کا ہو میرے نام ✽ طفیلِ مسیحا علیہ السّلام

حضرت عیسےٰ علیہ السلام کی مدح میں نعت کے طرز پر غزل لکھی ہے جس کے شعر ہیں کہ:۔

ٹپکے ہی جاں وہی وہ ہر رتبہ کلام کا ✽ مدّاح ہوں مسیح علیہ السلام کا ✽ اے شور چشم تر کو بنا چشمۂ حیات ✽ کر ورد جان و دل سے مسیحا کے نام کا

شعر و سخن میں صاحب کو اچھی لیاقت معلوم ہوتی ہے۔ فارسی و اُردو دونوں زبانوں میں ان کے دیوان مشہور ہیں: نظم میں گو اساتذہ کے مرتبہ کو نہیں پہونچے مگر اس مثنوی کے جو پیشِ نظر ہے لاجواب ہونے میں شک نہیں ✽ اوّل تو حالاتِ واقعی کے لکھنے میں مبالغہ کی بہت گنجایش نہیں ہوتی اور مبالغہ شاعری کی جان سمجھا جاتا ہے۔ دوسرے اپنا بیان اپنی زبان سے بیان کرنا مشکل ہے: گو مشہور ہے کہ تصنیف را مصنّف نیکو کند بیان مگر

ایسی تصنیف جس میں دوسرے کا بیان ہو جس طرح لیلےٰ مجنوں۔ شیریں فرہاد۔ وامق وعذرا وغیرہ کے قصے۔ پھر بھی اِس سوانح عمری میں مثنوی کی ساری خوبیاں موجود ہیں ؛

"سبب تالیف مثنوی ہٰذا" میں فرماتے ہیں :-

کہا دوستوں نے۔ اے شور یار	ہیں مشہور دیواں ترے تین چار	تخلص ہے شور اور ہے شیریں کلام
ہے شیریں کلامی بھی مشہور عام	فرنگی تجھے کہتا ہے اک جہاں	پر اس قوم کی یہہ زباں ہے کہاں
کہاں سے تو لایا یہہ شیریں کلام	اور اسپر رکھا شور پھر اپنا نام	نہیں میر وسودا سے کچھ کم زباں
کہ تعریف کرتا ہے سارا جہاں	پر اک بات کی اب کمی ہے ذرا	کہ ہو جس سے وہ چند چرچہ ترا ہو کر
وہ یہہ ہے کہ اک مثنوی بھی ضرور	رقم کر کہ ہو جس سے سب کو سرور	کہ ہو عمر بھر کا ترے اس میں حال
عیاں جس سے ہوں تیرے سارے خیال	جو گزرا ہو تجھ پر کر اس میں بیاں	زمانہ کے سب ہوں چھپیں اور چھپاں
بڑھا شوق بے چین پھر دل ہوا	قلم پھر نگارش پہ مائل ہوا	مزہ چٹکیاں دل میں لینے لگا
	ناتکامل کو بھی طعنے دینے لگا ؛	

شور صاحب علیگڈھ (کول) میں سنہ ۱۸۲۲ء میں پیدا ہوئے۔ گھر میں معلموں سے تعلیم پاکر اٹھارہ برس کی عمر میں روزگار کی تلاش میں گھر سے نکلے۔ پہلے میرٹھ میں پولیس میں ملازم ہوئے وہاں سے علیحدہ ہونے پر آگرہ گئے۔ اسی طرح پھرتے رہے کہ ان کے نانا فراسو کوین صاحب نے انہیں یاد کیا۔ فراسو صاحب بہت خوش حال صاحب جاگیر وجائداد تھے۔ شور صاحب اپنے نانا کے پاس پہونچے۔ شادی بڑی دھوم سے ہوئی۔ شادی کے دو مہینے پیچھے سنہ ۱۸۵۷ء کا غدر پڑ گیا ؛ غدر کا حال شور صاحب نے بہت مفصل لکھا ہے ؛

کہ اک روز دہلی کو جانا ہوا ؛ بروز سوم واں سے آنا ہوا ؛ تو اثنائے رہ میں سنا حال غیر ؛ کہ دہلی کا ہے کچھ نہیں آج خیر

سنی یہہ روایت تو آئی ہنسی ؛ کہ بازاریوں کی ہے یہہ گپ کوئی ؛ منگائی خبر بھیج کر آدمی ؛ تو اس نے بھی اس طرح تصدیق کی

کہ پیسے بھی باغی وہاں چڑھ گئے ⁂ خلل کے ہیں آثار کچھ پڑ گئے ⁂ سنی یہ خبر ہوش پرّاں ہوئے ⁂ قیامت کے آثار و ساماں ہوئے
لگی پھر تو گھڑنے روایت نئی ⁂ شکایت نئی اور حکایت نئی ⁂ کسی نے کہا خوب میرٹھ چلی ⁂ کسی نے کہا تیغ بھی واں چلی

اس مضمون میں مجھے شور صاحب کی شاعری سے بہت غرض نہیں۔ زیادہ غرض سنہ ۵۷ء کے حالات سے ہے کہ صاحب نے اس مفسدہ کا حال مفصل لکھا ہے خاص کر فتح دہلی کا:-

ہوا حالِ دہلی نہایت تباہ ⁂ لڑائی رہی تا بدن پنج ماہ ⁂ نئی آفت اک قلعہ پر آ گئی ⁂ خبر کالوں نے بادشہ کی بھی لی
کیا کرتے تھے روز حیران انہیں ⁂ پھر آخر کیا گھر سے ویران انہیں ⁂ کہا شہ سے فتویٰ یہ تم دو ہمیں ⁂ فرنگی کا ہم قتل جائز رکھیں
کہا شہ نے فتویٰ میں دونگا نہیں ⁂ کہ اس طرح جائز نہیں ہے کہیں ⁂ ستانا کیا شاہ کو خوب تنگ ⁂ ہوا شاہ اور قلعہ کا پھر کو ڈھنگ
گئے لیکے دس بیس انگریز واں ⁂ کیا ابذ لوہے کو پھر تیز واں ⁂ وہ بندوق ان پر چلایا کئے ⁂ غضب جان شہ پر اٹھایا کئے
بڑھو و گوسیاں رکھا شہ کا نام ⁂ کیا پھر یہ کالوں نے واں انتظام ⁂ کہ شہزادوں کو ساتھ اپنے لیا ⁂ انہیں فوج کا اپنی افسر کیا ⁂
بنا کوئی جرنیل اُس فوج کا ⁂ فرنگی سے لڑنے کو پکا ہوا ⁂ ہوا کوئی کرنیل کالونکا واں ⁂ کہ گوروں کو کہنے لگا بے نشاں
بنایا کسی کو تو تحصیلدار ⁂ رسد دے تلنگوں کو لیں نہار ⁂ اور ایک اُن میں تھا شہر کا کوتوال ⁂ مجسّم تھا شیطان شیطان خصال
غرض سب نے اپنی چلائی وہاں ⁂ کی انگریز سے پھر لڑائی وہاں ⁂ کیا قلعہ اور شاہ کو پھر خراب ⁂ ہوا نام گم تخت کا بے حساب
اگر شاہ قلعہ سے آتے نکل ⁂ تو حالت میں ہوتا نہ ایسا خلل ⁂ بگڑتی نہ شاہی کبھی شاہ کی ⁂ یہ روئی نہ لیتا کوئی شاہ کی
لگا مورچہ جب کہ دہلی کے پاس ⁂ اُڑے سب تلنگوں کے ہوش و حواس ⁂ گھسے گورے کشمیری دروازہ سے ⁂ کیا حملہ سب نے اک اندازہ سے
بہا پھر تو وہ خوں کالوں کا واں ⁂ کہ بازار سب ہوگیا خونفشاں ⁂ ہوئے پشت پر کھا کے کالے فرار ⁂ نہ گوروں کے آیا کوئی روبکار
پڑی شہر میں کھلبلی برملا ⁂ لگے بھاگنے جان اپنی بچا ⁂ اُسی حال میں تھے ظفر بادشاہ ⁂ کسی نے نہ دی اُن کو کچھ بھی پناہ
ہمایوں کے وہ مقبرے میں چھپے ⁂ کہ دو کوس دلی سے تھا وہ پرے ⁂ خبر پا کے گورے تعاقب کناں ⁂ پکڑ لائے شہ کو وہاں سے یہاں
کیا پھر نظر بند گوروں کے پاس ⁂ گئے اُن کے سب ہوش و عقل و حواس ⁂ پھر آیا جواں بخت بیٹا صغیر ⁂ رکھا اُس کو بھی پاس شہ کے اسیر
پکڑ لائیں بیگم جو تھیں تاج محل ⁂ پکڑ لائے گورے کہ تھا اُن کو سہل ⁂ جواں بخت کی ماں جو تھیں بے گماں ⁂ اسیر بلا ہو کے آئیں وہاں
ہوئے مقید جرنیل و کرنیل بھی ⁂ ملی جنکو کالونکی تھی افسری ⁂ بجا پھر فرنگی کا ڈنکا بشان ⁂ ہوئی فوج کالونکی کافور واں

رکا جنگی پھر ہونے اک انتظام	ملی پھانسیاں باغیوں کو تمام	گئے راجہ نواب پھانسی دئے	کہ باغی ہوئے تھے وہ سرکار سے
وہ جرنیل و کرنیل مارے گئے	بنے باغی اور سر اُتاری گئے	اڑی ملکوں ملکوں خبر صبح شام	ہوا فتح دہلی سے گوروں کا نام
فحکلدہ پہاڑی پہ تیار ہو	ہر ایک گورہ گورہ عملدار ہو	ہوئے شہ مقید تو رنگوں میں	گئی تیری اولاد سب خون میں
	رہا تاج باقی نہ وہ تاج دار	سدا نام خالق رہے برقرار	

غدر کی خیر خواہی میں شور صاحب کے نانا کو کئی دیہات سرکار سے بہ صلۂ خدمت گزاری عطا ہوئے۔ غدر کے بعد شور صاحب نے اکثر بڑے شہروں کی سیاحت شروع کی اور وہاں کے حالات قلمبند کئے۔ خاصکر آگرہ۔ لکھنو۔ جے پور۔ الور۔ گوالیار۔ مراد آباد۔ کانپور۔ الہ آباد۔ علیگڈہ وغیرہ کے: جہاں جہاں گئے وہاں کی نامی عمارتوں صحبتوں اور روسا و اُمرا کا حال بہت مفصّل لکھا۔ مگر چونکہ صلائے عام کا تعلق دلّی سے ہے اس شہر کی نسبت شور صاحب نے جو کچھ لکھا ہے واقعی پڑھنے کے لایق ہے۔ دلّی کی عمارتوں کا حال بعد غدر جس طرح اُنہوں نے دیکھا اچھی معلومات کا ذخیرہ ہے۔ خاص کر صلائے عام کے اُن مضامین کے خیال سے جو "ستر بہتر برس کی دلّی" کے عنوان سے صلائے عام ماہ اپریل ۱۹۲۶ء اور مئی ۱۹۲۶ء کے پرچوں میں شایع ہوئے۔ یہہ مضامین پھر لکھے جائیں گے۔ یہاں میں اس مثنوی سے دلّی کے اُن نامور لوگوں کا ذکر نقل کرتا ہوں جس طرح شور صاحب نے لکھا ہے:۔

لکھوں شہر کے اب عماید کا حال   کہ کیا کیا یہاں لوگ تھے بے مثال   تھے اک مولوی یاں کے صدر الصدور   کہ ثانی نہ تھا اُن کا نزدیک و دور
خدا نے انہیں رتبۂ اعلیٰ دیا   کہ مفتی عدالت میں بھی وہ ہوئے   تخلص تھا آزردہ شعر انتخاب   وہ دہلی میں شاعر بھی تھے لاجواب

ہر اک فن میں کامل تھے اور نامور
رہے ہاتھ ملتے ہی خورد و کلاں
گئے اُن کے ہمراہ لخت جگر
کہ عہدہ جنہیں دیکھ ہوتے تھے غش
کرامت میں یکتا تھے اور باتمیز
ہر اک فن میں وہ ہائے کامل بھی تھے
کہ بدر الدین مشہور تھا اُن کا نام
نہ تھا ثانی اُس کا بروئے زمیں
مرنجاں مرنج اُن کا قول و یقیں
کہ تھا شعر گوئی میں اُن کو کمال
وہ اُردو کے مشاق اور پیشوا
سب اُستاد وقت اُن کو کہتے رہے
کہی مثنوی خوب وہ انتخاب
کہ جوں مہر و مہ تھے وہ روشن ضمیر
فراسو بھی شاگرد اُن کے ہوئے
دماغ اُن کا سا ہے نہیں فی زماں
اور اُن کے تھے شاگرد کرسی نشیں
تخلص اُنہوں نے جو دارا کیا
زمانے میں مشہور تھے جو شتیر
یہ اُستاد سے اُن کو رتبہ ملا ؛
بھرا درد سے ہے سراسر کلام

اُنہیں مانتے سب تھے جن و بشر
نہ زندہ رہے ہائے جہاں بھی
مرے ساتھ سنتے ہیں دونو پسر
ہوئے ایسے دہلی میں یہ خوش نویس
وہ مشہور تھے شاہ عبد العزیز
تھے اک اور یاں شہر میں نثر پسند
ثنا خواں تھے سب شہر میں خاص و عام
تھے اک کالے صاحب بھی یاں پر طبیب
بشر ایسے بے شر تو دیکھے نہیں
ہوئے نامور ایسے تھے ایک میر
زباں ایسی پائی یہ کس نے بھلا
ہوئے میر حسن اور دہلی میں ایک
نہیں ہند میں پایا اُس کا جواب
وہ مشکل پسند ایسے اُردو کے تھے
تھے قوم فرنگی میں شاعر بڑے
تھے شاگرد اور اک جناب بشیر
ولی عہد بھی ایک تھے خوش نویس
مناجاتیں دارا کی ہیں بے نظیر
تھے شاگرد اُن کے یہ دو منظیر
اور اک تھے یہاں خواجہ میر درد
؛ دوا درد مندوں کی ہے وہ تمام

گئے یاں سے جب وہ بسوئے جناں
گئی غدر میں جان یوں مفت ہی
امیر ایسے نادر تھے یاں پنجہ کش
ہر اک پر تھے اس فن میں ہر طرح بیس
ہر اک علم کے خوب عامل بھی تھے
بڑے نامی اور عمدہ تھے مُہر کند
کیا کندہ جو جو کہ نقش و نگیں ؛
ارسطو زماں اور عجیب و غریب
تھے شعرا بھی دہلی میں وہ بے مثال
کہ دیوان اُن کے ہیں چند بے نظیر
ہوئے جتنے شاعر وہ مانا کئے ؛
کہ سو میں تھے وہ ایک ہی مرد نیک
اور اک نامی گرامی تھے شاہ نصیر
کہ ہر اک نہ طرز اُن کی پرکھ سکے
کہ ہیں چند دیوان اُن کے یہاں
اُنہیں مانتے تھے صغیر و کبیر
ولی عہد کا شہرہ ہر جا ہوا
کہ پڑھتے ہیں ہر جا امیر و فقیر
کہ نام اُن کا تاثیر و تنویر تھا ؛
کہ دل اُن کے قولوں سے ہوتا سرد
ظفر بھی وہ شاعر ہوئے بے مثال

کسی بادشہ کو نہ تھا یہہ کمال
ہوئے اور دہلی میں اک میر سوز
زباں سے نکلتا تھا ہر دم دھواں
وہ غالب زمانہ میں یکتا ہوئے
کہ فارس نے جانا اُنہیں باکمال
یہہ رمال بھی ایسے تھے انتخاب
ارسطو سمجھتا تھا پشت دیناہ
ہوئے ذوق ایسے کہ تھا اُن کو فوق
کہ ادنے و اعلے سبھی غش ہوئے

لکھے چار دیوان وہ پرُ فضا
جلے اور پھکنے رہتے تھے شب و روز
غضب سوز تھا اور عجیب ساز تھا
کہ غالب ہر اک پر ہمیشہ رہے
یہہ مومن بھی شاعر وہ السان تھے
حساب رمل جن کا تھا لاجواب
تھے شاطر بھی شطرنج کے اس قدر
کلاموں سے اُن کے رہا سب کو شوق
غرض موت کا سب نے چکھا مزا

کہ اربع عناصر کہوں تو بجا
وہ سوز نہاں اُن کا تھا لا بیاں
عیاں کب کسی پر نہاں راز تھا
ہوئی فارسی اُن کی وہ بے مثال
جنہیں مانتے سب مسلمان تھے
اور حکمت میں وہ تھی اُنہیں دستگاہ
دل و جاں گئے ہار اُن سے بشر
مضامین اُردو وہ اعلیٰ لکھے
خدا کو بقا اور آدم فنا

رہے اب تو باقی ہیں نامی یہاں ۔ اُنہیں بھی لکھوں ختم ہو داستاں

بیان رئیسان و شاعران موجودہ حال دہلی

ضیاء الدین خاں سا بھی کوئی نہیں
رہے نام نیکوں کا ہی یادگار
انہیں فارسی میں ہے وہ دست گاہ
زباں ہے نفیس اور بیاں ہے نفیس
سراپا مجسم ہیں اخلاق کے
وہ یکتا ہیں قانون کے باب میں
حسام الدین خاں بھی ہیں شاعر بڑے
بہت دہلی میں یہہ بھی ہیں نام ور

کہ شیریں زباں ہیں بہ علم و یقیں
قناعت گزیں اور گوشہ نشیں
کہ غالب ہیں ثانی خدا ہے گواہ
اسی گھر کے نواب احمد سعید
بھرے خوبیوں اور اشفاق کے
اُنہیں شعر گوئی سے بھی شوق ہے
کلام اُن کا بھی سن کے ہم خوش ہوئے
جناب مبیں بھی اک اُستاد ہیں

لوہارو کے نواب ہیں نامدار
وہیں اپنے گھر میں ہے ماہ مبیں
اور اُردو بھی کہتے ہیں ایسی سلیس
ضیاء الدین خاں کے پسر رشید
وہ ڈپٹی کلکٹر ہیں پنجاب میں
جو اذوق پر بھی نواب فوق ہے
کہ نواب عالی کے ہیں وہ پسر
فن شعر میں قابل بہلا ہیں

ہر اک شعر ہوتا ہے وہ پُر اثر ۔ کہ تڑپا کریں سن کے دل دو دو پہر

جہاں میں ہیں موجود جتنے حسیں
وہ گاتے ہیں محفل میں غزل مبیں
ہے شور اُن کا اس واسطے گھر بہ گھر
کہ پائی ہے شہر میں زباں خوب تر
ہیں نواب مرزا بھی عالی دماغ
تخلص ہے جن کا زمانہ میں داغ
کلام اُن کا بھی ہوتا ہے مثلِ ذوق
کہ شاگردی ہے بلا اُن کو فوق
ہوئی نوکری اُنکی جو رام پور
تو دہلی سے رہتے ہیں فی الحال دور
ہیں اک اور رشد بھی شہزادہ یاں
بھری سربسر اُن میں ہیں خوبیاں
کلام اُنکا بھی ہوتا بس خوب ہے
ہر اک شاعروں کو وہ مرغوب ہے
اک آچھن شاعر اک حاکی یہاں
نہیں اختر و دُر سے کم بے گماں
کلام اُن کا پیچیدہ ہے اس قدر
کہ مضموں ہیں اس میں نہاں سربسر
ہیں ویراں بھی نابینا اک انتخاب
کہ تاریخ گوئی میں ہیں لاجواب
فضل ایسے اس جا مصور ہیں اب
کہ تعریف کرتے جہاں میں ہیں سب
اگر ہوتے بہزاد مانی یہاں
تو ہاتھ اُن کا وہ چومتے بے گماں
وہ تصویر اُن سے کھچا کرتی ہے
کہ اپنی ہی صورت تکا کرتی ہے
قطب اور دہلی کے ہیں اک حکیم
کہ محمود خاں برگزیدہ کریم
بڑی حکمتوں سے وہ حکمت ملی
جو لقمان کو بھی بہ دقت ملی
دوا اور دعا میں اثر ہے سدا
اگر خاکپا دیں تو ہووے شفا
بڑے نامور ہیں وہ دنیا میں آج
کہ راجہ بھی خود پوچھتے ہیں مزاج
اگر ہوتا لقمان بھی فی زماں ÷
تو وہ مانتا اُن کو بے ایں و آں
طبیب اور ہیں ایک بدرالدیں خاں
کہ ہے مثلِ بدر اُن کا بھی خانداں
ہے مشہور روشن دلی اس قدر
مرض کو وہ پا جاتے ہیں جلد تر
دوا دل سے کرتے ہیں بیمار کی
مسیحا ہیں وہ وقت کے اپنے ہی
ہیں اک دوست اور اپنے یاں پر حکیم
قیام الدین ہے نام طبع سلیم
وہ منجھلے میاں کے بڑی ہیں پسر
جو دہلی میں تھے وہ بھی اک نامور
ہے تشخیص ان کی بھی وہ لاجواب
کہ ہیں خاندان اپنے میں انتخاب
دوا کرنے میں سب ہے توجہ دلی ÷
کہ بیمار ان سے نہ دق ہو کبھی
عرق جس دوا کا دیا کرتے ہیں
عرق ریزی اُس میں کیا کرتے ہیں
وہ گولی کہ اُس نے ہی گو۔لی قسم
یہ دیتے ہیں بیمار کو بے درم
سرِ دست جلاب دیتے نہیں
نہ کی ہیچ کی بات ہرگز کہیں
فرنگی ہیں ایک یاں جیمس اسکنر
رئیسِ کلاں اور ہیں عالی در
بڑے خانداں کے ہیں وہ آدمی
بزرگ اُن کے افسر تھے فوجوں کے بھی
کہ کرنیل و میجر رہے نامور ÷ فقیہا بیاں اُن کی مشہور تر

ہیں نواب مرزا بھی اک وضع دار
کہ اصلی ہے نام اسلوٹ اسکنر
اور اک چھوٹے مرزا بھی ہیں خوش وضع
کہ جرنیل تھا باپ ان کا کبھی
جو قایم ہیں یارب یہہ قائم رہیں
سفریاں سے عقبیٰ کو جو کر گئے ❊

وہ اخلاق میں منتخب روزگار
بڑے سیدھے سادے ہیں وہ آدمی
کہ نازک مزاج اور رنگیں طبیع
ہمارے یہ دونوں ہی ہیں یار غار
خوش و خورم و شاد دایم رہیں
کرد شکر حاکم کہ دل شاد ہے

اسی خانداں کے ہیں وہ بھی پسر
کجی کی نہیں بات دیکھی کبھی
بڑے خانداں کے ہیں یہہ آدمی
شفیق صمیمی ہیں اور غم گسار
وہ جنت میں داخل ہوں جو مر گئے
نئے سر سے دہلی پھر آباد ہے

غزل جناب مائل دہلوی

لوگ جو انتخاب ہوتے ہیں ❊ ہم سے خانہ خراب ہوتے ہیں ❊ ہاں جو مجھکو خطاب ہوتے ہیں
عاشقی کی کتاب ہوتے ہیں ❊ یہہ حسیں بھی زمیں کے پردے پر ❊ مہر و مہ کے جواب ہوتے ہیں
میں تو کیا ہوں فرشتے ڈرتے ہیں ❊ جب صنم پر عتاب ہوتے ہیں ❊ کچھ اُدھر کی بھی لو لگی ہو اگر
شعر پھر لاجواب ہوتے ہیں ❊ کعبہ جائیں کہ بتکدہ جائیں ❊ اہلِ دُنیا خراب ہوتے ہیں
کیا ہوا ہے قصور کہئے تو ❊ کیوں عتاب و خطاب ہوتے ہیں ❊ میکدہ کیوں نہ ہو تجلی زار
سیکڑوں آفتاب ہوتے ہیں ❊ ہم گناہوں کو کیوں گنے اپنے ❊ جب کرم بے حساب ہوتے ہیں
میکدے میں تو شیخ صاحب بھی ❊ مست پیکر شراب ہوتے ہیں ❊ ہم تو ہیں رند کچھ نہیں معلوم
کیا عذاب و ثواب ہوتے ہیں ❊ مصحفِ رُخ کو دیکھ کر جانا ❊ بُت بھی اہلِ کتاب ہوتے ہیں

ہم نے دیکھی بیاضِ دُنیا کی ❊ کچھ ورق انتخاب ہوتے ہیں

شرم توبہ سے حضرتِ مائل
آج غرقِ شراب ہوتے ہیں

افاداتِ مہدی

(یعنی نامور انشا پرداز ایم۔ مہدی حسن مرحوم "افادی الاقتصادی" کا مجموعہ مضامین)

ناصر علی سرہندی کے ذکر میں صاحبِ خزانۂ عامرہ سید جعفر رومی کی زبانی لکھتے ہیں کہ:

"روزے باجمعے از یاراں بزیارت مرقدِ شیخ ناصر علی رفتیم و باہم صحبت داشتیم یارے رو بقبرِ شیخ آوردہ گفت کہ اے شیخ! بارے آں قول شما چہ شد؟ ؎

خاک گردیدیم و میر قصد ہنوز افغانِ ما ✤ خم شکست اما نمے ریزد مئے جوشانِ ما

گفتم بزبان شما ایں افغانِ ناصر علی است کہ برقص در آمدہ یاراں تحسین کردند۔"

یہہ واقعہ ایم۔ مہدی حسن مرحوم کے حال سے ملتا جلتا ہے کہ "افادات" کی وجہ سے اس باکمال شخص کی یاد اون کے جاننے والوں کے دلوں زندہ رہے گی۔ مجھے مہدی حسن سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا مگر خط و کتابت اس مرتبہ کو پہونچ گئی تھی۔ کہ اگر "المکتوب نصف الملاقات" صحیح ہے تو دو خطوں میں پوری مُلاقات ہوجاتی تھی۔ اور دونوں

طرف سے خطوں کا تانتا بنا رہتا تھا۔

مہدی بیگم صاحبہ نے "آفادات کے دوسرے مضمون میں جو "اُن کی یاد" میں لکھا اڈیٹر صلائے عام کو اُن خوش نصیب لوگوں میں لکھا ہے جنکو مرحوم سے مراسم خاص کا فخر حاصل تھا۔

حضرت مہدی حسن سے تحریری رسم و راہ کی وجہ پہلے رسالہ "تیر صنوبر" صدی کی توجہ سے ہوئی جس کی ایک جلد انھوں نے اپنے کتب خانہ "ام الجمیلہ" نامی میں نہایت محبت سے جمع کی تھی۔ میری طرز تحریر سے اُنہیں اُنس زیادہ اس سبب سے ہوگیا۔ کہ گورکھپور میں لسان الملک حضرت ریاض۔ جناب حکیم برہم اور دو ایک میرے کرمفرما اپنے حسن ظن سے مہدی حسن صاحب تک میرے مضامین کی رسائی کا باعث ہوئے پھر صلائے عام جاری ہونے پر جناب مرحوم نے دائرہ ادبیہ کے عنوان سے دو ایک مضمونوں میں "موضوع سخن ناصر علی کا اُردو لٹریچر" رکھا۔ اور لکھا کہ:۔

× × × × × "جنکی (ناصر علی کی) پاکیزہ خیالی اور خوش بیانی کی نسبت مجھے اصرار ہے کہ مُلک کی انشا پردازی میں امتیاز خاص رکھتی ہے۔ اور ظلم ہے اگر اُردو کے آشنائے ازلی کے کمالات کی داد نہ دی جائے جس کا فیاضانہ اعتراف خود لٹریچر کے فرایض میں سے ہے" + + + + + + + + + + + + + + +

صلائے عام کے متعلق مرحوم کے خطوط میرے پاس بہت تھے۔ معمولی بات بھی وہ نہایت پاکیزگی سے ادا کرتے تھے۔ ایک دن جلدی میں میں نے پوسٹ کارڈ ان کی خیریت دریافت کرنے کو لکھا۔ جواب میں لکھتے ہیں کہ "آپ کے ادھے خطوں کے پہونچنے جب تک صلائے عام جاری ہے اور آپ زندہ ہیں فکر و رنج ممکن نہیں" + پوسٹ کارڈ کو خطوں کے ادھا کہنا اُنھیں کا حصہ تھا۔ مجھے افسوس ہے کہ متواتر سفروں کی وجہ سے ان کے اکثر خطوط میری بے احتیاطی سے گُم ہوگئے۔ یہ کسے خبر تھی۔ کہ

مہدی حسن سے ہمیشہ کے لیے جدائی ہوجائے گی + واقعی ان کے حادثہ کی خبر مجھے عرصہ دراز تک معلوم نہ ہوئی۔ ابھی جناب مولوی سبحان اللہ صاحب رئیس گورکھپور سے دلی میں اتفاقاً ذکر آگیا۔ اسکے بعد "افادات" منگا کے مفصل حال معلوم ہوا۔ مہدی حسن کی انشا پردازی کا سکہ تمام اہل قلم کے دلوں میں بیٹھا ہوا تھا افسوس ہے کہ ان کی عمر نے وفا نہ کی! اور اگر ان کے مضامین ان کی بیگم صاحبہ "افادات" کے نام سے شایع نہ کردیتیں تو اور بھی زیادہ افسوس ہوتا +

"دائرہ ادبیہ" کی ایک کھلی چٹھی کا اقتباس جو مہدی حسن صاحب نے میرے نام لکھی تھی میں یہاں یادگار کے طور پر "افادات" سے نقل کرتا ہوں +

بخدمت، جناب خان بہادر سید ناصر علی صاحب بالقابہ ایڈیٹر "صلائے عام" دہلی۔ جناب من:

یاد فرمائی کا شکریہ! سنیے دیکھیے۔ مدت کی چوٹ جو دل کا چور بنی ہوئی تھی اُبھر آئی میں آپکے لٹریچر کا اُسوقت سے دلدادہ ہوں جب لٹریچر کا صحیح مفہوم بھی میرے ذہن میں نہیں تھا کم و بیش بیس برس ہوئے جب آپ نے ایک وضع خاص پر لکھنے پڑھنے کا شغل جاری کیا۔ یعنی "تیرھویں صدی" میں دادِ سخن دی + "تہذیب الاخلاق" کے ساتھ ساتھ آپ نے جس ٹھاٹھ سے دھواں دھار مضامین لکھے اور سرسید کے لٹریچر پر جس سلیقے اور سخن گستر شوخیوں سے آپ نے انتقادات کی ٹھہرائی سچ یہ ہے وہ اُردو لٹریچر کی جان ہیں۔ آج سنجیدگی اس قدر بڑھ گئی ہے کہ میں نہیں سمجھتا ملک کے نامور اہل قلم آپ کے گزشتہ کمالات کی داد دیں گے لیکن میں کھل کر کہنا چاہتا ہوں کہ آپ نے اُسوقت انشاپردازی کو چمکایا جب بہتوں نے قلم بھی ہاتھ میں نہیں لئے تھے + آپ کا ادبی مذاق اور ایک خاص طرح کا مادہ اختراعی (اریجینیلٹی) دراصل آپ کے اولیات میں داخل ہونے کے لائق ہے + موجودہ نسل تمام تر "تہذیب الاخلاق" کی ادبی دور کی پیدا کردہ ہے۔ جب آپ کے لٹریچر کا شباب تھا، اور یہیں سے اپنا مرتبہ دیکھ لیجئے "تیرھویں صدی" میں بلاخوف تردید

کہہ سکتا ہوں آپ کا عنصر غیر فانی ہے لیکن افسوس ہے آپ کو یہ خیال نہ آیا کہ جس سے پچھلے دنوں اتنے دماغی سلسلے رہے وہ بہیئت مجموعی کتابی صورت میں جلوہ گری کا حق رکھتی کہ اس پاکیزہ مجموعے کی ترتیب سے اُردو ادب العالیہ (کلاسیکس) میں آپ کی طرف سے مستقل قیمتی اضافہ ہوتا جو یادگار زمانہ رہتا۔ آپ معاف فرمائیں گے یہ بدترین حق تلفی تھی جو آپ اپنی کر سکتے تھے۔ یہ خیال قطعاً صحیح نہیں ہے کہ ملک میں اچھے لکھنے والے پیدا ہو گئے ہیں۔

* * * * * * * * * * * * * * * * * * *

ملک میں اچھے لکھنے والے کم ہیں۔ اُن میں بھی تھوڑے ہی ایسے ہیں جو آپ کے رنگ میں دو سطریں بھی لکھ سکیں؛ مرحوم ریاض (خدا اُسے مدتوں زندہ رکھے) اور برہم و آغہری کے دل سے پوچھئے۔ ناصر علی پھر کہاں؟

* *

* * * * * * * * * * * * * یہ لکھ رہا ہوں اور سمجھ میں نہیں آتا آپ کے قدردان کہاں سے آئیں گے؟ موجودہ نسل آپ کو نہیں جانتی یا کم سے کم میری طرح نہیں جانتی۔ اور یہ آپ ہی کا قصور ہے۔ لیکن "ہر فعل خود اپنی مکافات ہے" دنیا میں رہنے اور اچھی طرح رہنے کا اس قدر حق ہے کہ جس طرح ہو اپنی مستقل یادگار چھوڑیئے اس کی چلتی ہوئی ترکیب یہ ہے کہ تیرھویں صدی اور متفرق پرچوں میں آپ نے جو کچھ لکھا لکھایا ہے۔ اہتمام کے ساتھ ایک دم سے شایع کر دیجئے لیکن مضامین غیر نہ ہوں، آبروؤں میں گاڑھے کا پیوند بے جوڑ رہے گا۔ اگر یہ نہ ہوا میں سمجھوں گا میرے منہ میں خاک "آپ جیتے جی مر گئے" اور لٹریچر کے خون ناحق کا بار گراں جو گردن پر رہا وہ علیحدہ۔ یہ اصرار آپ کے خاص مرتبۂ انشا پردازی کے لحاظ سے ہے۔ آپ کی زبان اپنے مختص النوع صفات کے ساتھ کسی اور کے بس کی چیز نہیں اور سچ یہ ہے کہ آپ اپنے فن کے اختصاصی (اسپشلسٹ) ہیں۔

قناعت

اونٹ اک دن رو دیا ہو کر کھڑا | گڑگڑا کر عرض یوں کرنے لگا
یا الٰہی جتنے ہیں بندے ترے | کچھ نہ کچھ تحفہ دیا ہے سب کو دیے

سونڈ ہاتھی کو گل نازک کو خار | مور دشتی کو حصار نیش دار
سینگ گاؤ کو دیے گھوڑے کو کھر | گربہ کو چنگال اور چڑیا کو پر

جست دی چیتے کو بچھو کو زہر | اور زبان مکار کو دی چشم تر
اس میں کیا حکمت ہے ای خالق مری | چیز کوئی بھی مجھے ایسی نہ دی

دشمنوں کو جس سے رکھتا دور میں | اور نہ ہوتا اسقدر مجبور میں
حکم اس کی عرض پر صادر ہوا | کان اسکے کاٹ لو آدھے ذرا

ہے سزا اس کی یہی بے ادب | پوچھتا ہے ہم سے حکمت اور سبب
اس کی گستاخی سے ہیں ناراض ہم | اسکو جو کچھ ہے دیا کیا ہے وہ کم؟

ڈیل ڈول اس کو ہوا ہے وہ عطا | دیکھ کر ہوں ہوش انسان کے خطا
ہاں مگر چھوٹا ہے سر اور عقل کم | اس لئے ہے بیوقوفی میں علم

حاصل

جانتا ہے خوب وہ دانائے راز | خالق عالم کریم کارساز
کونسی بہتر ہے شے تیرے لئے | اور مضر کیا چیز ہے تیرے لئے

حکمت ہے ہر کام میں وہ دادگر | مصلحت مخلوق کی زیر نظر
رکھ تو اطمینان اس کا کوئی کام | خالی حکمت سے نہیں ہے نیک نام

ہے یہ ممکن جو ہماری عقل میں | اچھا ہے نقصان پہنچا ہے ہمیں
اور جسکو جانتے ہیں ہم مضر | ہو اسی میں فائدہ کچھ مستتر

کر قناعت پڑ نہ تو جنجال میں | کر خدا کا شکر ہر اک حال میں

محمد حسین عارف

(خان بہادر پیرزادہ جناب محمد حسین رئیس دہلی ریٹائرڈ سشن جج)

ایک پرانا پوسٹ کارڈ

×× "خط کے آدھے" یعنی آپ کے کارڈ ملتے رہے۔ کیا بتاؤں آج کل کس عالم میں ہوں۔ "دلکش وجہ" مفصل سُننے گا۔ جب تک ناصر علی دنیا میں ہے مکروہات زمانہ سے مجھے کیا واسطہ؟ × × × × × × × ×

ہمیشہ آپکا۔ مہدی۔ (الٰہ آباد)

مہتمم کی طرف سے۔

اِطّلاع

صلائے عام کی قیمت پیشگی چھہ روپیہ سالانہ ہے۔ قیمت بذریعہ منی آرڈر عنایت فرمائی جائے۔ مضمون نگار بھی صلائے عام کی قیمت سے بری نہیں۔ نہ یہہ ضرور ہے کہ ہر مضمون خواہ مخواہ شایع کیا جائے۔ جامع اوراق کو مضمون میں کمی بیشی کا اختیار ہے۔ جو مضمون شایع نہ ہو سکیں اُن کے واپس کرنے کا ذمہ نہیں ؛

صلائے عام میں ہر طرح کے مضامین نظم نثر شایع ہوتے ہیں۔ زیادہ تر نثر کہ اس وقت نثر کی زیادہ ضرورت ہے: اور نثر بھی ایسی جس میں زبان کی خوبی وفصاحت کے ساتھ مضمون کی پاکیزگی و نازکخیالی ضرور ہو یعنی بلسانِ عربی حُسنِ جمیل و لباسِ حریر شرط ہے کہ مضمون پاکیزہ اور ادائے بیان لاجواب چاہئے ؛

اکثر اصحاب نمونہ کا پرچہ مانگتے ہیں۔ اوّل تو ایک پرچہ سے صلائے عام کی ساری خوبیوں کا حال معلوم ہونا مُشکل ہے دوسرے صلائے عام اتنے عرصہ سے جاری ہے کہ اہلِ علم میں شاذ ہی کوئی ایسا ہوگا جو اس سے واقف نہ ہو: پھر بھی اگر کسی کو نمونہ یا سال سے کم کی خریداری منظور ہو تو ایک روپیہ فی پرچہ کے حساب سے قیمت لی جائے گی ؛

صلائے عام کا پتہ اس قدر کافی ہے کہ :-

دہلی۔ فراشخانہ : مکان میر ناصر علی خان بہادر

حسب الارشاد میر ناصر علیخاں بہادر مطبع ناصری واقع فراشخانہ دہلی میں باہتمام میر احمد چھپا اور شایع ہوا ؛

Printed and Published by Mir Nâsir Ali Khân Bahâdur (Editor) at the Nâsri Press, Farrâsh-Khânâ Delhi.

REGISTERED No L. 1462 SALA-I-AM, DELI

لوح رکھکر بیاض جبیں کہا دوسرا کوئی تجھسا نہیں



نمبر ۲ جلد ۱۳

SALA-I-AM, DELHI.

A high class Monthly Magazine devoted to the cause of Urdu literature, the preservation of the old Indian, especially Mohammadan culture and refinement, and the assimilation of the best features of the new civilization.

حسب الارشاد میر ناصر علیخاں دہلوی باہتمام میر مبین احمد مطبع ناصری واقعہ فراشخانہ دہلی میں چھپا اور شائع کیا

جلد ۱۳ — نمبر ۲

فہرستِ مضامین

بابت ماہ فروری ۱۹۲۵ء مطابق رجب ۱۳۴۳ ہجری

مضمونِ پریشان

(طنز) دلقِ گدایاں

میں نے دیکھا کہ صلائے عام کے "مضمون پریشان" پر دلقِ گدایاں کی پھبتی خاصی ہے۔ فقیروں کی گُدڑی میں نہ صرف چھوٹے بڑے بلکہ رنگ برنگ کے پیوند ہوتے ہیں اور پیوند بھی نئے پرانے سب طرح کے۔ کوئی کہیں اور کوئی کہیں۔ کوئی آج کا کوئی کبھی کا۔ ریشمی کے ساتھ موٹے گاڑھے کے اور رنگین کے ساتھ بے رنگ؛ جیسا پیوند ہوا جہاں اور جب مل گیا تھوپ لیا ع چاک دامن کے ہوں یا ٹکڑے گریبانوں کے ؛

گُدڑی کے ساتھ گدائی کا خیال بُرا نہیں۔ یہہ خیال مجھے اس وجہہ سے ہوا کہ اخبار و رسالے والوں کو جہاں قیمت کا رونا رہتا ہے یہہ سوال بھی صدائے درویش کی طرح اکثر کی زبان پر ہے کہ "آپ اپنے دوست آشناؤں میں ایک ایک دو دو خریدار پیدا کرکے توسیعِ اشاعت میں کوشش کیجئے ورنہ اخبار و رسالہ

زبانی ہی

زیر باری کی وجہ سے بند ہوتا نظر آتا ہے" ۔ اس سوال سے اخبار و رسالہ والوں کی ظاہرا اس قدر کسر شان نہیں جس قدر اس سوال کے ٹالنے والوں کی کہ ایسی خفیف بات کی زبان پر لانے کی نوبت آئی ؎

اس کے ہاتھوں سے ہم اب ربط خفا سنتے ہیں ۔ اے مرے خونِ جگر ہائے یہ کیا سنتے ہیں

اس کے ساتھ قومی و ملکی خیر خواہی کے دعوے !

مجھے معلوم نہیں کہ ان دعووں سے قوم و ملک کو کیا فائدہ ہوا ؟ قومی و ملکی فائدوں میں ایک معمولی بات اپنی زبان کی ترقی تھی ۔ اس کا رونا روز بروز بڑھتا جاتا ہے ۔ آغا اسد اللہ کا شعر ہے ؎

جھوٹھ بلبل ترا سب عشق کا افسانہ تھا ۔ کیوں خزاں دیکھی جدا ہوتے ہی مرجانا تھا

اس وقت قوم کو اپنی زبان کی ترقی کے سوا کسی چیز کی ضرورت نہیں ۔

زبان کی ترقی کے دو ہی ذریعے ہیں ۔ نظم و نثر ۔ نظم و نثر کی بحث میں اس وقت اچھے اچھے مضمون نکل رہے ہیں اور آیندہ اور بھی نکلیں گے ۔

میں نظم کو نثر سے بہتر سمجھتا ہوں ۔ شاعرانہ فتوے جوازے کی طرح ؏

جو وصال ہو تو حلال ہے جو فراق ہو تو حرام ہے ۔ تکلّف و عیش کے لئے شعر سے بہتر کوئی مشغلہ نہیں ۔ اس کے سوا لٹریچر میں اظہار کمال کا ذریعہ صرف شاعری ہے ۔ رکابدار کا فن بریانی و متنجن و مظعفر کے پکانے میں ظاہر ہوتا ہے نہ کہ روزمرہ دال روٹی میں ۔

یہی پریشانی کا مضمون جو میں مدت سے لکھ رہا ہوں نثر میں مجھسے ابتک بن

بن نہ پڑا۔ اسی کو اساتذہ دو چھوٹے چھوٹے مصرعوں میں کس خوبصورتی سے باندھ گئے :

حمد میں ہے ؎

زعشقِ او غزلخواں گشتہ بلبل ؛ پریشانی تخلّص کرد سنبل

سنبل کا تخلّص پریشانی مجھے قیامت تک نہ سوجھتی۔ اس تخلّص کے ساتھ ؎

دلے آشفتہ تر از سنبلم بخش ؛ پریشاں نالہ چوں بلبلم بخش

حضرت احسن مثنوی جلوۂ ناز میں جو شاہ جہاں بادشاہ کے عہد میں کشمیر کی تعریف میں لکھی تھی فرماتے ہیں :-

حمد ؎ زعشقش بید مجنوں در سماع است ؛ میاں سرو و آزادی وداع است

(وداعِ سرو و آزادی کمالِ فصاحت ہی) ؎

چناں سرسبز از لطفش چنار است ؛ کہ ہر برگِ خزانش نوبہار است

نخواہد کرد شکرت بے نیازم ؛ اگر از اشک خود صد سبحہ سازم

مناجات ؎ بیا ای ساقی اے ہم مشربِ من ؛ اثر دارد مستی یا ربِ من ؛

نعت ؎ خزاں رانیست دیگر رنگے از گل ؛ پریشانی نہ بیند جعد سنبل

دنیا میں عیش و معصیت رندی و پارسائی دونوں کا امتحان کرکے یہہ نتیجہ نکالا کہ ؎

گہے سبحہ گہے ساغر بدستم ؛ ندانم کز کدامیں نشہ مستم

بادہ مستی اور فاقہ مستی دونوں بے کار ہیں ؎

رموزِ عشق از استاد دارم ؛ ہزاراں طعنہ بر فرہاد دارم

بہتمامِ میواں

بہ آسے میتواں چوں جاں سپردن ٭ نباید تیشہ را بدنام کردن

سر منصور ازاں بادار شد جفت
کہ حق میگفت اما حق نمی گفت

باغ کی تعریف میں دو ایک شعر پریشانی کی رعایت کے اور سننے کے قابل ہیں

مگر خوابِ پریشاں دیدہ سنبل ٭ کہ دارد دعوے ہم چشمے گل
بود بیگانہ پژمردگی گل بحدے ٭ پریشانی نہ فہمید است سنبل
خزاں کردہ زبس تاراج گلشن
پریشانی تواں بردن بہ دامن

میں دیکھتا ہوں کہ یہ مضمونِ پریشاں میں نے بطرزِ دلق گدایاں شروع کیا اور یادِ رفتگاں کی لے پر آگیا کہ کلام اساتذہ سے زیادہ کام نکل گیا۔ مجھے اپنی طرف سے بہت کم لکھنا پڑا: میرا عقیدہ ہے کہ اساتذہ جو بات جس طرح کر گئے ہم سے بن نہ پڑی ٭ یادِ رفتگاں میں مجھے جناب مرزا نوشہ کی رائے مضمون و زبان کی نسبت تذکرۂ جلوۂ خضر[1] سے یاد آگئی جو صاحبِ تذکرہ نے حضرت کی زبانی لکھی ہے۔ ×× × × × × × × × ”فرمایا میاں اگر مجھ سے پوچھتے ہو تو زبان کو زبان کر دکھایا تو لکھنؤ نے اور لکھنؤ میں ناسخ نے۔ ورنہ بولنے کو کون نہیں بول لیتا۔ اب جس کا جی چاہے تراش خراش روز کرے مگر میرے نزدیک وہ تراش خراش کی جگہ ہی نہیں چھوڑ گیا ہے۔ ہاں قواعد لکھ نہیں گیا۔ قواعد جاننے والا اس کے کلام کے مزے پاتا ہے۔ ہماری دلی ہمیشہ اس بات میں پیچھے رہی کہ مضمون کے آگے زبان کی درستی نہ کی اور مضمون میں بھی عاشقانہ

[1] تذکرۂ جلوۂ خضر مطبوعہ مطبع نور الانوار ۱۳۰۲ ہجری

زیادہ خیال

کا زیادہ خیال رہا مگر یاد رہے × × × × × × × × × × × ×

× × × × × × میں نے بھی ایک طرز خاص ایجاد کیا تھا جس میں ہر طرح کے مضمون کو نشو و نما ہو سکتا تھا مگر یاروں نے چلنے نہ دیا۔ اور سچ پوچھو تو یہہ ایجاد ناسخ کا ہے۔ میاں جب ناسخ کا کلام دہلی میں پہونچا جیسا تمنے ولی کے دیوان کا حال سنا ہوگا کہ دلی میں آیا تو جیسے نئی چیز پر لوگ گر پڑتے ہیں اُسی طرح اُس کے کلام پر گر پڑے۔ اُس وقت فارسی کی شاعری دہلی میں بہت چمکی تھی۔ مگر اُردو کی مداخلت فقط بول چال میں تھی اس کو مسلسل نظم میں جو دیکھا تو نوخیز اور فارسی داں سب اُس کی تقلید پر چلنے لگے۔ اور ہر ایک نے اپنے اپنے معلومات کے مطابق رہ سپری کی۔ گر وہ فقط زبان کو نظم کر دینا تھا کچھ ایسی دقت نہ ہوئی۔ پھر بھی جتنے لوگوں نے ادھر توجہہ کی ہر ایک کی ایک طرز نئی ہو گئی۔ مگر ناسخ کے کلام نے (جس کو علم درکار تھا اور قاعدہ کے زیر تو پر ڈالا گیا تھا) دہلی میں آکر سب کو حیران کر دیا۔ اور قاعدے کے ساتھ مطالب کا واضح طور سے ادا ہونا دلوں کو برانگیختہ کرنے لگا۔ یہاں تک کہ شعر لکھتے ادھر رغبت کی نگاہ سے دیکھا اُس وقت ہم تین شاعر با مذاق نام برآوردہ تھے۔ میں۔ اور مومن خاں اور ذوق + ذوق نے ادھر کم رغبت کی۔ کیوں کہ اُن کو اپنے مضمون ہی کے باندھنے میں دقت پڑتی تھی زبان کی طرف کب خیال کر سکتے ہیں۔ مگر مومن خاں نے خیال کیا۔ پہلے یہ شاہ نصیر کے شاگرد تھے شاہ نصیر کی جو طرز ہے وہ معلوم ہے۔ مگر مومن خاں نے اُن کو چھوڑ کر ناسخ کے طرز پر غور کیا۔ اور فارسی کی تراش خراش پر توجہہ کی۔ ادھر میں نے بھی۔ غرض ہم دونوں دہلی کی طرز زبان کو چھوڑ کر ترکیب اور بندش کی درستی میں مصروف ہوئے۔ مگر جب بہت کچھ کہہ گئے تو دیکھا کہ ہم دونوں کی طرز الگ الگ ہو گئی۔ اور کوئی ناسخ سے نہ ملی۔ میں نے تو میر تقی میر کا انداز اختیار کیا۔ اور مومن خاں اپنے اُسی رنگ میں رہے۔ خلاصہ یہہ کہ دہلی کی زبان میں ہر شاعر کے کلام میں اختلاف پاؤ گے۔ اور اختلاف کی وجہہ یہی ہے کہ

ناسخ نے جن قاعدوں سے زبان کو درست کیا۔ جس کے سبب سے تمام لکھنؤ کی ایک ہی زبان ہو گئی وہ قاعدے عام نہیں ہوئے کہ ہم تک پہونچتے۔ ناچار اپنی جودتِ طبع سے جو کچھ ہوا وہ کیا۔ مگر یاد رہے کہ مضمون دہلی کا اور زبان لکھنؤ کی مستند ہے"؛ × × × × ×

× × × × × × × × × × × × × × × ×

یہ ذکر اس لئے یاد آگیا کہ ایک مدت تک تو زبان کے معاملہ میں دلّی و لکھنؤ کا جھگڑا رہا۔ وہ جھگڑا کم و بیش حق بجانب بھی تھا: اس کا عوض زمانہ نے اب اس طرح سے لیا کہ پنجاب مدراس۔ بمبئی۔ ڈھاکہ و بنگالہ وغیرہ ہر قریہ و دیہہ سے یہی آوازیں آنے لگیں؛ دلّی و لکھنؤ میں تو آغاز سے اُردو کے سوا اور کسی زبان کا چرچا نہ تھا۔ اُردو ہی ہر شخص کی زبان تھی۔ اُسی میں کمال پیدا ہو گیا؛ برخلاف اس کے پنجاب اور اور علاقوں میں اور زبانیں بھی وہاں کے باشندوں کی اصلی اور مادری زبانیں موجود ہیں۔ اپنی زبانیں چھوڑ کر اُردو کا دعوےٰ۔ آپ جانیں اور دعویٰ کرنیوالے جانیں؟

انجمن ارباب علم پنجاب

کی طرف سے ایک اشتہار صلائے عام میں شایع ہونے کے لئے آیا ہے کہ اُردو کو فروغ دینے کی غرض سے "ادبی معرکہ" کے نام سے ایک مجلسِ نظم لاہور میں قائم ہوئی ہے۔ ہر سال بارہ مجالس مقابلہ منعقد ہوا کریں گی: پہلے بارہ ماہ کے لئے علے الترتیب ذیل کے بارہ عنوان اہل قلم کی طبع آزمائی کے لئے انجمن کی مجلس ادبیہ نے تجویز کئے ہیں:-

۱۵ مارچ ۱۹۲۵ء نورجہاں۔ اپریل نمودِ سحر۔ مئی سری کرشن۔ جون۔ برسات جولائی حُسن۔ اگست ہمارا وطن۔ ستمبر تاروں بھری رات۔ اکتوبر گنگا۔ نومبر محبت۔ دسمبر شاعر۔ جنوری ۱۹۲۶ء۔ دوشیزۂ کوہسار۔ فروری۔ موسیقی۔

دیر و حرم کا فسانہ

× × × × × × × × × × × × ×

"کون کتنے پانی میں ہے" پنڈت دیاشنکر نسیم کی مثنوی گلزار نسیم پڑھ کر برہمن لوگ مارے غصہ کے بھوت ہو رہے ہیں۔ پنڈت سے پوچھتے ہیں:۔ ایں! خیر تو ہے! تیرے منہ سے حمد۔ نعت۔ اور منقبت کیسی؟ اللہ رسول پنجتن کے رشتہ جوڑنے کے کیا معنی؟ پنڈت دیاشنکر آخر شاعر ہے۔ فی البدیہ کہتا ہے:۔ مہاراج! اس میں جبیں بہ جبیں ہونے کی کون بات ہے؟ میری مثنوی کا مطلع پھر پڑھئے ؎ ہر شاخ میں ہے شگوفہ کاری * ثمرہ ہے قلم کا حمدِ باری!

یعنی اپنے "ھر" کا نام ہمنے پہلے لے لیا تھا تب "حمد باری" شروع کی تھی! برہمنوں کے ماتھے پر اب ایک شکن نہیں۔ سب خوش خوش گھر واپس جا رہے ہیں۔ مگر پنڈت دیاشنکر قلم ہاتھ میں لیکر اُس کو یوں مخاطب کرتا ہے:۔ ارے سُنتا ہے؟ یہ رسائی فکر اور گلو خلاصی ثمرہ ہے حمد باری کا! اللہ کی حمد نہ کئے ہوتے تو اس وقت یقینی شہ مات تھی!

کون کتنے پانی میں ہے؟ بکسر کی لڑائی کو دس برس ہو چکے ہیں۔ شجاع الدولہ تخت اَوَدھ کی بہاریں دیکھ رہا ہے یکایک قریب ناف ایک پھوڑا نمودار ہوتا ہے۔ پھوڑا کیا ہے ایک چھوٹا تربزہ ہے۔ پھوڑا پھوٹتا ہے۔ اطبا کہتے ہیں کہ یہہ لاعلاج ہے۔ آخر یہہ پھوڑا ہوا کیوں کر؟ چشم دید گواہ کہتے ہیں۔ کہ حافظ رحمت خاں سپہ سالار روہیلکھنڈ جب مارا گیا تو شجاع الدولہ نے اُسکی بی بی بچوں کو اپنی حرم سرا میں نظر بند کیا۔ مرحوم کی ایک لڑکی تھی۔ دوشیزہ۔ سترہ کا سن۔ کشیدہ قامت صاحب جمال۔ باعصمت! شجاع الدولہ نے ہم آغوشی چاہی نا جائز و جبریہ ہم آغوشی۔ لڑکی جب خلوت میں طلب ہونے لگی تو ماں نے بلا کر کہا۔ بیٹی! یاد رکھنا کہ تیری رگوں میں سپہ سالا حافظ رحمت کا

کا خون ہے۔ تو اس لئے پیدا نہیں ہوئی تھی۔ کہ کسی کی داشتہ بنکر رہے۔ بالخصوص اُس کی داشتہ جو تیرے باپ کا قاتل ہے! دوشیزہ نے اپنی زلفوں میں ایک زہر آلود چاقو چھپا لیا اور خلوت میں حاضر ہوئی۔ شجاع الدولہ نے بستر عیش پر شجر ممنوعہ سے پھل توڑا مگر اسی عالم میں دوشیزہ کے زہر آلود چاقو نے عیش پسند کو غم کا سبق پڑھایا۔ عیش پسند نے اُسی کرب و اذیت میں خواجہ سراؤں کو اشارہ کیا ہیں خواجہ سراؤں نے دوشیزہ کو خنجر سے فوراً ٹھنڈا کر دیا۔ آئندہ کے خدشوں سے بچنے کے لئے دو ہزار بیگمیں شاہی محل سے شہر بدر کی گئیں۔ ان دو ہزار میں چار سو ایسی تھیں جنھیں سات برس کی مدت میں یعنی دو ہزار پانچسو پچیس راتوں میں صرف دو بار شجاع الدولہ کی ہم بستری نصیب ہوئی تھی! الغرض چشم دید گواہ کہتے ہیں۔ کہ یہ پھوڑا اُسی زہر آلود چاقو کی یادگار ہے۔ مگر اور لوگ کہتے ہیں کہ نہیں آج سے ایک برس پہلے ایسا ہی زخم پشت یا شانہ پر نمودار ہوا تھا۔ شجاع الدولہ نے پانچ لاکھ کی نذر مانی تھی۔ اور جب صحتیاب ہوا تھا تو نذر ادا بھی دی تھی۔ شجاع الدولہ پر کیا ہے اُس کے باپ اور نانا کو بھی یہی عارضہ تھا اور اسی میں دونوں فوت بھی ہوئے۔ پس یہ پھوڑا کسی زہر آلود چاقو کا اثر نہیں ہے۔ بلکہ باپ اور نانا سے ترکہ میں ملا ہے۔ کوچہ و بازار میں اُس طرف یہی روایتیں مشہور ہو رہی ہیں اور اِس طرف شاہی محل میں اندھیرا ہو رہا ہے۔ پھوڑا اپنے شباب پر ہے اس شباب کو زوال نہیں۔ شجاع الدولہ پریشان ہو کر فیض آباد جاتا ہے وہاں کی آب و ہوا بے فیض ثابت ہوتی ہے۔ یہاں بھی وہی پھوڑا ہے اور وہی جاں کندنی ہے ۲۲ ذیقعد روز پنجشنبہ ۱۱۸۸ ہجری اس جان کندنی سے نجات ہوتی ہے۔

کون کتنے پانی میں ہے؟ شجاع الدولہ کو غسل میت دیا جا رہا ہے۔ غسل و کفن ہو چکا اب جنازہ محل کے باہر آگیا ہے۔ جنازہ کہاں جا رہا ہے؟ گلاب باغ جا رہا ہے۔ یہ باغ کہاں ہے ۴ میل کے فاصلہ پر ہے۔ جنازہ کے ساتھ کون کون ہیں؟ مرزا علی خاں اور سالار جنگ ہیں۔ وزرائے سلطنت اور مشاہیر فوج ہیں۔ شاہی خاندان اور متوسلین خاندان ہیں۔ غرضیکہ فیض آباد کی ٹھیکری ہے؛ ہاتھی گھوڑوں کی قطار پیچھے ہے۔ کیا یہ سب لوگ چار میل تک پیدل

کی جا رہی ہے

ہی جائیں گے؟ دو میل کی مسافت طے ہو چکی مگر دیکھو تو شانہ بدلنے کے لئے لوگ اب بھی ٹوٹے
پڑ رہے ہیں۔ ایں ایہ ماتم داروں کی صف چیرتے ہوئے کون بدتمیز چلے آرہے ہیں؟ یہ بدتمیز قاصد
ہیں مرزا امانی کے! مرزا امانی کون؟ مرزا امانی عرف آصف الدولہ۔ جس کا جنازہ جا رہا ہے اُسی کا سپوت
بیٹا۔ کیا آصف الدولہ اپنے باپ کے جنازہ کے ساتھ نہیں ہے؟ ساتھ ہوتا تو ہرکارے کیوں بھیجتا۔
آخر ساتھ کیوں نہیں ہے؟ اپنی سعادت مندی کا ثبوت دے رہا ہے۔ ہرکارے کیوں بھیجے ہیں؟
مرزا علی خاں اور سالار جنگ کو پیام آیا ہے کہ جنازہ چھوڑ کر میرے پاس فوراً چلے آئیے۔ یہ دونوں
آصف الدولہ کے کون ہیں؟ سگے ماموں ہیں۔ ماموں ہرکاروں سے کیا کہہ رہے ہیں؟ کہہ رہے
ہیں کہ جنازہ جب تک گلاب باغ نہ پہونچ لے ہم کیونکر چھوڑیں اور چھوڑیں بھی تو خلق اللہ کیا کہے گی
ایں! اب یہ دوسرے ہرکارے صفِ ماتم کو چیرتے ہوئے کیوں آئے ہیں؟ یہ حکم لیکر آئے ہیں کہ دونوں
ماموں اگر یوں نہ آئیں تو پکڑ کر لے آؤ۔ تب؟ دونوں ماموں مجبوراً جنازہ کو چھوڑ کر جا رہے ہیں اور خلق اللہ
انگشت بدنداں ہے۔ ماموں بھانجے میں کیا گفتگو ہو رہی ہے؟ بھانجا اپنے دونوں ماموؤں سے کہہ رہا
ہے کہ باپ کا غم ہوتا رہے گا۔ پہلے آپ لوگ ہم کو جانشین قرار دے لیجئے۔ پھر؟ پھر یہی۔ کہ دونوں ماموں
کانوں پر ہاتھ رکھ رہے ہیں کہ اتنی عجلت کیوں ہے۔ مگر بھانجا کہتا ہے کہ واہ! نماز میت کے بعد ہی گلاب
باغ میں اگر میرا چھوٹا بھائی مرزا سعادت علی جانشین قرار دے دیا گیا تو پھر ہم کیا کریں گے۔ تب؟ تب یہ ہوا
کہ مرزا علی خاں۔ سالار جنگ اور کرنل کلین مجبوراً آصف الدولہ کے سر پر شاہی عمامہ باندھ رہے
ہیں۔ فوجی باجا تخت نشینی کا اعلان کر رہا ہے۔ جنازہ کے ساتھ جتنے مشاہیر تھے سب دربار میں بلا لئے
گئے ہیں۔ صرف غربا و مساکین نماز میت کے لئے چھوڑ دئے گئے ہیں۔ اس طرف سپوت بیٹا مشاہیر
سلطنت کی نذریں لے رہا ہے۔ اور اُس طرف باپ کی لاش پیوند خاک ہو رہی ہے! مرزا امانی عرف
آصف الدولہ تخت اودھ پر بیٹھکر کیا کرتا ہے؟ سب سے پہلا کام یہ کرتا ہے کہ اپنے پالکی بردار کہار کو
راجہ مہاراجہ کا خطاب دے کر امور سلطنت میں شریک کرتا ہے!
کون کتنے پانی میں ہے؟ جنگ پلاسی میں سراج الدولہ کی طرف سے میر مدن دھاوا کر رہا ہے

اتنے میں ایک توپ کا گولہ آتا ہے اور میر مدن کی ران غائب! میر مدن کا انجام دیکھ کر سراج الدولہ اپنی ٹوپی میر جعفر خاں سپہ سالار کے پاؤں پہ رکھتا ہے۔ کہ میری جان اور آبرو تمہارے ہاتھ میں ہے۔ میر جعفر خاں کہتا ہے۔ کہ اب اس وقت تو شام ہوئی کل صبح کو دیکھا جائے گا۔ اب یہی گفتگو ہو رہی ہے کہ اتنے میں موہن لال سراج الدولہ کی طرف سے آگے بڑھ گیا۔ اس کو بڑھتا دیکھکر میر جعفر خاں حکم دیتا ہے کہ موہن لال! بھاگ آؤ! سراج الدولہ میر جعفر کا مُنہ تکتا ہے۔ میر جعفر خاں جواب دیتا ہے کہ حضور میری تو یہی رائے ہے! موہن لال کو بھاگتا دیکھکر فوج کے پاؤں اُکھڑ جاتے ہیں۔ سراج الدولہ اب میدان میں بے یار و غمگسار اکیلا کھڑا ہے۔ مجبوراً میدان چھوڑتا ہے۔ رات بھر چلتا ہے۔ آٹھ بجے صبح کو منصور گنج محل میں پہونچتا ہے۔ افسران فوج کو حکم دیتا ہے۔ کہ کم سے کم میری ذاتی حفاظت کے لئے محل میں پہرہ کا سامان کردو۔ ایک سپاہی نہیں آتا۔ اس عالم میں تین بجے رات کو محل سے پوشیدہ فرار ہوتا ہے۔ بھگوان گولہ سے ہوتا ہوا ناؤ پر راج محل کے دوسرے ساحل پہ پہونچتا ہے۔ صرف ایک گھنٹہ کے لئے اُترا ہے کچھ کھچڑی پکا کر تین دن کا فاقہ توڑے۔ تین برس کی بچّی جو ساتھ ہے وہ بھی فاقہ سے ہے۔ سراج الدولہ چولھا سلگانے بیٹھتا ہے!! قریب میں شاہ دانا کا جھونپڑا ہے۔ شاہ دانا فاقہ کش کے پاس آتا ہے۔ دیکھ کر پہچانتا ہے۔ کہتا ہے کہ حضور فقیروں کا نان و نمک قبول ہو۔ نان و نمک حاضر کرنے کے لئے شاہ دانا اپنے جھونپڑے میں واپس جاتا ہے۔ وہاں پہونچکر میر قاسم اور میر داؤد کو خفیہ خبر بھیجتا ہے کہ جلد آؤ! تمہارا شکار اس وقت میرے دام میں ہے۔ شکاری پہونچتے ہیں۔ سراج الدولہ صید ہو کر مرشد آباد آتا ہے۔ دوپہر کا وقت ہے۔ میر جعفر خاں اب شاہ بنگالہ ہے۔ بھانگ کے نشہ میں بے ہوش پڑا ہے۔ اسکا بیٹا میرن حکم دیتا ہے کہ سراج الدولہ کو بغل کے کمرے میں بند کردو۔ پھر میرن اپنے مصاحبین خاص میں سے محمدی بیگ کو قیدی کے کمرے میں بھیجتا ہے۔ جلاد کے ہاتھ میں ننگی تلوار دیکھکر سراج الدولہ عرض کرتا ہے۔ کہ وضو کے لئے تھوڑا سا پانی دے دو کہ نماز توبہ پڑھ لیں۔ محمدی بیگ توبہ کا دشمن ہے اس لئے پانی دینے سے انکار کرتا ہے۔ سراج الدولہ چلاتا ہے۔ پانی! پانی! ایک گھونٹ پانی خدا کی راہ میں! شمر اس کی پیاس بجھاتا ہے مگر صرف آب شمشیر سے!۔

سراج الدولہ اُسی جاں کندنی میں در و دیوار سے کہتا ہے ۔ بس بس! ہم چلے! الفراق اے دنیا الفراق! آج حسین قلی خاں کا خون بے باق! جلاد اپنی شمشیر خوں آشام سے لاش کو پارچہ پارچہ کرتا ہے ۔ میرن اُس نعش صد پارہ کو ہاتھی پر رکھوا کر مرشد آباد کے بازاروں میں گشت کے لئے بھیجتا ہے ۔ فیلبان اپنی کسی ضرورت سے ہاتھی کو اتفاقیہ بازار میں ٹھہراتا ہے ۔ مگر ہاتھی جس دروازہ کے سامنے اُس وقت رُکتا ہے وہ خدا کی شان کہ حسین قلی خاں کا دروازہ ہے! ہاتھی رُکتا ہے اور نعش صد پارہ سے خون کے چند قطرے ٹھیک اُس جگہہ پر گرتے ہیں جہاں آج سے دو برس پہلے شام کے وقت سراج الدولہ نے حسین قلی خاں کا خون بہایا تھا! بیشک حسین قلی خاں کا خون آج بے باق ہوگیا! ہاتھی اب آگے بڑھتا ہے گشت کرتا ہوا اُس محل سے گزرتا ہے ۔ جہاں سراج الدولہ کی ماں آمنہ بیگم ہے ۔ کسی نے آمنہ بیگم سے کہدیا کہ بی بی! تم کو لبسنت کی کچھ خبر بھی ہے؟ جوان بیٹے کی لاش گشت کے لئے جارہی ہے! آمنہ بیگم چیخ مارتی ہوئی ننگے پاؤں ننگے سر ۔ زنانخانہ سے بازار میں دوڑی آتی ہے ۔ بیٹے کی لاش پر گر کر بلائیں لیتی ہے ۔ آمنہ بیگم کی فغاں و سینہ کوبی سے بازار میں زلزلہ آگیا ۔ خلق خدا ماتم کر رہی ہے ۔ شقی القلب خادم حسین خاں اپنی چھت سے یہ تماشہ دیکھ رہا ہے ۔ اپنے عصا برداروں کو دوڑاتا ہے ۔ عصا بردار بازار میں آتے ہیں اور آمنہ بیگم کو تھپڑ ۔ گھونسہ اور لاتوں سے مار کر بیٹے کی لاش سے چھڑا لیتے ہیں! اب ہاتھی آگے بڑھتا ہے ۔ اِدھر نعشِ صد پارہ گشت ہو رہی ہے اور اُدھر میر جعفر خاں بھانگ کے نشہ سے ہوش میں آتا ہے ۔ خبر ہوتی ہے کہ سراج الدولہ قید ہو کر آگیا ۔ میرن کو رقعہ لکھتا ہے کہ بیٹا! قیدی بھاگنے نہ پائے! خبردار! میرن حاملِ رقعہ سے کہتا ہے کہ ۔ ابا جان سے کہدیجیو کہ آپ کا بیٹا آپ سے زیادہ تیز ہے ۔

کون کتنے پانی میں ہے؟ سراج الدولہ کے بعد اُس کے چھوٹے بھائی مرزا مہدی کی باری آتی ہے پندرہ برس کا لڑکا ۔ نہایت حسین ۔ دو تختوں میں داب کر مار ڈالا جاتا ہے ۔ اس کے بعد آمنہ بیگم اپنی بڑی بہن گھسیٹی بی بی کے ساتھ قید کرکے ڈھاکہ بھیجی جاتی ہے ۔ جسارت خاں گورنر ڈھاکہ کو میرن خط بھیجتا ہے کہ اِن دونوں کو وہیں دریا میں ڈبو دو ۔ جسارت خاں جواب دیتا ہے کہ .

گورنری کو سات سلام مگر یہ اندھیر ہم سے نہیں ہوگا۔ تب میرن اُس کو لکھتا ہے۔ کہ اچھا حامل رقعہ کے ساتھ اُن دونوں کو میرے پاس مرشد آباد بھیجدو۔ جسارت خاں دونوں کو حامل رقعہ کے ساتھ کردیتا ہے۔ میرن کا قاصد دونوں کے ساتھ ناؤ پر سوار ہوتا ہے۔ جب ناؤ ایک سنسان مقام پر پہونچتی ہے تو قاصد کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے ہیں۔ کیوں کہ اب اس کو میرن کے پوشیدہ حکم کو بجا لانا ہے۔ کہتا ہے۔ کہ بیبیو۔! آج تمام دن تم لوگوں نے کچھ کھایا نہیں ہے۔ بہتر ہے کہ فاقہ شکنی کرلو اور اُجلے کپڑے بدل لو کیوں کہ یہ آخری سفر ہے! آخری سفر کا نام سنکر گھسیٹی بی بی اور آمنہ بیگم تھرا جاتی ہیں۔ پھر چھوٹی بہن سنبھل کر بڑی بہن سے کہتی ہے کہ۔ سنو جی! موت سے ڈرنا کیسا؟ جو آتا ہے مرنے کے لئے آتا ہے۔ عید مناؤ کہ اس خونِ ناحق سے ہم دونوں کے گناہوں کی گٹھری خود بخود میرن کے سر پر چلی جائے گی! موت کی موت۔ کفارہ کا کفارہ اور انتقام کا انتقام ہے۔ ایسی موت تو قسمتوں سے ملتی ہے! یہ کہکر دونو بہنیں وضو کرتی ہیں۔ کفن کی جگہہ اُجلے کپڑے پہنتی ہیں۔ خاک شفا ملتی ہیں۔ دعائے توبہ پڑھتی ہیں پھر میرن کے قاصد سے کہتی ہیں کہ ہم دونوں اب تیار ہیں۔ بھیّا تم اپنا کام کرلو! قاصد ہچکچاتا ہے۔ یہ کہکر دونوں بہنیں ہاتھ پھیلا کر بہ آوازِ بلند دعا مانگتی ہیں۔ کہ خدایا اپنی گنہگار کنیزوں کی آواز سن! جس رکابی میں میرن آج کھا رہا ہے وہ رکابی تیری کنیزوں کی ہے۔ کنیزیں گنہگار ہیں تو تیری نہ کہ میرن کی! محسن کُش میرن کی سرکوبی کے لئے اپنے قہر کی بجلی بھیج اور اپنی کنیزوں کا انتقام لے! اس مناجات و فریاد کے بعد دونوں بہنیں قبلہ رو ہوتی ہیں۔ کلمہ پڑھتی ہیں خاک شفا کو بوسہ دیتی ہیں اور ایک کا ہاتھ ایک تھام کر بہ یک وقت دریا میں کود پڑتی ہیں!

کون کتنے پانی میں ہے؟ جس شب کو دریائی موجوں نے گھسیٹی بی بی اور آمنہ بیگم کو اپنی آغوش میں لیا اُسی شب کو تقریبًا تقریبًا تین سو کوس کے فاصلہ پر میرن اپنے مصاحبین خاص کے ساتھ دریا کے کنارے خیمہ زن ہے۔ شروع برسات ہے۔ بادل کی گرج اور موسلہ دھار پانی سے عاجز ہوکر ۱۱ بجے رات کو اپنے بڑے خیمہ سے ایک مختصر دلیر خانی خیمہ میں پناہ کے لئے

آتا ہے۔ اس چھوٹے خیمہ میں آکر میرن ابھی پلنگ پر لیٹ ہی رہا ہے کہ اتنے میں بجلی خیمہ کو چیرتی ہوئی آتی ہے اور اس کے سر پر گرتی ہے! اب دیکھا جاتا ہے تو پلنگ کے سرہانے پٹی جل کر راکھ ہوگئی ہے۔ مگر خود میرن کا جسم راکھ نہیں ہے۔ بلکہ سر میں چھ سوراخ اور پیٹھ پر چھ سات کوڑوں کے نشان ہیں!! اخفائے موت کے لئے یہ لاش صبح کو ہاتھی پر گشت کرائی جاتی ہے وہ اس طور پہ۔ کہ دونوں پاؤں ہودج سے باہر لٹک رہے ہیں تاکہ دیکھنے والے سمجھیں کہ میرن بیمار ہے اور سو رہا ہے۔ مگر دیکھنے والے فوراً سمجھ جاتے ہیں کہ یہ بیمار نہیں بلکہ مردہ ہے۔ اور یہ مردہ اسی کا ہے جس نے آج سے تین برس پہلے سراج الدولہ کی نعش صدپارہ ہاتھی پر گشت کرائی تھی۔ کیا خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ دے اُس ہاتھ لے!!

کون کتنے پانی میں ہے؟ میرن کا باپ میر جعفر خاں شاہ بنگالہ ۷۴، ۷۵ برس کا بڈھا بستر علالت پر پڑا ہے۔ جسم مبروص ہے۔ شعبان کی چودھویں سہ شنبہ کا دن ۱۱۷۸ھ ہے۔ آثار موت نمایاں ہیں۔ مہاراجہ نند کمار عیادت کو آیا ہوا ہے۔ معلوم ہوا۔ کہ نواح مرشد آباد میں کرت کونا مندر ہے اُس مندر میں دیوتاؤں پر جو جل چڑھایا جاتا ہے۔ آب حیات ہے۔ میر جعفر خاں حکم دیتا ہے کہ دیوتاؤں کا اُلش فوراً حاضر کیا جائے۔ مندر سے آبحیات آتا ہے۔ دیوتاؤں کا پانی میر جعفر خاں کی آخری پیاس بجھاتا ہے۔ آخری پیاس اس لئے کہ یہ آب حیات حلق سے اترتا ہے اور میر جعفر دریائے ممات میں غرق ہو جاتا ہے!!

اے خدا کی ہستی سے انکار کرنے والے! شیطان کے ریشہ دوانیوں کا اندازہ کرنا ہو تو ان اسناد و نظائر کو دیکھ لے۔ قیافہ شناس! ابلیس صورت دیکھکر سمجھ جاتا ہے۔ کہ **کون کتنے پانی میں ہے**؟ اور پھر جس کو جیسا پاتا ہے ویسی ہی رشوت دیتا ہے۔ کسی سے کہتا ہے۔ کہ تف ہے تمہاری صید افگنی پر کہ حافظ رحمت کی پارسائی اب تک شکار نہیں ہوئی۔ کسی سے کہتا ہے۔ کہ شاید تم نے مکڑیوں کا جال کبھی دیکھا نہیں۔ کہ مکڑیاں گھر بیٹھے کس طرح بادشاہت کرتی ہیں۔ پس جنازہ کے ساتھ گلاب باغ جانے سے کہیں بہتر یہ ہے

کہ جنازہ کے ساتھ جتنے لوگ ہیں اُنہیں کو اپنے پاس پکڑ بلاؤ۔ کسی سے کہتا ہے کہ خضر و سکندر کو شرمانا ہو تو کرت کو نامندر سے دیوتاؤں کا آلش منگوا کر پی لو۔ کسی سے کہتا ہے کہ بہشت شداد کی تمنا ہو تو علی وردی خاں شاد بنگالہ کی صاحبزادیوں اور نواسوں کے سینہ پر چڑھ کے بہشت کا دروازہ کھول لو۔ کسی سے کہتا ہے۔ کہ امیر المومنین کسی کا غلام نہیں ہے کہ نماز جمعہ پڑھانے کے لئے ہر آٹھویں دن مسجد میں دوڑا جائے۔ طلبی کے لئے اگر آدمی پہ آدمی آ رہا ہے تو کیوں نہیں تم اپنی محبوبہ کو اس وقت امامت کے لئے بھیج دیتے ہو

کہاں پھر جوانی کہاں پھر یہ جوشش ٭ عفور است ایزد تو ساغر بنوشش

کسی سے کہتا ہے کہ عشرہ محرم کا ڈراما موثر ہو نہیں سکتا جب تک یزید کا انتظام نہ کیا جائے۔ خبردار! یزید کی تلاش میں تم روپے کا مُنہ مت دیکھنا! دو ہزار میں بھی کوئی آدمی مل جائے تو غنیمت جاننا۔ کسی سے کہتا ہے۔ کہ بھائی ایک گھنٹہ کے لئے تفریحاً یزید بنجاتے میں آخر نقصان کیا ہے؟ ایمان میں خلل کیوں آنے لگا؟ کیا امام حسینؑ تم سے گلہ کرنے آئیں گے؟ ارے دو ہزار کی رقم اس وقت مُفت مل رہی ہے اس کو لے لے۔ بعد میں عاقبت سنوار لینا۔!

اللہ کے بندے جب شیطان کی رشوت قبول کر لینے کا تہیہ کرتے ہیں تو بالعموم اُن کی رسّی اور دراز کر دی جاتی ہے تاکہ اُسی ذریعہ سے اور لوگوں کی آزمایش ہو سکے۔ چنانچہ یزید نے جب شیطنت اختیار کر لی تو یزید کے ساتھ دیگر بندگانِ خدا کا بھی امتحان ہو گیا۔ یعنی ابلیس پرست شمر کی طرح ہزاروں لاکھوں نے یزید کا ساتھ دیا۔ لیکن خدا پرست حضرت حُرؑ کی طرح چند آدمیوں نے امام الصابرین کا ساتھ دیا۔ فوج ابلیس کو وقتی عروج اور فوج الٰہی کو وقتی زوال یقینی ہوا۔ مگر اسی عروج و زوال میں ایک بہت بڑا امتحان پنہاں تھا۔

اسپِ تازی شدہ مجروح بزیرِ پالان ٭ طوقِ زرّیں ہمہ در گردنِ خرمی بینم

دہرے اس طریقۂ امتحان سے ناواقف ہیں۔ اسلئے فوجِ الٰہی کی وقتی شکست کو دیکھکر فوراً خدا کی ہستی سے انکار کر دیتے ہیں اور انکار کی وجہ یہ پیش کرتے ہیں کہ اگر خدا موجود تھا تو اپنے

فدائیوں کی ذلت کیوں دیکھتا۔ رہا کلمہ گویوں کا جواب یہ ہے۔ کہ جس خدا نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو طمانچے کھانے کے لئے چھوڑ دیا تھا اُسی خدا نے امام الصابرین کو بھی ریگ تفتہ پر ذبح ہونے کے لئے مصلحتاً چھوڑ دیا تھا تاکہ فوج الہی کو شکست دیکھ کر ابلیس کے جھنڈے کے نیچے کون کون جاکر پناہ لیتا ہے!

(سید وصی احمد بلگرامی (فانی))
(ڈپٹی مجسٹریٹ بریلیہ ضلع مان بھوم)

(منقول از دسٹرکٹ گزٹ گونڈہ)

صلائے عام۔ دیر و حرم کا یہہ مضمون کئی حصوں میں دسٹرکٹ گزٹ گونڈہ کے "اقتباسات" میں شایع ہوا اور اس مین سناہے کہ علیگڈہ منتھلی سے لیا گیا تھا:
پورا مضمون بہت بڑا ہے۔ لیکن اس کی ضمنی سُرخی "کون کتنے پانی میں ہے"؟ صاحب مضمون نے جس خوبصورتی سے نبہائی یہہ انہیں کا حصّہ ہے: خوش بیانی کے سوا مضمون میں تاریخی معلومات کا اس قدر ذخیرہ ہے کہ اکثر اجزائے بیان کی تفصیل کے لئے علیحدہ علیحدہ ایک کتاب لکھی جاسکتی ہے: اس میں شک نہیں کہ اس مضمون کا طرز بیان خاص ہے۔ خاصکر "کون کتنے پانی میں ہے"؟ اس کو حضرت مضمون نگار نے کمال فصاحت سے نبا[ہا]!:

ہماری زبان میں لیسے ذی کمال لکھنے والوں کی بہت ضرورت ہے۔ اور یہی وجہہ ہے کہ یہہ مضمون صلائے عام میں نقل کیا جاتا ہے۔ جس سے ثابت ہے کہ اُردو میں اوائے بیان کے کتنے اچھے اچھے ذرایع ہیں:

صلائے عام۔ ماہِ دسمبر ۱۹۳۴ء کی تنقید

× × × × × × × × × × × × ×

ان دنوں کچھ افکار اور کچھ تن درستی نے ایسا ستایا کہ خلافِ معمول رسالہ ... صلائے عام بابت ماہِ دسمبر کے بالاستعاب دیکھنے کی اب نوبت آئی ہے۔ جنوری کا رسالہ ابھی دیکھنا باقی ہے اور فروری بھی اسی لیت ولعل میں قریب الختم ہے۔ ؎

صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے ؛ عمر یونہیں تمام ہوتی ہے

میرے محترم بزرگ نواب محمد علی خاں صاحب نے بمصداق "سرود بہ مستاں یاد دہانیدن" "نظم ونثر" کے تقابل کی اچھی سرسری چھیڑ دی۔ صاحب موصوف سے بہتر اس مسئلہ کو کون سلجھا سکتا ہے ؎ رام کرے کہیں نیناں نہ اٹکیں، دا لجھیں تو سلجھائے نہ سلجھیں

اس مضمون کے مراتبِ ابتدائی میں خاکسار کو بھی ع ہم بھی ہیں پانچویں سواروں میں۔ کے زمرے میں داخل کیا ہے۔ یہ تو ان کا حسنِ ظن اور محض قدر افزائی ہے ورنہ میں تو اپنے حساب یہ سمجھتا ہوں کہ ع او خویشتن گم است کرا رہبری کند۔ بہر حال میں باتباعِ حکم۔ اس مضمون پر دیر سویر کچھ نہ کچھ لکھوں گا ضرور۔ دیر آید درست آید۔

بیاضِ خطوطِ شہزادہ مراد بخش ایک نادر اور نایاب تحفہ ہے۔ خان بہادر ایک جھلک دکھا کر خاموش نہ ہو جائیں۔ اس کا ایک ایک لفظ چھاپیں، ضرور چھاپیں اور جلد چھاپیں۔ شائقین چشم براہ ہیں + مزیل الاغلاط والا مضمون بھی نہایت غور اور توجہ کے قابل ہے جناب محمد جمشید علی خان صاحب اتنی مہربانی اور فرمائیں کہ لغت اور ماخذ کا حوالہ بھی دیں کیونکہ غلط العام کی تصحیح بدون اس صراحت کے قابلِ توثیق نہیں فقط

خاکسار بشیر

(مولوی البشیر الدین احمد رئیس دہلی)

سلونو کا تیوہار

سلاطین مغلیہ کے زمانہ میں اسلام کی تقریبوں کی طرح اہل ہنود کے تیوہاروں کے ماننے کا کم بیش رواج تھا۔ ہولی۔ دیوالی۔ دسہرہ۔ سلونو وغیرہ کے تیوہار شاہی محلات میں اکثر دھوم سے منائے جاتے تھے: بلکہ سلونو کی نسبت ایک واقعہ ایسا سننے میں آیا ہے جس کا تعلق تاریخ سے معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ تیوہار باضابطہ منایا جاتا تھا؛ ثبوت میں اس کا ذکر میں کتاب "بزم آخر"[1] سے یہاں نقل کرتا ہوں جو منشی فیض الدین صاحب نے لکھی ہے؛ اس مضمون سے غرض یہ ہے کہ یہ واقعہ کسی تاریخ میں ہو تو اس کا پتہ مجھے دریافت کرنا منظور ہے کہ از روئے تحقیق اس کی پوری حقیقت معلوم ہو جائے +

"اس رسم کا ذکر یوں سنا ہے کہ عزیز الدین عالمگیر ثانی بادشاہ سے اُن کے وزیر غازی الدین خاں کو دشمنی تھی۔ ایک دن ایک ڈھکوسلا بنا کر عرض کیا کہ حضور پرانے کوٹلے میں ایک فقیر صاحب کمال آئے ہیں۔ بادشاہ نے حکم دیا اچھا بلاؤ۔ اُس نے کہا بہت خوب۔ دوسرے دن پرانے کوٹلے میں ایک موقع کا مکان تجویز کر دو آدمی خنجر لیکر وہاں چھپوا کھڑے کر دئے اور بادشاہ سے جھوٹ موٹ آکر عرض کیا کہ کرامات فقیر صاحب کہتے ہیں۔ ہم آپ بادشاہ ہیں۔ بادشاہ کو غرض ہے تو آپ ہمارے پاس چلے آئیں۔ بادشاہ کو فقیروں سے بہت اعتقاد تھا۔ فرمایا ہم آپ چلتے ہیں۔ جب کوٹلے میں پہنچے وزیر نے عرض کیا جہاں پناہ! فقیر صاحب یہ بھیڑ بھاڑ دیکھ کر ناراض ہوں گے۔ بادشاہ نے حکم دیا اچھا سب یہیں ٹھیریں بادشاہ تن تنہا وزیر کے ساتھ اندر گئے۔ جاتے ہی اُن دونوں نابکاروں نے بادشاہ کے خنجریں

[1] بزم آخر۔ مصنفہ منشی فیض الدین صاحب مطبوعہ مطبع ارمغان دہلی واقع ترکمان دروازہ۔ صفہ ۷۳۔ ۷۵ +

بھونک دیں اور کام تمام کر کے لاش کو دریا کی طرف نیچے پھینک دیا۔ آپ وہاں سے جھپٹ
بنے۔ وزیر یا جو آیا۔ لوگوں نے پوچھا حضور کہاں ہیں؟ کہا فقیر صاحب پاس بیٹھے ہیں۔ مجھے
جواب گاہ میں سے ایک کاغذ منگوایا ہے وہ لینے جاتا ہوں۔ تم سب یہیں کھڑے رہو میں
ابھی اُلٹے پاؤں آتا ہوں۔ یہہ فقرہ کہہ کر یہ بھی وہاں سے سٹک گیا۔ اِدھر دریا کی طرف سے کوئی
ہندنی چلی آتی تھی کہیں اُس کی نگاہ پڑی کہ کسی کی لاش پڑی ہے۔ پاس آ کر دیکھا تو پہچانا کہ ارے
یہ تو ہمارے بادشاہ ہیں۔ ہے ہے کس ظالم نے یہہ کام کیا؟ وہیں بیٹھ گئی۔ جب دیر ہو گئی
تو یہہ لوگ گھبرائے اور درآنہ اندر گھس گئے وہاں دیکھیں تو بادشاہ نہ فقیر۔ اِدھر اُدھر دیکھنے
بھالنے لگے نیچے جھک کر جو دیکھیں تو بادشاہ قتل ہوئے پڑے ہیں ایک ہندنی پاس بیٹھی لاش کی
نگہبانی کر رہی ہے۔ لاش کو اُٹھا کر لائے۔ نہلا دُھلا ہمایوں کے مقبرہ میں دفن کیا۔ شاہ عالم
بادشاہ نے اُس ہندنی کی اس خیر خواہی پر کہ اس نے میرے باپ کی لاش کی رکھوالی کی اُس کو
اپنی بہن بنایا اور بہت سا کچھ اُس کو دیا۔ بہنوں کی طرح ساری رسمیں اُس سے برتتے رہے
وہ بھی بھائی سمجھ کر اپنی رسم کے موافق سلونوں کے تیوہار کو بہت سی مٹھائی تھالوں میں لیکر آتی تھی اور
بادشاہ کے ہاتھ میں سچے موتیوں کی راکھی باندھ دیتی تھی۔ بادشاہ اُس کو روپے اور اشرفیاں
دیتے تھے۔ شاہ عالم کے بعد اکبر شاہ نے اُس سے اور بہادر شاہ نے اُس کی اولاد
سے یہ رسم نباہی"۔

(منقول از بزم آخر مطبوعہ مطبع ارمغانِ دہلی مصنفہ منشی فیض الدین)

ریویو (صلائے عام - ماہ جنوری ۱۹۲۵ء)

یہ تو ظاہر ہے کہ ریویو کرنے والا معمولاً نشانہ آماج ہونے کا اندیشہ اپنے احباب میں ضرور
رکھتا ہے اور اُس کا قلم حرف چینی کرتے ہوئے لرزتا چلتا ہے مگر یہ خوبی و لطف اُن احباب کا بالیقین

جو تنقید سے بہرہ مند ہوتے ہیں اور کسی قسم کے سقم یا غلطی نکلنے سے کبیدہ خاطر کو کبھی بھی دخل نہیں دیتے بلکہ حق پسند خوش ہوتے ہیں اور نقاد کے احسان مند ہوتے ہیں کیوں کہ غلطی کا رفع ہونا صحت کی علامت ہے۔

اس قدر تمہیدی کلمہ کے بعد میں احباب کی خدمت میں یہہ عرض کرونگا کہ اگر میرا قلم زیر و زبر سے کہیں جائے تو مجھے معافی بخشیں گے۔ مجھسے خاص طور پر فرمایش ہوئی ہے کہ میں ریویو صلائے عام پر لکھوں۔ مگر جن صاحب نے یہہ فرمایش کی ہے اُن کو ذرا بھی یہہ علم نہیں کہ مجھ میں کھوٹے کھرے کی تمیز نہیں پس میری پرکھ کساد بازاری کی قیمت سے زیادہ نہیں ہو سکتی میں اپنا سکہ کیسے جما سکتا ہوں مگر بقول حضرت جامی رحمۃ اللہ علیہ ع از صاف و دُرد پیش آر آنچہ داری - ماہ جنوری کے صلائے عام کو غور سے پڑھکر حسب ذیل التماس کرتا ہوں :-

پیرایۂ آغاز - بار بار کا یہ کہنا عبث ہے کہ خان بہادر نے مضمون میں لطف دلکش پیدا کرنے کا مادہ قدرت سے پایا ہے اگر اکتسابی ہوتا تو اور بھی بہت سے نثار ایسی دلفریبیاں کر ڈالتے۔ نظم و نثر کے لحاظ سے جو فقرات درج ہیں وہ بالکل ایسے ہیں جیسے کہا کرتے ہیں کہ "میرے دونو میٹھے" او خدا جانے کہاں سے ڈھونڈھکر یہ شعر نکالا ہے کہ ؎

کچھ عشق میں مجنوں ہی سوا ہے نہ تو فرہاد * لیلےٰ ہی نہ چھوٹی ہے نہ شیریں ہی بڑی ہے۔

مگر اس پر بھی خود بدولت کو نثر ہی پسند ہے اور یہ حق بجانب ہے *

آغاز سال کے مضمون میں کیا برجستہ فقرہ ہمارے خان بہادر لکھتے ہیں کہ "رسالوں اور اخباروں کو آپ زمانۂ حال کی سوانح عمری سمجھیں"۔ یہہ بالکل حسب حال اور سچا خیال ہے اور ترقی زبان کے واسطے واقعی بہترین تدبیر یہی ہے جو خان بہادر صاحب نے بالآخر تحریر یائی ہے کہ "آپ اپنی زبان کے رسالوں اور اخباروں کو ان کے اخراجات کی زیر باری سے مستغنی کر دیں" اس فقرہ میں اپنی زبان اور زیر باری دونوں اہم اور قابل توجہ خاص الفاظ ہیں اور ایسے برجستہ ہیں کہ کسی تفسیر و تشریح کی حاجت نہیں۔ ع حاجت مشاطہ نیست روے دلارام را *

امنیتہا الفتیان - اس مضمون میں باہمی سلوک ہمدردی اور مسافر نوازی کا کمال دکھلا

گیا ہے اور جناب خان صاحب مرزا محمد علی صاحب رئیس دہلی کا ہم کو احسان مند ہونا چاہئے کہ ایسے مضامین سے سب کی اور بالخصوص اہلِ اسلام کی ہمت بڑھتی ہے اور جوشِ اخوت پیدا ہوتا ہے۔ مجھے اس میں تو تامل ہے کہ عیسائیوں کی مذہبی سرگرمیاں دیکھکر ان نوجوان مجاہدین نے اپنے کو خاص کر لیا ہوگا جیسا کہ مرزا صاحب فرماتے ہیں میرا یقین یہ ہے کہ یہ اخوت کا پیدا کرنا۔ سب کو بھائی بھائی بنا کر اپنا کر لینا اور ہر طرح سے انسانی ہمدردی کرنا ہمارے حضرت پیغمبر آخرالزماں کے خاص کے صدقہ میں تھا اور ہے اور تا قیامت باقی رہے گا۔ یہ مضمون ایسا پاکیزہ اور نفع بخش عام ہے کہ میں یہ التماس کروں گا (شافی مطلق مرزا صاحب موصوف کو صحت کلی عطا فرمائے) کہ وہ اس سلسلۂ مضمون کو جاری رکھیں ؛

قطعہ از جناب نواب صاحب بہادر لوہارو۔ نواب صاحب کے کلام کی داد میں پہلے بھی چند بار دے چکا ہوں۔ پس یہ کوئی نئی بات نہیں جو اس قطعہ کی خوبیان بیان نکروں۔ اردو میں یہ قطعہ میرے نزدیک اس خوبی کے ساتھ اوّل ہی اول نظر آیا ہے ؛ کتنی لاجواب حکایت مےخانہ کی بیان کی ہے کہ جی لوٹا جاتا ہے۔ صراحی و ساغر کے سوال وجواب اور ساقی کی جھلک دکھا کر نہایت عبرت خیز اور حیرت انگیز نتیجہ یہ نکالا ہے کہ ”احسان جو جتائے نہیں ہے وہ آدمی“۔ یہ بالکل امرِ حق ہے کہ ”نیکی کن و بدریا انداز“۔ صلائے عام نے اس قطعہ کی بڑی خوبی سے داد دی ہے اور یہ کلام واقعی بہت کچھ قابلِ داد ہے

شور صاحب کی مثنوی۔ خان بہادر صاحب نے اس مثنوی کے متعلق جو شور مچایا ہے وہ دہلی کے واقعات پر ہے۔ دنیا تو شور کو شیریں نہیں کہہ سکتی۔ اردوے معلےٰ کے دربار سے اجرائے سند کا محکمہ جب ٹوٹ گیا تو پھر زبان کی سند نہیں مل سکتی۔ دہلی خدا جانے کتنی بار دہلی اور زبان بھی وہ نہ رہی۔ مگر پھر بھی زبان کا مدرسہ تو دہلی ہی ہے سند چاہے جاری ہو یا نہ ہو ؛

غزل جناب مائل دہلوی۔ سارے شعر لاجواب ہیں مگر سب سے لاجواب یہ ہے کہ

مصحفِ رُخ کو دیکھکر جانا ؛ بت بھی اہلِ کتاب ہوتے ہیں ؛

قناعت۔ خان بہادر پیرزادہ متخلص بہ **عارف** نے خوب اس آیت کی تفسیر فرمائی ہے

موازنۂ نظم و نثر

(از جناب مرزا محمد علیخان صاحب رئیس دہلی)

ہمارے مخدوم جناب مرزا عرفان علی بیگ صاحب نے نظم و نثر کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اب اس سے زیادہ عمدہ لکھے جانے کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ اوّل مضمون میں ترازو اور اناج کی مثال سے خوب کام لیا ہے۔ نظم و نثر کے دونو پڑلے برابر بھی کر کے دکھلا دئے اور جو باریک فرق نظم و نثر کا ہے وہ بھی واضح طور سے دکھلا دیا۔ اور دوسرے مضمون میں تو کرامت دکھلائی ہے اُسکی تو تعریف ہی نہیں ہو سکتی۔ اس خوبی سے نظم و نثر کی تمام خوبیاں اور خرابیاں بیان فرمائی ہیں کہ نظم و نثر لکھنے والے اگر اس کو اپنا دستور العمل قرار دیکر نظم و نثر لکھیں گے تو ان کی مشکلات میں بہت آسانی پیدا ہو جاوے گی۔ مرزا صاحب نے کوئی بات اُٹھا نہیں رکھی۔ ہر پہلو پر روشنی ڈالی ہے۔ بظاہر اس سے بہتر کوئی کیا لکھ سکے گا۔ بہت ہوا تو ان ہی الفاظ کے الٹ پھیر ہوگی۔ خلاصہ یہ کہ ضرورت تھی وہ تو پوری ہو چکی ہے آئندہ جو کچھ لکھا جائے گا۔ ممکن ہے کہ زیادہ وہ اس فن میں معلومات کا ذریعہ ہو۔ میں نے بھی اس کے متعلق کچھ لکھا تھا مگر مرزا صاحب کی تحریر دیکھ کر جو لکھا تھا ردّی کی ٹوکری میں ڈالدیا۔ کہ مونہہ چڑا لنے سے فائدہ کیا۔

اجتناب

مرزا عرفان علی بیگ صاحب نے مینخواری کی مذمت میں ایک معقول مضمون

لکھا ہے

لکھ کر بھیجا ہے جس کے اخیر میں "اجتناب نشہ" کے عنوان سے یہ عبارت لکھی ہے :-

× × × × × × × × × × × × × × × ×

"اسلام نے ہمیں شروع ہی سے نشہ سے اجتناب کا حکم دیا ہے ۔ یہاں تک کہ منشی اشیاء کا مرکب کرنا دوا کے واسطے بھی روا نہیں ؛ کیوں کہ جب نشہ بازوں کو یہ بہانہ ہاتھ لگیگا تو پھر نشہ کا ترک کرنا معلوم ۔ اور اس کی نگرانی کسی معقول انتظام سے نہیں ہو سکتی البتہ جو ایمان والے ہیں وہ تو نشہ کے پاس بھی نہ پھٹکیں گے ۔ میری ذاتی رائے غیر اسلام والوں کو اور ان کے لئے جو حضرت پیغمبر آخر الزماں کے احکام کو (جن کو انہوں نے وحی آسمانی سے پایا تھا) نہیں مانتے کہ (۱) وہ امتناعی حکم الٰہی کی تعمیل کریں (۲) بادیان قوم ممانعت کے وعظ کہنا اپنا فرض سمجھیں (۳) گورنمنٹ ملک میں قانونِ ممانعت بڑی سخت سزا کے ساتھ نافذ فرماوے اور (۴) مضامین مختلف زبانوں میں نفرت دلانے والے ارزانی کے ساتھ شایع کئے جاویں ۔

جو تدابیر کہ امریکہ و دیگر ممالک میں کی گئی ہیں وہ ان سے خاص قومی واسطہ رکھتی ہیں ملک ہند چونکہ مجموعہ آبادی مختلف اقوام اور مختلف اقسام انسانی کا ہے ۔ وہ یہاں کارآمد اور اثر پذیر نہیں ہو سکتیں اور انہوں نے میعاد اپنے یہاں منشی اشیاء کے استعمال سے متروک ہوجانے کی قرار دے رکھی ہے وہ محض خواب و خیال ہے ۔

یہ تو البتہ امکان میں ہے کہ خاص خاص فرقے اپنے اپنے طرز پر ترک استعمال کرائیں مگر خالی پند و نصایح اور وعظ تو کارگر ہوتے ہرگز نظر نہیں آتے ۔

مجھ کو جناب ریورنڈ ہربرٹ انڈرسن صاحب کی تجاویز سے جو انہوں نے ملک کی بہی خواہی میں سوچی ہیں کلیتاً اتفاق نہیں ہے فقط ۔"

. . . .

لب لباب تو اسی قدر ہے جو عرض کر دیا گیا اور مضمون تو طول ہے ۔ کیا میں یہ امید کروں کہ

ناظرین اہلِ اسلام میری رائے زنی پر اپنے خیالات کا قوم کی بہتری کی نظر سے اظہار فرماویں گے فقط۔

عرفان علی۔ از آگرہ

صلائے عام - یہ مسئلہ لٹ کے جائز اور ناجائز ہونے کا اتنا پرانا ہے کہ اس میں ایک حرف گھٹانے بڑھانے کی گنجائش نہیں ؎

کفارۂ شراب خوری ہائے بے حساب
ہشیار در میانۂ مستاں نشستن است

دیوانِ بشیر

جناب مولوی بشیر الدین احمد صاحب المتخلص بہ بشیر رئیس دہلی کا دیوان نہایت تکلف سے چھپا ہے۔ مولوی صاحب کو نظم و نثر میں کمال حاصل ہے۔ میرے ذہن میں تھا کہ جن کو نثر میں دخل ہے وہ نظم میں پیچھے رہ جاتے ہیں۔ برخلاف اس کے مولوی صاحب نے دونوں میں کمال دکھا دیا۔ نثر میں آپ **صلائے عام** میں بہت پاکیزہ مضامین لکھا کرتے ہیں۔ دیوان اس بات کے ثبوت میں ہے کہ نظم میں بھی آپ کو ید طولےٰ حاصل ہے اور اصنافِ سخن میں شعر کہتے ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ شعر گوئی کی مجھ میں لیاقت نہیں۔ میری داد **صائب** کی "تحسین ناشناس" میں داخل ہے۔ کلام نظم کی داد اہلِ فن کو زیبا دیتی ہے نہ مجھ جیسے بیگانہ شخص کو جو نظم کے گلی کوچوں سے واقف نہیں۔ اس لئے اور اصحاب ذی کمال نے آپ کی شاعری کی تعریف میں جو کچھ لکھا ہے اُس پر میں صاد کئے دیتا ہوں۔

ہندوستان کی آئندہ طب

گذشتہ بیس سال طب قوم کی خدمت میں مشغول رہنے کی وجہ سے میں اس نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ اس ملک کے لئے فی زمانہ ویدک۔ یونانی اور ڈاکٹری علاج ایک دوسرے کے محتاج ہیں۔ لہذا طب قدیم کے بیش بہا مشاہدات کے ساتھ طب جدید کی مفید معلومات کو شامل کر کے علاج کرنے میں مجھے نہایت کامیابی ہوتی ہے۔ اس طریقۂ علاج کا نام میں نے **نوویدک** رکھا ہے اور میرے خیال میں ہند کی آئندہ یہی طب ہوگی۔

نوویدک طریقہ علاج جسقدر سریع التاثیر ہے اُسی قدر اہل ہند کے مزاج کے موافق ہے اور خوبی یہہ ہے کہ نسبتاً ارزاں ہے۔ چنانچہ ہر مرض کا علاج خواہ وہ کیسا ہی پیچیدہ یا کہنہ کیوں نہ ہو عموماً صرف دو روپیہ ہفتہ خرچ ہو سکتا ہے۔ **نوویدک** کے مرکبات زیادہ تر ست وجوہر کی شکل میں ہیں جو کہ بآسانی بذریعہ ڈاک روانہ ہو سکتی ہیں۔ علاوہ بریں مریض کو خورد و نوش میں بالکل دقت نہیں ہوتی۔

نوویدک طریقہ علاج چونکہ بہت مفید ثابت ہوا ہے اسلئے رفاہ عام کی خاطر اس کو مشتہر کرنا میں اپنا عین فرض سمجھتا ہوں۔ خط ہر زبان میں صاف تحریر ہو کر معہ جوابی ٹکٹ آنے چاہئیں۔

المشتہر

ڈاکٹر بی۔ کے۔ متر۔ ایل۔ ایچ۔ ایس۔ دہلی۔

(سابق پرنسپل طبیہ کالج۔ دہلی۔ ورشی کل آیرویدک کالج۔ ہردوار)

صلائے عام۔ یہہ مختصر مضمون بطور اشتہار کے ہے۔ مشتہر صاحب سے میں واقف ہوں اور واقفیت کی وجہ یہہ ہے کہ میرے اور متعلقین کے معالج عرصہ سے یہی ہیں اور ہمیشہ ان کے علاج سے فائدہ ہوا ہے۔ رہا یہ مسئلہ کہ ہندوستان میں آئندہ علاج معالجہ کا کیا ڈھنگ ہوگا؟ اس میں اس فن کے ذی کمال فیصلہ کریں۔ اگر میں کچھ لکھوں بھی تو علیحدہ مضامین کی ضرورت ہے ؛

پردہ

اسلام اور پردہ

پردہ کے متعلق مدت سے مباحثے ہوتے چلے آتے ہیں کوئی فرقہ مخالف ہے کوئی موافق ہے اور کوئی تذبذب میں پڑا ہوا ہے۔ ہمکو کسی اور قوم سے ہرگز بحث نہیں ہے محض اسلام کے متعلق کچھ لکھنا مناسب سمجھتے ہیں۔ ہم کو اس محل پر عقلی دلائل سے ہرگز واسطہ نہیں ہے اور اس وجہہ سے نہیں ہے کہ جملہ موقعے اور محل پردہ اور بے پردہ ہونے کے جُدا گانہ طرز رکھتے ہیں اور ایسے عقلی دلائل اپنے اپنے محل پر ضرور صادق آتے ہیں مگر یہہ ظاہر ہے کہ جس طرح سے ایک قانون کسی خاص امر کے کرنے یا نکرنے پر اُن لوگوں کو جو پابند قانون ہیں مجبور کر دیتا ہے اُسی طرح سے ہر مذہب اپنے حکم کو ہر پابند مذہب کے واسطے لازم کر دیتا ہے نہ تو قانون میں اگر مگر کی گنجایش ہوتی ہے اور نہ مذہب اگر مگر کو کبھی جائز رکھتا ہے۔ ہر انسان اگر وہ مذہب کا پابند ہے تو اس کو مذہبی احکام کی تعمیل کرنا بھی لازم ہوتی ہے۔

وجہہ تحریر مضمون

قبل ازیں کہ ہم اس مباحثہ پر قلم اُٹھاویں اس کی وجہہ ظاہر کر دینا مناسب جانتے ہیں کہ ہم کو اس مضمون کے لکھنے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ اِس زمانہ میں زنانہ اسکول اور کالج کا رواج ہو گیا ہے اور وہ ترقی کرتا جاتا ہے اور جس طرح سے کہ لڑکوں کی تعلیم کے لحاظ سے ذات پانت نہیں پوچھی جاتی ہر قوم کا لڑکا حق رکھتا ہے کہ وہ چاہے جس درس گاہ میں داخل ہو جاوے۔ بشرطیکہ ایسی درس گاہ کو کسی ذات و مذہب واحد سے تخصیص نہو۔ اُسی طرح سے لڑکیاں بھی زنانہ اسکول اور کالجوں میں تعلیم پانے کی مستحق سمجھی جاتی ہیں۔ لیکن لڑکوں کی جماعت میں وہ تخصیص نہیں ہو سکتی جو لڑکیوں کی جماعت سے واسطہ و سروکار رکھتی ہے۔ یعنی لڑکوں کے واسطے یہ امکانی صورت بالیقین ہے کہ وہ وہ پوشاک اختیار کریں جو اہل درس و تدریس کو منظور ہو۔

اور اکثر رواج اسی کا ہو گیا ہے کہ سب لڑکے ایک وضع میں نظر آویں۔ مگر لڑکیوں کے واسطے پابندی اُن کے رسم و رواج خاندانی اور مذہبی لازم ہے۔ ہم کو ایسی لڑکیوں کی وضع سے سروکار ہرگز نہیں ہے جو اپنی وضع کو ترک کرنا گوارا خود کرتی ہوں یا اُن کے والدین پابندی وضع سے کچھ سروکار نہ رکھتے ہوں۔

چند ہی روز ہوئے ایک زنانہ کالج سے یہہ شکایت میرے گوش زد ہوئی کہ مسلمان لڑکیاں برقع پہن کر کلاس میں آتی ہیں اور کھیل تماشوں میں شریک نہیں ہوتیں۔ اس سے دو باتیں قابلِ اعتراض پیدا ہوتی ہیں۔ اوّل تو جب سب لڑکیاں ایک وضع میں ہیں تو ان برقع پوشوں سے جماعت بدنما ہوتی ہے دوسرے کھیل تماشوں میں شریک نہ ہونے سے ان کی تندرستی میں فرق آتا ہے فقط۔ ایک چھٹی بھی میرے نام ایک اعلیٰ خاتون وافسر کالج نے کچھ اسی قسم کی بھیجی میں نے اُس کا جواب مودبانہ اور رہنمایانہ دیا جس کو میں آگے چلکر اس مضمون کے پیرایہ میں ظاہر کرونگا۔

کچھ اس چٹھی پر ہی قناعت نہ تھی بلکہ ایک لیڈی صاحبہ خود بھی غریب خانہ پر تشریف لائیں اور مجھسے اُنہوں نے اپنے خیالات کا ازبس خوبی سے اظہار فرمایا۔ مجھسے جو جواب ان کو ملے اُن کا خاتمہ میری جانب سے مذہبی پیرایہ میں تھا اور اس پر اُن کا سکوت تھا۔

متذکرہ بالا چٹھی اور جناب لیڈی صاحبہ کی تشریف آوری نے بھی اطمینان نہیں دیا بالآخر ایک ماہواری انگریزی رسالہ میں ردوبدل الفاظ کے ساتھ اس برقع کو بھاری ٹوپی کے ساتھ اور بڑی بیماری غلطی کو منسوب کیا۔

یہہ وجہہ ہے کہ مجھے پردہ پر مضمون لکھنے کی ضرورت پیش آئی۔

بعض نوجوان مسلمان اور آزادی

ہم یہہ تو نہیں کہتے کہ سب مسلمان پردہ کے رکھنے یا اُٹھا دینے میں ہم خیال ہیں کیوں کہ یہہ علانیہ ناممکن ہے مگر بعض اشخاص جنہوں نے زمانہ حال میں آزادی سے قدم بڑھایا ہے وہ ہم جیسے دیرینہ انسانوں کو گیا گزرا سمجھ چکے ہیں اور پردہ کو بے حقیقت سمجھتے ہیں ایک میرے دوست ایم۔ اسے نے بھی لیڈی صاحبہ کے دلائل سے اتفاق کیا تھا لیکن

اُن کے دلائل اُن لوگوں کے سے ہیں جو کسی کو بد نظری نہیں دیکھتے بلکہ ہر شخص کو نیک طینت جانتے ہیں اور کسی پر بدگمانی کا اندیشہ تک نہیں کرتے اور امر حق یہی ہے کہ اگر سب نیک ہی نیک ہوجاویں تو بد تو درکنار بدی کا نام و نشان ہی دُنیا کے پردہ سے اُٹھ جاوے۔

ایک خاتون کا پردہ پر اعتراض

اس موقع پر میں ایک اور خاتون کا اعتراض لکھ دینا بھی مناسب جانتا ہوں اور وہ اس وجہہ سے کہ ناظرین کو یہہ واضح ہوجاوے گا کہ ع پائے استدلالیاں چوبیں بود۔ اُنہوں نے بھری محفل میں ایک بُرقع والی سے یہہ سوال کیا کہ آپ تو خدا کے فضل سے بہت خوب صورت ہو پھر یہہ برقع کیوں لادتی ہو۔ بدصورتوں کو البتہ مُنہ چھپانا چاہئے۔ افسوس اس کا ہے کہ ایسے اعتراض جمانے والوں کو خود اپنے تن بدن کی خبر نہیں کہ قدرت نے تو ننگا ہی پیدا کیا تھا مگر پیدا ہوتے ہی یا تو بدنمائی کے سبب سے یا نظر سے بچنے کے لئے سارا بدن کپڑوں سے لپیٹ لیا۔ اگر بقول ان پردہ دروں کے ننگے ہی خوب صورت لگتے تو کپڑے کیوں پہنتے۔ اور شرم و حیا اور تہذیب کو ہوا بتاتے۔

مگر ہم کو عقلی دلائل سے واسطہ نہیں محض تذکرتاً ایک اعتراض لکھ دیا گیا۔ مذہبی دلائل بھی ہمہ تن عقل کا انتہا ہیں لیکن اُن کو مذہب سے تطابق کرنے سے مضمون ازبس طولانی

نص قرآنی پردہ پر

سب سے پہلے پردہ کے متعلق جو آیت نازل ہوئی وہ سورہ احزاب پارہ ومن یقنت نمبر ۲۲ رکوع ہفتم میں یہ ہے وَاِذَا سَاَلْتُمُوْهُنَّ مَتَاعًا فَسْئَلُوْهُنَّ مِنْ وَّرَاۗءِ حِجَابٍ حضرت عیسٰے علیہ السلام کے اُمت والے تو اس پر بھی بغیر اعتراض کئے نہیں رہتے اور اس حکم کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتی اغراض پر حوالہ کرتے ہیں حالاں کہ جو احکام الہٰی ہمارے حضرت پر تہذیب اخلاق کے متعلق نازل ہوئے اس کی تعمیل تمام اُمت محمدی پر لازم ہو چکی۔ یہہ تو صاف ظاہر ہے کہ جو ہدایت اخلاق انسانی سے واسطہ رکھتی ہے وہ بالیقین تمام انسانوں سے متعلق ہے نہ کہ خاص ایک بشر یا پیغمبر سے ہمارے حضرت کے زمانہ میں عرب بالکل جہالت و گمراہی میں ڈوبا ہوا تھا اُس زمانہ میں تہذیب بالائے طاق وحشت و بد اخلاقی جابجا پھیلی ہوئی

تھی مردوں میں کوئی لحاظ و پاس عورتوں کی عزّت و حرمت کا بھی باقی نہ تھا چنانچہ کھانے پینے میں بھی بے حد بے باک تھے اگر کوئی دعوتِ طعام دیتا تو بے تکلف اُس کے گھر میں گھس پڑتے تھے اور چھینا جھپٹی مچا دیتے تھے۔ خود ہمارے حضرت جب دعوت دیتے تو اُن کے گھر میں بھی اسی طرح کی بے تمیزیاں کرتے تھے۔ تب آنحضرت پر وحی نازل ہوئی اور جو آیت اس محل پر ہے وہ بہت بڑی ہے جس کا ایک جز سطور ماقبل میں لکھدیا گیا اور اس کا مطلب تمام تر یہہ ہے کہ" اے مومنو جب تک تم کو اذن نہ ملے کہ کھانا کھانے اندر جاؤ تم پیغمبر کے گھر میں بلا انتظار تیاری طعام مت گھسو۔ مگر جب تمہیں اذن مل جاوے تو اندر جاؤ اور کھانا کھانے کے بعد کچھ گفت و شنید کی غرض سے مت ٹھیرو بلکہ باہر چلے جاؤ۔ کیوں کہ پیغمبر کو تمہاری ایسی پیش قدمی سے ایذا ہو تحتی ہے لیکن وہ اُس کا متحمل ہوتا ہے اور اللہ تعالےٰ حق کو برداشت فرماتا ہے۔ اگر تم کو کسی چیز کے مانگنے کی ضرورت ہے تو مستورات سے پردہ کی آڑ سے مانگ لو اس میں تمہارے دلوں کی بڑی صفائی ہے۔ اور مستورات کے دلوں کی پاکی ہے۔ اور یہہ تمہیں زیبا نہیں ہے کہ خدا کے رسول کو دُکھ دو" مذکورہ بالا آیت سے صاف ظاہر ہے کہ پردہ لازم ہے۔ اور تمامی امتِ رسول مقبول پر اس کی تعمیل فرض ہے

چادر لٹکا کر ستر پوشی پر دوسری آیت قرآن

اسی سورۃ میں آگے چل کر آٹھویں رکوع میں پہلی ہی آیت میں چادر لٹکانے کا حکم عورتوں کے واسطے نازل ہوا ہے۔ جس کا مقصد یہہ ہے کہ وہ اپنے چہرہ کو ڈہانکے رکھیں۔ مُدّعا تو صرف چہرہ کا ڈہانکنا ہے اور اسی غرض سے چادر۔ گھونگھٹ۔ نقاب برقع وغیرہ اقسام ایجاد کئے گئے ہیں جن کا میل اور جن کی موزونی طرز اور وضع پوشاک مستعملہ پر موقوف ہے وہ آیت یہہ ہے یٰاَیُّھَا النَّبِیُّ قُلْ لِاَزْوَاجِکَ وَبَنٰتِکَ وَنِسَاۤءِ الْمُؤْمِنِیْنَ یُدْنِیْنَ عَلَیْھِنَّ مِنْ جَلَابِیْبِھِنَّ ذٰلِکَ اَدْنٰۤی اَنْ یُّعْرَفْنَ فَلَا یُؤْذَیْنَ وَکَانَ اللّٰہُ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا ٥ اس کا مطلب یہہ ہے کہ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے کہ اے نبی اپنی بی بیوں سے بیٹیوں سے اور مسلمان عورتوں سے کہہ دو کہ وہ اپنی چادروں کو ذرا نیچی لٹکا لیویں تاکہ اُس سے وہ پہچانی پڑیں اور کوئی ان کو نہ ستاوے

اور اللہ مہربان اور بخشنے والا ہے۔

گھونگھٹ | واضح رہے کہ یہ پہچان اُن بی بیوں کے واسطے اللہ تعالےٰ نے رکھی ہے جو صاحب عصمت و عفت ہیں اور جن کو اپنے ننگ و ناموس کا خیال ہے۔ یہ گھونگھٹ اسی وجہ سے ایجاد ہے اور تمام ہندوستان میں اہلِ ہنود کی مستورات بہترین نمونہ اس عصمت و عفت کا ہیں اُن میں سے کوئی بھی تو بلا گھونگھٹ کے نظر نہ آوے گی۔ اور یہ رسم ان میں صرف شرفا ہی کی عورتوں میں محدود نہیں بلکہ اسفل ترین قوم حتیٰ کہ بھنگی مستورات بھی گھونگھٹ مارتی ہیں۔ اور اس قدر حیادار ہیں کہ اپنے بزرگوں کے سامنے بھی بلا گھونگھٹ مارے نہیں نکلتیں۔ انصاف کریئے اور اپنے گریبان میں مُنہ ڈالکر دیکھو کہ بداطوار ناہنجار اور بدذات مردوں سے بچنے کے لئے اس سے بہتر کیا تدبیر ہوسکتی تھی۔ ایک گھونگھٹ کی خوبی پر نظر کرو کہ اس کی وجہ سے گھونگھٹ والیوں کو قدم بقدم صرف راستہ کے نشیب و فراز دکھائی دیتے ہیں جس سے وہ تمام تر محفوظ طریق سے اپنی راہ کو طے کرتی ہیں مگر اور کسی طرف نظر نہیں بہکتی اور بدظنوں کی نگاہِ بد سے امن میں رہتی ہیں۔ اور یہہ چادر جو گھونگھٹ کا کام دیتی ہے پاؤں کو ٹخنوں کے نیچے تک ڈھانک لیتی ہے بالعموم اہلِ ہنود کی مستورات اسی قسم کی چادر کا استعمال کرتی ہیں اور بڑی عصمت بی بیاں ہیں۔ یہہ پردہ ان کو اسلام نے سکھلایا ہے۔ عرب کے بدرویہ جاہل راستہ چلتے مستورات کو چھیڑنے لگتے تھے اس وجہ سے خدائے پاک کی جانب سے یہہ حکم جاری کیا گیا۔ مسلمانوں پر پردہ کا برقرار رکھنا بالیقین فرض ہے۔ عقلی دلائل تو عدہا موجود ہیں اور پردہ کی خوبیوں سے بے انتہا اچھی خوبی یہہ ہے کہ پردہ والیاں تمام آفاتِ آبروریزی سے محفوظ رہتی ہیں اور فسادات کا باب بند ہوجاتا ہے ؛

لیڈی صاحبہ کو سکوت ہوا | ہم نے جب لیڈی صاحبہ کو والیۂ ریاستِ بھوپال دام ظلہا و اقبالہا کے نقاب ڈالنے کی تمثیل دی تھی اور کہا تھا کہ اسلامی پردہ کی تعمیل باوجود خود مختار ہونے کے بھی فرماتی ہیں۔ تو اُن کا جواب یہہ تھا کہ وہ پبلک کے سامنے نقاب ڈالکر بولتی ہیں۔

[illegible]

ہمنے پھر انہیں کی قوم کی تمثیلیں دیکر اُن کو خاموشی کا موقع دیا کہ عیسائی شریف خاندانوں کی مستورات بھی نقاب ڈالتی ہیں۔

پردہ سے تحفظ عزت اب لُب لباب اور خلاصہ اس مضمون کا یہ ہے کہ مستورات کے واسطے پردہ ہی تحفظ عصمت ہے۔ عورت اور مستورات عربی الفاظ دونوں پوشیدگی کا اظہار کرتے ہیں اور یہہ زنان سے تخصیص رکھتے ہیں اور پردہ چاہتے ہیں۔ ان کو ہندی میں استری۔ناری۔ لُگائی اور بنتا کہتے ہیں۔ مستورات اور استری دونوں کا مادہ ستر ہے خوب صورتی اور بدصورتی کے لحاظ سے بحث کرنا محض عبث ہے اور صرف اسی قدر کہہ دینا کافی ہے کہ عزیز تر شئے تحفظ کی محتاج رہتی ہے۔ اور وہ عزت ہے۔

لطیفہ عبرت خیز مضمون کے خاتمہ پر ایک لطیفہ بھی کہدینے کو جی چاہتا ہے۔ اور اُس سے مقصد صرف اسی قدر ہے کہ جن کو دنیا و مافیہا سے مطلق بے خبری ہے وہ جو چاہیں سو کریں اُن کے واسطے پردہ حجاب اکبر ہے چنانچہ جب بادشاہ وقت نے تارک الدنیا سرمد پر حکم تعزیر جاری کیا اور اس وجہہ سے اُن کی سیاست فرمائی کہ وہ خلاف شرع برہنہ رہتے تھے تو انہوں نے فاش جواب اور برجستہ اس رباعی میں جان جاتے جاتے دیا کہ؎

آنکس کہ ترا تاج جہان بانی داد ٭ مارا غم و اندوہ پریشانی داد
بخشید لباس ہرکرا عیب بدید ٭ بے عیباں را لباس عُریانی داد

یہہ واضح رہے کہ شریعت اسلام نے گناہ گاری کی صورت میں اہل اللہ کو بھی سیاست سے ہرگز نہیں بچایا۔ فقط۔

راقم مرزا عرفان علی بیگ۔ آئی۔ ایس۔ او۔ از آگرہ۔

جاہل ماں

بیٹا اکلوتا کسی بیوہ کے تھا ؛ مدرسہ وہ ایک دن پڑھنے گیا ؛ پڑھ کے آیا جب وہ واپس وقت شام
ہنس کے اول تو کیا ماں کو سلام ؛ پھر لپٹ کر یہ کہا اے والدہ ؛ میں چرا کر لایا ہوں اک قاعدہ
ہم سبق میرا ہے اک طفل صغیر ؛ اک ذرا غافل ہوا جب وہ شریر ؛ میں نے جھٹ جزدان سے کے نکال
اپنے بستہ میں لیا چپکے سے ڈال ؛ تھی یہ عورت جاہل اور احق بڑی ؛ مسکرائی پہلے تو پھر ہنس پڑی
دل میں اپنے خوش ہوئی وہ بدشعار ؛ بیٹے کو تاکید کی یہہ بار بار ؛ مدرسہ میں تو نہ لیجانا اسے
اور کسی کو بھی نہ دکھلانا اسے ؛ چمڑی تک اُستاد گو ڈالے اُڑا ؛ پر نہ کہنا کام یہ میں نے کیا
حکم پہ ماں کے کیا اُس نے عمل ؛ بچگیا وہ قسمیں کھا کر برمحل ؛ لپکا چوری کا اسے ایسا پڑا
وہ نہ چھوٹا ہو گیا پر وہ بڑا ؛ چوریاں کرتا رہا وہ نابکار ؛ عادت اس کی ہو گئی خوب استوار
تھوڑے عرصہ میں ہوا جب وہ جواں ؛ ریش چہرہ پہ ہوئی اُس کے عیاں ؛ دھاک سارے شہر میں اسکی پڑی
کانپتے تھے اس سے اشراف و دنی ؛ چور اُچکا جیب کترا بن گیا ؛ شہر کے چوروں میں چترا بن گیا
ہے بدی کا بدنتیجہ بے گماں ؛ خیر ملتے کب تلک بکرے کی ماں ؛ اتفاق ایسا ہوا پکڑا گیا
چور کے سو دن تو اک دن ساہ کا ؛ حکم حاکم نے دیا دربار میں ؛ دو چڑھا سولی اسے بازار میں
چوک میں جب لے گئے کہنے لگا ؛ میری اماں کو بلا دو تم ذرا ؛ لائے ماں کو اس کے جب وہ سامنے
بیٹا اور ماں گفتگو کرنے لگے ؛ ماں سے اپنی یہہ کہا اے نیک ذات ؛ کان لا پاس اک مجھے کہنی ہے بات
دل میں اُس کے تھا نہ کچھ خوف و ہراس ؛ لے گئی وہ کان اس کے مُنہ کے پاس ؛ کاٹ لی دانتوں سے جھٹ لو کان کی
لی خبر یوں اُس نے اماں جان کی ؛ جب کیا اُس نے یہہ کار ناپسند ؛ نعرۂ نفریں ہوا ہر سو بلند
صبر تو اک دم کرو اُس نے کہا ؛ تم سنو میری کہانی بھی ذرا ؛ یہہ سماں تم دیکھتے ہو جو کھڑے
اب یہہ جو کچھ ہے تمہارے سامنے ؛ ہیں یہ سب کرتوت اِس مردار کے ؛ گو نظر آتے ہیں برخوردار کے

اس نے پھر قصہ سنایا وہ تمام ؛ سیکھا اُس نے جس طرح چوری کا کام ؛ پوچھا پھر اُس نے ذرا تم سچ کہو
چھوڑتا ہوں تم پہ ہی انصاف کو ؛ عقل اس عورت میں کچھ ہوتی اگر ؛ یہ نہ ہوتی اس قدر کو یہ تقصیر
اس سے جاتی مجھے اُستاد کے ؛ کرتی سب کے سامنے رُسوا مجھے ؛ بار اول ہی جو مل جاتی سزا
آج کیوں میں دیکھتا یہ دن بُرا

حاصل

جُرم پر کرنی حماقت تھی ہے ؛ حق میں بچوں کے خصوصًا زہر ہے ؛ جرم پر کچھ گوشمالی چاہیے
تاکہ ہوں کان اُن کو آگے کے لئے ؛ ورنہ بجائیں گے ننگِ خانداں ؛ خانداں کا وہ مٹائیں گے نشاں

(پیرزادہ خاں بہادر مولوی محمد حسین صاحب ریٹائرڈ سیشن جج رئیس دہلی)

غزل۔ جناب نواب صاحب بہادر فرمانروائی ریاست لوہارو

ایک نام سا جہان میں آنے کا کر گئے ؛ دن کیسے جلد عمر کے اپنی گزر گئے
دنیا کہیں اسے کہ کہیں کارواں سرائے ؛ آئے جو شام صبح کو وہ کوچ کر گئے
اس دردِ دل کے رونے کو کس در پہ جائیں ہم ؛ وہ سُننے والے غم کی کہانی کدھر گئے
باقی ہے کون سوزِ محبّت کا آشنا ؛ گنتی کے دل جلے تھے وہ افسوس مر گئے
کیا پوچھنا ہمارا کہ ہیں عشق کے مریض ؛ آیا نہ دل کو چین نہ داغِ جگر گئے
یہ اُن کے ہتھکنڈے صفائی تو دیکھو ؛ دل میرا سب کے سامنے لیکر مکر گئے
چھیڑو نہ ہمکو بیٹھے ہیں بیزارِ زیست سے ؛ سمجھو کہ زندگی میں جہاں سے گزر گئے
اچھا ہے گر نہ جائیں کہیں کشتگانِ عشق ؛ رکوائیں گے وہ خون کے آنسو جدھر گئے
اعظم خدا کے واسطے اُس زُلف کو نہ چھیڑ
ہوں گی خرابیاں جو وہ کاکُل بکھر گئے

بہاریہ نظم

خزانہ تھا مسرت کا مآلِ ابرِ باراں میں ÷ اُگے اشکوں سے لیکن پھول ہنستے ہیں گلستاں میں
ہرے ہو ہو کے کانٹوں نے نکالا اپنی کاوش ہے ÷ وہ تھوڑا فرق جو باقی تھا عاشق کی رگِ جاں میں
نویدِ آمدِ فصلِ بہاری سن کے موسم سے ÷ زمیں کی قوتیں ہیں صرفِ استقبالِ مہماں میں
رہیں تیار دل والے ابھی سے سیرِ گلشن پر ÷ وہ سب ہوگا جو ہوتا ہے رخِ رنگینِ جاناں میں
ہوائے دامنِ اُردی بہشت اب نخ پھیکوگی ÷ وہ گوہر آفریں جوش آچلا ہے طبعِ نیساں میں
غزلیں ابر یعنی غنچہ و گُل کے نظارے سے ÷ وہ دل اُبھرے ہیں جو ڈوبے گئے چاہِ زنخداں میں
یہ قدرت کے کرشمے ہیں کہ سوسن ڈھونڈھ لائی ہے ÷ زبانیں کھو گئی تھیں جس قدر شہرِ خموشاں میں
میں ثاقب ہوں جو حسن و عشق کا عالم دکھاتا ہوں ÷ فقط اک بابِ سعدی کو ملا سارے گلستاں میں

(منقول از ڈسٹرکٹ گزٹ گونڈہ - ۱۷ فروری ۲۹ء)

"بچشم"

گفت ای یارِ من بگزر زجاں گفتم بچشم ÷ آشنائی ترک کن با این و آں گفتم بچشم
گفت گر خواہی کنی نظارہ رخسارِ من ÷ بامنہ دیگر بباغِ گل رخاں گفتم بچشم
گفت میخواہی اگر بینی ہلالِ ابرو یم ÷ ننگری دیگر بماہِ آسماں گفتم بچشم
گفت اگر خواہی شبے آیم ترا اندر کنار ÷ کن کنارہ از تمامِ گلرخاں گفتم بچشم
گفت گر خواہی بچینی گل نہ باغِ وصلِ من ÷ خارمی باید شوی در ایں جہاں گفتم بچشم
گفت گر داری طمع بوسی لبِ خندانِ من ÷ خوں رواں باید کنی از دیدگاں گفتم بچشم
گفت میخواہی اگر آئی نہاں در کوئے من ÷ بایدت بوسید پائے پاسباں گفتم بچشم
گفت گر خواہی سرِ زلفِ مرا آری بکف ÷ بایدت زنار بندی درمیاں گفتم بچشم

گفت بارا اجی گرفتاری اگر در بندِ عشق
کن فغاں و نالہ چوں دیوانگاں گفتم بچشم

پرانی دلّی کی لوہے کی لاٹھ

(گذشتہ سے پیوستہ)

چندرگپتا ثانی جس نے یہ لوہے کا ستون بنوایا تھا اور اُس کے فرزند کمارگپتا اول جس نے
... پر کتبہ کندہ کرایا ان دونوں کے زمانے کے کتبے متھرا میں دستیاب ہوئے ہیں۔ وجوہ متذکرۂ
بالا کی بنا پر نہایت اغلب ہے کہ یہ آہنی ستون ابتدائً متھرا ہی میں ایستادہ کیا گیا ہوگا۔
کٹرا نام کا ٹیلا۔ جہاں وشنو کے نام کا شاندار مندر جس کا نام "کیسوا" تھا اور جو کسی زمانے
میں موجود تھا، بہت زیادہ اغلب ہے کہ وہی "وشنوپداگری" ہو جس کے معنی وشنو کے
نقش قدم کا مقام مرتفع ہے اور جس کا ذکر آہنی ستون کے کتبے میں ہے"[۵۱]

مسٹر سمتھ کے اُن دلائل پر جو اوپر نقل کئے گئے مجھے سخت اعتراضات ہیں۔ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ
متھرا فی زمانناوشنو کی پرستش کا بڑا بھاری مرکز ہے خاصکر وشنو کے اوتار کرشن کی صورت میں لیکن
یہ امر تعجب خیز واقعہ ہے کہ قدیم زمانے کے سنگین بُت جو متھرا اور اُس کے اطراف میں بافراط ملے
ہیں اُن میں سے کوئی بھی وشنو کی پرستش سے تعلق نہیں رکھتا۔ وہ یا بدھ مذہب کے ہیں یا جین مت
کے اور اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ متھرا میں **کشانوں** اور **گپتوں** کے زمانے میں یہی دو سرے آور دہ
مذہب تھے۔ یہ امر بھی سچ ہے کہ ضلع متھرا میں ٹیلے کثرت سے ہیں لیکن یہ قدرتی پہاڑیاں نہیں
ہیں۔ بلکہ گری ہوئی عمارتوں کے ڈھیر ہیں[۵۲]۔ رہا کٹرے نام کا ٹیلا جس کا سمتھ صاحب نے ذکر
کیا ہے وہ بھی اسی قسم کا ہے جس پر اورنگ زیب نے ایک بڑی بھاری مسجد "**کیسب دیو**"
نامی مندر کو حکماً منہدم کرکے بنوائی ہے لیکن یہ مندر خود جب اس کی تعمیر کی نوبت آئی کبھی بھی

---

۵۱ ماخوذ از جرنل رائل ایشیاٹک سوسائٹی۔ صفحہ ۱۶ الف بابتہ ۱۸۹۷ء۔ ۱۲
۵۲ اس میں شکستہ مندروں کے ڈھیر بھی شامل ہیں۔ ۱۲

شک نہیں کہ بدھوں کی عمارتوں کو ڈھا کر اُسی مقام پر بنایا گیا تھا چنانچہ یہ بات بہت سے کتبوں سے جو اسی جگہ سے نکلے ہیں ثابت ہو چکی ہے۔ میں خاص کر کے **بدھا** کی اُس کتبے دار مورت کا ذکر کرتا ہوں جس کو سر الگزینڈر کننگھم نے ایک کنوئیں میں سے نکلوایا تھا اور جو اب لکھنؤ کے عجائب خانے میں محفوظ ہے۔ اس پر گپتا کے زمانے کا سنہ ۲۳ لکھا ہوا ہے جو سنہ ۴۹-۵۰ء کے مطابق ہوتا ہے

اس قضیہ پر بحث کرتے وقت پہلے کے محققین نے غالباً کتبے کی طرز و روش کتابت کے اہم معاملے کو نظر انداز کر دیا ہے۔ جو خط آہنی ستون کا ہے وہ چوتھی صدی کے زمانے کے لگ بھگ کا ہے جیسا کہ ڈاکٹر ہوآرنلی نے بتلایا ہے۔ ہم کو معلوم رہنا چاہئے کہ گپتا خاندان کی خطاطی کی روش بالکل دو جداگانہ طریق کی تھی جن کو مشرقی اور مغربی سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ سب سے پرانا نمونہ مشرقی طرز تحریر کا جو اب تک ملا ہے وہ مشہور تعریفی کتبہ سمدر گپتا کے متعلق ہے جو **الہ آباد** کے ستون پر ہے اب رہا مغربی طرز۔ اس طرز کا کتبہ ڈاکٹر بہلر پرانی دہلی کے آہنی ستون کے کتبے کو خصوصیت کے ساتھ بتلاتے ہیں[۵۱]۔ اگرچہ ڈاکٹر بہلر قدیم زمانے کے ہندوستانی کتبوں کے پڑھنے کے فن میں بڑے اُستاد ہیں لیکن اس خاص معاملے میں مجھے اُن سے اختلاف ہے۔ میں نے جو اس کتبے کو نظر غائر سے دیکھا تو اس نتیجے پر پہونچا ہوں کہ سر حرف **لا**، **شا** اور **ہا** مشرقی طرز کو ظاہر کرتے ہیں نہ کہ گپتا خاندان کی مغربی طرز کی خطاطی کو[۵۲]

اس واقعے کے امر مابہ البحث میں صاف طور سے یہ نتیجہ نکلتا ہے اور یہ ایک اور قوی دلیل اس خیال کی تائید میں ہے کہ آہنی ستون کی اصلی جگہ یہ نہیں ہے۔ (باقی آئندہ)

---

۵۱ ڈاکٹر بہلر۔ انڈیکا ایپیگرافیکا جلد دوم صفحہ ۴۸ - ۱۲

۵۲ لیکن ڈاکٹر ہوارنلی نے بھی مہرولی کے کتبے کو گپتا خاندان کے شرقی طرز کے حروف تہجی کا بتلایا ہے۔ انڈین انٹی کویری جلد (۲۱) سنہ ۱۸۹۲ء صفحہ ۲۴۳ اور دیباچہ باور مینسکرپٹ کا حاشیہ زیریں - ۱۲

صلائے عام

میں خوش ہوں کہ صلائے عام کی قیمت اس سال پارسال کی بہ نسبت زیادہ وصول ہوی - پھر بھی ابھی اکثروں کے ذمہ باقی ہے: لکھنے پڑھنے کے معاملہ میں تقاضہ و تاکید مجھے پسند نہیں کہ ع در بزم عاشقاں سخن مدعا کہ کرد؟ لیکن رسالہ کا خرچ روز بروز بڑھ رہا ہے - اب تک جو کچھ زیرباری ہوئی اُس کو نظر انداز کرکے میں چاہتا ہوں کہ آگے کو یہہ تکلیف اُٹھانی نہ پڑے ؎

گہر افشانم و بہا طلبم ؛ سیم و زر رائیگاں نمی خواہم

اپنی زبان کی ترقی کے لئے رسالے و اخبار سب سے زیادہ ضروری ہیں - ان کے لئے خرچ اخراجات کی بھی ضرورت ہے: خاص کر اُردو زبان کے اخبار و رسالے اور زبانوں کے رسالے و اخباروں سے بہت کم قیمت ہیں - لیکن بقول غالب ؎

کس نیست متاع را خریدار ؛ با آنکہ بہا گراں نہ گویم

زاں رو کہ خردوران گیتی ؛ رنجند چو قدرداں نہ گویم

ناچار متاع غم دارم ؛ بیرونقی دکاں نہ گویم

ایں بس کہ اگر ز آسمانم

پُرسند ز ریسماں نہ گویم

دوسری عرض یہہ ہے کہ صلائے عام آپ کبھی کبھی اور کہیں کہیں سے نہ دیکھیں۔ کم سے کم سال بھر کے پرچے سرے سے اخیر تک لگاتار دیکھا کیجیے: ایک پرچہ اگر آپ کی مرضی کے موافق نہ نکلا تو دوسرا نکلے گا۔ ایک مضموں اگر پسند نہ آیا تو دوسرا موجود ہے۔ کچھ کہیں سے کچھ کہیں سے ایک پرچہ دیکھا۔ باقی رہ گئے۔ اس پر رائے قائم کر لینی لکھنے والوں کی جان پر ظلم ہے۔ بقول جناب صفیؔ لکھنوی ؎

غمِ ہجر کا نوشتہ کوئی دیکھتا مسلسل ٭ یہہ نہیں کبھی یہاں سے کبھی سُن لیا وہاں سے

مرے ماجرائے غم کو نہ سمجھئے بے سر و پا
کوئی داستاں جو سُنئے تو نہ سُنیے درمیاں سے

دُنیا میں جب تک لکھنے پڑھنے کا مشغلہ ہے۔ کوئی لکھے گا کوئی پڑھے گا: پڑھنے والوں میں کوئی داد دے گا کوئی عیب نکالے گا۔ عیب نکالنے میں اگر جلدی نہ کیجائے تو شرافت ہی ہے عیب نکالیں مگر ساری داستان سُن کر یعنی ایک دو پرچے دیکھ کر نہیں۔ آغاز سے سارے پرچے اگر نظر سے نہ گزرے ہوں تو کم سے کم پورے ایک سال کے پرچے سرے سے اخیر تک دیکھ لیجیے ٭ اس پرچہ میں اتفاق سے میری طبیعت ناساز ہو گئی۔ مجھ سے زیادہ لکھا نہ گیا: غیروں کی پونجی سے دُکان کا کام نکل گیا ٭ دوسرے یہہ مہینہ (فروری) تمام سال میں بہت چھوٹا تھا۔ زیادہ لکھنے کی فرصت نہ ملی ؎

ہمیشہ گزری قفس میں اسی تمنا میں ٭ کہ اب رہا ہوئے اب موسم بہار آیا

اگلا مہینہ کچھ دُور نہیں ہے۔ خدا نے چاہا ساری کسر نکل جائے گی ؎

لائے اے آہِ جگر تو اُسے یا نالۂ دل ٭ کون دونوں میں کرے جلد اثر دیکھیں تو؟

مہتمم کی طرف سے۔

اِطّلاع

صلائے عام کی قیمت پیشگی چھ روپیہ سالانہ ہے۔ قیمت بذریعہ منی آرڈر عنایت فرمائی جائے۔ مضمون نگار بھی **صلائے عام** کی قیمت سے بری نہیں۔ نہ یہ ضرور ہے کہ ہر مضمون خواہ مخواہ شایع کیا جائے۔ جامع اوراق کو مضمون میں کمی بیشی کا اختیار رہے۔ جو مضمون شایع نہ ہوسکیں اُن کے واپس کرنے کا ذمہ نہیں۔

صلائے عام میں ہر طرح کے مضامین نظم و نثر شایع ہوتے ہیں۔ زیادہ تر نثر کہ اس وقت نثر کی زیادہ ضرورت ہے۔ اور نثر بھی ایسی جس میں زبان کی خوبی و فصاحت کے ساتھ مضمون کی پاکیزگی و نازک خیالی ضرور ہو یعنی بلباس عروسِ جمیل دلباس حریر۔ شرط ہے کہ مضمون پاکیزہ اور ادائے بیان لاجواب چاہیئے۔

اکثر اصحاب نمونہ کا پرچہ مانگتے ہیں۔ اوّل تو ایک پرچہ سے **صلائے عام** کی ساری خوبیوں کا حال معلوم ہونا مشکل ہے دوسرے **صلائے عام** اتنے عرصہ سے جاری ہے کہ اہلِ علم میں شاذ ہی کوئی ایسا ہوگا جو اس سے واقف نہ ہو۔ پھر بھی اگر کسی کو نمونہ یا سال سے کم کی خریداری منظور ہو تو ایک روپیہ فی پرچہ کے حساب سے قیمت لی جائے گی۔

صلائے عام کا پتہ اس قدر کافی ہے کہ:

دہلی۔ فراشخانہ: مکان میر ناصر علی خاں بہادر

حسب الارشاد میر ناصر علیخاں بہادر مطبع ناصری واقع فراشخانہ دہلی میں باہتمام میر احمد چھپا اور شایع ہوا۔

Printed and Published by Mir Nasir Ali Khan Bahadur (Editor) at the Nasri Press, Farrash-Khana, Delhi

سر تو رکھکر بیاضِ جبیں   کہا دوسرا کوئی سمجھا نہیں

جلد ۱۳   نمبر

SALA-I-AM, DELHI.

A high class Monthly Magazine devoted to the cause of Urdu literature, the preservation of the old Indian, especially Mohammadan culture and refinement, and the assimilation of the best features of the new civilization.

حسب الارشاد ناصر علی مدیر بااہتمام [illegible] مطبع ناظمی فراشخانہ دہلی میں چھپا اور شائع ہوا

جلد ۱۳　　　نمبر ۳

فہرست مضامین

بابت ماہ مارچ ۱۹۲۵ء مطابق شعبان ۱۳۴۳ ہجری

مضمونِ پریشاں

میں نے دیکھا ہے کہ دنیا میں جو سامان پریشانیوں میں داخل ہیں اکثر یہی اطمینان کا باعث ہو جاتے ہیں۔ اور اطمینان کے اسباب پریشانی کا سبب ۔ پریشانی میرے لئے مصیبت ہو تو ہو حسینوں کے بالوں کا چہرے پر پریشان ہو جانا خوبصورتی کی جان ہے ۔ غایتِ عیش کے سامانوں میں بقول ظہوری ؎

شراب و کباب است و ساقی و شمع ۔ پریشانیٔ زلف و دل ہائے جمع

رخسارِ تاباں پر زلفِ خوباں کا بکھر جانا چاہنے والوں کے دل سے پوچھئے کہ نگاہ ہٹانے کو جی نہیں چاہتا ۔ بالوں کی یہی پریشانی دیکھنے والوں کی جمعیتِ خاطر کا سبب ہو جاتی ہے کہ رُخِ یار پر نظر گویا جم جاتی ہے ۔ "پریشانیٔ زلف و دلہائے جمع" کی تصویر دیکھ لیجئے ۔ ؎

ہر کہ بنشست بہ پہلوے تو شاداں بنشست ۔ ہر کہ برخاست ز بزمِ تو پریشاں برخاست

نالہ ساں ہر دو بہم دوختہ خیاطِ ازل
کسوتِ ماتمی و پیرہن شادیٔ ما

یہ اُنگلیاں جو طبیب کے ہاتھ میں مریض کی نبض دیکھنے میں کام آتی ہیں مُضطرب

ہوئی

کے ہاتھ میں مضراب کے ساتھ ستار بجانے میں نغمہ و سرود کی جان سمجھئے: وہاں اسبابِ تشخیصِ امراض اور یہاں غذاے روح کا سامان دیکھ لیجئے: حضرت شیخ سعدیؒ کے قول کے موافق کہ ع راستی موجب رضائے خداست الخ تیر کی راستی تیرانداز سے جدائی کا باعث ہوتی ہے اور کمان کی کجی کمان کو تیرانداز کے ہاتھ سے علیحدہ نہیں ہونے دیتی تیر راستی کی وجہ سے مارا پھرتا ہے اور کمان رات دن تیرانداز کے ہاتھ سے جدا نہیں ہوتی ؎

گر ہمچو کماں کجی ز دستت نہ نہند :: ور راست روی چو تیر بر خاک اُفتی :

یہہ اجتماعِ ضدین کی صورتیں ہیں :

ہم پر شراب حرام کی گئی اور خود ابر و باراں اور آفتابِ درخشاں سے میاں نے انگور کے خوشوں میں جان ڈال کر زمین پر ثریا کا جواب پیدا کر دیا۔ یہہ کام نہ ساقی کے بس کا تھا نہ میرے آپ کے بس کا کہ بردانہ انگور سے دخترِ رزسی دل کش صورت پیدا ہو۔ جس کے منہہ لگانے سے ہم گنہگار قرار دئے جائیں ؎

ساقیا عہدِ شباب است تو ہم می دانی :: روز و شب غفلت و خواب است تو ہم می دانی
مے کشی عین ثواب است تو ہم می دانی :: دفعِ غفلت ز شراب است تو ہم می دانی
آب غارت گرِ خواب است تو ہم می دانی

ساقیا! تو جانتا ہے کہ عالم شباب ہے اور جانتا ہے کہ شباب میں غفلت و خواب کے سوا کچھ نہیں سوجھتا۔ غفلت و خواب کا علاج پانی کا چھینٹا ہے۔ چھینٹا پانی کا

ہو گلاب کا ہو یا شراب کا ؛ یہہ تدبیر جوانی کی غفلت کی ہے - پیری میں اگر یہہ صورت ہو تو نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ خوب فرماتے ہیں کہ ؎

چوں بہ پیری کنم اے شیخ ز رندی توبہ ؛ کارسازانِ قضا بخت جوانم دانند ؛

آپ نے دیکھا کہ عربی فارسی اُردو کی شاعری میں معمولی و رسمی عقاید کے خلاف اکثر مضامین ایسے بندھ جاتے ہیں جو عوام کی سمجھ سے باہر ہوتے ہیں - اور سمجھ سے باہر ہونے کی وجہہ سے متعصب زاہدانِ خشک کفر و الحاد کے فتوے لگا دیتے ہیں ؛ گو ان فتوؤں سے شعرا کے کلام پر کچھ اثر نہیں ہوتا - کیوں کہ شاعری کی جان ہی شیخ و زاہد سے بیگانگی ہے : مگر شعر میں تو ایسے خیالات کا رواج اس قدر ہو گیا ہے کہ عقاید کے خلاف کوئی بات ہو تو ہوا کرے آزادئ خیال کا خون نہ ہونے پائے ؛ جب مقتضائے فصاحت خیال کی آزادی ٹھہری تو شعر میں اگر آپ اس کا جواز درست سمجھتے ہیں تو نثر میں اُسی آزادی پر خفگی کی کیا وجہہ ہے ؟ یہہ خیال مجھے اس لئے ہوا کہ "مضمونِ پریشان" میں آپ کوئی بات عوام کی سمجھ سے باہر اگر دیکھا کریں تو میری جان کو نہ آ جائیں ؎

رازِ نہفتہ گفتم اگر ساقیا مرنج ؛ میگفتمت کہ بادہ مدہ این قدر مرا

تا پریشاں نہ شود کار بسامان نہ شود
شرطِ عشق است کہ تا این نشود آن نشود

تحقیق کتب اہل کتاب

عرصہ ہوا جب سر ولیم میور صاحب بہادر ممالکِ مغربی و شمالی کے لفٹننٹ گورنر تھے اُس زمانہ میں صاحبِ ممدوح نے بڑے معرکہ کی کتاب "شہادت قرآنی علے الکتب ربانی" نامی لکھی تھی۔ صاحب ممدوح کو زبانِ عربی میں بہت دخل تھا اور عربی کی اسلامی کتابیں مطالعہ میں رہتی تھیں ؛ اُس تصنیف میں یہہ ثابت کیا تھا کہ مسلمانوں میں قرآن شریف سے توریت و انجیل کی شہادت ثابت ہے ؛ یہہ ظاہراً ایسی ضروری بات نہیں کیوں کہ ہر مسلمان کے ایمان کا مدار صحفِ انبیاء علیہم السلام کو سچّا و برحق سمجھنے پر ہے۔ مگر معلومات کی ترقی کے لئے یہہ بحث دلچسپ ہے ؛

اہلِ یورپ میں عوام کے ذہن میں ہے کہ قرآن شریف زیادہ تر توریت و انجیل سے لکھا گیا۔ یہہ خیال عامیانہ ہے : لیکن اس میں شک نہیں کہ اہل کتاب کے تینوں مذہب یعنی توریت و انجیل و قران کے ماننے والے کم و بیش آپس میں متفق ہیں ؛ راقم الحروف کے حضرت والد ماجد قبلہ نے اپنی تفسیر میں یہہ بحث بہت مفصّل لکھی ہے کہ اہلِ کتاب کا خدا ایک ہے اور تینوں آسمانی کتابوں یعنی توریت و انجیل و قرآن مجید کا لب ولہجہ و طرز بیان ایک دوسرے سے ملتا ہے۔ کیوں کہ ان تینوں کا

خدا وہی ایک ہے ۞ یہہ بات بڑے کام کی ذہن میں آئی ۞ لیکن اس وقت اس مسئلہ سے غرض نہیں ہے ۔ بلکہ مقصود یہہ ہے کہ وہ پُرانا خیال کہ۔ اہلِ عرب نے بنی اسرائیل کی تعلیم سے موثر ہو کر عقائدِ مذہبی پیدا کئے ۔ قابلِ اطمینان نہیں : بلکہ اُلٹا یہہ ثابت ہو رہا ہے کہ مُلکِ عرب کے تعلقات سے بنی اسرائیل کے بعض عقائد کا وجود ہوا ۞ اس اثر کا ظہور اسلام سے بہت پہلے بنی اسرائیل پر ہو چکا تھا ۞ قدیم کتبے اسلام سے پہلے کے جو عرب میں پتھروں پر کندہ شدہ ملے ہیں اُن سے ثابت ہے کہ نصف سے زیادہ توریت کا بیان عرب سے علاقہ رکھتا ہے ۞

اسلام سے بہت پہلے بنی اسرائیل (یہودی) عرب میں سکونت پذیر تھے اور اسلام نے یہہ کبھی نہیں چاہا کہ یہودی عرب سے جلا وطن کئے جائیں ۔ پتھر کے کتبوں پر اکثر اہلِ یہود کے نام کندہ ہیں جو توریت سے بہت ملتے جلتے ہیں گو حضرت ابراہیم کے نام سے اسلام سے پہلے کے عرب بالکل ناواقف معلوم ہوتے ہیں ۞

روایتیں ہیں کہ حضرت ابراہیم اور ان کی اولاد عرب سے کنعان گئی ۔ اور کو بنی اسرائیل اقرار نہ کریں لیکن قومی شہادتیں ہیں جن سے عرب کا اثر بنی اسرائیل پر ثابت ہوتا ہے ۞ زبانِ عبرانی جو بنی اسرائیل کی زبان سمجھی جاتی ہے عربی سے اس طرح ملی ہوئی ہے جس طرح اُردو فارسی سے اور بھاشا سنسکرت سے ۞

دِقت یہہ ہے کہ قدیم زبانوں میں خاصکر عربی میں کوئی وسیع لٹریچر نہیں ۔ اسلام سے پہلے کی تاریخوں کا پتہ نہیں ۔ ان کی لٹریچر کا مدار اور خاتمہ محض شاعری پر ہے

شاعری کو تحقیق سے واسطہ نہیں ۔ بلکہ لٹریچر کی کمی کی وجہہ سے اسلام سے پہلے کا زمانہ "ایام جہالت" کے نام سے مشہور رہے ۔

توریت کے اکثر نام عربی ناموں سے ملتے ہوئے ہیں۔ قربانی کی رسم اور پہلے پہل کے پھل کی نذر خدا کے نام پر۔ خود خدا کا نام عربی و عبرانی میں بہت ملتا ہے کہ "یاھو" اور "یھووا" دونوں قریب قریب ہیں اور معنی بھی ایک سے یعنی "ہونا" جس کے ہونے میں شک نہیں ۔ اہلِ عرب اور بنی اسرائیل کے طرزِ عبادت اور زبانِ عربی اور عبرانی کی فرہنگ و لغت ایک دوسرے سے ایسی متشابہ ہیں کہ ناواقف کو شبہ ہوتا ہے کہ کس نے کس سے کیا لیا؟ عبادت میں ساتویں دن کی خصوصیت اور طہارت و حرام و حلال کی تاکید کہ خدا کے نام کے سوا ذبیحہ جائز نہیں۔ حج و خیرات ۔ و عشر اور ایسے ایسے اکثر مسائل ہیں بنی اسرائیل اور اہل عرب میں بہت فرق نہیں ۔ سابعہ معلقہ کے پہلے معلقہ میں کم و بیش حضرت ایوبؑ کے تذکرہ سے مشابہت ہے کہ حمار نامی کسی شخص نے چالیس برس خدائے واحد کی پرستش کی مگر اتفاق سے اس کے دس لڑکے قضائے آلہی سے اکبارگی مرگئے جس پر حمار نے ارادہ کیا کہ اب ایسے خدا کی عبادت کرنی بے کار ہے جو میرے بیٹوں سے اس طرح پیش آیا ۔ یہہ ذکر حضرت ایوب علیہ السلام کے صحیفہ سے بہت ملتا ہے اور آج کل کے محققوں کا خیال ہے کہ یہہ صحیفہ زیادہ تر شاعرانہ ہے۔

جہاں تک تحقیق سے معلوم ہوتا ہے بنی اسرائیل کو عرب سے از روے زبان و خیال سب سے زیادہ تعلق رہا۔ عرب کی شاعری کو عبرانی سے گو پوری مناسبت نہیں

مگر اور زبانوں کے مقابلہ میں عبرانی کو عربی سے زیادہ موافقت ہے ؛ اسلام کے الہام و وحی میں توریت و انجیل کے وحی و الہام سے قدرے اختلاف ہے۔ اور گو تمام اہلِ کتاب کا انبیاء علیہم السّلام پر ایمان ہے۔ مگر صُحفِ انبیاء اور قرآن شریف میں یہہ امتیاز ہے کہ اسلام کے عقیدہ میں کلام الٰہی خدا کی زبان ہے اور توریت انبیاء نے اور انجیل حواریوں نے لکھی ؛

مجھے گمان تھا کہ بنی اسرائیل (یہودی) ہندوستان کے برہمنوں کی طرح آبائی قوم تھی کہ جس طرح برہمن کے لئے شرط ہے کہ اس کا باپ بھی برہمن ہو اسی طرح یہودی وہی سمجھا جا سکتا تھا جس کا باپ یہودی ہو۔ مگر تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ آجکل کے فرقہ "آریہ" کی طرح غیر قوموں کے لوگ بھی یہودیوں میں شامل ہو جاتے تھے۔ چنانچہ آغازِ اسلام میں بہت سے عربوں نے یہودی مذہب اختیار کر لیا تھا : یہاں تک کہ سلاطین عرب میں حمیاری بادشاہوں نے مذہبِ اہلِ یہود اختیار کیا اور یہہ مذہب سلطنت کا مذہب سمجھا گیا ؛ شعراء عرب میں یہودی و نصرانی (عیسائی) ہوئے ہیں۔ اور نہ صرف شعراء بلکہ اکثر اہلِ کمال ؛ چوں کہ صلائے عام کو لٹریچر سے بہت تعلق ہے عرب کی شاعری کا ذکر آیا تو دو ایک عربی اشعار کے مضمون ترجمہ کر کے نثر میں لکھنے کو جی چاہتا ہے :-

(۱) اگر انسان نے اپنی شرافت پر کسی کمینہ پن سے دھبہ نہیں لگا لیا تو ہر لباس میں وہ خوب صورت معلوم ہو گا ہ

بہر رنگے کہ خواہی جامہ مے پوش ÷ من انداز قدت را می شناسم

(۲) وہ طعنہ دیتی ہے کہ تمہارے ساتھی تھوڑے ہیں - میں جواب دیتا ہوں کہ شریف ہوتے ہی تھوڑے ہیں ÷

(۳) مفاخرہ یعنی بہادری و شجاعت میں تعلّی کے مضمونوں کا نمونہ ہے کہ :-

میرے فرقے میں بوڑھے بہت نہیں ہونے پاتے کہ ہمیں مرنے کا شوق ہے -
برخلاف اس کے ہمارے دشمن مرنے سے ڈرتے ہیں اور ایڑیاں رگڑ کر مرتے ہیں
ہمارے خاندان میں کوئی چارپائی پر نہیں مرتا ÷

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل دو ہزار برس پہلے جو باتیں عرب سے لے گئے تھے وہ بعد از بربادیٔ بیت المقدس جو غیر قوموں کے ہاتھ سے ہوئی پھر عرب میں واپس لے آئے - گویا میزان برابر ہوگئی ÷

یہہ اسلام کا عقیدہ نہیں ہے نہ مضمون نگار کا ہے - لیکن آج کل محققین جو محنت کر رہے ہیں ان کی داد دینی بھی ضرور ہے ÷ اس مضمون کا مسالہ زیادہ تر مسٹر مارگولیاتھ صاحب کی کتاب[1] سے لیا گیا ہے جو اس تحقیق میں بے مثل تصنیف ہے : صاحب کتاب کی یہہ تصنیف قابل داد ہے - یہہ مضمون بطور داد ہے ÷ بحث بہت وسیع ہے جو دو چار مضمونوں میں ختم نہیں ہو سکتی - اور اصحاب بھی اپنی معلومات کے مطابق اس طرف متوجہ ہوں : مگر شرط ہے کہ عقاید مذہبی کو دخل نہ ہو سکے ÷ محض تحقیق پر مدار رہے ؎

تحقیق ہو تو جانو کہ میں کیا ہوں قیس کیا
لکھا ہوا ہے یوں تو سبھی کچھ کتاب میں

---

[1] The Relatius between Arabs and Israelites prior to the Rise of Islam The Schweich Lectures, 1921.

نکماپن

جس قدر ہم میں ریاضت کی عادت گھٹتی جاتی ہے اُسی قدر بلکہ اُس سے زیادہ نکماپن ہم میں بڑھتا جاتا ہے اور جس قدر آرام ہم کو ملتا جاتا ہے ہمارا وجود کاہل ہوتا جاتا ہے۔ آرام سے ہم آرام کی قدر کھوتے ہیں اور تھوڑی سی مصیبت پڑنے پر بہت ساروتے ہیں۔ سبب ظاہر ہے کہ ریاضت جب ہم سے چھوٹ گئی تو تکلیف اُٹھانے کی ہمت ٹوٹ گئی۔ اور جب ہمارے جوارح ہمارا بار نہیں اُٹھاتے تو پھر ہم آدمی بنکر کسی کے کیا کام آتے۔ فی الحقیقت امر حق یہہ ہے کہ اپنے آپ کو نکما بنا دینا۔ احسانِ خداوندی کا پورے طور پر فراموش کردینا ہے۔ پانی اگر بہتا نہ رہے تو گندہ ہوجاتا ہے۔ لوہا اگر چلتا نہ رہے تو مُردہ ہوجاتا ہے۔ بہر حال حرکت کرنا علامت زندگی ہے اور سکوت میں رہنا نشانی افسردگی کی ہے۔ لوہے کو تھوڑے ہی دنوں کے سکوت میں زنگ کھاجاتا ہے۔ لیکن صیقل کرتے رہو تو چکنا دلکنا کام کا بنا رہتا ہے ؎

آہن ارچہ تیرہ وبے نور بود ٭ صیقلے آں تیرگی از وے زدود

اور صیقل کردینے سے لوہا اس قدر صاف و شفاف ہوجاتا ہے کہ ہمارے لئے آئینہ بن جاتا ہے۔ اگر انسان خاکی نژاد اپنے جوارح کو اسی طرح سے کام میں لاتا رہے جس طرح سے صانع حقیقی نے اُن میں اپنی حکمتِ کاملہ سے قوتِ عملی بخشی ہے تو بالیقین ہم تمام تر جسم انسانی کو ایسا ہی کمل پاویں گے جن کی جیسی تکمیل خالقِ مطلق کو منظور تھی۔ اِس سے زیادہ اور کیا منشا آفرینش کے لیئے درکار ہے۔ ہم تو ایسے آرام طلب ہوگئے ہیں اور ہوتے چلے جاتے ہیں کہ گویا مٹی کی کچی پتلی ہیں یعنی خود تو بالکل نکمے ہیں مگر کوئی دوسری طاقت ہم کو جنبش دیتی رہے تو ناچتے رہیں۔ یہہ ہمارا نکماپن بالیقین ہماری آفرینش کے منشا کے بالکل خلاف ہے

بعض منتخبات

بعض تمثیلات دیکر میں اس نکتہ کو واضح طور پر حسب ذیل بیان کرتا ہوں۔

لیکن قبل ازیں کہ تمثیلات کا ذکر شروع کروں یہ کہہ دوں کہ یہ مقصود اس مباحثہ کا ہرگز نہیں ہے کہ جو آسانیاں قدرت کاملہ سے ہم کو ودیعت ہوئی ہیں یا جو ہماری ہنرمندی سے ہم کو نصیب ہوئی ہیں ان سے ہم مستفاد نہ سمجھے جاویں اور اس کا کام میں لانا متروک کر دیں بلکہ جب ہماری قوت بشری ہم کو جواب دے اور کسی نہ کسی عارضی وجوہ سے ہمارے قویٰ کے تعطل ہمارے سدِ راہ ہوں تو بالیقین وجہ معقول ہے کہ ہم اُن وسائل کو کام میں لاویں جو ہمارے ارادوں اور ہمارے منشا کے پورا کر دینے میں معین ہوں۔

پہلی تمثیل

جب ہم دودھ پیتے بچّے تھے تو گھٹنیوں چل کر اپنے والدین کی مسرت کا باعث ہوتے تھے اور ہماری ماں ہم کو اپنی اُنگلی پکڑا کر کھڑا کرتی تھی اور ایک ایک پاؤں آگے بڑھا کر لاڈ کے الفاظ بیّاں بیّاں کہہ کر قدم قدم چلنا سکھلاتی تھی اور یہاں تک ہم کو مزاولت کراتی تھی کہ ہم چلنا اور دوڑنا سیکھ جاتے تھے۔ یہ تو ہمارے چلنے پھرنے کی ابتدائی تعلیم تھی پھر تو ہم سیکھ کر خوب چل اُٹھے اور اُن پاؤں سے چلے جو قدرت نے ہم کو بخشے ہیں۔

لیکن قدرت کاملہ نے ہمارے واسطے سواریاں بھی بخشیں جو مختلف خطہ ہائے ارضی پر ہم کو لاد کر لے جاتی ہیں۔ کبھی ہم سیدھی زمین پر کبھی پہاڑ پر کبھی دریا پر اور کبھی سمندر پر اُن پر چڑھ کر چلتے ہیں اور وہ قوت ہم کو بخشی کہ ہم اپنی سواریوں کے واسطے بہایم و انعام کو اپنے قابو میں لے آئے۔ چنانچہ گھوڑے۔ گدھے۔ خچر۔ بیل اور ہاتھی اور اُونٹ سب سے ہم کام لیتے ہیں اور سب پر چڑھتے ہیں۔ بوجھ بھی اُن پر لادتے ہیں اور دور دراز مقامات کا سفر اُن کی امداد سے آسانی سے طے کرتے ہیں۔

ہم نے مصنوعات کو بھی اپنی جلبِ منفعت کی آسانیوں میں دخل دیا اور کشتیاں۔ گاڑیاں

ڈولیاں۔ پالکیاں۔ محافے۔ رتھ۔ بگھیاں۔ ریلیں طرح طرح کی خوبیوں کے ساتھ اپنی ہنرمندی سے بنائیں اور اُنکو کام میں لاتے ہیں اور اسی قدر نہیں بلکہ اس سے بڑھکر ہوا پر بھی حکومت کے ڈھنگ نکالے اور اُڑن کھٹولے اور ہوائی جہاز بنا کر ہوا پر بھی چل اُٹھے۔

ہمارے واسطے سواریوں کی ضرورت اُس وقت ہوتی ہے جب ہم بغیر اُن کے کام نہیں کرسکتے ورنہ ظاہر ہے کہ اپنی قوت کو کیوں محتاج دوسری قوّت کا کرتے لیکن ہماری کاہل وجودی نے اس امداد کا ہمیں خود ایسا محتاج بنا دیا کہ ہم نے اپنی قوّتِ جسمانی کو کھو دیا اور ہم پورے پورے نکمے ہو گئے۔ ہم محل استعمال اور ہم کو ہماری ضرورت بھول گئی۔

ابتدا اس طرح سے کیجیئے کہ (۱) ہم جب ایک منزل طے کرنا چاہتے تھے تو پیدل چلتے تھے (۲) جب یہ ہمکو باور ہوتا تھا کہ ہم اس قدر بُعد مسافت طے کرنے پر تھک جاویں گے اور منزل پھر بھی باقی رہ جاوے گی تو کسی نہ کسی سواری کو ساتھ لے لیتے تھے اور جب تھکتے تھے تو اُس پر چڑھ لیتے تھے (۳) ہمارے ہم سفر اگر بال بچّے ہوتے تھے جو ہمارا پیدل چلنے میں ساتھ نہ دیتے تھے تو ہم سواری میں اُن کو لے چلتے تھے اور جہاں تک ہماری قوّتِ رفتار ہماری معین ہوتی تھی ہم اپنی ذات خاص کے واسطے اُس کو کام میں ضرور لاتے تھے (۴) اگر ہم کسی ایسے عارضہ کے مبتلا ہوتے تھے جس سے ہم کو معذوری پیش آتی تھی تو سواری کا استعمال بالضرور کرتے تھے اور (۵) جب ہم کو اپنا تزک احتشام دکھلانا مصلحتاً مناسب ہوتا تھا تو سواری کا استعمال جائز رکھتے تھے اور بالامر (۶) ہم بار برداری کا کام سواری سے لیا کرتے تھے مگر اب زمانہ حال میں ہم بغیر سواری کے قدم اُٹھانا بھول گئے ہیں اور یہاں تک ہماری کاہل وجودی نے زور پکڑا ہے کہ اگر ہم ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں کو اپنے یا پرائے کام کو جاتے ہیں تو چاہے وہ ایک ہی دو میل ہو بغیر سواری کے نہیں جاتے حتّٰی کہ اگر اُس فاصلہ میں ریل جاری ہے تو چاہے جس قدر وقت ہمارا ریل کے انتظار میں گزر جاوے مگر اسٹیشن پر بیٹھے بیٹھے اُس کی آمد آمد کو تاکا کریں گے۔ جیب کے پیسے خرچ کریں گے اور اُس پر سوار ہو کر جاویں گے اور اُس کی

ہرگز پرواہ نہ کریں گے کہ پیدل جاتے تو ایک گھنٹہ میں پہونچ جاتے۔ پیسے بھی بچ جاتے اور انتظار ریل میں دو گھنٹے ضایع نہ ہوتے۔ یہ ہمارا نکماپن ہے۔

دوسری تمثیل

اندھیرے اُجالے ہم اپنے کام کرتے رہتے ہیں۔ دن کا کام جب ہم ختم کر پاتے تو رات کو بھی کام کرتے ہیں اور اپنی اس راحت کا وقت جو قدرت نے ہمیں بخشا ہے کام کرنے میں صرف کرتے ہیں اور چوں کہ چاند کی روشنی بھی ہماری بینائی چشم کو کافی نہیں ہوتی لہذا چراغ جلاتے ہیں اور اس مصنوعی روشنی کے واسطے ہماری ہنرمندی نے اس درجہ ترقی کی کہ طرح طرح کے لیمپ۔ لالٹین۔ شمع دان۔ فتیلہ سوز وغیرہ ایجاد کر لئے اور اس پر بھی ہنر کی ترقی نے حد نہیں کی گیس اور بجلی کی روشنیاں اور ان کے طرح طرح کے قندیل۔ زجاج۔ جھاڑ فانوس اور قباب وغیرہ بنائے۔ پہلے تو اسی پر قناعت کرتے تھے کہ روئی کی بتی بنائی تلوں کے تیل میں ڈبوئی اور چراغ میں تیل بھر کر بتی اس میں رکھکر جلادی اور چراغ کو چراغ دان (دیوٹ) پر یا کسی طاق پر اس غرض سے رکھ دیا کہ جگہہ کو روشنی دیتا ہے اور ہمارا کام ہوتا چلا جاے۔ مگر تساہل نے ہم کو پکڑ لیا اور کہنے لگے کہ بجلی کی روشنی ہوتے ہوئے کون اپنی آنکھیں دھیمی روشنی میں پھوڑے اور کاہے کو بتیاں بٹے اور چراغ جلاتا پھرے۔ اب ہم سارے فوائد اس دیا بتی کے بھول گئے نہ یہہ یاد رہا کہ ایک پیسہ میں رات بھر گھر کو جگمگاتے تھے سو اب پانچ روپے میں بھی ناممکن ہے ہم نے اپنی کفایت شعاری اور خفیف سی محنت کو اس صرف کثیر کی بدولت صدقہ کر کے پھینک دیا اور کاہلی اس کے ساتھ ساتھ خرید لی۔ اس موقع پر اُن فوائد کا ذکر کرنا مقصود نہیں ہے جو اُس دھیمی اور ٹھنڈی روشنی سے ہم کو حاصل ہوتے تھے۔ یہاں پر اسی قدر ظاہر کرنا تھا کہ بلحاظ روشنی بھی ہم نکمے بن بیٹھے۔ اور دوسروں کی امداد کے اس قدر محتاج ہوئے کہ اگر اندھیرا گھپ ہو جاوے تو ہمکو ہاتھ سے ہاتھ نہ سوجھے اور کوئی تدبیر اپنے گھر

روشنی کی دبن پڑے اور ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے رہیں۔

تیسری تمثیل

ہم اگر کسی دریا کے کنارہ بستے تھے تو اُس کا پانی پیا کرتے تھے یا قدرتی آبشار و جھرنوں کا پانی پیتے تھے یا کنواں کھودتے تھے اُس کا پانی پیتے تھے۔ اور ہماری جائے بود و باش کے لحاظ سے وہ ہمیشہ ہماری تندرستی قائم رکھتا تھا اور ہم نہانے دھونے اور پینے میں بالیقین آسانی پاتے تھے یہ ضرور تھا کہ کنوؤں کے کھودنے میں یا پانی کے بھرنے میں یا پانی کو اُس کی جگہ سے اپنے گھر لانے میں یا اُس کے موقع پر اس کو استعمال کرنے میں ہمیں بالیقین چلنا پھرنا اور ہاتھ پاؤں ہلانا پڑتے تھے جب پانی پینے کا مزہ آتا تھا۔ ہم پانی کے بہم پہونچانے میں ڈول۔ رسی۔ گھرنی اور گگری اور دیگر ظروف کا استعمال کیا کرتے تھے۔ اب ہم شہروں کے رہنے بسنے والے وہ سارا جر ثقیل بھول گئے اور ایسے اپاہج بن بیٹھے کہ جب تک نل میں پانی نہ آوے پیاسے مرا کریں۔ پانی کی ترہ ترہ کیا کریں مگر پانی کی بوند بھی نصیب نہ ہو۔ ہم اُن فوائد سے بھی محروم ہوئے جو ہمکو ہاتھ پاؤں چلا کر پانی پینے سے حاصل تھے۔ اور اب نل ہمارے گھر گھر دوڑا دئے جن کا پانی ہم گھر بیٹھے پیتے رہتے ہیں۔ ہمیں اُن نقصانات کا ذکر کرنا منظور نہیں جو نل کے پانی پینے سے ہوتے ہوں کیونکہ اُن کے نقصانات کی صورت مختلف مقامات کے لحاظ سے مختلف ہے مگر صرف یہ دکھانا منظور ہے کہ ہم ایسے نکمے پڑ گئے کہ جب نل ٹوٹ جاوے یا بند ہو جاوے تو ہمارے پاس کوئی دوسرا ذریعہ بہم رسانی آب کا باقی نہیں رہتا نہ ہم کچھ کر سکتے ہیں محض بے دست و پا ہو کر پڑے رہنے کے سوا اور کوئی بھی چارہ کار نہیں ہے فقط

تمثیلات متذکرہ صدر سے یہ مقصود نہیں ہے کہ ہماری ہنر مندی بے کار ہے۔ بالیقین بہت کار آمد ہے مگر بر محل و موقع محتاج حکمت ہے اور کسی صورت میں ہم کو نکما نہ بنا چاہئے۔ زیادہ تفصیل عبث سمجھکر ہم مضمون کو ختم کرتے ہیں۔ صدر کے لفظ کو بدل کر اس شعر کو حسب حال کہدینا بیجا نہ ہو گا کہ ؎ راحتیں پا کر نکمے ہو گئے ؛ ورنہ ہم بھی کوئی سے کام کے فقط راقم مرزا عرفان علی بیگ آئی ایس او۔ از آگرہ

نظم و نثر

مضمون کا میرے لطف اُٹھاتے ہیں قدرداں ٭ کھاناوہی ہے جس کو ہے کرتی زباں پسند

میرے مخدوم و مکرم و محترم بزرگ نواب مرزا محمد علی خاں صاحب کو جب سوجھتی ہے اُپج ہی کی سوجھتی ہے۔ اب بیٹھے بٹھائے نظم و نثر کے دنگل میں لے آئے بمصداق "مردو بہ مستاں یاد دہانیدن" آپ تو ایک سرسری چھوڑ کے الگ ہو گئے اب دونوں کی کشتی کا تماشہ دور سے دیکھ رہے ہیں ؎

عُریاں ہی دفن کرتے مجھے کوئے یار میں ٭ اک اور دوستوں نے لگائی کفن کی شاخ

اُردو ہندی یا ہندو مسلمانوں کا جھگڑا ابھی طے نہیں پایا تھا خدا جانے یہ اُونٹ کس کروٹ بیٹھے کہ یہ نئی گھنپ کی ٹھیری۔ الامر فوق الادب میں بھی ایک ٹوٹا پھوٹا مضمون لکھ کر لہو لگا کر شہیدوں میں داخل ہونا چاہتا ہوں کیوں کہ نواب صاحب ممدوح نے اس ناچیز کو بھی الٹیمیٹم دیا ہے۔ ع قرعۂ فال بنامِ منِ دیوانہ زدند۔ ورنہ اس گوشہ نشین کو اس جنابِ زرگری سے کیا تعلق؟ ؎

چہ خوش است باد و یکدل سرِ حرف باز کردن ٭ سخنِ گزشتہ گفتن گلہ را دراز کردن

جناب مرزا عرفان علی بیگ صاحب تو بڑے قلم کے دھنی ہیں اُنہوں نے پالا مار لیا۔ صاحب موصوف نے ہر پہلو کو مدِ نظر رکھ کے ایک مشرح مدلل اور مبسوط مضمون لکھا ہے۔ لکھا کیا ہے قلم توڑ دیا ہے ؎ اثر تو لوٹ لیا بات بات نے تیری ٭ رہا نہ کچھ بھی مرے عرضِ مدعا کے لئے ٭ انہوں نے کون سی بات چھوڑی ہے جو کوئی دوسرا لکھے اور اگر میری طرح کوئی لکھے گا تو اُسی مضمون کو کچھ اُلٹ پلٹ کر کے لکھدے گا ؎ حریفاں بادہا خوردند و رفتند ٭ تہی خم خانہا کردند و رفتند۔ ہمارے خان بہادر صاحب نے جو ایک پریزیڈنٹ کی حیثیت رکھتے ہیں پہلے ہی اپنی رائے ظاہر کر دی۔ میں نے مانا کہ وہ شاعر نہیں یعنی شعر نہیں کہتے مگر جوہرِ طبیعت موزوں رکھتے ہیں نہ کہیں یہ دوسری بات ہے

مگر کہہ تو سکتے ہیں۔ ہم نے یہہ بھی گھڑی بھر کو مان لیا کہ نہیں کہہ سکتے۔ ذرا ایک سیڑھی نیچے اُتر آیئے سمجھ تو سکتے ہیں یا اس میں بھی کسی کو شک ہو؟ میں کہتا ہوں کہ ہر کہ شک آرد کافر گردد ؎

شعر گفتن گرچہ دُر سُفتن بود ٭ لیک فہمیدن بہ از گفتن بود

ناصر۔ **ناشر** کے ماسوا سخن فہم۔ سخن سنج تو ضرور ہیں سخن گو نہ شد نہ شد۔ ہاں تو آپ نے یہہ فتویٰ دے دیا کہ **نظم سے نثر مشکل ہے**۔ اب فرمایئے کہ میر مجلس یہہ کہہ دے تو ماوشما کو کیا ضرور ہے کہ اُن کی رائے سے اختلاف کر کے مفت کی جھنجھٹ میں پڑے۔ ہمارے **میرزا صاحب** نے بھی اِقتدَیتُ بِھذَا الْاِمام کہہ کے یہی نتیجہ نکالا ہے اور شک نہیں کہ کافی چھان بین اور مالہٗ و ماعلیہ دیکھ بھال کے اس نتیجے پر پہونچے ہیں۔ میرے پاس تو اس کا مختصر سا یہہ جواب ہے ؎

ہر اک کے واسطے کب عشق کی دشوار منزل ہے ٭ جسے آساں ہو آساں ہے جسے مشکل ہو مشکل ہے

مجھے افسوس ہے کہ میں اپنے فاضل دوست **مرزا صاحب** سے اختلاف رائے کرنے پر مجبور ہوں میری رائے (ممکن ہے کہ وہ ناقص ہو) یہ ہے کہ نثر کے مقابلے میں **نظم مشکل** ہے۔ میرے دعوے کی سند یہہ ہے ؎ سخن گفتن دگر جاں سفتن است ٭ نہ ہر کس سزائے سخن گفتن است ٭

جناب **محمد علی خاں صاحب** ؏ اے بادِ صبا ایں ہمہ آوردۂ تست۔ آپ بھی کچھ بولیں گے یا مُنہ میں گھنگنیاں ہی بھرے بیٹھے تماشہ دیکھتے رہیں گے؟ ؎

گلہ ہو چشم سخن گو سے خامشی کا ہمیں ٭ دہن کے ہونے نہ ہونے میں کچھ کلام نہیں

یہ بات ٹھیک نہیں۔ آپ بھی نقادِ سخن اور صاحب سخن ہیں۔ نظم و نثر دونوں پر آپ قادر ہیں "جوڑی ہانکتے ہیں" ذرا میدان میں تشریف لایئے۔ آپ کی خموشی تو ؏ خموشی معنی دارد کہ در گفتن نمی آید ؎

وہ آنکھ اِشاروں میں کیا ساری باتیں کہہ نہ گی ٭ خدا کے واسطے رہنے دو کچھ زباں کے لئے ٭

آمدم برمطلب۔ سب سے پہلے تو مجھے یہہ ثابت کرنا ہے کہ ترجیح اور اولویت نظم کو ہے یا نثر کو۔ معلوم ہونا چاہیے کہ تقدّم کس کو ہے۔ جواب اس کا فریقین (ناظم و ناشر) بالاتفاق یہی دیں گے کہ نثر کو۔ نیچر (فطرت) نثر سکھاتی ہے نہ کہ نظم۔ بچہ ماں کے پیٹ سے نثر لے کے پیدا

پیدا ہوتا ہے نہ کہ نظم۔ دوسرے۔ اگر اولیت نظم کو ہوتی تو تمام کُتب سماوی نظم میں ہوتیں نہ کہ نثر میں خصوصاً قرآن شریف جس کی فصاحت اور بلاغت مسلّم ہے نظم میں نازل ہوتا نہ کہ نثر میں۔ نتیجہ یہہ نکلا کہ پہلے نثر بعدہٗ نظم۔ نثر سے نظم نکلی ہے نہ اس کے برعکس۔ لہذا نثر بڑی بہن ہے (بجائے ماں کے) نظم چھوٹی بہن ہے (بجائے بیٹی کے) نثر اصل ہے نظم فرع ان وجوہ سے بمصداق "الفضلُ للمتقدم" اولیت۔ بزرگی کلانیت اور ترجیح اور راجح ہونے کا فخر بجا طور پر نثر کو ہے نہ کہ نظم کو۔ قطعی اور کُلّا فیصلہ جس کا پریوی کونسل سے قولِ فیصل ہو چکا ہے یہ ہے۔ اِنَّ مِنَ الشِّعرِ لَحِکمَتہٗ وَاِنَّ مِنَ البَیَانِ لَسِحرًا اس سے بھی نثر ہی کو ترجیح ہے نظم حکمت ہے نثر سحرِ (حلال)۔

امر واقعی یہ ہے اور حق بات نگلی نہیں جا سکتی کہ نثر بادشاہ ہے اور نظم وزیر۔ دونوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے نثر کی رونق نظم سے ہے اور نظم کی نثر سے۔ نثر کا میدان بے حد و بے پایان لق و دق ہے۔ اس کھلے اور وسیع میدان میں اشہبِ قلم۔ بگٹٹ دوڑتا ہے۔ کہیں روک ٹوک نہیں۔ نظم کا میدان محدود اور تنگ ہے جو چاروں طرف سے قواعدِ عروض سے جکڑ بندی میں مقیّد و محصور ہے۔ سب سے پہلے تو بحور کے بحر میں شناوری کرتا ہے اُس کے باہر جا ہی نہیں سکتا۔ پھر قافیہ اور ردیف دو زبردست کانسٹبل ہردم مثل کراماً کاتبین کے مسلّط ہیں جو گھیر گھار کے ایک سکڑے رستے پر لاتے اور اُکسنے نہیں دیتے۔ نثر میں یہہ مصیبت کہاں کہ فلاں لفظ تقطیع سے گرتا ہے فلا حرف دبتا ہے۔ یہ مصرع ساقط الوزن ہے۔ یہ قافیہ نادرست ہے۔ بندش سُست ہے چست نہیں۔ یہ تعقید بے محل ہے۔ یہ شعر بھرتی کا ہے۔ یہاں توارد ہے۔ وہاں سرقہ ہے۔ غرض صدہا قسم کی رُکاوٹیں اور دقتیں ہیں کہاں تک گنواؤں۔ اُن کے دل سے پوچھو جو شعر کہتے ہیں۔ بتلائیے نثر میں یہ قدم قدم پہ ٹھوکریں کھانا کہاں ہے۔ جو دل میں آتا ہے وہی زبان پر ہے اور وہی قلم سے تراوش کرتا ہے۔ نثر میں جتنی سادگی۔ سلاست اور بے ساختگی ہے اُتنا ہی نظم میں تصنع اور بناوٹ ہے۔ نظم لکھنے بیٹھو تو اُسے وزن کی ترازو میں تولو۔ بحر کے سانچے میں ڈھالو پھر قافیے کو دیکھو بھالو۔ ہم کہنا کچھ چاہتے ہیں وہاں بحر اور وزن کچھ اور کہلواتے ہیں۔ ع من چہ می سرایم و طنبورہ من چہ می سراید

قافیہ جیسا کہ برجستہ اور جب یاں چاہیے ڈھونڈے نہیں ملتا یہاں تو اڑ گیا۔ ناچار مانی الذہن کا اظہار جس طرز اور جس پیرایہ میں ہم چاہتے ہیں ہو نہیں سکتا پس مجبوراً اُس خیال اور اُس مافی الضمیر طرز ادا کو چھوڑنا پڑتا ہے اور شعر کی پابندی کرنی پڑتی ہے اور جہاں یہ کیا سلاست رفو چکر ہوئی۔ کہیں اغلاق سے سابقہ پڑتا ہے تو کہیں تعقید گلا دباتی ہے۔ غرض یہ کہ نہ پائے رفتن و نہ روئے ماندن۔ نثر میں یہ پابندی کہاں؟ نثر کے میدان میں ہم کھلے بندوں ترارے بھرتے ہیں مگر نظم کے تنگ کوچے میں سکڑ سکڑا کے۔ داہنا بایاں۔ ٹھوکر بچا کر سمٹ سمٹا کر بدن چرا کر جانا پڑتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ نثر آمد ہے اور نظم آورد اور آمد اور آورد میں جو فرق ہے وہ ظاہر۔ نثر کی سادگی پر نظم کی بناوٹ تصدق ہے۔ نثر طلائے خالص ہے اور نظم ملمع کی انگوٹھی ؎

نہیں محتاج زیور کا جسے خوبی خدا نے دی ✣ کہ جیسے خوش نما لگتا ہے دیکھو چاند بن گہنے

اور اتنی دور کیوں جائیے ذوق فرماتے ہیں ؎

اے ذوق تکلف میں ہے تکلیف سراسر ✣ آرام سے ہیں وہ جو تکلف نہیں کرتے

اب نفسِ شاعری کو لیجئے۔ لوگ کہتے ہیں "شکار کار بے کاران ست"۔ میں ڈرتے ڈرتے کہتا ہوں "شاعری کار بے کاران ست" سرے سے شاعری کوئی قابلِ قدر یا باعثِ فخر یا شئ محمود نہیں بلکہ ذی علم اور بھاری بھر کم لوگوں کے لئے کسرِ شان اور تنقیصِ مرتبت سمجھی جاتی ہے۔ کیا آپ نے یہ مشہور مقولہ نہیں سُنا؟ "الشعرُ یزری بالعلمِ" یعنی شاعری عیب لگاتی ہے علم کو ؎

ولولا الشعر بالعلماءِ یزری ✣ لکنتُ الیومَ اشعرُ من لبیدٖ

شاعری کو لوگ نحس بھی کہتے ہیں۔ "راست و دروغ بر گردنِ راوی" کوئی شاعر خوش حال نہیں دیکھا گیا۔ غالب ہی کو لیجئے ہمیشہ مفلسی کے شاکی رہے اور ایسی بہت سی مثالیں ہیں۔ خیر اُس زمانے میں تو شعراء کی کچھ قدر تھی بھی اور اب تو کوئی کوڑی کو نہیں پوچھتا ؎

مجبور شعر کہنے کی عادت سے ہو گئے ✣ اس قسم اِس مذاق کی تو آبرو نہیں

کوئی ڈپٹی صاحب شاعر تھے اُنہوں نے کہا ؎

لوگ کہتے ہیں کہ فنِ شاعری منحوس ہے ؛ شعر کہتے کہتے میں ڈپٹی کلکٹر ہو گیا

کسی دل جلے نے اس کا جواب دیا ؎

تیری قسمت میں کمشنر ہونا ہی تو تھا لکھا ؛ شعر کہتے کہتے تو ڈپٹی کلکٹر رہ گیا

مولٰینا حالی مرحوم و مغفور بڑے جید ناثر و ناظم تھے انہوں نے ایک طویل نظم مناظرہ واعظ و شاعر کی لکھی ہے اُس کے چند اشعار یہاں تفریح طبع کے لئے لکھے جاتے ہیں۔ نظم۔

"شاعرِ مغرور بھی اک سمت خنداں زیرِ لب ؛ سُن رہا تھا لافِ اہلِ فضل اور خاموش تھا
دعوئے فضل و ذہانت اُس کو زیبا ہی یہاں ؛ جو کوئی تلمیذِ رحمن تم میں ہو میرے سوا
صاف ہوتا ہی بیاں اپنا خس و خاشاک سے ؛ پاک ہو جیسے وساوس سے دلِ اہلِ صفا
اتفاقاً گر کسی کی مدح پر آجائیں ہم ؛ خاطرِ دشمن میں اُس کا نقشِ الفت دیں بٹھا
خاک کو چرخِ بریں پر دیں اگر ترجیح ہم ؛ ماند ہو ذرّے کے آگے مہرِ تاباں کی ضیا
وصفِ خوباں ہم سے گر سُن پائے سالک ایک بار ؛ ہو نہ ہرگز بچۂ عشقِ مجازی سے رہا
گر کریں ہم گُل رخوں کی بے وفائی کا بیاں ؛ ہو نہ بلبل پھر چمن میں رو کے گل پر مبتلا
کھینچ دیں گر خاطرِ مشتاق کی تصویرِ شوق ؛ قیس کی کرنی پڑے لیلےٰ کو جا کر التجا
ہیں ہماری مدح کے پیر و جواں امیدوار ؛ اور ہماری ہجو سے تھرّاتے ہیں شاہ و گدا
گرمیٔ بزمِ حریفاں ہے ہماری ذات سے ؛ بادۂ گلگوں کا ہے ہر بات میں اپنی مزا
فکر اپنی لغزشِ اہلِ نظر سے پاک ہے ؛ ہم جہاں چلتے ہیں واں مسدود ہی راہِ خطا
کچھ نہیں اپنا ضرر گو ہو روایت میں خلل ؛ جھوٹ سے ہوتی ہے یاں رونق عبارت کو سوا
خودستائی جو کسی کو جز خدا بھبتی نہیں ؛ آکے ہو جاتی ہے شاعر کی زباں پر خوشنما
فحش اور دشنام کو ملتا ہی یاں رنگِ قبول ؛ گالیاں دے دے کے ہم سُنتے ہیں اکثر مرحبا

تصویر کا دوسرا رُخ

جب یہ بالا خوبیاں شاعر کی واعظ نے سنیں ؛ مسکرایا اور یہ فرمایا کہ لے ہذیاں سرا

شیوا تیرا بو الفضولی اور یہ لاف و گزاف ÷ پیشہ تیرا یاوہ خوانی اور اتنا اِدّعا
شعر مستحسن اگر ہوتا تو قرآں میں اُسے ÷ کیوں خلافِ عقل ختم المرسلیں کہتا خدا
شان میں بالعلم بیزری جس کے آیا ہی صریح ÷ فخر ہے اس شعر پر تجھ کو یہ اے شترا لورا
اس زبانِ یاوہ گو کو اپنی کیا سمجھا ہے تو ÷ جرم گو چھوٹا ہے اس کا جُرم ہی لیکن بڑا
بے حقیقت ہیں ترے سارے خیالاتِ بلند ÷ ہجو ہے تو بے اثر اور مدح ہے تو بے صفا
ہے جہاں خامے کو تیرے خدمتِ مشاطگی ÷ مورت اک پتھر کی ہے واں حورِ جنّت سی سوا
بال سے باریک تر معشوق کی تیرے کمر ÷ رات سے تاریک تر ہجرِ صنم میں دن ترا
شش جہت میں تو کرے برپا قیامت سات بار ÷ یار سے اپنے اگر دم بھر کو ہو عاشق جُدا
تیغِ چوبیں کی ہو گر تعریف بیاں کرنی تجھے ÷ ہے تنزل گر اُسے ٹھیرائے تو تیغِ قضا
ہو جہاں لکھنی تجھے اسپِ گلی کی جست خیز ÷ اک ترارے میں اُسے پہونچا دے تو فوق السما
تو ہوا مدح و ثنا میں جس کی سرگرمِ غلو ÷ اور اُلٹا خوبیوں پر اُس کے پردہ پڑ گیا
لکھے تو اک گربۂ مسکیں کو سارا منزلت ÷ اور کہے اک لُعبتِ سنگیں کو تو یوسف لقا
فی المثل گر ہو ترا ممدوح اک برگِ گیاہ ÷ اُس میں ثابت کر کے چھوڑے تو صفاتِ کبریا
شعر کو الہام سمجھے گر نصیبوں سے کبھی ÷ کان میں پڑ جائے تیرے ایک جھوٹی واہ وا
مذہبِ شاعر میں جس کا دینِ باطل نام ہی ÷ راستی اور صدق سے بڑھ کر نہیں کوئی خطا
سر بسر اقوال تیرے کچھ ہیں اور افعال کچھ ÷ ہے زبانِ گوہر افشاں پر نعم اور دل میں لا
شان میں آیا ہے جن کے قولِ مَا لَا یَفْعَلُوْن[1] ÷ چشمِ بد دور آپ کے ہادی ہیں وہ اور مقتدا
ایسے درد انے بہت کم پائیں گے آفاق میں ÷ جن پہ صبح و شام تو نے دی نہ ہو جا کر صدا
ہے زبانِ خامہ تیری تابعِ فرمانِ حرص ÷ کام تجھ کو کچھ نہیں جز مدح و قدحِ اغنیا
مدح میں حد سے زیادہ جن کی کرتا ہے غلو ÷ گالیاں دیتا ہے اکثر تو اُنہیں کو بر ملا

[1] قرآن شریف میں شعرائے جاہلیت کی نسبت فرمایا ہی کہ اِنَّھُمْ یَقُوْلُوْنَ مَا لَا یَفْعَلُوْنَ یعنی وہ کہتے ہیں جو نہیں کرتے ۱۲-

بندۂ عرض ہنر میں مانگتا ہے بھیک تو ۔ گر یہی ہے شاعری تو تجھ سے بہتر ہے گدا

مولینا حالی کی بات کو شاید آپ نہ مانیں اور اس کان سن کر اُس کان سے اُڑا دیں کہ یہ نظم بھی شاعری کی تک بندی اور مبالغے میں داخل ہے مگر متعدد جگہ قرآن شریف میں شعراء کی بُرائی آئی ہے۔ حامیانِ شعر گوئی اور دل دادگانِ و مدحت سرایانِ شعراء کے پاس اس کا کیا جواب ہے؟

(۱) اَمْ یَقُوْلُوْنَ شَاعِرٌ نَّتَرَبَّصُ بِهٖ رَیْبَ الْمَنُوْنِ۔ (۲) بَلْ قَالُوْٓا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍۢ بَلِ افْتَرٰىهُ بَلْ هُوَ شَاعِرٌ۔ (۳) اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِیْمٍ وَّ مَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ۔ (۴) وَیَقُوْلُوْنَ اَئِنَّا لَتَارِكُوْٓا اٰلِهَتِنَا لِشَاعِرٍ مَّجْنُوْنٍ۔ (۵) وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا یَنْۢبَغِیْ لَهٗ۔ (۶) وَالشُّعَرَآءُ یَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ (۷) اِنَّهُمْ یَقُوْلُوْنَ مَا لَا یَفْعَلُوْنَ۔

بہرحال جن کو شاعری کی لت پڑ گئی ہے اُن کو یہ شغل مبارک مگر سادگی اور بے ساختگی کا محفوظ و مصئون طریقہ تو نثر ہی ہے۔ شاعری کی مشکلات بہ مقابلہ نثر کے ہم اوپر بہ صراحت لکھ آئے ہیں۔ جس کا دل چاہے اُسے محک امتحان پر کس لے۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے۔ جب تک ہم سوچ سوچ کے دماغ پر زور ڈال کے اور لفظوں کو اُلٹ پلٹ کر کے دس گیارہ شعر کی ایک غزل کہیں گے جس میں نصف سے زیادہ شعر بھرتی کے ہوں گے۔ ہم کھلے بندوں دو صفحے نثر کے بلکہ اس سے بھی زیادہ لکھ سکیں گے اور طبیعت پر کچھ بار نہ ہوگا۔ اگر نظم و نثر دونوں میں کسی شخص کو کمال ہے تو ایسے ذوجہتیں شخص کے قدم چومنے چاہئیں کہ چُپڑی اور دو دو۔ ایسوں کا کیا کہنا۔ ہم مانتے ہیں کہ نثر میں حسب موقع اشعار آبدار ایسی بہار دکھاتے ہیں جیسے سادہ زیوروں میں جڑاؤ زیور۔ نثر کو نظم سے نہ صرف مدد ملتی ہے بلکہ عبارت کی برجستگی۔ دلچسپی۔ شگفتگی اور کشش یا یوں کہو کر رونق اضعافاً مضاعفہ ہو جاتی ہے۔

سخن را بدستورِ خرد مند ۔ زنظم و نثر باید داد پیوند ۔ کہ گاہے طبع زیں آرام یابد ۔ زمانے زاں دگر ہم کام یابد

اس معنوں سے نظم کا اشکال تو اظہر من الشمس و ابین من الامس ظاہر ہو گیا کہ نثر کے مقابلے میں نظم مشکل ہے۔ نثر آزاد و بے قید ہے نظم پابند و مقید۔ شاید لوگ کہیں کہ تو نیا شاعر ہے تجھے نظم میں دقت معلوم

ہوتی ہوگی جو کہنہ مشق شاعر ہیں اُن کے لئے شعر موزوں کرلینا اُن کے "بائیں ہاتھ کا کھیل ہے" (مگر لکھا دائیں ہاتھ سے جاتا ہے اور جو لکھتا ہے وہی جانتا ہے) اس میں مجھے بھی کلام نہیں لا کلام اُن کو بمقابلہ مجھ ہیچمدان کے ضرور آسان ہے۔ مگر پھر میں یہی کہوں گا کہ نظم کرنا لوہے کے چنے چبانا ہے۔ کیسا ہی ماہر شاعر ہو مگر اُسے بھی فکرِ سخن میں غور و خوض کے بدون چارہ نہیں طبیعت پہ زور ڈالے بغیر یہ گتھی نہیں سلجھتی ورنہ آمیر مینائی جیسا شاعرِ ذی کمال و بے بدل یہ نہ کہتا ؎

آمیر اک مصرع ترتیب کہیں صورت دکھاتا ہے ٭ بدن میں خشک جب ہوتا ہے شاعر کا لہو برسوں

رہا میں نہ ناثر نہ شاعر۔ میری وہی مثل ہے ہیشِ مُلّا طبیب و پیشِ طبیب مُلّا و پیش

ایسی قسمت تھی کہاں کرتا جو میں کسبِ کمال

بے کمالی میں بھی افسوس کہ کامل نہ ہوا

حررہٗ حقیر بشیر

(مولوی بشیر الدین احمد رئیس دہلی)

کشّاف۔ صوبۂ پنجاب کے کثیر التعداد رسائل میں "کشاف" کا اور اضافہ ہوا ہے جو ہر انگریزی مہینہ کی بائیس تاریخ کو امرتسر سے انکشافاتِ حکمیہ۔ اجتہاداتِ علمیہ۔ ارشاداتِ عملیہ۔ رموزاتِ ادبیہ اور اقتباساتِ نادرہ کے ساتھ شایع ہوا کریگا۔ اس میں ادبی حصہ کے ذمہ دار جناب غلام حسین بشرہ۔ اور علمی کے جناب ایم محمد الدین غریب ہیں۔ "علمیات" کے تحت میں عملیات۔ اجتہادات۔ مصنوعات۔ انکشافات۔ روحانیات۔ تفریحات۔ تاثیرات۔ انعامیات سب کچھ ہیں ٭ تازہ بتازہ پھڑکتی ہوئی غزلیات۔ عشق و محبت کی دل ہلا دینے والی داستانیں اور حیرت انگیز فسانے بھی نذرِ ناظرین کرے گا ٭ غرض اپنی قسم کا پہلا رسالہ دیکھنا چاہو تو صرف ۱۲؍ بھیجکر منیجر رسالۂ "کشاف" امرتسر سے منگالو ٭

مرزا مظفر حسین بیگ (علیگ)

اُردو کی ترقی کس طرح ہو سکتی ہے؟

اس سے پہلے ایک مضمون اُردو زبان کے متعلق لکھا گیا ہے جس میں ہم نے اُن برادران وطن کو متنبہ کیا تھا جو اُردو زبان کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اُردو کا نام مٹا دیں۔ آج اُن اصحاب سے کچھ عرض کیا چاہتے ہیں جو اُردو کے ہوا خواہ ترقی خواہ ہیں۔ ان کا قول ہے کہ جس قدر اُردو رسالے روزانہ ماہانہ۔۔ اور اخبارات کثرت سے جاری ہوں گے اور اُن کی قدر و منزلت کی جاویگی اُسی قدر اُردو کی ترقی ہوگی۔ مگر ہماری رائے اس کے خلاف ہے۔ اُردو اخبار اور رسالوں کی کثرت سے یہہ تو ممکن ہے کہ اُردو کا رواج زیادہ ہو مگر اُردو کی ترقی کیوں کر ہوگی۔ اگر یہہ حضرات ترقی کے لفظ کو اس معنی میں استعمال کرتے ہیں کہ اس کا زیادہ رواج ہو تو خیر اور اگر ترقی سے یہہ مراد ہے کہ یہہ زبان وسیع ہو اور دُنیا کی دوسری وسیع اور فصیح زبانوں کے لگ بھگ ہو تو اس کی تدبیر اور ہے۔ ہر ایک شخص جانتا ہے کہ زبان اُسی ملک کی وسیع ہوتی ہے جس کی حکومت ہو دولت ہو جس کا تمدن بڑھا ہوا ہو اس لئے کہ ان باتوں کو زبان کی ترقی اور وسعت میں بڑا دخل ہے۔

جب تک ہندوستان میں دہلی کی بادشاہت قائم رہی اُردو نے ترقی کی۔ جب دہلی کی دولت و حکومت کو زوال ہوا اور لکھنؤ میں دہلی سے قریب نئی بادشاہت قائم ہوئی تو دہلی کے اہل کمال سمٹ کر لکھنؤ پہونچے۔ اُدھر لکھنؤ والوں کو شوق ہوا کہ پوربی زبان کی جگہہ اُردو کی سرپرستی کی جاوے۔ پس وہاں کی نئی دولت حکومت اور تمدن کا یہہ اثر ہوا جو دیکھ رہے ہو۔ اب انگریزوں کی ہندوستان میں حکومت ہے اُنہیں کا تمدن انہیں کی دولت اُنہیں کا علم و ہنر پر قبضہ ہے صدہا ایجادات ہزاروں انکشافات اختراعات کا دریا بہہ رہا ہے۔ ہزار ہا چیزیں استعمالی یورپ سے یہاں آرہی ہیں اور نئے نئے انکشافات ہو رہے ہیں وہ سب چیزیں اپنے اصلی ناموں کے ساتھ

اردو میں داخل ہو رہی ہیں۔ کہا تو یہہ جاتا ہے کہ اُردو اصل میں وہی ہے جو دہلی لکھنؤ کی زبان ہے جن الفاظ جن محاوروں جن اصطلاحات کو دہلی لکھنؤ والے خاص کر چکے ہیں اُن کے سوا کوئی نیا لفظ نیا محاورہ بولا نہ جاوے اور دہلی لکھنؤ والوں کو اس پر بڑا فخر ہے ایک کہتا ہے ؎ اُردو ہے جسکا نام ہمیں جانتے ہیں داغ ہندوستاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے ۔ دوسرا کہتا ہے ؎ اُردو کا دعوے لکھنؤ والوں کے سامنے اظہار بوئے مشک غزالوں کے سامنے۔ مراد یہہ ہے کہ جس نے اُردو میں ہماری پیروی کی وہی اُردو والا ہے باقی سب گنوار ہیں۔ مگر دہلی لکھنؤ والوں سے کوئی یہہ تو پوچھے کہ ایجادات اور انکشافات کا جو سیلاب یورپ سے ہندوستان کو آرہا ہے یہہ تمہارے روکے رُک سکتا ہے یا نہیں؟ اور اب تک تم نے کچھ اس کو روک لیا۔ جب یہہ طے ہو گیا کہ زبان اُسی مُلک کی رواج پاتی ہے جس کے ہاتھ میں دولت حکومت ہو علوم و فنون ہوں جن کا تمدن معراج کمال پر ہو اور یہہ سب آج انگریزوں کے ہاتھ میں ہے اور اِس وجہہ سے ہزار ہا نئے انگریزی ناموں کا اُردو میں اضافہ ہو رہا ہے اور اُردو والے اِس سے غافل ہیں تو آگے چلکر اس زبان کا حشر کیا ہوگا یہہ زبان لکھنؤ دہلی والوں کی رہے گی۔ یا بمبئی مدراس بنگالے والوں کی جہاں انگریزی کا زیادہ رواج ہے۔ اگر موٹر۔ سائیکل۔ انجن۔ ٹرام اسٹیشن وغیرہ ہزاروں انگریزی الفاظ کی جو اُردو میں شامل ہو چکے ہیں اُن کی تحقیقات کی ضرورت ہو تو کیا دہلی لکھنؤ والوں سے پوچھا جاویگا کہ صحیح لفظ کیا ہے یا بمبئی مدراس والوں سے جن کی انگریزی تم سے بہتر ہے۔ اگر آج میر۔ سودا۔ انشاء اللہ۔ ناسخ۔ آتش۔ انیس۔ ذوق۔ غالب۔ مومن خاں زندہ ہوتے اور اُن سے کہا جاتا کہ فونوگراف میں آپ کی غزل سُنی گئی یا آپ کے رفع بخار کو ڈاکٹر نے کونین دس گرین تجویز کی قس علیٰ ہذا تو وہ کیا سمجھتے۔ یا یہہ اُن کے اختیاری بات تھی کہ اِن الفاظ کو اُردو میں نہ داخل ہونے دیتے۔ خلاصہ یہہ ہے کہ ہماری رائے یہہ ہے کہ اُردو کے ہوا خواہ اور ترقی چاہنے والے اگر اُردو کی وسعت چاہیں تو یہہ کام کریں کہ جس چیز کے نئے نام رکھنے کی ضرورت ہو اُس کا مناسب نام اردو سے تلاش کر کے رکھیں اگر اُردو میں کوئی ہم معنی لفظ نہ میسّر آوے تو اُردو زبان سے ملتا جلتا نام تجویز کریں۔ یہہ بھی نہ کریں کہ جو علمی اصطلاحات فارسی

عربی سنسکرت

عربی سنسکرت کے اول سے اُردو میں شامل ہو چکے ہیں اُن سے قطع نظر کریں۔ جیسا مرزا قتیل نے علم منطق کے مصطلحات کو بدلا تھا مثلاً (معنی) کو مراد کا گھر (سالبہ کلیہ) کو پورا توڑ (تصدیق) کو بھرپور وغیرہ ایسا بھی نہ ہونا چاہئے ہے۔ بلکہ عرب والوں کی تقلید کرنا چاہئے۔ آپ کو معلوم ہے کہ اسلام عرب سے نکلا اور عربوں نے اپنے علوم وفنون کو اسلام کے ساتھ ساتھ دنیا میں پھیلایا اول اول اُنکو کوئی مشکل پیش نہ آئی کیونکہ جو کچھ ایجادات انکشافات ہوئے اُنہیں کے ملک والوں کے ہاتھوں ہوئی۔ پھر دور آخر میں اہل عرب سے اہل عجم ہر بات میں بازی لے گئے۔ ایران کا تمدن معراج کمال پر پہونچا۔ ان کی فتوحات کی دولت کی کوئی حد نہیں رہی ان میں ہر علم وفن کے ایسے کامل پیدا ہوئے کہ اہل عرب نے ان کا لوہا مانا اس سے زیادہ کیا ہوگا کہ خاص عربی زبان کی (لغت) قاموس نامی ایک عجمی نے لکھی اور ایسی لکھی کہ اُس سے بہتر عرب والے نہ لکھ سکے تدوین لغت میں اہل عرب کے نزدیک وہ مستند قرار پائی۔ امام مالک عرب کے مجتہد ابوحنیفہ عجمی سے بازی نہ لے جاسکے استنباط استخراج مسائل جزئیہ فقہ میں امام اعظم کہلائے۔ خاص عربی زبان کے قواعد نحو میں شرح جامی سے بہتر کوئی نہ لکھ سکا قیاس کن زگلستان من بہار مرا

مگر دکھلانا یہاں یہہ ہے کہ باوجود اس کے کہ آخری دور میں عرب پر عجم غالب آگیا تو بھی عربوں نے اپنی زبان کی حفاظت میں سہو غفلت اور بے پروائی نہ کی۔ جو کچھ عجم سے نئی معلومات کے نتائج اور انکشافات عرب نے پائے اُن کو اپنی زبان میں اس طرح سے لیا کہ یہہ معلوم نہ ہو سکا کہ یہہ لفظ عجمی ہے اُس کو بڑی خوبی سے معرب کیا۔ عرب کی یہہ دانشمندی قابل تعریف ہے کہ اُنہوں نے عہد ترقی اور تنزل دونوں میں اپنی زبان کی حفاظت کی اور اپنی زبان کو کسی کا دست نگر نہ ہونے دیا یعنی دور اول میں جب عرب دنیا کے مالک ہوئے اور مصریوں یونانیوں سے علوم وفنون لئے تو اُن علوم کی مصطلحات اور الفاظ کو یہاں تک کہ اُس مُلک کے باشندوں کے اصلی ناموں کو بھی عربی کا جامہ پہنایا کہ مشکل سے پتہ چلا کہ فلاں عرب تھا یا یونانی۔ ارسطو افلاطون وغیرہ ناموں کو بھی بغیر بدلے اپنی زبان میں نہ لیا۔ دورِ آخر میں بھی عجمی الفاظ کی یہی گت کی کہ اُن کو عربی بنالیا۔

بس بہار اپنی

بس ہمارا یہہ کہنا ہے کہ اگر آج خدا نے ہندوستان کو یورپ کا محتاج کیا تو مضائقہ نہیں کہ یہہ ہندوستانیوں کے بس کی بات نہیں مگر یہہ تو اختیاری بات ہے کہ جو انگریزی نام اردو میں داخل کئے جاویں اُن کو اُردو کا لباس پہنا دیا جاوے۔ کہ وہ انگریزی کی نہ معلوم ہوں۔ لفظ کی صورت بدلنا کچھ مشکل نہیں۔ ایک صاحبِ منصب انگریز جب خفا ہوتے تو کہتے تھے کہ آئی ایم وقننگ یعنی میں دق ہو رہا ہوں۔

خلاصہ یہہ کہ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھے رہنے سے کام نہیں چلیگا کچھ غور و فکر سے کام لینا چاہئے ہے۔ ہر اخبار میں فہرست اُن الفاظ کی شایع کرنا چاہئے کہ جو اُردو لباس پہنائے جاویں نئی اصطلاحات کی ضرورت ہو تو نئے اصطلاحات کو عام کیا جاوے۔ اگر ایسا نہ ہوا تو دیکھوگے کہ قریب تر زمانے میں اردو زبان دہلی لکھنؤ کی معتبر اور مستند نہ ہوگی بلکہ کلکتہ مدراس بمبئی کی اُردو قابلِ سند ہوگی۔ جہاں انگریزی اچھی بولی جاتی ہے۔

ہمارے زمانہ کے نوعمر تعلیم یافتہ بھی اُردو پر ظلم ڈھا رہے ہیں کہ بے ضرورت انگریزی الفاظ اُردو میں بولتے ہیں۔ خدا رحمت کرے سید محمود مرحوم فرزند سرسید پر کہ اُن کو بارہا اُردو بولتے دیکھا مگر باوصف اعلیٰ انگریزی دانی کے ایک لفظ بھی انگریزی کا نہ بولتے سنا حالانکہ سرسید کو یہہ احتیاط نہ تھی۔ فقط باقی باقی

مرزا محمد علی (خاں صاحب) رئیس دہلی۔

"عندلیب"

ماہِ فروری سنہ حال میں خورجہ (یوپی) سے "عندلیب" نامی ایک ماہوار رسالہ شایع ہوا ہے۔ اس کے مقاصد میں جہاں علم و ادب کی خدمت کرنا ہے وہاں یہ بھی اُس کے فرائض میں داخل ہوگا کہ زبان کو ادق الفاظ اور غیر مانوس ترکیبوں سے حتی الوسع پاک رکھا جائے۔

چمنستان اردو دہلی

چنانچہ اُردو کی موجودہ اندھا دُھند تقلید اور غلط روش پر مرثیہ خوانی کے واسطے "عندلیب" نے سب سے پہلی اواز اُٹھائی ہے۔

جناب ہلال احمد زبیری اڈیٹر "عندلیب" قابل مبارکباد ہیں کہ انہوں نے بہی خواہانِ اُردو سے اپنے رسالہ کا تعارف ایسے نازک وقت میں کرایا جب کہ "اُردو بازار" شیطانی لشکرگاہ بنا ہوا ہے۔ جو جس کے ہاتھ لگا لے اُڑا۔ اور جس کا جدھر مُنہ اُٹھا چل دیا۔ کوئی ماوعل سامنے ہے نہ کوئی منزلِ مقصود پیشِ نظر۔ حضرت احسن مارہروی کا مضمون "اصلاحِ اُردو" اس نمبر کی جان ہے۔ اُردو زبان کی تحقیق و تدقیق میں جو کاوش و جانفشانی مولانا فرما رہے ہیں وہ میری داد سے بالاتر ہے۔ خصوصاً ۱۸۵۷ء سے قبل اور اس کے بعد کی اُردو کے نمونے اس خوبی سے پیش کرنا اُنہیں کا حصہ ہے۔

"تحریک اتحاد تورانی" جیسی اہم سیاسی بحث کو ادبی مضمون بنا دینا بھی مولانا ظفر علی خاں بی۔ اے (علیگ) ہی قلم کا کام ہے۔

مولوی سعید احمد مارہروی کی تالیف "مخزن الآثار" سے واقعی اُردو ادب میں ایک معتدبہ اضافہ ہو جائیگا۔ یوں تو فنونِ لطیفہ سے عموماً مسلمانوں کو کچھ نہ کچھ شغف رہا ہے مگر فنِ تعمیر میں مسلمان خاص طور پر مسلم الثبوت اُستاد مانے گئے ہیں۔ مصر۔ اندلس۔ ایران و ہندوستان کے آثار الصنادید گزشتہ اسلامی جدتوں کی ابتک غمازی کر رہے ہیں۔ ناظرینِ عندلیب کے لئے یہ تاریخی سلسلہ نہایت دلچسپ اور پُر از معلومات ہوگا۔

نظم میں جناب جوش ملیح آبادی کی "صنفِ نازک اور مزدوری" اور قاضی اشتیاق حسین قریشی کی "برکھا رت" خوب ہے۔ اگرچہ اس سے پیشتر خواجہ الطاف حسین حالی۔ مولوی سیف الحق ادیب اور مولانا عبدالله شائق وغیرہ نے بھی اس پر خوب خوب طبع آزمائیاں کی ہیں مگر قریشی صاحب کی "برکھا رت" میں ایک نئی بہار ہے۔

مَیں آخر میں مدیرِ "عندلیب" سے گزارش کرونگا کہ وہ عنوانات کے انتخاب میں اختصار کو ملحوظِ خاطر رکھیں تو بہت بہتر ہوگا۔ "عندلیب" کے لئے ایک سیاسی ادیب کا مشورہ" اور اسپر مدیر کی قلم سے پورے ایک صفحہ کا نوٹ کسی قدر غیر موزوں معلوم ہوتا ہے۔ چار لڑکا "صحبو" کے عنوان کا پہلا حصہ ایک حد تک غیر ضروری اور نامناسب سا ہے۔ افسانے کی سُرخی صرف "صحبو" ہی کافی ہوگی۔

باقی (آئندہ)

باقی رسالہ ہر حیثیت سے اچھا ہے "برکھا رت" کے زیر عنوان شروع میں جو تصویر دی گئی ہے اس کے لئے "چشموں نے بلندی سے گر گر مینوں تک شور مچایا ہے" کے مصرع کا انتخاب قابل تعریف ہے۔ اور آئندہ کے واسطے تصاویر کے مستقل انتظام کا وعدہ بھی نہایت امید افزا ہے۔ لکھائی چھپائی از بس غنیمت ہے۔ تین جز کے لئے سالانہ چندہ للعہ کچھ زیادہ نہیں ؛

(مرزا مظفر حسین دہلوی - علیگ)

انشاء بشیر

ہندوستان میں اس زمانہ کے تعلیم یافتہ گروہ سے پہلے جو مکتبی تعلیم کا سلسلہ جاری تھا اُس میں منجملہ دیگر علوم و فنون کے انشاء پردازی مضمون نگاری اور خوش خطی پر عام طور سے زیادہ توجہ کی جاتی تھی جو اس میں کمال رکھتے تھے اُن کو منشی کہا جاتا تھا۔ ہندو مسلمان شریف زادے انشا پردازی خوش خطی کو بہت ہی ضروری جانتے تھے یہاں تک کہ شہزادے اور امیر زادے دوسرے علوم و فنون حاصل کرتے نہ کرتے مگر انشا پردازی خوش خطی کو اپنے لئے لازمی جانتے تھے کیونکہ بدخطی اور املا انشا کے نقص کو بہت بُری نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔ فی زمانہ اُس پر کسی کو توجہ نہیں ہے۔ صرف (جناب من) لکھ کر ساری خط کتابت پوری کی جاتی ہے نہ القاب سے بحث نہ آداب سے۔ خوشخطی کی یہ گت ہے کہ اگر مطابع نہ ہوتے اور کاپی نویسوں کی ضرورت باقی نہ رہتی تو خوشخطی کا کوئی نمونہ بھی دیکھنے میں نہ آتا۔ بعض نے اُردو میں انشاء لکھی ہیں مگر وہ سب بے کار ہیں اُن سے مضمون آفرینی کی قوت پیدا نہیں ہوتی۔ اُن کو پڑھ کر تہنیت تعزیت۔ عیادت۔ مزاج پرسی تک کے دو حرف نہیں لکھنے آتے انشا پردازی کے معنے کچھ اور ہیں۔ اس ضرورت پر نظر کرتے ہوئے

ہمارے سچے دوست مولوی بشیر الدین احمد صاحب اول تعلقہ دار ممالک نظام نے جو مولوی ڈپٹی ڈاکٹر حافظ محمد نذیر احمد صاحب کے فرزند رشید ہیں ایک انشاء اردو میں لکھی ہے خاص کر کے وہ لکھی تو گئی ہے شریف خاندان کی لڑکیوں کی ضرورت سے مگر وہ لڑکوں کے لئے بھی کارآمد ہے۔

سارے ہندوستان میں ڈپٹی ڈاکٹر مولوی نذیر احمد صاحب سے شاید ہی کوئی واقف نہ ہو اور ان کی بے نظیر تالیف و تصنیف سے شاید ہی کوئی بے خبر ہو کیوں کہ وہ اپنی تقریر و تحریر کا قریب قریب سارے ہندوستان میں سکہ جما گئے ہیں۔ جو کتاب لکھی لاجواب لکھی ہزاروں کے انعامات گورنمنٹ سے حاصل کئے علمی مجالس سے ڈگریاں حاصل کیں ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک شہرت حاصل کی مگر اب وہ زندہ نہیں ہیں۔ مسلمانوں کی حالت دیکھتے ہوئے ممکن تھا کہ ان جیسا صاحب کمال اب دیکھنے میں نہ آیا۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ خود انہیں کے صاحبزادگی خدا نے ان جیسے پیدا کر دئے یہ نہ تحریر میں ہیٹے نہ تقریر میں نہ نظم میں نہ نثر میں ایسے نامور باپ کے ایسے ہی فرزند ہونا چاہئے تھے۔ الولد سرٌ لابیہ بہ لحاظ معلومات اور علم و فضل کے اپنے والد ماجد سے زیادہ نہیں تو کم بھی نہیں ہیں۔ انگریزی میں فارسی میں اردو میں عربی میں غرض کسی میں بند نہیں تالیف و تصنیف میں کچھ اپنے والد سے بھی زیادہ ہیں اکثر کتابیں انکی طبع ہو چکی ہیں مگر اس وقت ہم کو ان کتابوں سے بحث نہیں اس وقت ہمارے روبرو ان کی وہ انشاء اردو ہے جس کا اوپر تذکرہ ہوا ہے یہ عجیب کارآمد اور مفید کتاب ہے۔ نام کو چند معمولی خطوط کا مجموعہ ہے مگر حقیقت میں نوعمر ناکتخدا شریف خاندانوں کی لڑکیوں کے لئے ایک مہذب تجربہ کار استانی کا کام دیگی۔ یوں تو ہر انشاء کے پڑھنے سے خط کتابت میں مہارت حاصل ہو جاتی ہے۔ مگر وہ باتیں رہ جاتی ہیں جن کی بڑی ضرورت ہے۔ یعنی کتاب ایسی ہو کہ اس کے پڑھنے سے لڑکیوں کی حیا بڑھے سلیقہ مندی بڑھے۔ ماں باپ کی خدمت گزاری شکر گزاری کی توفیق ہو۔ نشست برخاست ادب آداب کی آدمیت ہو۔ گفتگو میں حفظ مراتب میں مراسم کنبہ داری میں تمیز ہو۔ دین داری خدا پرستی کا شوق ہو۔ جب بیاہی جائیں تو امور خانہ داری میں سلیقہ شعاری میں خاوند کے ساتھ وفاداری

میں اپنی ہم عمروں میں ممتاز ہوں اگر صاحب اولاد ہوں تو بچوں کی پرورش میں اُن کی غور پرداخت میں بوجہ احسن حصہ لیں سُسرال والوں سے مُٹ بھیڑ ہو تو اُن کی نظروں میں عزت و وقار ہو۔ اگر کتاب ہے اور اُس کے پڑھنے سے ان مقاصد کی تکمیل نہ ہو اور محض عشق و محبت کے افسانے ہوں۔ بدتمیزی بدسلیقگی آزادی بڑھے تو ایسی کتاب پڑھنے سے یہہ بہتر ہے کہ لڑکیوں کو ان پڑھ رکھا جاوے۔ ہم جہاں تک دیکھتے ہیں مولوی صاحب کی اس انشاء میں ان امور کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ اور اُن خیالوں سے کتاب کو بچایا گیا ہے جن سے بچانا ضرور تھا۔ خلاصہ یہہ کہ انشاء میں وہ تمام باتیں بڑی خوبی سے لکھی گئی ہیں کہ جن کی ضرورت تھی۔ لکھنے والے کا بڑا کمال اسی میں پایا جاتا ہے کہ جو ضرورت ہو اُس پر کتاب لکھنے سے پہلے نظر کرے۔ فقط

(مرزا محمد علی خاں)

جناب مہدی حسن مرحوم کے پُرانے خطوں سے چند سطریں

× × × × × × × × × × × × × × ×

"مجھ کو آپ کے لٹریچر کے ساتھ جو خاص تعلق ہے اور جس حد تک میں آپ کے مختصر النوع اور لطیف انشا پردازی پر مٹا ہوا ہوں اُس کی تفصیل عنقریب آپ مشرق میں دیکھینگے۔ یہہ چند سطریں صرف سلام "روستائی" کی حیثیت سے ہیں" × × × × × × ×

× × × × × × × × × × × × × × ×

"کل لکھ چکا ہوں پھر جی نہیں مانتا۔ × × × × × × × × × × × ×

میں آپ کو اگر جلد جلد لکھوں تو اس سے آپ پر تقاضہ منظور نہیں۔ یعنی اخلاق کیوجہ سے لازمی نہیں کہ جواباً خطوں کی تعداد ترکی بہ ترکی پوری کرتے رہئے۔ کم لکھئے۔ مگر جب لکھئے زیادہ لکھئے × × × × × ×

(فدائی۔ مہدی حسن)

صلائے عام فروری سنہ ۱۹۲۵

خان بہادر کو ماشاء اللہ اِک نئی بات سوجھتی ہے - اس پرچہ میں مضمون پریشان میں دلقِ گدایاں کی پیوند پاری کی ہے - گزی گاڑھے کی قسمت تو کوئی دیکھے کہ ریشمی لباس میں اپنا پیوند لگایا ہے -

صلائے عام کی ذیل میں عجب خوبصورت اور پُرمذاق فقرہ یہ لکھا ہے کہ "غیروں کی پونجی سے دُکان کا کام نکل گیا - میں یہ عرض کروں گا کہ خان بہادر بڑے بھاری خریدار ہیں اور جو سودا کرتے ہیں وہ دیکھ بھال کے کرتے ہیں - پس غیروں کی پونجی میں بھی کچھ دیکھ لیا ہوگا جب تو دکان چل اُٹھی بقول شخصے متاعِ نیک از ہر دکان کہ باشد - **صلائے عام** کے مضمون از بس قیمتی ہیں اور اپنے ہیں غیر کے نہیں ہیں - فقط خدا کرے آپ کی طبیعت اچھی رہے -

"دیر و حرم کا فسانہ" - اس میں جناب سید وصی احمد صاحب بلگرامی نے سخن طرازی میں ایک جدت پیدا فرمائی ہے - اس نے عجب لطف پیدا کر دیا ہے - لیکن یہ دلچسپ معاملہ "کون کتنے پانی میں ہے" بغیر تاریخ دانی کے حل ہونا مشکل ہے اور جو تاریخ و جغرافیہ داں ہیں اُن کے واسطے تو نعمتِ عظمےٰ ہے - خان بہادر صاحب نے بڑی معقول داد اس کی دی ہے -

"موازنہ نظم و نثر" - اس مضمون کے پڑھنے سے مجھے حجاب آتا ہے - ہمارے مخدوم و مکرم جناب مرزا محمد علی خانصاحب نے جو داد میرے مضمون کی دی ہے وہ قدر افزائی ہے اور اُن مخدوم کی وہ داد و دہش ہے جو میرے حوصلہ سے کہیں زیادہ ہے مگر یہ اُن کا دستِ کرم ہے اور میرا دامن کوتاہ ہے پس آنکھیں نیچی کرتا ہوں اور کیا

"اجتناب کشتہ" والے مضمون کو صلائے عام نے جگہ پوری نہیں دی آخر ش فروری کا مہینہ تھا جو صرف چار ہی ہفتہ میں جواب دے گیا - فقط - راقم مرزا عرفان علی بیگ ای ایس او از آگرہ -

اصولِ سلطنتِ مغلیہ

دراصل جمہوری سلطنت کی بنیاد صحیح اصولوں پر اسلام نے ڈالی مگر جوں کہ شخصی خود مختار حکومتوں کی بنیاد روزِ ازل سے پڑ چکی تھی اور اسلامی حکومت کے چاروں طرف شخصی خود مختار حکومتیں موجود تھیں۔ اس لئے خود اسلام میں بھی زیادہ دنوں جمہوری سلطنت نہ رہ سکی گو جمہوری سلطنت کی خیر و برکت شخصی خود مختار حکومتوں سے درجہا بڑھی ہوئی ہوتی ہے۔ تو بھی شخصی حکومتوں کی تعداد اور ان کا زمانہ اقتدار جمہوری حکومتوں سے ہمیشہ زیادہ رہا۔ برِ اعظم ایشیا کو ہمیشہ خود مختار شخصی حکومتوں سے سابقہ پڑا۔ شخصی خود مختار حکومت میں یہہ بڑا روگ ہے کہ ایک شخص واحد کی رائے پر اور اُس کے اچھے بُرے ہونے پر اس حکومت کا دار مدار ہوتا ہے۔ اگر بادشاہ نواب راجہ خوش مزاج نیک دل خدا پرست ہوا تو خیر ہے ورنہ سوائے خرابی بربادی اور کچھ نہیں۔ جمہوری سلطنت کا بڑا اصول یہہ ہے کہ مُلک کے باشندے اپنے مُلک میں جس کسی کو لایق سمجھتے ہیں اُس کو منتخب کرتے ہیں اور ایک مناسب تعداد کی مجلس قرار دیکر اپنی قسمت کا فیصلہ اُس کے ہاتھ میں دیتے ہیں۔ ارکان مجلس باہمی مشورہ سے ہر صیغہ کا انتظام کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ جمہوری سلطنت میں ہر کام ٹھیک ہوتا ہے۔ بخلاف شخصی خود مختار حکومت کے کہ بادشاہ نواب راجہ کو جس بات کا شوق ہوتا ہے یا جس طرف توجہ ہوتی ہے وہ ہی کام ترقی پذیر باقی ندارد۔ مثلاً ایک صاحبِ حکومت کو شکار کا شوق ہے تو یہاں اسی صیغہ کو ترقی ہوگی مختلف شکارگاہیں ہوں گی۔ بہت سے جنگل محفوظ ہوں گے۔ شکار کی افراط ہوگی اگرچہ صحرائی جانور گرد نواح کی دیہات کی زراعت کو پامال اور برباد کردیں تاہم پرواہ نہیں ہوگی کیوں کہ شکار کا شوق ہے۔ اسی طرح کسی کو پیسہ جمع کرنے کا شوق ہوا تو جائز ناجائز ہر طریقہ سے پیسہ جمع ہوگا گو اس کا نتیجہ کچھ ہی کیوں نہ ہو۔

اگرچہ ہمارے ہندوستان میں فی زمانہ اعلےٰ حکومت انگریزوں کی جمہوری اصول پر ہے

توبھی خودمختار

تو بھی خود مختار شخصی حکومتوں کے نمونے ہماری پیش نظر ہیں۔ انگریزوں کی خوش انتظامی کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ جس صیغہ کے انتظام پر نظر ڈالو یہہ معلوم ہوتا ہے کہ ساری سلطنت اسی صیغہ کی اصلاح اور درستی میں مصروف ہے۔ فوج دیکھو ریلوے دیکھو تعلیم دیکھو تعمیر دیکھو امور آسائش عامہ دیکھو۔ صیغہ مال فوجداری غرض ہر طرف می نگرم انجمنے ساختہ اند۔ آج اگر ہمارے ملک کے نواب راجہ مہاراجہ صرف انگریزوں کی تقلید کریں تو سب کام کیسے عمدہ ہوں اور ملک کس قدر ترقی حاصل کرے۔ ہماری بدقسمتی سے تقلید بھی کرتے ہیں تو بے کار باتوں میں۔ کوٹ پتلون میں۔ کالر ٹائی میں۔ کھانے پینے میں۔ تن تنہا بے یار و مددگار مارے مارے پھرنے میں ورنہ جو یہاں انتظام ہے وہ وہاں بھی ہو سکتا ہے۔ یہہ بڑے پیمانہ پر ہے وہ چھوٹے پیمانہ پر ہوگا۔ یہاں کی کئی کروڑ رعایا خوشحال ہے تو وہاں کئی ہزار یا کئی لاکھ خوشحال ہوگی۔

ایک بار میں دورہ میں ایسی دیسی ریاست سے گزرا کہ جہاں کچھ عرصہ تک بوجہہ نابالغی رئیس کے انگریزی انتظام اور نگرانی رہ چکی تھی اور اب رئیس کو اختیار حاصل ہو چکا تھا۔ دفعتاً بارش ہونے پر مجھے اس امر کی ضرورت پیش آئی کہ کوئی مقام سایہ دار مل جاوے تو وہاں ٹھہر کر بارش سے محفوظ رہیں۔ اسی تلاش میں تھے کہ ایک سایہ بان بہت بڑا وسیع خالی دیکھا گیا۔ اور کسی کی اجازت سے اس میں جا ٹھہرے۔ پھر مجھے خیال آیا کہ بڑا سایہ بان خالی بے کار کس غرض سے بنایا گیا معلوم ہوا کہ بزمانہ انتظام انگریزی۔ یہاں ایک شخص نے فرنیچر یعنی لکڑی کا کارخانہ کیا تھا۔ اب رئیس کی ناجائز دار و گیر سے تنگ آکر کہیں چلا گیا۔ یہہ سنکر مجھے سخت رنج ہوا اور خیال ہوا کہ حقیقت میں آزادی اور آبادی مرادف لفظ ہیں جہاں آبادی ہے ضرور ہے کہ آزادی ہوگی۔ جہاں آزادی ہوگی ضرور ہے کہ وہیں آبادی ہوگی۔ اسی ہندوستان میں بعض رئیس ایسے بھی ہیں کہ اُنہوں نے اپنی ریاست میں ہر صیغہ کا انتظام ایسا ہی کیا ہے جیسے انگریزی علاقہ میں انتظام ہے۔ وہاں کی خوشحالی بھی روز افزوں ہے۔ ان کل امور پر غور کرنے سے اور تاریخ کی ورق گردانی کرنے سے یہہ خیال ہوا کہ سلطنت مغلیہ میں باوجودیکہ شخصی خود مختار سلطنت بھی

پھر بھی انتظامی حالت ملک کی اس روشن زمانہ سے کچھ کم نہ تھی جو آج انتظام دیکھ رہے ہیں یہہ سب کچھ پہلے بھی تھا۔ بابر نے ہندوستان میں حکومت قائم کی مگر ابھی فتوحات سے فرصت نہ ملی تھی کہ اُسے سفرِ آخرت پیش آیا۔ پھر ہمایوں کو کثرت سے ملکی ترددات پیش ای اور وہ بھی ناگہانی موت سے مرگیا۔ اس کے بعد اکبر جلال الدین کم عمر تخت نشین ہوا اس نے ابتدا میں جو ترددات پیش آئی اُقلع قمع کرکے ساری توجہہ ملک گیری کی جانب مبزول نہ کی بلکہ جس قدر ملک قبضہ میں آتا گیا اس کے انتظام کی طرف توجہہ کرتا گیا۔ سب سے اوّل اُن لوگوں کو جمع کیا کہ جو ہر قسم کی انتظامی قابلیت رکھتے تھے۔ ہر ایک کی قابلیت کا صحیح اندازہ کرکے اُن کے لایق کام سپرد کئے اور وہ سب کچھ کیا جو آج دیکھ رہے ہو۔ راجہ تودرمل کے ذریعہ بندوبست کرایا۔ زمین کی پیمایش کرائی زمین کی اقسام زمین کی پیداوار کا اندازہ کیا۔ زرِ لگان اور تحصیل زرِ لگان کے قواعد مقرر کئے۔ مال کا عملہ اور اُس کے اہلکاروں کی تعداد ضرورت کے لایق مقرر کی گانو بلائی سے لیکر صوبہ تک مختلف مراتب کے اہلکار مقرر کئے۔ پٹواری۔ شحنہ گرداور تحصیلدار قانون گو وغیرہ۔ ایک فوجداری کا عملہ انتظامی علیحدہ قرار دیا چوکیدار سے لیکر سپہ سالار تک مختلف مراتب کے افسر قرار دئے۔ جاگیرداروں منصبداروں میں امتیاز پیدا کیا۔ تقاوی دینے کے قواعد قلم بند ہوئے ضبطی بٹائی کو ایک عجیب پسندیدہ طریقہ پر جاری کیا۔ غلہ کی اجناس قابلِ لگان کو اور میوہ جات اور ترکاریوں غیر لگان کے اقسام کو بڑی خوبی سے علیحدہ کیا۔ زمین نہری چاہی بارانی پر پورا لحاظ کیا گیا۔ مال کا انتظام پورے اختیاروں کے ساتھ راجہ تودرمل اور میر فتح اللہ شیرازی کے ہاتھوں ہوا دونوں کی قابلیت نے رعایا زراعت پیشہ کو خوش حال اور مالا مال کردیا۔ میر فتح اللہ شیرازی وہ شخص ہے جس کا جواب ایران اور ہندوستان میں دوسرا نہ تھا تودرمل اسی کا پیش دست ہے۔ یہہ وہ شخص ہے کہ جس کی نسبت ابوالفضل جیسا شخص کہتا ہے کہ اگر کہن نامہ ہاے دانش مفقود شوند او اساس نو برنہد۔ سنہ ۳۰ جلوس میں اسی کو امین الملک خطاب ہوا تھا۔ دوسرے صیغہ جات کی ترقی اور اصلاح کا اہتمام بھی ہوا۔ ہندوستان میں سوائے گاڑھے گزی کے اور ملبوسات میں کیا رکھا تھا۔ اکبر نے دیبائے یزدی۔ مشجر۔ خارا۔ اطلس خطائی مخمل۔ خانی۔ سرز

قطنی۔ کتان۔ تافتہ۔ انبری۔ مطبحا۔ خز۔ چوتاما۔ململ۔ نینسکھ۔ سری صاف۔ گنگاجل۔ بھیروں۔ ساؤر۔ بہادرشاہی۔ گرہ سوتی۔ سلیہ دکھنی۔ مہر کل۔ تہن۔ جبونہ۔ ساونی۔ محمودی پنج تولہ جبولہ چھینٹ وغیرہ کے کارخانے کے کارخانے جاری کئے۔ شال کشمیری میں اس قدر اضافہ ہوا کہ جو آج نظر نہیں آتا۔ زردوزی کا علیحدہ کام ہوتا تھا۔ بانہنول۔ اوکچہ۔ کلابتون۔ کشیدہ۔ قلغہ۔ زربفت گجراتی۔ کاستی۔ بروی۔ طاس۔ دارائی۔ مقیش۔ شروانی وغیرہ۔ ان کے کارخانے دلی۔ لاہور آگرہ۔ فتح پور۔ احمد آباد۔ گجرات میں صدہا قائم کئے۔ ایران۔ فرنگستان۔ چین سے کاریگر بلوا کر قیمتی کپڑے تیار کرائے۔ ابو الفضل لکھتا ہے۔ از توجہ گیتی خداوند گوناگوں قماس چہرہ برافروخت۔ ایرانی فرنگی۔ ختائی فراوان شد۔ اوستادان کارپرداز۔ ہنرمندان نادرہ آئین آمدہ۔ ہنگامہ آموزش گرم ساختہ۔ در پیشگاہ حضور در شہر لاہور۔ فتح پور۔ احمد آباد گجرات کارنامہا پدید آمد۔ لاہور میں صرف پشمینہ کے کارخانے ایکہزار سے زیادہ تھے ؛ ہندوستان میں عمدہ گھوڑے نہ ہوتے تھے بابر بادشاہ کو اس کی شکایت تھی۔ ٹٹو چوگوشیہ زیادہ ہوتے تھے۔ اکبر نے ایران۔ ترکستان۔ عربستان) سے عمدہ عمدہ گھوڑے خرید کر منگائے اور اُن کے گلے صدہا جگہ قائم کئے۔ زمینداروں کو جاگیرداروں کو علیحدہ حکم ہوا کہ گھوڑوں کی نسل بڑھائیں تھوڑے عرصے میں ہر قسم کے عمدہ گھوڑے کثرت سے میسّر آنے لگے۔ اسی طرح قدآور خچر ؛ ہندوستان میں باغ تھے مگر باغوں کی یہہ شکل تھی جیسے آج کل ممالک مغربی شمالی میں آموں کی سہ درختی دیکھتے ہو۔ نہ روش نہ خیاباں نہ چار دیواری نہ تختہ بندی۔ اس کی اصلاح اول بابر نے کی پھر اکبر نے اس کی تکمیل کی۔ نخلبندی پیوند کاری کا دستور نہ تھا میوہ جات میسّر نہ آتے تھے اکبر نے ادھر اس درجہ توجہ کی کہ دُنیا کے میوہ جات بازاروں میں میسّر آنے لگے۔ ہر قسم کے پھول بھی ولایتوں کے پیدا ہونے لگے۔ اسی طرح راستوں کی درستی بسرائے اور پُل اور چاہات آب نوشی کا انتظام کیا گیا۔ راستوں کی حفاظت کے لئے مسافروں کے نقصانات کے تاوان کا ہر علاقہ دار کو ذمہ دار بنایا گیا۔ اسی طرح ہر ادنے اعلےٰ کام کی درستی و اصلاح ہوی۔ باقی آئندہ۔ مرزا محمد علی

(مرزا محمد علی خان صاحب رئیس دہلی)

لیاقت دولت

سیاست و مولویت

یہہ دونوں لفظ صلائے عام کے لب ولہجہ سے مناسبت نہیں رکھتے نہ صلائے عام کو ان کا دعوے ہے۔ معمولی انشا پردازی کو ان سے واسطہ نہیں: یہہ باتیں بھیڑ میں گھس کے دیکھنے کی نہیں۔ صرف دور سے دیکھنے کی ہیں + میں دیکھتا ہوں کہ علمار دین بھی سیاسی معاملوں میں جنہیں انگریزی میں پالیٹکس کہتے ہیں دخل دینے لگے ہیں۔ دینی ومذہبی مباحثے اس قدر پیچیدہ ہیں کہ ان کے سلجھانے میں صدیاں گزر گئیں اور ہنوز روزِ اول ہے: پالیٹکس کا تو ذکر ہی کیا ہے + مذہبی مسائل تو مرورِ زمانہ سے کم وبیش عمل درآمد کے لایق ہو گئے۔ پالیٹکس ہر زمانے کے موافق رنگ بدلتے رہتے ہیں: اسلام میں بنی اُمیہ کے پالیٹکس اور تھے اور عباسیہ کے اور۔ ان کو سلطنت کے معاملہ میں اپنے خاندان کی طرفداری کے سوا اور کوئی خیال نہوا۔ عباسیہ کو غیروں کی بھی رعایت منظور رہی جو ظاہراً علوم و فنون کی ترقی کا باعث ہوئی مگر قیام سلطنت کے لئے بے کار نکلی + گھر گرہستی کے بندوبست کی طرح انتظامِ سلطنت میں نہ غایت درجہ کی نرمی سے نہ غایت درجہ کی سختی سے کام نکلتا ہے۔ بنی اُمیہ کو اپنی قوم اور خاندان کی طرفداری کے سوا کچھ

اور نہ سوچا

اور نہ سوجھا۔ عباسیہ نے غیروں کا زیادہ اعتبار کیا: اُن کی بیجا سختی اور ان کی ضرورت سے زیادہ نرمی سے کام بگڑ گیا ؛

آغازِ اسلام میں علما کا کوئی خاص گروہ نہ تھا۔ دینی معلومات میں ساری قوم کا مرتبہ برابر تھا؛ مولویوں سے پوچھکر لڑائیاں اور غیروں پر چڑھائیاں نہیں ہوتی تھیں۔ جمہور کی رائے سے کام ہوتا تھا: اُس وقت اختلاف رائے کا نام نہ تھا؛ نماز روزے حج و زکواۃ کے مسائل میں جو کچھ باریکیاں ممکن تھیں وہ ایک دفعہ طے ہونے کے بعد پھر کسی کو مداخلت کا اختیار نہ تھا ؛

اس زمانہ کے سیاسی اُمور یعنی پالٹیکس میں نری عربی فارسی اُردو سے کام نہیں چل سکتا۔ نہ محض دینی و مذہبی بحث مباحثہ سے۔ اوّل درجہ انگریزی زبان وخیالات سے پوری واقفکاری ضرور ہے۔ بلکہ یورپ و امریکا کے مُلکی اور قومی معاملات سے راتدن کی آگہی کی ضرورت ہے ؛

جس طرح اخباروں کو مذہبی معاملات سے کنارہ کشی مناسب ہے اسی طرح علماء دین اگر پالیٹکس کے جھگڑوں میں نہ پڑیں تو دُنیا کے معمولی کاموں میں آرام کی صورت زیادہ ہوسکتی ہے ؛ اب تو "مولٰینا" وغیرہ کے لقب زیادہ تر انہیں بزرگوں کے شایان مرتبہ سمجھے جاتے ہیں جو پالیٹکس میں مشق رکھتے ہیں؛

تیمور کے لشکر کی ترتیب کی نسبت لکھا ہے کہ میر لشکر نے تیمور کو اطلاع دی کہ سوار و پیادے و تیر انداز و توپ خانہ اپنی اپنی جگہہ قایم کر دیا گیا۔ بیگمات

کی سواریاں حفاظت کے خیال سے کہ لڑائی میں کسی طرح کا صدمہ نہ ہو پنچے سب سے پیچھے رکھی گئی ہیں مگر لشکر میں ایک گروہ مولویوں کا بھی ہے ان کی نسبت کیا حکم ہے؟
تیمور نے جواب دیا کہ مولویوں کو بیگمات کے پیچھے رکھا جائے :۔

واقعی مولوی عُلما جس قدر لڑائی بھڑائی کے جھگڑوں سے بچیں مناسب وقت ہے :۔

انتزاع سلطنت اودھ سے پہلے لکھنؤ میں ایک مذہبی معرکہ مولوی امیر علی صاحب کا بہت سخت ہوا جس میں قابلِ افسوس جانوں کا نقصان ہوا اور اس سے پہلے جناب مولوی اسماعیل صاحب کی چڑھائی سکھوں کے زمانہ میں بڑے معرکہ کی مہموں میں داخل تھی۔ مگر دونوں میں نامور جانیں نذرِ اجل ہوئیں: جو خالقِ زندگی و موت کی مرضی ہوئی۔ ہوا :۔

میں اُن واقعات کی نسبت رائے نہیں دے سکتا۔ میرا مطلب صرف اتنا ہے کہ آج کل کے عُلما پالیٹکس اور مذہبی عقائد کو خلط ملط نہ فرمائیں: اگر زیادہ فرصت ہو تو اسلام کے قدیم علوم و فنون کی تحقیق و تعلیم میں توجہ فرمائی جائے۔ خاص کر نازک خیالی اور پاکیزہ بیانی میں جو مسلمانوں کی میراث میں داخل ہے :۔

صلائے عام

"نِنامی" مضمون

یہہ عنوان اِس مضمون کا بالکل نیا ہے۔ کہتے ہیں کہ زوالِ سلطنتِ مُغلیہ میں قلعہ معلّے کے محلات کی زبان میں سورۂ یٰسین کا نام "نِنامی" تھا کہ مُسلمانوں میں یہہ سورۃ چونکہ مرتے وقت سنائی جاتی ہے اس لئے خیالِ غمگینی سے بچنے کے واسطے اس سورۃ کو بے نام (نِنامی) کہنا رنج سے بچنے کی تدبیروں میں سمجھا گیا۔ اسی طرح مستورات میں "اَنگنا" مہینہ سمجھا جاتا ہے کہ خیریت سے یہہ مہینہ خدا نکال دے۔ رنج کے اکثر مطالب الفاظ بدل کر بولے جاتے ہیں۔ مثلاً مرنے کو انتقال کرنا کہتے ہیں۔ فلاں شخص چل بسا۔ وہ ہو لئے۔ "نِنامی" گو انوکھا لفظ معلوم ہوتا ہے مگر لال قلعہ کی زبان میں داخل ہے اور قلعہ کی زبان سب سے زیادہ معتبر سمجھی جاتی ہے۔

بہرحال۔ اس مضموں میں مجھے خاص عنوان سے بچنا منظور ہے کہ میں مُختلف ذکر اذکار اس مضمون میں جمع کرنے کا ارادہ کر رہا ہوں۔

دُنیا میں مصیبت کو کسی نام سے پکار لیے رہے گی وہ مصیبت ہی۔ نام کے

بدلنے سے مصیبت میں فرق نہیں آسکتا ۔ فلاسفی کا یہہ پرانا مسئلہ کہ دُنیا کو جیسا سمجھ لو ویسی ہی نکلے گی قابلِ اعتبار نہیں۔ ایسا سمجھنے والے دیوانے نہیں تو ہوش میں بھی نہیں : بعض مرتاض طبایع اپنے ذہن میں اور دیکھنے والوں کی نگاہ میں ظاہرا مُصیبت کو مُصیبت نہ سمجھیں یہہ اور بات ہے ۔ مُصیبت کے برداشت کرنے کی قوت عجیب نعمت ہے ۔ زندگی اور موت میں بڑا فرق یہی ہے کہ زندگی میں ہمیں مُصیبت سے تکلیف معلوم ہوتی ہے اور موت میں نہیں۔ مُصیبت سے تکلیف محسوس نہ ہو سکے تو موت سمجھئے ۔

زندگی ہو تو مصیبتیں اس طرح ٹل جاتی ہیں جس طرح چاندنی رات میں ہلکے بادل چاند کے اوپر سے جلد جلد ہٹ جاتے ہیں۔ یا کوئی حسین اپنے چہرہ سے سیاہ بال بار بار ہٹائے ۔ یا جس طرح دو آدمی لڑتے جاتے ہوں اور اس قدر قریب ہوں کہ آواز سنائی دے مگر سمجھ میں نہ آئے کہ کیا کہتے ہیں ؟ یعنی دنیا سے ع

از دور نظارہ کردہ بگزر ۔

دُنیا کی سب سے بڑی مصیبت موت ہے ۔ لیکن مرنا اور نہیں تو اس لئے نعمت ہے کہ خوف و رجا کی کشمکش سے رہائی ہو جائے گی ۔ حضرتِ زاہد کی رات دن کی دھمکیوں اور ملامتوں سے چھوٹ جائیں گے : انسان کہاں تک سُنے کہ مرنے کے بعد عذابِ الٰہی کا خوف ہے ۔ زندگی تو جس طرح گزرنی تھی گزر گئی (اچھی تھی تو دو دن کی۔ بُری تھی تو اس کا مِٹ جانا ہی اچھا ہوا) مگر مرنے کے بعد اس کے یاد دلانے کی کیا ضرورت ہے؟

یہہ خوف کہ ع
ا ہے ہے ہم کو پھر جینا پڑیگا - جیتے جی مارے ڈالتا ہے ؛

یہہ عجیب بات ہے کہ دُنیا کے تمام عقائدِ مذہبی میں آغازِ عالم سے انسان نے اپنے سوا تمام مخلوق سورج چاند - ستارے - کواکب وسیّارے - دریا و سمندر پہاڑ و درخت - چرند و پرند - بر و بحر - خشکی و تری - بیماری و تندرستی - دولت و محتاجی - آگ غرض تمام اشیاءِ عالم کی کسی نہ کسی طرح پرستش کی - مگر اپنی پرستش کی طرف متوجہہ نہ ہوا ؛ اہلِ ہنود میں اوتار کے اور تصوف میں پیر پرستی کے عقیدہ نے اسے اپنی طرف کچھ متوجّہہ کیا اس میں بھی اپنے تئیں نہیں - غیر کو پرستش کے لایق سمجھا : پھر آخر تمام عالم کو چھوڑ کر ایک نامعلوم ذات (خدائے واحد) کی طرف رُخ کیا جس کو تمام عالم سے نرالا پایا ؛ اُس میں ذات سے کہیں صفات کا اجماع دکھائی دیا - حالاں کہ معمولی قواعدِ صرف ونحو کی رو سے صفات سے زیادہ اسماء ضروری سمجھے جاتے ہیں : لیکن یہہ مسائل معمولی سمجھ سے باہر ہیں ؛

عشق ومحبّت میں وصل وہجر سے زیادہ ضروری کوئی مسئلہ نہیں - بلکہ اس مشغلہ کا مدار ہی وصل وہجر پر ہے ؛ وصل تو خیر کچھ چیز ہے بھی - مگر ہجر کا رونا اس قدر کیوں رویا جاتا ہے ؟

وصل سے ہجر کا علاج آسان ہے - وصل کے جھگڑے میں تو راتوں کا جاگنا جانفشانی و دولت کی بربادی - حُب کے تعویذ و عمل اور ہزار درد سر کا جھگڑا ہے - ہجر میں آرام ہی آرام ہے ؛ "اُنھیں "محبت نہیں تو ہم کیوں" اُن کے" پیچھے پڑے رہیں ؟

اُن کی بے وفائی و غفلت کا رونا رونے سے فائدہ ؟ گو ہم اپنی طرف سے ترک محبت کے مُدّعی نہیں مگر اُدھر سے ترک محبت کے آثار ہیں تو پھر اُن کی جان کو آنا حماقت ہے ٭ ترکِ محبت کے آثار دونوں کے دلوں میں آپ سے آپ آئینہ کی طرح دکھائی دیتے ہیں۔ اس میں باتیں بنانا بے کار ہے ٭ لیکن آثاروں میں دو ایک کا ذکر تمثیلاً مناسب ہے ٭

وہ پہلا سا شوق بار بار ملنے کا نہیں رہا۔ جب ایک دن گزر جائے تو دو دن بھی گزر سکتے ہیں۔ دو دن کے بعد تین دن۔ پھر ہفتہ و ماہ و سال بھی ممکن ہے ٭ پہلے راتوں کو نیند نہیں آتی تھی۔ جب ایک رات نیند آجائے تو پھر آئندہ جاگنے کی تکلیف کیوں اُٹھائی جائے ؟ شہر میں جی نہیں لگتا تو اور شہر بہت ہیں "مُلک خدا تنگ نیست" ٭ دونوں کی طرف سے شوق تھا تو اور بات تھی اب ایک ہاتھ سے تالی نہیں بجتی ٭

کتابوں میں ہمارے ہاں کا عیش مشہور ہے۔ مشہور کیا ہم اس میں بہت بدنام ہیں : مگر یورپ کا عیش دیکھئے تو آپ کی آنکھیں کُھل جائیں ٭ پار کے جوڑے کا جو رنگ ہے اُسی کی جوڑ کے لایق فرش فروش فرنیچر و چھت گیری و پردے اور کھانے پینے کے ظروف و شمعیں وغیرہ چاہیئے ٭ جوڑا دن میں تین چار دفعہ بدلا جائے۔ صبح سواری کے لئے۔ حاضری کا علیحدہ اور چاء و طعام کا علیحدہ۔ مہمانوں سے ملنے کا علیحدہ اور ناچ تماشے سیر و تفریح کا علیحدہ۔ شادی بیاہ۔

سفر و حضر کا لباس علیحدہ اور ہر لباس کا رنگ علیحدہ ۔ یار کی آنکھیں اگر نرگس سے شابہ ہیں تو سنگار میز کا سامان ایسے جواہرات و نگینوں سے مرصع ہو جو نرگس کے رنگ سے ملتا ہوا ہو۔ گلے کے ہار اور زیور کے رنگ میں یہی احتیاط رہے خفیف ابر میں یہہ رنگ ہو اور گہرے بادلوں میں وہ رنگ ۔ اسی لحاظ سے موٹر کا رنگ اور موٹر اس سے اچھی دوسری نہ ہو ۔

یہہ شاہی سر و سامان کا ذکر نہیں ۔ معمولی روزمرہ کے خوشحال لوگوں کا ذکر ہے ۔ یہاں دو تین سو برس میں ایک آدھ عیش دوست ایسا پیدا ہو گیا تو کیا ہوا ۔ وہاں ہر "شوقین" و دولتمند "نیا نواب" ہے ۔ دلّی میں پھول والوں کی سیر میں مشکل سے ایک "نیا نواب" بنتا ہے ۔ ولایت میں رات دن یہی مشغلہ ہے ۔ زندگی کی لٹریچر میں انسان کی جوانی شعر و شاعری سے مشابہ ہے اور ضعیفی نثر سے ۔ یہہ وجہہ ہے کہ صلائے عام کو نثر کی زیادہ فکر ہے ۔

صلائے عام ۔ اس پرچہ میں صلائے عام کے معمولی مضامین میں "پیرایۂ آغاز" نہیں لکھا گیا ۔ کیوں کہ مضامین دیر میں آئے اور چھپنے شروع ہو گئے تاکہ زیادہ دیر نہ ہو جائے ۔ "پیرایۂ آغاز" کے نہ ہونے کا مجھے افسوس ہے کہ مضامین کی داد دینے سے رہ گئی ۔ پھر بھی ۔ راقم ۔ خان صاحب مرزا محمد علی خاں سابق جوڈیشل ممبر ریاست ٹونک (رئیس دہلی) کی تاریخی معلومات کی تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکتا جن کے مضمون

اصولِ سلطنتِ مُغلیہ (صفحہ   ) سے ثابت ہے۔ اس میں ایسے پارچوں کی تفصیل اور نام بڑے کام کی چیز ہے جو سلاطینِ مُغلیہ کے عہد میں رائج ہوئے ؛

"**محشرِ خیال**" بھی علائے عام کے معمولی مضامین میں ہوتا تھا اُس کی جگہ یہہ "**نامی مضمون**" سمجھ لیا جائے کہ "محشرِ خیال" والا عنوان پُرانا ہوگیا تھا ؛

مجھ سے جناب رجسٹرار صاحب (دہلی یونیورسٹی) کی عرصہ سے فرمائش ہے کہ کشمیر کی اُس زمانہ کی تہذیب کا حال جب کشمیر کا تعلق سلطنتِ مُغلیہ سے تھا لکھا جائے۔ اس میں شک نہیں کہ کشمیر کا وہ زمانہ واقعی لاجواب ہوگا ؛ میری عُمر زیادہ ہے۔ اس عمر میں یہہ کام میرے بس کا نہیں : لیکن جس قدر ہوسکا میں علائے عام میں لکھتا رہوں گا ؛ کشمیر کے چند شعرائے فارسی کا کلام میرے کتب خانہ میں نکل آیا جو اگلے پرچہ میں لکھا جائے گا ؛

غزل – جناب مائل دہلوی

ہے یادِ چشمِ مست کہ میخانہ گھر میں ہے
قامت نظر میں ہے کہ قیامت نظر میں ہے

اے سوزِ دلگداز یہہ تیرا طفیل ہے
ڈوبی ہوئی جو آہ ہماری اثر میں ہے

ساقی بھی ہے شراب بھی شیشے بھی جام بھی
گھر میں خدا کے وہ نہیں جو میرے گھر میں ہے

اب آگیا تو باغِ جہاں دیکھتا چلوں
اچھا ہے یا بُرا ہے مگر رہگذر میں ہے

تو کہہ تو مجھ سے اے دلِ بیتاب کیا بنی
کچھ تازہ تازہ خون مری چشمِ تر میں ہے

وہ دن گئے کہ زندہ دلوں میں شمار تھا
اب زندگی کشاکشِ شام و سحر میں ہے

اے آرزوے قتل مبارک ہو آج تو
خنجر ہے جسکا نام وہ اُن کی کمر میں ہے

قاتل اب اسکو ہے تری ٹھوکر کی آرزو
تن سے جُدا پڑا ہے مگر درد سر میں ہے

مائل اُٹھا نہ سجدہ سے رہتا نہیں ہوں میں
بحرِ کرم کا جوش مری چشمِ تر میں ہے

منقول از رسالہ شادمان

مہتمم کی طرف سے۔

اِطّلاع

صلائے عام کی قیمت پیشگی چھ روپیہ سالانہ ہے۔ قیمت بذریعہ منی آرڈر عنایت فرمائی جائے: مضمون نگار بھی صلائے عام کی قیمت سے بری نہیں۔ نہ یہ ضرور ہے کہ ہر مضمون خواہ مخواہ شایع کیا جائے: جامعِ اوراق کو مضمون میں کمی بیشی کا اختیار رہے۔ جو مضمون شایع نہ ہوسکیں اُن کے واپس کرنے کا ذمہ نہیں ؛

صلائے عام میں ہر طرح کے مضامین نظم و نثر شایع ہوتے ہیں۔ زیادہ تر نثر کہ اس وقت نثر کی زیادہ ضرورت ہے: اور نثر بھی ایسی جس میں زبان کی خوبی و فصاحت کے ساتھ مضمون کی پاکیزگی و نازک خیالی ضرور ہو یعنی لباس بھی عروسِ جمیل دلبار حریر۔ شرط ہے کہ مضمون پاکیزہ اور ادائے بیان لاجواب چاہیئے ؛

اکثر اصحاب نمونہ کا پرچہ مانگتے ہیں۔ اوّل تو ایک پرچہ سے صلائے عام کی ساری خوبیوں کا حال معلوم ہونا مشکل ہے دوسرے صلائے عام اتنے عرصہ سے جاری ہے کہ اہلِ علم میں شاذ ہی کوئی ایسا ہوگا جو اس سے واقف نہ ہو: پھر بھی اگر کسی کو نمونہ یا سال سے کم کی خریداری منظور ہو تو ایک روپیہ فی پرچہ کے حساب سے قیمت لی جائے گی ؛

صلائے عام کا پتہ اس قدر کافی ہے کہ:

دہلی۔ فراشخانہ: مکان میر ناصر علی خاں بہادر

حسب الارشاد میر ناصر علیخاں بہادر مطبع ناصری واقع فراشخانہ دہلی میں باہتمام میر احمد چھپا اور شایع ہوا

...ted and Published by Mir Nasir Ali Khan Bahadur (Editor) at the Nasri Press, Farrash-Khana, Delhi

REGISTERED No.

ر نوح رکھکر بیاضِ جبیں　　　　کہا دوسرا کوئی تجھسا نہیں

جلد ۱۳　　　　نمبر

SALÂ-I-ÂM, DELHI.

A high class Monthly Magazine devoted to the cause of Urdu literature, the preservation of the old Indian, especially Mohammadan culture and refinement, and the assimilation of the best features of the new civilization

حسب الارشاد میر ناصر علیخاں رہنما مدیر امیر مجیر احمد مصطفیٰ مطبع ناظری فراشخانہ میں چھپا اور جاری کیا

فہرست مضامین

بابت ماہ اپریل سنہ ۱۹۲۵ء مطابق ماہ رمضان سنہ ۱۳۴۳ ہجری

صلائے عام

(بطور دیباچہ)

حکیم ثناء اللہ خاں۔ فراق کا شعر ہے ؎

دل تھامتا کہ آنکھ پہ کرتا تری نگاہ ٭ ساغر کو دیکھتا کہ میں شیشہ سنبھالتا

صلائے عام کے نکالنے میں مجھے یہ دقت ہے کہ بعض اصحاب اس کے مضامین مشکل بتاتے ہیں۔ اور جن کی سمجھ سے باہر ہوتے ہیں مہمل کہتے ہیں: انہیں کون سمجھائے کہ مضمون نگاروں نے پڑھنے والوں کی سمجھ کا ذمہ نہیں لیا ہے۔ نہ صلائے عام کو ہر کس و ناکس کی سمجھ سے واسطہ ہے ٭ لکھنے والوں کو اپنے اظہار کمال سے غرض ہے۔ پڑھنے والوں کی سمجھ سے باہر ہو تو اس کا کیا علاج کیا جائے؟ مولانا جامی رحمۃ کے شعر پر کسی طالب العلم نے اعتراض کیا کہ صرف و نحو سے صحیح نہیں۔ آپ نے فرمایا کہ میرا شعر مدرسہ میں کون لے گیا؟

اس سے پہلے پرچہ میں کتابت کی غلطیاں زیادہ رہ گئیں جن کا ذکر صفحہ ۴۴ میں ہے سبب یہہ کہ جلدی کی وجہہ سے مضمون نگار اپنے مضمون کی کاپیاں دیکھ نہ سکے۔ اور جلدی اس وجہہ سے ہوتی ہے کہ رسالہ وقت پر نکالنا ضرور ہوتا ہے ٭ لیکن معمولی کتابت کی غلطیوں سے مجھے یہہ فائدہ ہوتا ہے کہ پڑھنے والوں کی لیاقت علمی کا امتحان ہو جاتا ہے کہ ع

عاقلاں بیرون نقطہ : شوند ٭ اول تو یوں بھی کتابت کی غلطیوں کا علاج لیتھو کی چھپائی میں مشکل ہے۔ اس پر رمضان شریف میں روزوں کی وجہہ سے کتابت کی صحت کا ہوش کسے رہ سکتا ہے؟

اس پرچہ میں جو غلطیاں ہیں وہ روزوں کے سر سمجھئے +

مضمون نگاروں کا بڑا احسان ہے کہ باوجود ماہ صیام کے مضامین بہت اچھے بھیجے۔ خاص کر مرزا عرفان علی بیگ صاحب آئی ایس او۔ مولوی بشیر الدین احمد صاحب و خاں صاحب مرزا محمد علی خاں صاحب کا میں بہت ممنون ہوں ؛

جب آپ کو معلوم ہے کہ یہہ پرچہ رمضان شریف میں نکل رہا ہے تو آپ کی طرف سے قلتِ مضامین کی شکایت اور مجھے اس کی معذرت کی ضرورت نہیں ؎

جتنے قصے ہیں مرے شکوہ بیداد ہیں سب
ذکر کا ہے کو ہیں افسانۂ فریاد ہیں سب

غزل۔ تازہ جناب مائلؔ دہلوی

اے دلِ زار کیا کروں۔ آہ وہ یار اب کہاں ؛ صبر و قرار لیگیا۔ صبر و قرار اب کہاں
وہ تو گئے ہوا ہوئے مثلِ غبار اب کہاں ؛ ہاتھ بڑھائے لاکھ تو دامنِ یار اب کہاں
ڈھونڈھوں کہاں شبابکو ملاؤں کہاں سحر کولے ؛ آئے بہار شوق سے اپنی بہار اب کہاں
خاک سے تھے بنے ہوئے خاک میں تھے ملے ہوئے ؛ خلدِ بریں میں آگئے لطفِ مزار اب کہاں
اب تو قفس ہے اور تو لاکھ تڑپ کے جان دی ؛ برق گری وہ آشیاں بلبلِ زار اب کہاں
دشمن و دوست کوئی ہو قبر پر آئے شوق سے ؛ ہوگئے خود غبار ہم دل میں غبار اب کہاں
اسکی زباں سے پوچھ لو وضع کو اس کی دیکھلو ؛ مائلِ وشت گرد کا شہر و دیار اب کہاں

خارستاں

تصانیف زبانِ فارسی میں شیخ سعدیؒ کی گلستاں کو جو مقبولیت کا مرتبہ حاصل ہوا وہ کسی اور کتاب کو میسر نہ ہوا۔ گو اس کے جواب میں اکثر اور کتابیں لکھی گئیں۔ گلستاں کے جواب میں جو اسی طرز پر کتابیں حضرت جامی۔ قاآنی جیسے اہل کمال نے لکھیں اپنی اپنی وضع پر سب اُستادانہ ہیں لیکن جو خاص خوبیاں شیخ سعدیؒ کی گلستان میں ہیں یہہ حضرت ہی کا حصّہ سمجھئے۔ خارستان نامی فارسی میں ایک پاکیزہ تصنیف ہے جسے سمجھتے ہیں کہ گلستاں سعدی کے جواب میں لکھی گئی۔ یہہ کتاب بعض کا گمان ہے کہ حضرت امیر خسرو رحؒ کی تصانیف کثیرہ میں ہے۔ مگر کثرت رائے اسبات پر متفق ہے کہ کتاب خارستان کے مُصنّف حضرت خواجہ مجدالدین خافی ہیں جو اکبر بادشاہ کے عہد میں ایران سے ہندوستان میں تشریف لائے تھے: اور تعجب نہیں کہ بادشاہ کے حکم سے حضرت خافی نے خارستاں گلستاں کے جواب میں لکھی ہو۔ یہہ کتاب کچھ اوپر تین سو برس کی تصنیف ہے۔ اور واقعی گلستاں کے طرز سے بہت ملتی ہے۔ بعض کی رائے ہے کہ نصاب فارسی میں خارستاں گلستاں سے پہلے لڑکوں کو پڑھائی جائے تو مناسب ہے کہ خار گُل سے پہلے پیدا ہوتے ہیں۔

خارستان کی حکایتیں واقعی نہایت پاکیزہ و دلچسپ ہیں۔ دو ایک نقل کرنے

کو جی چاہتا ہے ÷

حکایت۔ دو لومڑیاں جال میں پھنس گئیں۔ ایک نے دوسری سے پوچھا کہ "بوا اب کب ملنا ہوگا؟" جواب ملا کہ "گھبراؤ نہیں ایک دو دن میں پوستین دوز کے ہاں ملیں گے کہ دونوں کی کھال کھنچکر پوستین دوز کی دوکان پر پہونچ جائے گی÷ (ہندوستان میں کھٹیک بھی کھالیں کما کر پوستین سینے والوں کے ہاتھ بیچ ڈالتے ہیں÷)

حکایت۔ شاہ خراسان کے سامنے ایک شخص پیش ہوا جس کی نسبت بیان کیا گیا کہ اس کو پیغمبری کا دعوے ہے۔ کہتا ہے کہ جبریل میرے پاس آتے ہیں اور خبریں دیتے ہیں÷ لوگوں کی رائے ہوئی کہ اس کو قتل کیا جائے÷ بادشاہ نے فرمایا کہ اس کو خلل دماغ ہوگیا ہے۔ اسے شفاخانہ لے جاؤ اور اچھی غذا و طعام سے اسے آرام دو کہ اس کا دماغ درست ہو جائے÷ ایسا کیا گیا÷ چند روز کے بعد بادشاہ کا ادھر سے نکلنا ہوا۔ دیکھا کہ دیوانہ کا رنگ و روغن اور ہی ہوگیا۔ ہوش کی باتیں کرتا ہے÷ بادشاہ نے پوچھا کہ "جبریل اب بھی آتے ہیں؟" جواب دیا کہ "ہاں" پوچھا "کیا کہتے ہیں؟" جواب دیا "کہتے ہیں کہ یہاں کھانے کو اچھا ملا ہے اس جگہہ کو ہرگز نہ چھوڑیو۔ دیوانہ ہے اگر یہاں سے نکلے" ؎

ہر کجا بے زحمتے آش است و ناں ÷ مغتنم داری برادر آں مکاں

گرچہ در زندان و کنج خانۂ ÷ گر بروں آئی یقیں دیوانۂ

حکایت۔ نوشیرواں بادشاہ نے مخفیہ پھرتے دیکھا (اگلے بادشاہ اکثر رعایا کا حال بھیس بدل کر دیکھا کرتے تھے) کہ ایک بڑھیا ٹوٹے بدھنے سے وضو کر رہی ہے۔ بدھنا ایسا ٹوٹا

ہوا تھا کہ ہر چند بڑھیا ہاتھ رکھنے کی کوشش کرتی تھی بدھنا لڑھک جاتا تھا اور پانی گر جاتا تھا۔ بادشاہ کو افسوس ہوا کہ میری رعایا میں محتاجی کا یہ حال ہے کہ سونے کا بدھنا نصیب نہیں جس سے وضو کر سکیں۔ وزیر حکیم بزرجمہر کو بلایا اور بڑھیا کا حال بیان کیا۔ وزیر نے عرض کیا کہ جو ارشاد عالی ہو تعمیل کی جائے۔ فرمایا "چاہتا ہوں کہ سونے کا آفتابہ بنوا کر بڑھیا کو بھیجدیا جائے"۔ وزیر نے کہا کہ "حضور کا ارشاد بہت درست ہے۔ لیکن بڑھیا کو شرمندگی ہوگی"۔ بادشاہ کو خیال ہوا کہ وزیر مانع معلوم ہوتا ہے۔ وزیر نے عرض کیا کہ "میں مانع ہرگز نہیں۔ لیکن حضور اس امر میں بڑھیا کی تخصیص نہ کریں۔ اسے شرمندگی ہوگی کہ بادشاہ کو عورتوں کا حال معلوم ہو گیا۔ اور عورت کے لئے پردہ داری لازم ہے۔ حضور سونے کے پچاس آفتابے تیار کرنے کا حکم دیں اور بڑھیا کے ہمسایوں میں جو محتاج ہیں اُن سب کو سونے کا ایک ایک آفتابہ بھیجدیں تاکہ بڑھیا سمجھ جائے کہ بادشاہ کے الطاف عام ہیں اور خجل نہ ہو۔"

عام ہیں اس کے تو الطاف شہیدی لیکن ؛ تجھ سے کیا ضد تھی اگر تو کسی قابل ہوتا

بے سبب کسی کا احسان لینے پر سڈنی اسمتھ کے ذکر میں ہے کہ کوئی امیر دولتمند ان کی لیاقتوں کا حال سن کر ان کی ملاقات کے مشتاق ہوئے اور دعوت کا پیام بھیجا کہ آج آپ میرے ساتھ کھانا کھائیں۔ سڈنی اسمتھ نے جواب میں لکھا کہ آپ مجھے اس طرح شرمندہ نہ کریں۔ آپ میرا حال جانتے ہیں کہ میری حیثیت آپ کو کھانا کھلانے کی نہیں۔ جب میں آپ کی دعوت نہ کر سکوں میری غیرت اجازت نہیں دیتی کہ میں آپ کی دعوت قبول کروں۔

مثل۔ مولانا قطب الدین نے کسی احول (بھینگے) سے پوچھا (احول کو ایک چیز کے دو اور دو

شعراء کشمیر

تھوڑا عرصہ ہوا کہ دہلی یونیورسٹی کے رجسٹرار صاحب نے مجھے فرمایا تھا کہ کشمیر کی تہذیب و تمدن کا حال اگر جمع ہو سکے تو بہت بکار آمد شغلہ ہے۔ مجھے اتنی فرصت نہ ملی کہ اس کی تعمیل بخوبی کر سکتا مگر کشمیر کے چند شعراء کا کلام فارسی میری نظر سے گزرا جو یہاں لکھنے کو جی چاہتا ہے ٭ کشمیر کے شاعروں میں **غنی** کا کلام ایران کے شعراء سے مرتبہ میں کسی طرح کم نہیں۔ **صائب** بھی کشمیر کے شاعروں سے ملا تھا جن کے ساتھ بزم سخن اکثر گرم رہا کرتی تھی ٭ ظاہر ہے کہ سلاطین مغلیہ کے زمانہ میں جب بادشاہ خود کشمیر تشریف لے جاتے تھے تو کشمیر بڑے ذی کمالوں کا مرجع رہا گیا ٭

یوسف کشمیری در سلاسلِ معانی و الفاظش پائے فکر و نظر زنجیرے ؎

دلم بجفۂ لعلِ تو مائل افتاد است ٭ چہ آتش است کہ در خانۂ دل افتاد است

ہما۔ مولوی عطاء اللہ کشمیری ہمائے اوجِ بے نظیری است ؎

حالِ دل راکہ دراں حلقۂ مو میداند ٭ ہر کہ در دام بلا می فتد او میداند

ہدایت۔ سعد اللہ خاں کشمیری خلف عنایت اللہ خاں عالمگیری است و فرخ سیر بادشاہ ہر چند باوے بد بود مگر بہ شکایت بعض مقربان او را قتل نمود ؎

جستم و مثل او نیافتہ ام ٭ انتخاب اینقدر نمی باشد

نازکی ختم شد بر اندامت ✤ موربا ایں کمر نمی باشد

آزاد۔ محمد عظیم۔ از خطۂ بے نظیر کشمیر است و بہ شاگردی شالم کشمیری کسب سخنش دل پذیرہ۔ برفاقت سید امیر خاں ناظم در اکبرآباد طرح اقامت انداخت و بہاں جالقد زندگانی باخت سه

ظلم بر ساغر و بے داد بہ مینا نہ کنم ✤ کنم موسم گل توبہ بے جا نہ کنم

(یہ شعر لاجواب کہا۔ موسم گل میں ساغر و مینا سے توبہ "توبہ بے جا" اور ساغر و مینا پر ظلم ہے) ✤

ہاشم۔ میر محمد ہاشم از مردم کشمیر است وکلامش رد درد لہا تاثیر سه

زحرف مہر فریبم مدہ کہ می دانم ✤ بجز جفا ز تو کارے دگر نمی آید

رباعی۔ رو فقر گزیں کہ فقر بہتر ز غنا ✤ کاں سایہ کند در آفتاب فردا

دولت نہ دہد نجات ز آتش چوں فقر ✤ خس خانہ بہ از قصر بود در گرما

رباعی۔ مائیم کہ در شعلہ نشیمن کردیم ✤ آتشکدہ را خیال گلشن کردیم

بردیم خیال دوست ہمراہ بخاک ✤ شمعے بمزار خویش روشن کردیم

وفا۔ پنڈت دینا ناتھ ولد منسا رام کشمیری شاگرد مرزا علی اکبر عارف شیرازی سه

خیال زلف پریشاں شگفتہ کرد مرا ✤ شمیم طرۂ جاناں شگفتہ کرد مرا

(ولہ)۔ داد ابروے تو اے ترک جواب شمشیر ✤ تیغ بر کش کہ منم تشنۂ آب شمشیر

(ولہ)، راحت تیغ نگاہ یار ما دانیم و دل ✤ لذت زخم دل افگار ما دانیم و دل

(ولہ)۔ تا مسی از بہرِ خوبی صرفِ دنداں کردۂ ٭ برق در دامانِ ابرِ سبزہ پنہاں کردۂ

(ولہ) اے کہ بر روے چو مہ زلفِ چلیپا داری ٭ صورتِ شام و سحر جمع بہ یک جا داری

وحشت۔ محمد شاہ خاں نام داشت و در خطۂ دل پذیرِ کشمیر پا بعرصۂ شہود گذاشت۔ از رفقائے اسلام خان بود و کمال تبحر بنکتہ رسی و مضمون ایجادی خود می نمود۔ از پنداری کہ داشت شعرِ خود پیش مردم خواندن عار و ننگ می انگاشت و بر سخنورانِ دیگر زبان بایرادی کشاد۔ چنانچہ ایں مصرع ناصر علی را ع چیزے کہ ندیدنی است آنہم مائیم۔ لغو قرار داد کہ منجملہ چیزہائے نادیدنی۔ زبان است۔ پس قائلش بقول خود ہمان است ٭ بالجملہ **وحشت** عمر دراز یافت و در سنہ بضع و اربعین و مایہ و الف ازیں وحشت کدہ بہ دار القرار شتافت ؎

گر آئینہ دار بہرِ رویت شدہ بر دوشم ٭ کہ ہمچوں ماہِ نو بر خویشتن می بالد آغوشم

ولہ۔ بسکہ در دل ہوسِ سیر نگاہاں دارم ٭ ہر کجا خاک شوم رو بہ صفاہاں دارم

رباعی۔ احسن اللہ خانِ کشمیری مخاطب بہ **فصاحت خاں** از منصب دارانِ محمد شاہ بادشاہ بود و زانوئے تلمذ پیشِ مرزا عبد الغنی **قبول** تہ نمود۔ کلامش تسکین بخشِ دلہائے ناشکیب و اوراقِ رنگین دیوانش ریاضِ دل فریب ؎

جہد بیادِ خطش آتشم ز چشمِ پر آب ٭ چو ننہد خضر چراغے بر دکسے لبِ جو

ولہ۔ آں رخ و لب ز خال مستغنی ست ٭ گل و مُل را نقط نمی باید

ولہ۔ با عندلیب صلح کنم یا بہ باغباں ٭ اے گل ترا بخاطرِ عاطر چہ می رسد

ولہ۔ اگر بجا تم یارانِ رفتہ نیست چرا ٭ ز جادہ ہاست الف سینۂ بیاباں

واله۔ خواجہ نور اللہ کشمیری؛ طلیق اللسان و فصیح البیان ست در بر شامدان نکات و دقایق واله و حیران ؎

بہ بوئے زلف یار اے دل بہ دنبالِ صبا رفتی ٭ برنگِ نکہتِ گُل در ہوایش تا کجا رفتی

(وله) رُخِ تست آتشِ طور و ید بیضا بود دستت ٭ مُسلّم دعوئے خوبی ہمہ اعجاز می آئی

واصل۔ محمد واصل خاں کشمیری۔ مشقِ سخن از مرزا گرامی کردہ ؎

واماند سر بمہر ما دولتِ نیاز ٭ در سر نوشت ما چو نگین جز سجود نیست

منتخب۔ مرزا روح اللہ منتخب۔ از سخن فہمانِ کشمیر است۔ دیوانش مفرح القلوب مردم دیگر ؎

مبیں اے بوالہوس بر چہرۂ زردم بچشم کم ٭ کہ من خود را باکسیرِ محبت کیمیا کردم

مشفقی۔ کشمیری۔ در تہذیب طبعزادگاں کمال شفقت و توجہ مبذول می داشت ؎

اے آنکہ سر ز شوق مستت دادند ٭ جائے و دے مہر پرستت دادند

یک جرعہ ببیں ساز بر تشنہ لباں ٭ شکرانۂ جامیکہ بدستت دادند

مقبول۔ مرزا ارحمند کشمیری پسر کوچک مرزا عبد الغنی قبول ؎

بے نرگس تو اشکِ من آلودہ خون شد ٭ ایں آبِ تیرہ صاف بیادام می شود

تمنا۔ شیخ ہبۃ اللہ کشمیری۔ تلمیذ شیخ علی حزیں لاہیجانی ؎

شرم زاں روز کہ یارم بسر بالیں گفت ٭ سخت جانی کہ ہنوزت نفسے می آید

تمکیں۔ مرزا محمد علی برادر زادۂ مرزا عبد الرسول استغنا کشمیری است ؎

ز رویت ہر نظر آئینۂ دیدار می خواہم ٭ بجانِ خود ترا اے دلستاں بسیار میخواہم

(ولہ)۔ ز بوستان محبت طمع چہ دارد کس ÷ کہ نخلِ عشق تباں را ثمر ز سنگ بود

تمکین تخلص مولوی رحمۃ اللہ از نبائر ملا محمد امین فاضل کشمیری و شاگرد مرزا عبد الغنی بیگ قبول است و از علمار عہد شاہجہانی و عالم گیری و ممارس علم معقول و منقول و در انشا سحر حلال سحر کاری با نمود

زفرطِ خاکساری کردہ ام جا بر سرِ کویت ÷ رقیباں زیں سبب دارند در خاطر غبارم را

(ولہ)۔ ہستسب بہر ماہ پارۂ من ÷ گرایں بود در ستارۂ من

(ولہ)۔ دل در سوادِ زلفش کرد است داغ روشن ÷ ہنگام شام سازد ہر کس چراغ روشن

(ولہ)۔ تپ فرقت مرا در استخواں است ÷ چو شمع از جنبشِ نبضم عیاں است

زبس از فرقتم قالب تہی شد ÷ گر آئی در کنارم جائے آں ست

تحسین۔ آقا عبد العلی کشمیری۔ دختر زادہ مرزا داراب جویاست۔ در زمرۂ ملازمانِ نواب برہان الملک سعادت خاں ناظم ملکِ اودھ انتظام داشت

این شیوہ کہ نامش آشنای است ÷ در مذہب ما سرِ جدای است

در پردہ برنگِ شمع فانوس ÷ کارِ تو ہمیشہ خود نمائی است

تحسین زعمت ہلاک گردید ÷ من بعد تخلصش فدائی است

(ولہ)۔ باشد مکاں ز گرم روی لامکاں مرا ÷ در زیر پا چو آبلہ است آسماں مرا

تائب۔ خواجہ ابو الحسن کشمیری۔ بحرفۂ تجارت معیشت می نمود

جنونم کو سرِ وحشت زد خبر شد کوہ صحرا را ÷ رہِ خود گیر اے مجنوں وطن کن کوے لیلےٰ را

زیارانِ زبانی دشمنِ جان قدرداں باشد ؛ دمِ آخر کہ ہمدم جز سکندر بود دارا را

گر تائبؔ تو حالِ پیرِ کنعاں ؛ غنیؔ بشنو

کہ روشن کرد نورِ دیدہ اش چشمِ زلیخا را[۱]

بینش - جعفر بیگ کشمیری از سخن سنجانِ عہد شاہجہانی ست - مثنوی و دیوان لطافت نشانش لایق دید است ؎

زریش خانۂ آئینہ سامانے دگر دارد ✤ پری در شیشہ مے در جام گلشن در نظر دارد

(ولہ) - دریں بہار نہ شد نو گلے دوچار مرا ؛ کہ زیر سایۂ خود جا دہد چو خار مرا

(ولہ) - کم بمن عربدہ اے شوخ لب باید کرد ؛ روے خود دیدہ مرا منع نظر باید کرد[۲]

اظہری - نابینا: نامش حیدر علی ست از خویشاں ملا **مظہری کشمیری** - و میان ہر دو اتحاد دلی ؛ پدرش از موصل بہ ہند رسید - اظہری از وے در دہلی سر بعرصۂ ظہور کشید - در عہد اکبری و جہانگیری بعیش و تنعم گزرانید - وے با ملا مظہری و ملا شیدا آبادی شوخیہا کردے و مطایبۂ ہمدگر ارباب صحبت را انگیختہ اور وے ؛ روزے **اظہری** با **مظہری** گفت کہ تو محل منی - وے جواب داد کہ تو محل مستعمل منی ؛ و یکبار **اظہری** در مشاعرہ غزل طرح میخواند چوں باین مقطع رسید ؎

خواہ با **اظہری** و خواہ بہ بیگانہ نشین ✤ من ہمیں شرم ترا بر تو نگہباں کردم

ملا شیدا گفت راست گفتی - خدا حافظ زنِ نابینا - دہانِ یارانِ رنگیں آشنائے قہقہہ گردید

---

[۱] تائبؔ کے یہہ تینوں شعر لاجواب ہیں جن کو شاعری کی جان کہنا چاہیئے ؛

[۲] یہہ مصرع جس پر خط کھچا ہے بہت خوب کہا کہ نہایت صاف اور بلا مبالغہ ہے ع روے خود دیدہ مرا منع نظر باید کرد ؛

دانہم ری خجلت کشیدہ

از دشمناں برند شکایات پیش دوست ٭ چوں دوست دشمن است شکایت کجا برم

(ولہ) دیدہ را بر رخ زیبائے تو حیراں کردم ٭ دیدہ داند کہ بہ ایں دیدہ چہ احساں کردم

(ولہ) گر بہ بت خانہ خرامی ز خرامیدنِ تو
بت شود برہمن از بہر پرستیدنِ تو

اس مضمون میں تمام شعرائے کشمیر کا ذکر آنا مشکل ہے۔ کشمیر کے نامور شعرائے نام مثل ملا غنی و مستغنی و مقبول وغیرہ کے میں نے عمداً چھوڑ دیئے کہ ان کو سب جانتے ہیں ٭ یہہ چند نام جو اس مضمون میں درج ہیں ان کی سند میں نے تذکرہ شمعِ انجمن سے لی ہے اور احتیاطاً اسی تذکرہ کی زبان جو فارسی میں ہے نقل کر دی ٭ کشمیر میں فارسی زبان کا رواج قدیم سے رہا وہاں اُردو کے شاعروں میں کسی کا نام نہیں سُنا ٭ اس میں شک نہیں کہ سلاطین مغلیہ کے زمانہ میں کشمیر کی تہذیب و تمدن قابل تعریف تھی جہاں ہر طرح کا عیش و اطمینان سب کو حاصل تھا۔

یہہ مضمون اور مثل اس کے ذی کمالانِ کشمیر کے لئے بڑے کام کے ہیں۔ سلاطینِ مغلیہ کے زمانہ میں کشمیری نہایت ممتاز عہدوں پر تھے اور اب بھی تمام اقوام ہندوستان میں کشمیری صاحبان بہت ذہین و لائق سمجھے جاتے ہیں۔ مضمون نگار اہل کشمیر کی لیاقت کا بہت قائل ہے ٭

نازک خیالیاں

زبانِ فرنچ کی نازک خیالیوں اور پاکیزہ بیانیوں میں بالزیک کا میں مدت سے قائل تھا۔ حال میں اناطول فرانس کی تصانیف دیکھ کر مجھے تعجب ہوا کہ خدا نے فرنچ زبان میں کیسے کیسے لاجواب لکھنے والے پیدا کر دیے۔ اناطول فرانس نے ابھی وفات پائی ہے۔ اس کی موت سے یورپ کے تمام اہلِ علم و اہلِ قلم میں تہلکہ پڑ گیا کہ بڑا ذی کمال دُنیا سے گزر گیا اس کی اکثر تصانیف یورپ کی اکثر زبانوں میں ترجمہ ہوئیں۔ خاص کر انگریزی زبان میں سب سے زیادہ۔ میں فرنچ زبان سے واقف نہیں۔ لیکن اس کے انگریزی میں ترجمہ شدہ ناول میں بہت شوق سے پڑھتا ہوں۔ اور چونکہ صلائے عام کو اپنی زبان میں نازک خیالیوں اور پاکیزہ بیانیوں کے جمع کرنے اور جہاں تک ہو سکے اُن کے پیدا کرنے کا خیال ہے۔ اناطول کے آغاز کے ایک ناول سے دو ایک نمونے اپنی زبان میں عرض کرتا ہوں۔

کسی راوی کی زبانی ہے کہ میں نے اُس معصوم کم سن بچی کو گود میں لے کر اپنے بھائی کے حادثہ کا ذکر کیا۔ کتنا ہی چھپانے کو جی چاہا مگر بے اختیار زبان سے نکل گیا کہ اب کی عید

میں تمہارے نئے کپڑے نہ بن سکیں گے : تم اپنے چچا کو جانتی ہو - تمہیں کس طرح پیار کرتے تھے - عیدمیں جو تمہارے لیئے کھلونے - چیزیں لاتے تھے - گزر گئے ! یہہ سُنکر تم رو و مت - رونا تو ہمارے نصیب میں رہا ہے کہ ہمارا قوتِ بازو نہ رہا - ایک دن یہہ سب کا حال ہونا ہے : اگر خدا کو منظور ہے تو اگلی عید پر تمہارے نئے کپڑے بنیں گے - پھر تم خوب عید کی خوشی منانا - یہہ بارہ مہینے جلدی کٹ جائیں گے ؛

یہہ سُنکر بچّہ نے ٹھنڈا سانس بھر کر میری طرف دیکھا اور کہا کہ اگلی عید پر چچا جان کا حادثہ کیا ہو جائے گا ؟ اس سوال کی خوبیٔ بیان اصل زبان میں غضب کی ہے کہ اگلی عید پر چچا جان زندوں میں داخل ہو جائیں گے ؟

اس قصہ کو پھر کہہ لینے دیجئے - باوا نہی معصوم بچّی سے کہہ رہے ہیں کہ اس عید پر خوشی ملتوی سمجھو کہ تمہارے چچا جان کا انتقال ہو گیا : اگلی عید پر تم خوشی منانا ؛ لڑکی پوچھتی ہے کہ اگلی عید کو چچا جان کا انتقال انتقال نہ سمجھا جائے گا ؟

انسان کے لیئے بڑی تسلّی کی یہہ بات ہے کہ یہاں اس کی خوشی کو ثبات نہیں اس کا غم بھی بے ثبات ہے ؛

— بچّہ کا باپ مر گیا - بچّہ ماں سے پوچھتا ہے کہ ابّا کب آئیں گے ؟ ماں جواب دیتی ہے کہ تیرے ابّا جہاں گئے ہیں وہاں سے پھر کر آنا ممکن نہیں : اس پر بچّہ کہتا ہے اچھا ہے جو ابّا اب نہ آئیں - اماں میں تمہیں اتنا چاہتا ہوں کہ میرے دل میں ابّا کو جگہ

کی گنجائش نہیں رہی +

عقل مندوں سے زیادہ دیوانوں میں میراجی بہلتا ہے کیونکہ ان سے فکر بڑھتی ہے اور ان سے فکر دور ہوتی ہے ع کا نزاکہ عقل بیش غم روزگار بیش ٭

جناب مسٹر جارج سنٹیلس بری صاحب نے فرنچ لٹریچر کی خوبیوں کے بارے میں بہت کچھ لکھا ہے۔ ان کی تصانیف کئی جلدوں میں ہیں: فرنچ زبان کے خوش بیانوں کے چند خیالات یہاں اس طرح عرض کرنے کو جی چاہتا ہے کہ خیال اُن کے اور زبان اپنی :-

حسینانِ عصمت شکن دل سے خدا کے خوف سے بہت ڈرتے ہیں کہ گو نفس کی مجبوری سے گرفتارِ معصیت ہو جائیں مگر رسوم مذہبی کے زیادہ معتقد ہوتے ہیں: درگاہوں، نذر نیاز۔ وغیرہ کی طرف ان کو سب سے زیادہ اعتقاد ہوتا ہے + اس کے دو سبب سمجھئے کہ یا تو ڈوبتے کو تنکے کا سہارا ہوتا ہے یا عقائد مذہبی میں عصمت فروشی چونکہ بڑا گناہ ہے انہیں اپنے گناہ کی خجالت زیادہ ہوتی ہے۔ چاہتے ہیں کہ کسی طرح خدا ان کے اس گناہ سے درگزر کرے +

مادمینٹل کہتا ہے کہ اگر تمہاری بی بی حسین و نیک ہے تو تمہاری خوش نصیبی میں کیا کلام ہے؟ اگر بد مزاج و آوارہ خصلت ہے تو تمہارے فلاسفر ہونے میں

شک نہیں کہ حکیم سقراط کی بی بی کے عیب سقراط کے ہنر کا باعث ہوئے ۔ بی بی کی بدمزاجی سقراط کے صبر و استقلال کا سبب تھی ۔ بہرحال ۔ عورت بھلی ہو یا بُری بے کار نہیں ۔ شیخ سعدیؒ کا قول جو فرماتے ہیں کہ ؎

زنِ بد در سرائے مردِ نکو ۔ ہم دریں عالم است دوزخِ او ۔ بہت ٹھیک نہیں ۔

— ایک ماہوش اپنے چاہنے والے سے روٹھ کر اُس کے تحفے تحائف واپس کرتے وقت سوچتی ہے کہ اُنکی واپسی سے اُسے میری جُدائی کا افسوس کئی سبب سے ہو گا :

اوّل تو ۔ میرے نصیب بُرے اور بُرے نصیب کے ساتھ مجھ میں بڑا خبط پارسائی کا ہے ۔ اور دونوں پارسائی و بدنصیبی میں توام بچوں کی طرح یک رنگی و ہم شکلی ہے ۔ مصیبت میں دونوں کے خط و خال ایک سے ہیں ۔ دوسرے میں ابھی کم سن ہوں اور کم سنی کے ساتھ حسین ہوں ۔ اس سے زیادہ اور کیا چاہیئے ؟ مجھے سوجھا کہ میں زندگی بھر اُسے نہ دیکھوں ۔ عورت ہو کر میرے لئے یہہ مردانہ حرکت ہے کہ ع ہزارت آفریں مردانہ رفتی ۔ سبب یہہ کہ میں اُسے چاہتی ہوں اور خوش تھی کہ مجھے اُس سے محبت تھی اور وہ جانتا تھا کہ مجھے محبت ہے ۔ اور اس پر بھی جو میں اُس سے ترکِ محبت کر رہی ہوں ۔ اُسے معلوم ہو جائے گا کہ کس غضب کے دل سے اُسے سابقہ پڑا تھا ۔

— خدا نے جب خلقت کو پیدا کیا تو جس سے اُس کو جتنی محبت تھی اتنی ہی اس میں خوبیاں پیدا کیں ۔ حسینوں سے اُسے محبت زیادہ تھی سب سے زیادہ خوبیاں حسینوں کو عطا فرمائیں ہر چیز خاک سی بنائی مگر ان کے دل موم سے بنائے (گو کہنے کو شاعر ان کے دل پتھر کے بتاتے ہیں) بہشت

ہماری نازک خیالیاں

بارہم طبائے دل غم آں ماہ پارہ شد ✤ ای وائے بر مریض کہ مرضش دوبارہ شد

جب میں غیر زبانوں کی نازک خیالیوں کا اس قدر دل دادہ ہوں تو اپنے ہاں کی نازک خیالیوں کی داد نہ دوں تو اس سے زیادہ کفران نعمت ممکن نہیں ؎

باز از ہر سخنم بوے جنوں می آید ✤ باز آہ از جگرم غرقہ بخوں می آید

ذرا عرصہ ہوا کہ گیتا نجلی کی واہ! واہ! کا شور سنکر دو چار مضمون اس عنوان سے صلائے عام میں لکھے لئے کہ "گیتا نجلی کی سی نازک خیالیاں" و "ہماری نازک خیالیوں" سے میری غرض سنسکرت۔ عربی و فارسی زبانیں ہیں: اردو میں اس وقت عمداً چھوڑتا ہوں کہ اس میں جتنا مجھے دخل ہے مجھسے زیادہ آپ کو و عموماً اوروں کو ہے۔ سنسکرت میں بالکل نہیں جانتا۔ اور عربی اس قدر نہیں جانتا کہ داد دینے کے مرتبہ کو پہنچ سکوں: اب رہ گئی فارسی اس میں نثر ایسی نہیں جو غیر زبانوں خاصکر یورپ کی زبانوں کی نثر سے بازی لے جاسکے: لیکن چونکہ ہر زبان کی لٹریچر میں نازک خیالی کا موقع و محل شاعری میں زیادہ ہے۔ نازک خیالی کا دعوے شاعری میں زیب دیتا ہے: نثر پر آپ کتنی ہی محنت کریں شاعری کے سامنے بیکار ہے ؎

بادیدہ حکایت ازلبِ دریا دلاں شنید ؛ گوشش حباب جانبِ دریا کشادہ است

فارسی کی شاعری میں اپنی اس لئے سمجھتا ہوں کہ اس میں مسلمان تو مسلمان اہلِ ہنود نے بھی بڑا کمال پیدا کیا - بلکہ اُردو میں شعرا اُردو نے مسلمان ہوں یا ہندو جو کمال دکھایا وہ فارسی زبان میں کمال کا نتیجہ ہے۔ اس لئے یہاں "اپنی نازکخیالیوں" کے چند نمونے پیش کرتا ہوں اور پہلے اہلِ ہنود کے کلام سے شروع کرتا ہوں ؎

نوائے زاہد و مرغِ چمن خداطلبی است ؛ ثنائے اوست اگر فارسی و گر ہندی است

منشی دولت رائے نبیرہ راجہ بھولاناتھ کے کلام سے دو ایک شعر عرض کرتا ہوں۔ ان کا تخلص **شوق** تھا۔ یہہ واجد علی شاہ بادشاہ کے اچھے تلامذہ میں تھے جو "تلامذۂ واجدی" کے نام سے مشہور تھے ؎

بادیدۂ گریاں بہوائے رُخِ او شوق ؛ بنشست بہر دشت و چمن ساختہ برخاست

(دشت کو چمن بنانے کی ترکیب کتنی اچھی نکالی کہ دیدۂ گریاں و ہوائے رُخِ یار۔ اس نے ایک دو دشت نہیں ہر دشت کو چمن بنادیا۔ کتنی آسانی سے ویرانہ عالم گلزار جہاں بن گیا)

اسی "برخاست" والی غزل میں یہہ دو شعر بھی پاکیزہ ہیں ؎

وحشت بردم آہ دراں دشت کہ یکدم ؛ قیس آمد و بنشست و جگر باختہ برخاست

(اس میں "جگر باختہ" خوب کہا) دوسرا شعر جنگ نامہ کا جواب ہے ؎

تُرکم چو کمر بستہ و تیغ آختہ برخواست ؛ مریخ ز بیمش سپر انداختہ برخواست

شوق کی دوسری غزل کے یہہ دو شعر بہت صاف ہیں ؎

رفتہ جا بدیدار کردہ ❊ اے اجل کار مسیحا کردہ ❊ نقد جاں دادی بہائے بوسہ ❊ شوقِ مشب طرفہ سودا کردہ (اجل سے مسیحا کا کام لینا اور اُن سے بہتر کہ اُن کے جِلانے میں پھر مرنے کا اندیشہ تھا یہاں ہمیشہ کو مرنے سے فراغت ہوگئی) یہہ مَیں پہلے عرض کرچکا کہ یہاں مجھے ہندو و مسلمان سے غرض نہیں۔ صرف زباں کی نازک خیالیاں دکھانی ہیں ❊ حضرت عیشی کا کلام ہے ؎

گریہ ہا در شوقِ رویش می کنم ❊ خندہ ہا بر ماہِ تاباں می زنم ❊ (گریہ و خندہ اور خندہ بھی ماہ تابان پر۔ اِس سے زیادہ شوقِ روئے یار کیا ہوگا؟) ؎

تا چند تواں نالہ و فریاد شنیدن ❊ عیشی بجذا با تو بیک خانہ نباشم

(گھر چھوڑنا پڑا) رباعی۔ عیشی بہ شکیب ایں ہمہ بیتابی چیست ❊ بگریستی آنچناں کہ دشمن بگریست

گویند کہ بعد مرگ اُمیدِ وصل است ❊ چندے باُمیدِ مرگ ہم باید زیست

(مرنے کی اُمید میں جینا غایتِ فصاحت ہے) ❊

جناب غافل سیستانی کی رباعی ہے ؎

غافل نہ شوی ازیں دو معنیٰ غافل ❊ سرمایہ مرد زیں دو گردد حاصل

زیں راہ نمایاں بہ یکے شوقائل ❊ یا عقلِ درست یا جنونِ کامل (آدمی ادھورا کسی کام کا نہیں ❊) یہہ رباعی بھی اچھی ہے ؎

در کوئے خرابات چہ درویش وچہ شاہ ❊ در راہِ یگانگی چہ طاعت چہ گناہ

بر کنگرہ عرش چہ خورشید وچہ ماہ ❊ رخسارِ قلندری چہ روشن چہ سیاہ

حاجی طیلسی کی رباعی بھی بُری نہیں ؎

درخوابگہ جہان من شب یلدای ∴ چشمے بکشودم از پے بینائی
دیدم مردہ و نبود بیدار کسے ∴ من نیز بخواب رفتم از تنہائی ∴ ؎

خون شد دل من خوب شد این خون شدنی بود ∴ آں بہ کہ ز بیداد تو رشد چوں شدنی بود
(ایکدن مرنا تو قسمت میں تھا۔ یار کے ہاتھ سے مارے گئے تو نصیب اچھے تھے ؎ کہا پتنگے نے بہ شمع دار پہ چڑھ کر ∴ بڑا مزہ ہے جو مرئے کسی کے سر چڑھ کر)

یوسف شیرازی کا شعر ہے ؎

جاں ز پہلوے تن از قیمتِ خود بے خبر است ∴ قطرہ در ابر چہ داند کہ گہر خواہد شد
(بندے کے قفس کا موت سے پوچھئے احوال ∴ کہ آگ لینے کو جائیں پیمبری مل جائے ∴ مرنے کے بعد اگر ہماری حالت یہاں سے بہتر ہو جائے تو آپ انکار کیوں کریں) اس کے خلاف

وقاری یزدی کا شعر ہے ؎

ز غربت بہرہ جز خواری نمی باشد عزیزاں را ∴ بہ از گوہر بود دنداں ولے تا در دہن باشد
(زندگی تب ہی تک ہے جب تک جان ہے۔ جان نکل گئی تو پھر کیا دھرا ہے؟)

وسعت سمرقندی کی غزل کس بلا کی ہے۔ کہتا ہے ؎

جنونم حیرتم آئینہ دارِ حسنِ معمورم ∴ چمن پروردہ عشقم بہارِ خونِ منصورم
(بہارِ خونِ منصور غضب کی بات نکالی کہ ایسی بہار جو خونِ منصور سے پیدا ہوئی)
سپندِ آتشِ نازم ز بے تشنید آزارم ∴ اسیرِ خندۂ گل بادم ہلاکِ چشمِ مخمورم
شرارم شعلہ ام داغم کبابم آتشم جوشم ∴ تپیدن ہاے زخمِ اضطرابِ نبضِ رنجورم

دلم دردم غمم آزادِ عشقم بندۂ حسنم ؛ نمک پروردۂ سبزان ہندم صد جہاں شوم

دغیر ملکوں کے رہنے والوں نے کبھی ہماری لٹریچر میں اس قدر کمال پیدا نہ کیا جس قدر کہ ہم نے غیر زبان میں کمال پیدا کرکے دکھا دیا۔ میر انشاء اللہ خاں دریائے لطافت میں لکھتے ہیں کہ :۔ "میرے امتحان میں یہہ آیا ہے کہ ہر شہر اور ہر ملک کے آدمی کی پوری تقلید کرنا دہلی کے رہنے والوں کا حق ہے دوسری جگہ کے بسنے والوں کو یہہ بات نصیب نہیں۔ اس پر تذکرہ جلوۂ خضر کا مصنف لکھتا ہے کہ "واقعی یہہ حصہ ہندوستانیوں ہی کا ہے کچھ دہلی پر تخصیص نہیں" ؛)

شیخ وجیہہ الدین پنجابی جو ملا نور العین واقف کے شاگرد تھے کیا خوب کہتے ہیں ؎

آمد بہار اے دلِ دیوانہ صبر کن : زنجیر از برائے تو فرمودہ ایم ما

اس سے بہتر کیا کوئی کہے گا؟ اسی طرح وارثی کا یہ شعر ہے ؎

چہ بے دردانہ آہے میکشی اے وارثی ہر دم ؛ تو ناشنیدنی تہیدِ درسو میکنی خود را

اب میں جلدی جلدی چند شعر نازک خیالی کے اور سنا دوں۔ اس میں شاعروں کے نام میں عمداً چھوڑتا ہوں کہ محض نازک خیالیوں کا خیال ہے۔ کسی کے نام و نمود سے مقصد نہیں ؎

یار در خواب و شب آخر شد و دل کام طلب ؛ مصلحت چیست کہ بیدار کنم یا نہ کنم

مدعی آمد عیادت از زبانِ یار کرد ؛ آہ این پرسش مرا بار دگر بیمار کرد

باغباں از گل حدیثے گفت و از گلزار خویش ؛ عارضش دید و پشیماں گشت از گفتار خویش

کارسازانِ جہاں در کار خود بیچارہ اند ؛ سیل نتواند کہ شوید گرد از رخسار خویش

نقد دو کون در گرہِ چشم بستن است ٭ سیرِ بہشت در پیِ زانو نشستن است

زندہ ام کن کہ روم باز بفرمانِ سرت ٭ تا بہ کے صبر کنم روزِ قیامت دیر است

ست بوقتِ شتہ ادتم معلوم ٭ زندگی ہم بکار نی آید

نفسِ دلسنیت از بہر گلہ برخاستن ٭ جا کند در دیدہ گرد از پیش یار برخاستن

گیرم دیرباس تواں کرد عاشقی ٭ دیوانگی چگونہ تواں در لباس کرد

آخر چو شمع سیہ روے گشت دانستم ٭ کہ ہر کہ پردہ دری کرد خود رسوا شد

طپد در سینہ ام دل از خیال حلقۂ زلفش ٭ چو گنجشکے کہ مارے گرد دش در آشیاں آید

فتد بر جا لہ شبنم بگشتِ او بخورشید است ٭ دلِ ہر کس کہ از خود می رود سوئے تو می

میں نہیں جانتا کہ شعرا فارسی کی نازک خیالیاں کہاں تک لکھے جاؤں۔ انکی نازک خیالیوں کی حد نہیں

بقول حضرت زجری ؎ قاصد بے رنگئہ خود انفعال کرد ٭ تا کے دروغ نقل کن از زباں

آخر میں فدائی طہرانی کے قطعہ پر میں یہہ مضمون ختم کرتا ہوں ؎

این جہانے کہ درو نیست کسے را بنیاد ٭ کہنہ دیریست کہ بسیار چو ما دارد

ایں جہانے ست کہ جمشید و فریدوں دیداست ٭ ایں جہانے ست کہ دادہ ست سلیماں

ایں ہماں جاست کہ خسرو بغم شیریں مرد ٭ ایں ہماں جاست کہ فرہاد بہ تلخی جاں

خرم آں کس کہ نیامد ز ازل سوئے وجود[1] ٭ فارغ آں کس کہ چو آمد بجہاں دل نہ نہاد

ہم نشیناں ہمہ رفتند تو ماندی تنہا

اے فدائی ز دلِ تنگ برآور فریاد

[1] یہہ انا للہ و انا الیہ راجعون کی تفسیر ہے۔

یہہ وہ مسئلہ ہے جسپر مہاراج گوتما بدھا کی تلقین و تعلیم کا مدار ہے کہ ... انسان پیدا ہو کر دنیا میں آتا ہے۔ اس ظلم کا علاج یہی ہو کہ ...

اُردو زبان پر انگریزی زبان کا اثر

اس عنوان پر انگریزی میں ایک جدید تصنیف ولایت سے میرے پاس آئی ہے۔ یہ مضمون قابلِ تحقیق و بحث ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہماری زبان پر انگریزی خیالات کا اثر بہت جلد ہو رہا ہے اور زیادہ ہوگا۔ ابھی اس سے غرض نہیں کہ یہ اثر ہماری زبان کی ترقی کا باعث ہوا یا نہیں۔ پہلے ہم اقبال کریں کہ اُردو کی ہستی کا باعث سلطنتِ انگریزی ہے: جس طرح آغاز میں مسلمانوں کی سلطنت سے فارسی اُردو میں سماگئی۔ اسی طرح انگریزی لب ولہجہ ہماری زبان میں دخل دے رہا ہے۔ یہاں تک کہ اکثر انگریزی خواں جب اُردو میں کوئی مطلب ادا کرنا چاہتے ہیں تو پہلے انگریزی ان کے ذہن میں آتی ہے جس کا ترجمہ کرکے اُردو میں بولتے ہیں۔ انگریزی دانی کا اس قدر رواج ہے کہ اُردو زیادہ تر انگریزی لب ولہجہ کا ترجمہ رہ گئی ہے: ٹھیٹھ اُردو یعنی خالص اُردو کی پاکیزہ بیانی کے لالے ہو رہے ہیں۔

اس کتاب کے مصنف کی رائے میں انگریزی لٹریچر کے اثر سے اُردو لٹریچر کو بہت فائدہ ہوا: اس میں شک نہیں کہ جس طرح گلاب میں پانی ملانے سے گلاب کی مقدار بڑھ جاتی ہے۔ لیکن خالص گلاب میں فرق آجاتا ہے اسی طرح بیگانہ لب ولہجہ کے مل جانے سے زبان کی وسعت کو گو فائدہ ہو مگر اصل زبان کی پاکیزگی میں فرق آجاتا ہے۔ غیر زبان کے ترجموں سے اصل زبان نہیں رہتی۔ کیونکہ اصل اصل ہی ہے اور نقل نقل ہے۔

Influence of English Literature on Urdu Literature

انگریزی لٹریچر کی تقلید میں سب سے بڑا نمونہ اُردو میں ناول نویسی ہے۔ اِس فن میں ہماری زبان نے کوئی بڑا کمال نہیں دکھایا۔ اُردو ڈراما میں بھی کوئی بات ایسی نہیں جس پر اُردو کو ناز ہو۔ شعر میں اگر انگریزی شاعری کی تقلید کیجائے تو اُردو کا شعر سُننے کو کسی کا جی نہ چاہے ✤

جس طرح غیر ملک و قوم کے لباس و طعام کی نقل سے کوئی خاص فائدہ نہیں اسی طرح غیر زبان کے لب و لہجہ سے اُردو میں ترقی تو درکنار اس کے مسخ ہو جانے کا اندیشہ ہے

مجھے تعجب ہے کہ باوجود اس قدر تعلیم انگریزی کے رائج ہونے کے ہم میں سے انگریزی دانوں میں بہت کم اچھی اُردو لکھنے والے پیدا ہوئے۔ مولانا شبلی و حالی اور خود سر سید احمد خاں اور اُن کے رفیقوں میں انگریزی دان نہ تھے۔ اور ان کی نسبت کہا جاتا ہے کہ ان کی وجہ سے انگریزی لٹریچر و خیالات کا اثر اُردو پر پڑا ✤

ہاں مگر میں دیکھتا ہوں کہ انگریزی لٹریچر کی وجہ سے ہندوستان میں پولیٹیکل بحث مباحثے زیادہ بڑھ گئے۔ کانگریس۔ خلافت۔ ورسوراج کے دعوؤں کا شور زمین سے آسمان تک پہونچ گیا کہ بیچاری اُردو کی کان پڑی ہوئی بات سمجھ میں نہیں آتی ✤ وہ اگلا سا ادب آداب کا طریقہ نہ رہا۔ لطف صحبت کا خون ہو گیا۔ دو چار صورتیں جو اگلے وقت کی باقی رہ گئی ہیں یہی اساتذہ کی زبان کی یادگار ہیں ؎

رنگیں سوا ہے اب کے گلِ نوبہار سے
اگلا جو برگ زرد کوئی اس چمن میں ہے

تنقید

(متعلقہ پرچہ ماہ مارچ ۱۹۲۶ء)

تنقید حسب ذیل عرض کرتا ہوں۔

مضمون پریشاں" اچھی دلجمعی پیدا کی ہے بڑا خوبصورت مضمون ہے۔ تیر و کماں کی تمثیل میں کج و راست کو خوب پیدا کیا ہے۔ یہ بڑا لطف خیز مضمون ہے۔ حیرت خیز یہ بات ہے کہ راستی موجب جدائی ہوتی ہے۔

"نظم و نثر" یہ مولوی بشیرالدین احمد صاحب رمیشؔ بی نے بہت ہی دلچسپ اور پُر مغز مضمون تحریر فرمایا ہے جس سے مذاق سخن پیدا ہوتا ہے۔ میرے خیال میں بازی انہیں کے ہاتھ رہی۔ اب تو میرا جی یہی چاہتا ہے کہ اقبال کر دوں کہ نظم مشکل ہے۔ گو مولوی صاحب مجھ سے اتفاق نہیں فرماتے مگر میں ان کا اتباع کرتا ہوں۔ **حالی** کا کلام عجب لطف دیگیا ہے اور امر حق کہا ہے کہ ع "جھوٹ سے ہوتی ہے یاں رونق عبادت کو سوا" کسی دل جلے کا قول ایک نظم گو کو سنتا ہے کہ ع "شعر کہتے کہتے تو ڈپٹی کلکٹر رہگیا۔ ورنہ کمشنر ہو جاتا" فقط سارا مضموں پڑھ جانے پر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جناب مولوی صاحب کو نظم خود بھی ناپسند ہے۔ اور اس کے مشکل ہونیکا ثبوت اس آخر شعر سے پیدا ہے۔ جس کی تقطیع کرنیکو میرا جی چاہتا ہے پس معہ وزن و تقطیع عرض ہے۔

	بحر اور وزن شعر	تقطیع شعر معہ ارکان
اول	رمل مثمن مقصور۔ مصرعہ اول فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلات ۱ ۲ ۳ ۴	ایسی قسمت (۱) تھی کہاں کر (۲) تا جو میں کر (۳) ب کمال (۴)
دوم	بحر رمل صدر و ابتدا سالم و حشو۔ عروض ضرب مجنون مقصور۔ مصرعہ ثانی فاعلاتن مفعلاتن فعلاتن فعلان ۳ ۴	بے کمالی (۱) میں بھی افسو (۲) س کہ کامل (۳) نہ ہوا (۴)

کیفیۃ

اس میں ایک لطف یہ بھی ہے کہ اگر مصرعہ اولی کو زبان دباد باکر پڑھو تو مصرعہ ثانی کے ہموزن ہو جاتا ہے۔

"اُردو کی ترقی کس طرح ہوسکتی ہے" یہ مضمون بہت قابلانہ لکھا ہے اور کیوں نہو۔ جناب مرزا محمد علی خاں صاحب رئیس دہلی کی قلم سے نکلا ہے۔ یہ امر حق ہے جیسا کہ فرمایا ہے کہ "زبان اسی ملک کی وسیع ہوتی ہے جس کی حکومت ہو دولت ہو جس کا تمدن بڑھا ہوا ہو..... جس کے ہاتھ میں علوم و فنون ہوں" جو تدابیر ترقی زبان اُردو کے ذکر فرمائے ہیں وہ بہترین ہیں اور "آئی ایم ویتنک" کی تمثیل بڑی پُر مذاق ہے۔ مجھے اس موقع پر یہ یاد آگیا کہ لکھنو کی گھوڑ دوڑ میں ایکبار میں نے ایک گورے کو ایک میوہ فروش سے نارنگی خرید کرتے دیکھا۔ گورے کے استفسار پر اس میوہ فروش نے یہ جواب دیا تھا کہ "ون پائس ایچیہ" "نوشی ٹیک خوشی نو ٹیک" (ایک ایک پیسہ میں جب چاہے لو چاہے نہ لو) میں کیونکر باور کروں کہ اردو زبان جو دہلی یا لکھنو کی کسی وقت میں ٹکسالی زبان تھی اس زمانہ میں اسی حیثیت پر قائم رہیگی بقول حضرت خاں صاحب موصوف "جو سیلاب یورپ سے ہندوستان کو آرہا ہے یہ ہمارے روکے رک سکتا ہے؟" ہمارے خان بہادر صاحب بیحد خفا ہوں گے جب میں یہ عرض کروں گا کہ یہ سیلاب ہرگز نہیں رک سکتا اور ہماری شیریں زبانی کی بنیاد جڑ سے کھود کر پھینکدیگا جیسا کہ میرے قول کی تائید خانصاحب موصوف کا یہ فقرہ درد انگیز ہے کہ "ہمارے زمانہ کے نوعمر... ظلم ڈھا رہے ہیں کہ "بے **ضرورت**" انگریزی الفاظ اُردو میں بولتے ہیں"

"اُصول سلطنت مغلیہ" کا مضمون بھی خاص کر جناب خاں صاحب (مرزا محمد علی رئیس دہلی) لکھا ہوا ہے اور بلا تصنع معلومات کا اعلیٰ ذخیرہ ہے۔ بالکل حق بجانب فرماتے ہیں۔ "انگریزوں کی خوش انتظامی کو دیکھکر حیرت ہوتی ہے... اگر ہمارے ملک کے نواب مہاراجہ... تقلید کریں تو.... ملک کس قدر ترقی حاصل کرے۔

"نمامی" یہ محلات کی بولی معلوم ہوتی ہے کہ موتے ڈر کر لیسین کا لفظ زبان سے نہیں

جناب خاں بہادر صاحب فرماتے ہیں کہ "رنج سے بچنے کی تدبیروں میں اور خیال غمگینی سے بچنے کے واسطے اسی سورۃ (یٰسین) کو بے نام (ناامی) سمجھا گیا" ہاں یہ طریقہ مہذب حُسنِ بیان کا ہے ورنہ جس طرح سے محلات کی زبان میں نگوڑی (جسکے پاؤں نہوں) نہتی (جسکے ہاتھ نہوں) مستعمل ہیں ناامی بھی ہے اور (نداقا) اس کا مطلب تو یہ ہوتا ہے کہ خبردار نام نہ لو ورنہ عزرائیل پہونچ جائیگا

(مرزا عرفان علی بیگ)

غزل
(در رسالہ صلائے عام کیلئے عید کی تقریب میں)

(از جناب مولانا سید معین الدین احمد صاحب قیسؔ رضوی عظیم آبادی)

عید کا دن ہے ساقیا! بادہ کشوں کو جوش ہے
شیخ کا نام بھی نہ لے شیخ تو دیں فروش ہے

ڈھال کے لا دو میکشو! منہ میں چوا دو میکشو!
جام اُٹھا کے خود پیوں آج کہاں یہ ہوش ہے

نام ہے جس کا سلسبیل ہے مرے میکدہ کا خُم
کہتے ہیں جس کو باغ خلد کوچۂ مے فروش ہے

کرگیا ساقیا ملال، دل کو مرے ترا جمال
ہاتھ بڑھا کے جام لوں کسکو یہاں یہ ہوش ہے

زہد ریا سے ہے بھرا، عدل ہے ظلم ناروا
گندم اُسے کہاں نصیب شیخ تو جو فروش ہے

دل کی لگی سے تنگ ہوں کرکے گرو شراب لوں
خرقۂ پیر خانقاہ اب تو وبالِ دوش ہے

حرمت میکدہ رنگین یا نہ رنگین شراب خوار
اپنی سی کہہ کے صاف صاف پیر مغاں خموش ہے

آنکھ سے کیا دکھائی دے کان کیا سنائی دے
نور ترا بہ محتسب پردۂ چشم و گوش ہے

ہے مئے ناب کی سبیل جوش پہ آیا ہے سلسبیل
شور نشور سے سوا بانگِ بیا بنوش ہے

اپنی خطا کو صاف کہہ قیس! حیا سے چپ نہ رہ
پیر مغاں کی بزم میں جو ہے وہ عیب پوش ہے

سوال - جواب طلب

مجھے عرصہ دراز سے دو سوال الجھن میں ڈالے رکھتے ہیں۔ ہر چند کوشش کی مختلف علماء سے بھی ان گتھیوں کو سلجھانے کی کوشش کی۔ مگر سب بے سود۔ میرا مقصد حاصل نہ ہوا۔ جوں جوں ان کے سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اتنا ہی زیادہ پریشان ہوتا ہوں۔ اور مشکلات کا سامنا ہوتا ہے۔ بالآخر یہی سمجھ میں آیا کہ آنجناب کی خدمت میں اپیل کروں۔ شاید منظور ہو جائے اور ان دونوں معموں کا حل معلوم ہو جائے۔

پہلا معمہ:۔ حیات و ممات انسانی ہے۔ اس میں یہ معلوم نہیں ہوتا کہ انسانی قدرت اور اختیار میں یہ کس حد تک ہے۔ قرآن پاک اور احادیث صحیح سے اسکا حل معلوم کرنا چاہتا ہوں۔

دوسرا معمہ:۔ تقدیر و تدبیر کا ہے:۔ اسمیں کون افضل ہے۔ تقدیر اول ہے یا تدبیر۔ اول الذکر غالب ہوتی ہے یا ثانی الذکر۔ جواب اسلامی نقطۂ خیال سے نیز فلسفیانہ اصول سے بھی ہو تو زیادہ مفید ہوگا۔ کیا میں امید کرسکتا ہوں کہ آنجناب خود یا کوئی صاحب اپنے قیمتی اور بیش بہا وقت کا حصہ صرف فرماکر احقر کو مطمئن اور ناظرین صحیفہ گرامی کو معلومات ضروریہ سے مستفیض فرمائینگے۔ فقط السلام

جواب کا طالب مصاحب نواب صاحب بہادر ریاست پاٹودی

چیفس کالج فسٹ ہاؤس۔ لاہور۔

صلائے عام۔ یہ سوال ایسے نہیں جو اخباروں میں طے ہوسکیں۔ انکے جواب میں کتبخانہ کے کتبخانہ خالی ہوگئے لیکن ہر شخص کے اطمینان کے لائق جواب نہ ملا۔ **صلائے عام** کو مقاصد مذہبی سے بہت کم تعلق ہے ایسے مضامین محض ازروئے تحقیق مجھے بالکل مناسب ہے۔ تحقیق کی رو سے جو لکھا جائے اسکے بعد بھی یہ جھگڑا باقی رہیگا کہ آپکے اطمینان کا ذمہ کون ہے یا پہلے یہ معلوم ہونا چاہیے کہ آپنے ان مسائل کے متعلق کیا کیا کتب دیکھی ہیں؟ دوسرے سوال کے ایک جزو یعنی تقدیر و نصیب کا جواب کچھ کچھ ع۔ اینہ نصیب است ہمہ میرسد

انچہ نصیب است بہم میرسد ؎

نصیب اس میں تو مطلق شک نہیں کہ جو نصیب کا لکھا ہے وہ ملیگا۔ لیکن نصیب کتنا ہے کہاں سے ملیگا کیسا ہے اور کب ملیگا۔ یہ سارے امور متعلقہ بحث طلب ہیں۔ جب تک نصیب نہ سمجھ لیں خالی اس پر قناعت کر لینے سے کہ انچہ نصیب است بہم میرسد کسی کو اطمینان نہیں ہو سکتا۔ اور نہ بیٹھے بٹھلائے نصیب والا حصہ مل سکتا ہے۔ اور پھر نصیب بھی اپنی خاص قسم رکھتا ہے یعنی برا ہے یا بھلا ہے۔ اگر خدانخواستہ برے نصیب کے حصہ میں پڑ گئے تو پھر ساری کوششیں اور ساری گفت وشنید رائگاں ہیں۔ بقول سعدی علیہ الرحمۃ ؎

بنتواند گرفت دامن دولت بزور
کوشش بیفائدہ است وسمہ بر ابروے کور

اس موقع پر بعض بدبختی کی حالت میں کہا کرتے ہیں کہ نصیب پھوٹ گئے۔

بخت واژگون ہر چند کہ ہنر بہت بڑی چیز ہے کہتے ہیں کہ ہنرمند بھوکا نہیں رہتا لیکن نصیب کے آگے ہنر کی دال نہیں گلتی۔ ؏

ہنر بکار نیاید چو بخت بد باشد

یہ تو سچ ہے کہ عقل ہر طرح باور کراتی ہے کہ ہنرمند بہرہ مند ہوتا ہے۔ مگر تجربہ نے ہزاروں ہنرمندوں کو اچھی طرح سے سمجھا دیا ہوگا کہ بخت کا پایہ زبردست ہے اور بختاور وہی کہلاتے ہیں جو اپنی سعی میں کامیاب ہوتے رہتے ہیں ورنہ بدبخت کہلاتے ہیں اور جن کا نصیب سو جاتا ہے وہ بدترین خلائق ہو جاتے ہیں اور ہر کس وناکس ان پر انگشت نمائی کرتا رہتا ہے لیکن بدبختی سے نکل جانے کا کوئی راستہ نہیں سمجھ میں آتا چاہے کیسی ہی زور آزمائیاں کیجئے بغیر نصیب جاگے

کچھ بھی ہاتھ نہیں لگتا ایسے ہی موقع پر کہا ہے کہ ؎

چہ کند زور مند واژوں بخت

بازوئے بخت بہ کہ بازوئے سخت

سعی و زعم یہ بہت کہ گفتہ شد کسی انسان کو بلا سعی کے ہرگز نہ رہنا چاہئیے نہ تو اسی پر بھروسہ رہنا شایاں ہے کہ ہم تو بختور ہیں خدا بن مانگے دیتا ہے اور نہ اسپر نا امیدی کی تہ لگا کر بیکار بیٹھنا چاہئیے کہ بدبختی تو سوار ہے ہمارے کئے کیا ہوتا ہے۔ کیونکہ نیک بختی اور بدبختی تو انسان کے اختیار میں نہیں ہے مگر کوشش کرتے رہنا اور غیب کی بخشش پر بھروسہ رکھنا ہر طرح سے لازم ہے عرب کا مقولہ ہے لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی لیکن سعی کے واسطے بھی عقل درکار ہے ورنہ وہ سعی بھی کچھ کام نہیں دیتی ؎

رزق ہر چند بے گماں برسد

شرط عقل است جستن از درہا

اور سعی اور تلاش رزق میں رنگت بوئے خاندان و دیگر اعزازی حالت پر کبھی اعتبار نہ ہونا چاہئیے جیسا کہ ایک موقع پر مولانا روم علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں ؎

افتخار از رنگ و بو و از مکاں

ہست شادی و فریب کودکاں

پس سعی کرنے والے کو زعم محض طفلانہ حرکت ہے اور کچھ بھی نہیں۔

جو ملتا ہے بقدر حاجت ہے یہ بالکل صحیح ہے کہ سعی کسی کی رائگاں نہیں جاتی گو قضیہ کی برائی بھلائی ساتھ ساتھ چلتی ہے مگر سعی کا بہترین نتیجہ ہنرمندی پر ما ئیفین موقوف ہے چنانچہ ایک موقعہ پر سعدیؒ نے فرمایا ہے کہ ؎

گر فریدوں شود بہ قیمت و ملک

بے ہنر را بہیچ کس مشمار

اور بہرہ مندی۔ نصیبہ وری اور بہرہ بھی اسی قدر انسان پا سکتا ہے اور پانیکا مستحق ہے کہ جسقدر
اُس کو حاجت درپیش ہے۔ یہ بھی امر حق ہے کہ دینے والا چھپّر پھاڑ کر دیتا ہے مگر داد و دہش بھی
لینے والے کی حاجت سے کبھی باہر نہیں ہوسکتی گو حرص و طمع کیسے ہی دامنگیر کیوں نہوں یہ
دونوں لفظیں بے نقط ہیں اور ان کے تین تین حرف محض خالی ہیں اپر یہ قول بالکل صادق آتا
ہے کہ ؎

گر زمیں را بآسماں دوزی
نہ دہندت زیادہ از روزی

پس بقدر حاجت سب کچھ ملتا ہے

بہرہ مندی کا ازالہ ۔ اگر بخت نافرجام اور عقل ناتمام سدراہ نہیں ہیں تو انسان اپنی سعی
سے بالیقین بہرہ مند ہوگا۔ اور سعی اُسی میں ہوسکتی ہے جس میں انسان کے لئے محض سعی ہے اور
عوض اس کا ذات الہی پر دارومدار رکھتا ہے اور وہی درگاہ تو ایسی ہے جس میں کمی کی گنجائش
ناممکن ہے اور عطیات فراواں کی انتہا نہیں۔ ایک حکایت میں مولانا روم فرماتے ہیں ؎

ہر چہ خواہندت بدہ مندیش[1] ازاں
داد یزداں را تو بیش از بیش داں

یہ اشارہ اور خواہش کی تصویر ایک امیر کی طرف سے جسکے دروازہ پر ایک درویش
شئ للہ کی صدا لگا رہا تھا اور امیر اپنے بخل سے بھرا اس کو لعن طعن اور بندہ شکم کہتا تھا
اور درویش یہ جواب دیتا تھا ؎

بہر نان در خویش حرص ار نہ بدے
اشکم نان خوارہ را بدریدے

فقط مجھے اس موقع پر وہ راز و نیاز کی باتیں کہنا منظور نہیں جتنلو اس درویش سے خاص
سروکار تھا میرا مطلب تو صرف اسی قدر ہے کہ **انچہ نصیب است بہم میرسد** ۔

[1] سدیں مخفف مندیش کا ہے جسکے معنی ہیں اندیشہ مکن۔

برآمدم بر سر مطلب — پس ستی کی داڑھی پہونچی اور امیر کا سارا بخل کرم کے ساتھ بدل گیا اور غیب سے آواز آئی ؎

در عطائے ما نخشید نہ کم
نے پشیمانی نہ حسرت نے ندم

اور بالآخر اس امیر کو یہ ارشاد ہوا کہ ؎

ید اللہ فوق ایدیہم تو باش
ہمچو دستِ حق گزافہ رزق پاش

اور پھر اس بخیل کی ایسی کایا پلٹ ہوئی کہ ؎

زر شدے خاک سیہ اندر کفش
حاتم طائی گدائے در صفش فقط

راقم مرزا عرفان علی بیگ آئی. ایس - از آگرہ

"رسالہ صلائے عام بابت ماہ مارچ ۱۹۲۹ء آج صبح کی ڈاک سے پہونچ پیکٹ کھولنے کے بعد صفحہ ۵۴ پر جناب مائل دہلوی کی غزل پر نظر پڑی. یہ شعر کیا خوب کہا ہے. ؎

اب آگیا تو بازیچۂ جہاں دیکھتا چلوں ۔ اچھا ہے یا برا ہے مگر رہ گذر میں ہے. یہ شعر بھی سبحان اللہ وہ دن گئے کہ زندہ دلوں میں شمار تھا ۔ اب زندگی کشاکش شام سحر میں ہے. لیکن اگر "سحر" کاتب صاحب "صحر" نہ لکھتے تو کیا نقصان تھا!

واہ اے آرزوئے قتل مبارک ہو آج تو ۔ خنجر ہے جس کا نام وہ ان کی کمر میں ہے

× × × × × × × × × × × × × × × × ×

سلہ تحریر معنی رجوع سلہ گزافہ حساب سے عدد

عورتوں کے چھل داؤ

دنیا کے دولت مندوں اور امیروں کا بہت بڑا مشغلہ یہ ہے کہ اپنا عزیز وقت اور اپنی بے بہا تندرستی کو عورتوں کی نذر کرتے رہتے ہیں اور اس نشہ میں اس قدر سرشار ہیں کہ اُن کو دین دُنیا کی خبر نہیں ہوتی ایک ہزار امیروں سے شاید ایک دو نفوس ہی ایسے بھی ہوں کہ دوسرے ضروری کاموں میں مصروف رہتے ہوں ورنہ جہاں تک دیکھا گیا اور سنا گیا سب کو اسی بلا میں مبتلا پایا اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ منجملہ دیگر خدا کی نعمتوں کے عورت بھی ایک بڑی نعمت ہے اس کی بے قدری کرنا نہ چاہئے۔ مگر اسی قدر کہ حدِ اعتدال سے تجاوز نہ ہونے۔ دُنیا میں ہزاروں امیروں کی خانہ بربادی اور خرابی اسی مشغلہ سے ہوئی۔ بہت سے بادشاہ۔ نواب راجہ عورتوں کی مصاحبت کی بدولت اپنی دولت و حکومت سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ عورت ایک عجیب جادو ہے۔ یا ایک حیرت انگیز دلربا قوت ہے کہ دیکھتے بھالتے سمجھدار عورتوں کے ہاتھوں خراب ہوتے ہیں:

فغاں کیں لولیانِ شوخ شیریں کار شہر آشوب: چناں بردند صبر از دل کہ ترکاں خوانِ یغما را

اور سنو امیر تو امیر بہت سے اوسط درجہ کے خوش حال بھی عورتوں کی بدولت بہت سی مصیبتوں کا شکار ہوتے ہیں:

سُنا ہے کہ جب سکندرِ اعظم کی ایشیائی فتوحات کی زیادہ شہرت ہوئی اور اسی عرصہ میں اُس نے ہندوستان کا رُخ کیا تو ہندوستان کے راجہ مہاراجوں میں کھلبلی مچی اور تردد و تشویش پیش آئی سب نے مل کر مشورہ کیا کہ کیا کرنا چاہئے ہے اکثر کا اس پر اتفاق ہوا کہ سکندر سے لڑ کر جیتنا دشوار ہے۔ کوئی اور تدبیر اختیار کرنا چاہئے ہے آخر یہ خیال کر کے کہ

سکندر تو عمر نہ رست بادشاہ ہے اس کو عورتوں کے دام محبت میں پھانس لیا جاوے ہر ایک راجہ نے حکم دیا کہ ہمارے علاقہ سے خوبصورت لڑکیاں تلاش کیجاویں چنانچہ صدہا خوبصورت لڑکیاں جمع ہوگئیں پھر ایک مجلس انتخاب کے واسطے مقرر ہوئی کہ وہ ان سب حور شمائلوں میں سے سب سے بہتر دو چار لڑکیاں منتخب کرے۔ اُس مجلس نے حسن و خوبی کے ہر پہلو پہ نظر کی اور دو لڑکیاں وہ بلائے بادروزگار منتخب کیں کہ جن کو حسن کی دیبی کہا جا ہئے۔ پھر اُن کو مختلف زیور اور مختلف رنگتوں کے ملبوسات پہنا کر دیکھا گیا۔ جو جس زیور اور لباس میں اچھی معلوم ہوئی اُس کے لئے وہ خاص کیا گیا۔ خلاصہ یہہ کہ چند دیگر تحائف کے ساتھ ان دونوں آفت کے پرکالوں کو سفیر لے کر روانہ ہوئے کہ سکندر کے روبرو پیش کیجاویں ؛

سکندر حالت سفر میں تھا کہ یہہ سفیر وہاں پہونچے سکندر کے ہمراہ ارسطو نہ تھا والیس وغیرہ حکیم ہمراہ تھے۔ والیس نے حقیقت حال سے مطلع ہو کر سکندر سے عرض کیا کہ ہندوستان کے راجہ آپ کی آزمایش کرنا چاہتے ہیں کچھ تحائف لیکر سفیر حاضر ہوئے ہیں۔ اُس نے کہا کہ کس بات کی آزمائش ہے حکیم نے کہا کہ حضور کی دانشمندی کی عام شہرت ہے وہ یہہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ سکندر کی عقل شہوت پر غالب ہے یا شہوت سکندر کی عقل پر غالب ہے۔ سکندر نے سفیروں کو حضوری کا حکم دیا اور اُن سے کہا کہ میں ہندوستان والوں کو بہت عقلمند سمجھتا ہوں مگر تعجب ہے کہ انہوں نے یہہ خیال نہ کیا کہ جو بادشاہ دنیا کے بہادر مردوں کو شکست پر شکست دے رہا ہے وہ اُن کی ضعیف عورتوں کے ہاتھوں شکست کھانے پر کیوں راضی ہوگا۔ جو بادشاہ بڑے بڑے زبردستوں کو اپنا فرماں بردار حکم بردار بنا چکا ہے وہ ضعیف ترین مخلوق کا یعنی عورتوں کا خود حکم بردار کیوں کر ہوگا۔ ہر آں کو بود بہتر انجمن ؛ کفن بہتر او را ز فرمان زن ؛ اگر نیک بودی زن و رائے زن ؛ زناں را مزن نام بودی نہ زن

یہہ سنکر سفیر بے نیل مرام واپس آئے۔ سمجھدار راجاؤں نے کہا سکندر جیسے شخص کی اطاعت کرنا واجب ہے

تصویر کا دوسرا رخ

سکندر ہندوستان آیا اور کچھ حصے ہندوستان کے قبضہ میں لایا فوج رات دن کی جنگ سے خستہ ہوگئی تھی اُس نے آگے بڑھنے سے انکار کیا تو سکندر واپس ہوا راستہ

میں بابل کی دلدل میں ناک سے خون آیا چونکہ خود طبیب تھا جانا کہ یہ ہی موت ہے۔ سکندر نے نجومیوں سے یہ بھی سُنا تھا کہ جب سکندر مریگا تو زمین لوہے کی اور آسمان سونے کا ہوجاویگا۔ سکندر کو بھی خیال ہوا کہ حقیقت میں مجھ جیسے بادشاہ کا مرنا معمولی نہ ہوگا کچھ نہ کچھ تغیر ہوگا۔ راستہ میں بیمار ہونے سے اور ڈیرے خیمے پیچھے رہ جانے سے ہمراہیوں نے اپنے زرین سپروں کا سکندر پر سایہ کیا اور اپنے زرین جھلیتے بجا فرش بچھا دیں۔ سکندر نے اوپر تلے نظر دوڑائی تو سمجھا کہ نجومیوں کی بات پوری ہوئی۔ پھر ایک ایک حکیم کا نام لیکر پکارا کہ آکر مجھے موت کے پنجہ سے چھڑا دو۔

ارسطو کجا تا بہ افسوں گری ؛ کند چارۂ جانِ اسکندری
دوا سپہ بہ پرسش فرستید کس ؛ مگر شاہ را دم دہد یک نفس
کجا شد فلاطونِ پرہیزگار ؛ کہ نکتہ بامن کند آشکار

حکیموں نے سکندر سے کہا کہ اس وقت علم و حکمت سے آپ کام نہیں لیتے عام لوگوں کی طرح موت سے ڈر گئے۔ سکندر یہ سُنکر ہنسا اور کہا کہ میری غرض اس چیخ پکار سے یہ ہے کہ اگر دُنیا میں کوئی شخص بوجہ اعلےٰ حکومت ہونے کے یا صاحب فوج و خزانہ ہونے کے یا بوجہ علم و حکمت کے موت سے محفوظ رہتا تو وہ میں تھا۔ اگر حکیم کسی کو دوا اور علاج معالجہ سے بچا سکتے تو وہ آج میں ہوتا۔ مگر میرا مرنا باوجود موجود ہونے ان کل سامانوں کے اس امر کی دلیل ہے کہ موت کسی کو نہ چھوڑے گی۔ تم کو چاہئے کہ میرے بعد میرے جنازہ کو مجمع عام میں رکھ کر ایسے کلمات بیان کرنا کہ جس سے لوگوں کو عبرت ہو کیوں کہ میرا مرنا بہت کچھ موجب عبرت ہے۔ چنانچہ مجلس عام میں جنازہ رکھا گیا تو ایک حکیم اُٹھا اور اُس نے لوگوں سے کہا کہ سکندر وہ بادشاہ تھا کہ بڑے بڑے بولنے والوں کی زبان میں اس کے روبرو لکنت پڑ جاتی تھی مگر آج یہ ایسا چپ ہے کہ گویا گویا نہ تھا۔ تم سب بول رہے ہو اس کو مجال سخن نہیں۔ دوسرا حکیم اُٹھا اور اُس نے کہا کہ یہ وہ بادشاہ ہے کہ اس نے مُلک کے مُلک لوگوں کو بخش دئے لاکھوں بیگہ زمین کا مالک کر دیا۔ مگر آج اس کو دو گز زمین کے دینے میں تکرار ہوگی

بیت و حکیم کھڑا ہوا اور اُس نے کہا کہ لوگو یہہ وہ بادشاہ ہے کہ آج اس کے خزانہ عامرہ میں دنیا جہان کی عمدہ سے عمدہ ہر شئے موجود ہے۔ مگر یہ خود دنیا سے دونوں ہاتھ خالی جاتا ہے یہہ کفن بھی تمہارا سلوک ہے ورنہ اس پر بھی اس کو قدرت نہیں۔ سکندر کا سپہ سالار آیا اور اُس نے کہا کہ نہ بودی ہمی نالہ بوق را ۔۔ گردید یکہ تنگ صندوق را۔ سکندر کے باڈی گارڈ کا افسر آیا اور اس نے عرض کیا کہ اے بادشاہ کہ میں سایہ کی طرح تیرے ساتھ ہمیشہ رہا اور تیری حفاظت میں آج مدفن سے آگے نہیں چل سکتا۔

روشنک سکندر کی بی بی اور دارا کی بیٹی آئی اُس نے رو کر کہا کہ اے سکندر جس سے تو نے تنہا لڑا تو تو نے فتح پائی ہزاروں کے ساتھ لڑا تب تو نے فتح پائی۔ میں سمجھتی تھی کہ تجھے ہمیشہ جینا ہے سہ زمانہ ترا داد گفتم جواز ۔۔ ہمی داری از مردمان خویش راز مگر حقیقت میں میرا خیال غلط ہوا۔ جو دوسروں کا حال ہوا وہی تیرا انجام ہوا ع ہمی خشت بنیم بہ بالین تو۔ یہہ کہہ سنکر اُس علم و حکمت کے خزانہ کو آخر مدفون کیا گیا۔ باقی آئندہ

(مرزا محمد علی)

ایک پرانے یار کا خط

× × × × × × × × × × × × × × × ×

میں پیدا تو ہوا شیعوں میں۔ اور ابتدا میں موافق دستور اُس وقت کے مذہبی احکام وغیرہ جو بتلائے و پڑھائے جاتے تھے وہ بھی معلومات حاصل کی سنہ ۷۲ء سے سنہ ۱۸۸۶ء تک اکثر اہل السنن کو نمازیں پڑھا کر امامت بھی کی۔ پھر یہاں آنے سے یعنی سندھ بلوچستان و افغانستان سے واپس آنے پر ستیارتھ پرکاش سری دیانند سرستی مہاراج کا دیکھنے سے شوق ہوا کہ جن جن مذہبوں پر اعتراض کیا گیا ہے۔ اُن کے بھی جوابات دیکھنے چاہئیں۔ وہ دیکھے عیسائی و یہودی وغیرہ کتب سماوی کی تفسیریں وغیرہ اردو میں ملیں اور یجروغیرہ وید وا پنشد

شاستروں کے اُردو میں ترجمے و شرحیں نہیں نگاہ کر دیکھیں۔

۱۹۰۸ء تک اسی شوق میں رہا۔ اب چند عرصہ سے یہہ حال ہے کہ ہندو و چار و سر گرا وغیرہ سب سے پرہیز ٹوٹ گیا اور کوئی مخالف خیال نہیں رہا۔ نہ بہشت کی آرزو اور نہ دوزخ کا خوف نہ دُنیاوی روپیہ پیسہ کی خواہش۔ جب تک سانس چل رہا ہے اس جسم کی ضروریات کو بھی موافق نظام قدرت مجبوراً پورا کرنا سمجھکر انجام نزرہی کر رہا ہوں۔ نہ بھائی یا عزیز سے محبت ہے اور نہ نفرت۔ نہ کچھ خواہش۔ مگر دنیاوی ضرورتیں تعلقات قدرتی سے جو کچھ کرنے پر مجبور کرتی ہیں کرنا پڑتی ہیں۔ خود خواہش اچھی یا بُری نہیں ہے۔ ۱۸۹۶ء سے بیوی۔ بچّے سے بھی سبکدوش ہوگیا تھا۔ اور وہ میری امداد کے خواہش مند بھی نہ تھے۔ × × × × × × × ×

× × × × × × × صرف کتب بینی کے زمانہ میں یہہ خیال ہوگیا تھا۔ کہ یہہ کارخانہ جو دکھلائی دیتا ہے۔ اس کا فاعل ضرور ہونا چاہیئے۔ بس اسی خیال سے پیدائشی عقیدے کے موافق اللہ میاں کے نام کا ورد ہوگیا ہے۔ کہ ہر وقت تنہائی میں خود بخود اللہ نکلتا رہتا ہے۔ عادت ہوگئی ہے۔ اس میں بھی کوئی امید و آرزو نہیں ہے نہ نماز ہوتی ہے نہ روزہ رکھا جاتا ہے۔ سال گزشتہ کے مارچ مہینہ سے کچھ حالت ہوگئی ہے۔ کہ گرمی زیادہ محنت سے چکر وغیرہ آجاتا ہے مگر بلاخیال موسم دس بارہ میل روز رات میں اور دن میں پھرے بغیر نہیں رہا جاتا۔

آپ تو ناحق اس عمر میں جبکہ اس جسم کی پرورش کا سب کچھ انتظام قدرت نے کر رکھا ہے۔ تکلیف اُٹھا رہے ہیں۔ مذہبی جھگڑے چھوڑئے۔ میاں میں دھیان لگا لیجئے بہت اطمینان سے اور آرام سے گزرے گی۔ آپ کئی دن سے یاد کر رہے تھے۔ مجھے تنہائی میں تیسرے چوتھے آپ کی یاد ہو جاتی تھی۔ مکان مجھے معلوم ہے آپ نے علیحدہ بنایا ہوگا۔

آپ کا دُعا گو

× × × ×

انشاپردازی

انشار کے لغوی معنی شروع کرنے کے ہیں لیکن اصطلاح میں اُس فن کو کہتے ہیں جسے خطوط نویسی اور مضمون نگاری سے علاقہ ہو پس علم انشار وہ علم ہے جس میں فن انشار کا بیان ہو اور اُس کے متعلق بحث وتکرار کیا جائے۔

املا کے معنی بھرنے اور شروع کرنے کے ہیں لیکن اصطلاح میں رسم الخط یعنی ترکیب حروف کو قاعدہ کے موافق لکھنے کا نام ہے۔ علم انشار کو علم ادب سے وہی نسبت ہے جو فرع کو اصل سے یا جزو کو کل سے یا علم کو عمل سے۔ اس لئے پہلے علم ادب کی تعریف اور اُس کے اصول وفروع کا بیان کیا جانا لازمی ہے کیوں کہ علم انشار میں اکثر علم ادب کے اصول وفروع کی ضرورت واقع ہوتی ہے اور اُن کے نجاننے سے علم انشار میں کمال حاصل نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ علم ادب وہ علم ہے جس کے باعث اُس خطا سے جو کلام کے لکھنے یا بولنے میں واقع ہوتی ہے بچتے ہیں۔ علم ادب کے اصول لغت۔ صرف۔ اشتقاق نحو۔ معانی۔ بیان عروض وقافیہ ہیں اور فروع رسم الخط۔ فرض شعر اور محاضرات وغیرہ ہیں۔ جس طرح علم ادب میں کلام کے بولنے یا لکھنے میں خطا سے بچنا لازمی امر ہے اسیطرح علم انشار میں بھی خطا سے بچنا واجبات سے ہے بایں کلام کو موثر اور دلچسپ بنانا علم انشار کا غایت کمال ہے۔ انشار آدمی کی تحریر وتقریر کو موثر اور شستہ بنا دیتی ہے اور جو لوگ اس میں معراج کمال کو پہونچ جاتے ہیں وہی صاحب قلم اور منشی کامل کہلاتے ہیں۔ انشار کے لئے علم صرف نحو۔ زباندانی۔ عام معلومات۔ علم اخلاق۔ ضرب الامثال شعر وسخن کا مذاق لازمی ہیں۔ ایک منشی جو نام ہی کا منشی نہیں ہے بلکہ علم انشار کی عام معلومات کے علاوہ اپنے ہنر کی بُرائی بھلائی کو بھی سمجھتا ہے اور اس میں بہت ہی کچھ مہارت حاصل کئے ہوئے ہے وہ ان سب باتوں سے بخوبی واقف ہوگا اور یوں تو شُدبُد پڑھے ہوئے بھی اپنی بُری بھلی تحریروں سے کام چلا ہی لیتے ہیں مگر یہ لوگ

صلائے عام

جناب کامل کا شعر ہے ؎

ہر باغ میں تو لالے و ہم دونوں برابر ؛ پر ہم میں یہہ زاید ہے کہ شورش ہے جگر میں

یوں تو صلائے عام اور اُردو کے رسالوں اور اخباروں کے برابر ہے۔ مگر اس میں دو ایک خاص باتیں بھی ہیں: اوّل تو سوداگری و بازاری اشتہاروں سے اسے تعلق نہیں۔ دوسرے کیبروں اور دفتروں کے نوٹس اور سمن وغیرہ اس میں نہیں ہوتے۔ یہہ دونوں ذریعے اخباروں اور رسالوں کی آمدنی کے لئے بہت کارگر سمجھے جاتے ہیں ؛ تیسرے۔ ایک خاص خوبی یہہ ہے کہ بغیر کسی کی شراکت و امداد کے یہہ عرصہ سے جاری ہے۔ عقائد مذہبی میں بحث مباحثے یا کسی فرقہ کی طرفداری سے اسے واسطہ نہیں کہ ظاہر اور اخبار و رسالوں کو اپنے اپنے طرفداروں سے امداد کا سہارا رہتا ہے ؛ جناب لطف فرماتے ہیں ؎

وہ مسیحا جن کی خاطر ہے مبارک اُن کو ہو ؛ ہم تو اُس کے ہاتھ سے آزار ہی پاتے رہے

جب یہہ سارے ذرائع آمدنی کے (زکات کیطرح جو ساوات کے لئے جائز نہیں) صلائے عام پر بند ہیں تو اس کا نکالنا معمولی زیرباری سے زیادہ زیرباری کا باعث کیوں نہ ہو؟ لیکن اس سے یہہ اشارہ نہیں کہ زیرباری کی وجہہ سے اس کے بند ہو جانے کا اندیشہ ہو۔ ہرگز نہیں: (گو زمانہ کی بیقدری سے کبھی کبھی اس کا خیال ہوتا ہے ؛) انشاءاللہ خاں کا ان کی وضع کا شعر گو صلائے عام کی وضع کے خلاف ہے مگر یہاں میرا مطلب ادا کرنے کے لئے بے موقع نہیں ؎

رہا ہے ہوش کچھ باقی اسے بھی اب نہ مرے جا ؛ یہی آہنگ اے مطرب پسر تک اور چھیڑے جا

میرے لئے یہہ تسلی بس ہے کہ اہلِ علم و ذی کمال صلائے عام کی قدر کرتے ہیں۔ ان کے لئے کمالات علمی کے اظہار کا یہی اچھا ذریعہ ہے اور یہہ بغیر اظہار کمال رہ نہیں سکتے۔ بقول جناب تابش ؎

کبھی بن بادہ رہ نہیں سکتے ؛ تو یہ کچھہ ہم کو سازگار نہیں

بلکہ ارادہ ہو رہا ہے کہ آئندہ صلائے عام کے مضامین اسکی طرز خاص سے زیادہ لکھے جائیں۔ ناسخ کا شعر بڑی تعلی کا ہے ؎ یہی کہنا ہے جلوہ میرے بت کا ؛ کہ اک ذات خدا ہے اور میں ہوں ؛

مہتمم کی طرف سے۔

اطلاع

صلائے عام کی قیمت پیشگی چھہ روپیہ سالانہ ہے۔ قیمت بذریعہ منی آرڈر عنایت فرمائی جائے۔ مضمون نگار بھی **صلائے عام** کی قیمت سے بری نہیں۔ نہ یہہ ضرور ہے کہ ہر مضمون خواہ مخواہ شایع کیا جائے۔ جامع اوراق کو مضمون میں کمی بیشی کا اختیار رہے۔ جو مضمون شایع نہ ہو سکیں اُن کے واپس کرنے کا ذمہ نہیں۔

صلائے عام میں ہر طرح کے مضامین نظم و نثر شایع ہوتے ہیں۔ زیادہ تر نثر کہ اس وقت نثر کی زیادہ ضرورت ہے۔ وہ نثر بھی ایسی جس میں زبان کی خوبی و فصاحت کے ساتھ مضمون کی پاکیزگی و نازکخیالی ضرور ہو یعنی لباس ع عروسِ جمیل دلبا بہ حریر۔ شرط ہے کہ مضمون پاکیزہ اور ادائے بیان لاجواب چاہیئے۔

اکثر اصحاب نمونہ کا پرچہ مانگتے ہیں۔ اوّل تو ایک پرچہ سے **صلائے عام** کی ساری خوبیوں کا حال معلوم ہونا مشکل ہے دوسرے **صلائے عام** اتنے عرصہ سے جاری ہے کہ اہل علم میں شاید ہی کوئی ایسا ہو گا جو اس سے واقف نہ ہو۔ پھر بھی اگر کسی کو نمونہ یا سال سے کم کی خریداری منظور ہو تو ایک روپیہ فی پرچہ کے حساب سے قیمت لی جائے گی۔

صلائے عام کا پتہ اس قدر کافی ہے کہ:

دہلی۔ فراشخانہ: مکان میر ناصر علی خاں بہادر

حسب الارشاد میر ناصر علیخاں بہادر مطبع ناصری واقع فراشخانہ دہلی میں باہتمام میر احمد چھپا اور شایع ہوا۔

Printed and Published by Mir Nasir Ali Khan Bahadur (Editor) at the Nasri Press, Farrash-Khana, Delhi

...نوح رکھکر بیاضِ جبیں   کہا دوسرا کوئی سمجھا نہیں

جلد ۱۳   نمبر

SALÂ-I-ÂM, DELHI.

A high class Monthly Magazine devoted to the cause of Urdu literature, the preservation of the old Indian, especially Mohammadan culture and refinement, and the assimilation of the best features of the new civilization

حسب الارشاد میر ناصر علی صاحب بہ اہتمام میر منتظر احمد مطبع ناصری واقعہ فراشخانہ میں چھپا اور شائع کیا

جلد ۱۳ — نمبر ۵

فہرستِ مضامین

بابت ماہ مئی ۱۹۲۵ء مطابق شوال ۱۳۴۳ ہجری

پیرایہ آغاز

ان سے تحریر کی [illegible] ہیں ﴿ نقش [illegible] ذرا رنگ جمالیں تو کہیں

میں دیکھتا ہوں کہ اب اکثر رسالوں اور تازہ تصنیفوں اور تالیفوں میں کچھ دیباچہ کے طور پر لکھنے کا دستور ہو گیا ہے۔ اس کا عنوان کہیں "شذرات" کہیں "ملاحظات" کہیں "معاملات" کہیں "[illegible]" کہیں "حرف گفتنی" کے نام سے لکھا جاتا ہے۔ مدت تک میں صلاح عام کے ہر پرچہ میں دیباچہ لکھا کرتا تھا۔ دیباچہ کا لفظ ذرا رسمی ہو گیا لیکن [illegible] کچھ نہ کچھ لکھنے کی ضرورت باقی رہ گئی ہے۔ اس لئے مضامین سے پہلے پیرایہ آغاز کے نام سے لکھنا بیموقع معلوم نہیں ہوتا۔

خواب میں جا کے زلیخا کو جگایا کس نے ﴿ چاک [illegible] پڑا کس کے جگر سے پہلے

پیرایہ آغاز سے غرض یہ ہے کہ مضامین کا حال پڑھنے سے پہلے پڑھنے والوں کو معلوم ہو جائے کہ اس پرچہ میں کیا کیا مضمون ہیں لکھنے والے کیسے کیسے ہیں [illegible] کا اثر [illegible] ہے۔

[illegible] خراب ﴿ [illegible] بیٹھا ہوں [illegible]

اس پرچہ میں مضمون پریشان تو وہی پُرانا مضمون ہے ؎

اے دل نہیں جاتا جو خیالِ شبِ گیسو • کیا خواب پریشاں ابھی دیکھا نہیں کوئی

مولوی بشیر الدین احمد صاحب رئیس دہلی نے خفتگانِ گور (صفحہ ۲۱) بہت پاکیزہ مضمون لکھا ہے۔ اسی طرح مرزا عرفان علی بیگ صاحب آئی ایس او نے کلامِ بے محل (صفحہ ۱۳) بہت اچھا لکھا۔ خانصاحب مرزا محمد علی خان صاحب نے میرے کہنے سے کلامِ فردوسی کے متعلق شاہ نامہ کی داد میں بہت عمدہ مضمون لکھا (صفحہ ۲۸) یہ مضمون دو تین پرچوں میں ختم ہوگا۔ اس کے ختم ہونے پر اس کی داد دینے کا حق مجھ پر ہو جائے گا ؛

بعض اچھوت قوموں کا مضمون (صفحہ ۱۰) انفرمیشن بیورو پنجاب ۲۵ء کی رپورٹ کا ریویو ہے ؛ قدیم اردو شاعری کے چند الفاظ و محاورے (صفحہ ۱۸) تحقیق زبان کے لئے بہت بکار آمد ہیں ؛

نظم میں قطعوں کا طرز مجھے زیادہ پسند ہے کہ غزل کی بہ نسبت قطعہ میں مسلسل مضمون کی زیادہ گنجایش ہوتی ہے۔ نواب صاحب بہادر فرما نروائے ریاست لوہارو کا قطعہ مسلسل مضمون کا اچھا نمونہ ہے (صفحہ ۳۴) حضرت ظہیر دہلوی کا مختصر قطعہ (صفحہ ۲۷) صلائے عام کی زبان کا شاہد حال ہے: ان کا دوسرا قطعہ شعر و سخن کی بیقدری میں نہایت صاف و پاکیزہ ہے (صفحہ ۱۰۱) دلّی کی شاعری (صفحہ ۳۲) یہ مضمون بطور قولِ فیصل نہیں ہے۔ سرسری طور پر مضمون نگار کی شخصی رائے کا اظہار ہے ؛

مضمونِ پریشاں

ستم ہے قہر ہے میرے لئے جمعیتِ خاطر ❊ مجھے رہنے بھی دے ناصح مرے حالِ پریشاں میں

یہہ ربطِ حسن و الفت ہے کہ باہم ملتی جلتی ہے
مرے دل کی پریشانی تری زلفِ پریشاں میں
(جناب ظہیر دہلوی)

انسان خوابِ پریشان نہ صرف رات کو سوتے میں دیکھتا ہے بلکہ دن کو جاگتے میں ایسے خواب اکثر دکھائی دیتے ہیں۔ ہماری زندگی کا بڑا جزو ایسے خواب سے بوابستہ ہے جو انسان جاگتے میں دیکھا کرتا ہے ع دیکھا ہے جس کو جاگتے میں یہہ وہ خواب ہے ❊ آپ نے خیال کیا ہوگا کہ خواب سے خواب کی تعبیر کا اثر دل پر زیادہ ہوتا ہے۔ جس طرح وعظ سے زیادہ افسانہ کا اثر ہوتا ہے ؎

واعظ وہی بیان کرو وعظ کے عوض ❊ گر تم کو یاد ہو کوئی افسانہ خواب کا

جس طرح تجربہ کچھ کھو کے سیکھنے کا نام ہے۔ اسی طرح انسان کے خیالی پلاؤ عیش کی جڑ اور غلطیاں دانائی کی بنیاد ہیں ❊ عالمِ اسباب کی تحقیق بُری نہیں۔ لیکن تحقیق کے نتیجے خللِ دماغ کا سبب سمجھئے ❊ آپ غیروں کو دلیل و حجّت سے قائل کر سکتے ہیں اپنے تئیں قایل کرنا مشکل ہے کہ جتنا چھلنے کر کرا نکلتا ہے ❊ بچے شرارت کریں معصوم سمجھے جاتے ہیں۔ گویا معصیت اور معصومیت سگی بہنیں ہیں ❊

بقیہ بر صفحہ

لیکن مجھے لفظوں سے تکرار نہیں۔ کاموں سے کام ہے جو انسان کر کے دکھائے سو

تو وہ کہتے ہیں کہ ہم کچھ ترے عاشق تو نہیں ۔ کیا ہوا ہم نے جو کہنا نہیں مانا تیرا

کہتے ہیں کہ نپولین بونے پارٹ نے فرانسیسی لغات سے لفظ ناممکن نکال دیا۔ وجہ یہہ ہے کہ سپاہی کا ایک معمولی سپاہی جب بادشاہوں کو بنا بگاڑ سکے تو اب اور کونسی ناممکن بات باقی رہ گئی ۔ دنیا میں کرنے کے لایق وہی بات ہے جسے لوگ ناممکن سمجھیں۔ نادر کا حال اس لئے تاریخ کی جان ہے کہ کہاں سے کہاں پہونچا۔

انسان کے لئے پیری بری نہیں مگر پیری میں جوانی کی ہوس بری ہے جس طرح بموجب مسئلہ تناسخ روح قدیم سے ہے مگر انسان کے جسم میں آکر نئی بن جاتی ہے اور جسم کے ساتھ بڑھتی ہے اور جسم نیا ہو کر پرانا ہوتا جاتا ہے۔ دونوں بے تکے ہو کر کشمکش میں زندگی کاٹتے ہیں ۔ انصاف کے ساتھ اگر سزا و جزا کا اختیار نہ ہو تو انصاف بے کار ہے ۔

یہہ عجیب بات ہے کہ انسان دولت و اقبال میں جب ہر طرح خوش ہو تو نیکی سے بہت منہہ نہیں موڑتا۔ نیکی سے میری مراد یہہ ہے کہ ابنائے زماں سے دشمنی پسند نہیں کرتا۔ برخلاف اس کے شیخ و زاہد ہمیشہ شاکی دیکھے ۔ واعظ ہمیشہ رندوں کی جان کو روتے رہے کہ عاقبت میں رندوں کا برا حال ہوگا۔ مگر رندان بے ریا نے کبھی زاہدوں کا برا نہیں چاہا۔ زاہدوں کو اپنے تقوے پر اور گنہگاروں کو عفو ایزدی پر بھروسہ رہتا ہے ۔ رندوں کو ضرورت نہیں کہ زاہدوں

سے عداوت کریں۔ انہیں اپنی ہی نیٹری مشکل ہوئی ہے ۔

زندگی خواہ آپ کیسی ہی کیوں نہ گزاریں آخر میں اجیرن ہوئے بغیر نہیں رہتی۔ تکلیف سے زیادہ آرام میں بسر ہونے والی زندگی زیادہ اجیرن معلوم ہوتی ہے: آرام کی زندگی اس لئے زیادہ اجیرن گزرتی ہے کہ ایک سی حالت کیسی کیوں نہ ہو اُلجھن پیدا کرتی ہے۔ اُلجھن کا علاج تغیّر ہے اور آرام کا تغیّر تکلیف ۔ اور آخر میں سب کا نتیجہ موت کے سوا کچھ نہیں ۔ زندگی بسر کرنے کے معاملہ میں حضرت ظہیر کا یہ قطعہ مجھے بہت پسند آیا کہ غایتِ عیش اور زُہدِ خشک کے درمیان میں راستہ نکالنا چاہیئے

قطعہ

اک روز ایک دوست نے مجھ سے کیا سوال ۔ ہاں کچھ بیانِ حالِ جہانِ خراب ہو
آسودہ روزگار میں کیوں کر رہے بشر ۔ کیا صورتِ معاشرتِ شیخ و شاب ہو
میں نے کہا کہ ہیں یہ تمدّن کے دو طریق ۔ اس میں سے جو پسندِ طبیعت جناب ہو

(۱) عیش کا طریقہ

دُنیا کی بود و باش کا گر پوچھتے ہو حال ۔ ہے زندگی کا حظ جو زرِ بے حساب ہو
بے صرفہ صرف حضرتِ دینار چاہیئے ۔ کچھ جمع خرچ ہو نہ حساب و کتاب ہو
سامان سب بہم ہوں نشاط و سُرور کے ۔ جوشِ نشاطِ طبع ہو عہدِ شباب ہو
یارانِ ہم جلیس ہوں خوش باش و خوش معاش ۔ یک دل ہوں سب دوئی کا نہ باہم حجاب ہو
آبِ رواں ہو باغ ہو ابرِ بہار ہو ۔ ساقی ہو دورِ جام ہو شُربِ شراب ہو

دن رات چہچہے ہوں شب و روز قہقہے ؛ مست شراب کوئی کوئی مستِ خواب ہو
رقاصہ مہر چہرہ ہو سرگرم رقصِ ناز ؛ دلکش صدائے بربط و چنگ و رباب ہو
جلوت تو یہ ہے اور جو خلوت کو پوچھئے ؛ تنہائی کا مکاں ہو جدا جائے خواب ہو
بالائے بام فرش ہو اور فرش پر پلنگ ؛ تکئے ہوں نرم بستر گل فرشِ خواب ہو
بیگانہ و یگانہ نہ ہو کوئی ہمدمِ مخل ؛ طرہ ہو اُس پہ یہ کہ شبِ ماہتاب ہو
آغوش میں ہو جلوہ گر اک چودھویں کا چاند ؛ اُٹھتی جوانی اور شروعِ شباب ہو
ہر دم گلے میں ہاتھ ہوں چسپاں ہوں لب سے لب ؛ لطفِ کنار و بوس و عتاب و خطاب ہو
ہر حرف بے نقط وہ کہے منہ سے لام کاف ؛ اُس مستِ برق وش کو نہ شرم و حجاب ہو
جبتک بسر ہو عیش سے یونہی گزاریئے ؛ جبتک کہ نوجوانی و عہدِ شباب ہو

(۲) طریقۂ زُہد

گریہ نہیں تو قطع تعلق کرو قبول ؛ ہاں کوئی روز زہد کی مٹی خراب ہو
مسجد میں چل کے بیٹھئے نعرے لگایئے ؛ دو نانِ خشک گندم و یک کوزہ آب ہو
تسبیح ہاتھ میں ہو مصلےٰ ہو دوش پر ؛ وعظ و نماز و روزہ و درسِ کتاب ہو
حضرت کو اپنے بوریئے بدھنے سے ہو غرض ؛ کاموں سے اک جہان کے پھر اجتناب ہو
رندوں سے طنز و طعن ہو مستوں سے دہشت ؛ ہر وقت ذکر و فکرِ عذاب و ثواب ہو
داڑھی ادھر بڑھے تو ادھر سر منڈائیے ؛ اس جزر و مد کی بحث میں دونا ثواب ہو
ہو شہرۂ اہلِ شہر میں مشہور نامِ پاک ؛ قاضیٔ شہر و شیخِ مشیخت مآب ہو

یہ بھی نہ ہو تو زندگی تلخ اسے ہے ٭ بدتر ہیم سے ہے کوئی شیخ و شاب ہو

(۳) دونوں میں اوسط روی کا طریقہ

آسودگی کی پوچھو تو وہ شکل اور ہے ٭ آزاد ہو نہ فکرِ عذاب و ثواب ہو
دیوانہ باش مسلکِ توحید پیش گیر ٭ بدست ہو نہ شیخ تقدس مآب ہو
تکلیف ہو کہ عیش ہو ہر حال میں ہو شکر ٭ دوزخ کا غم نہ فکرِ حساب و کتاب ہو
دشمن سے دشمنی ہو نہ اپنوں ہی دوستی ٭ اس پر نہ التفات نہ اُس پر عتاب ہو
غمگیں نہ رنج میں ہو نہ شادی میں شادماں ٭ دُنیا کے کُل امور سے پھر اجتناب ہو
اوسط روی ہی خوب جو توفیق دے خدا ٭ مُفتیِ شہر اور نہ رندِ خراب ہو
راہِ رضا و صبر و قناعت کر اختیار ٭ اور انتظار وقت بشکلِ حباب ہو

(از کلام جناب ظہیر دہلوی)

اتفاق سے اب کی دفعہ مضمونِ پریشان بہت مختصر رہ گیا لیکن اس کی خوش نصیبی ہے کہ ایسا قطعہ مِل گیا جو اُس مضمون کی جان ہے:
اس سے اچھا لکھنا مشکل ہے ؎

لو تکلف نہ کرو ہاتھ سے شانہ رکھ دو ٭
زُلف کا حُسن یہی ہے کہ پریشاں ہو جائے

بعض اچھوت قومیں

اس نام کی ایک کتاب شل رپورٹ ورسالہ کے میرے پاس بغرض ریویو آئی ہے۔ جس میں پنجاب کی چند جرایم پیشہ اقوام کا حال ہے ٭ سرکاری رپورٹیں اکثر خشک ہوتی ہیں جن میں لٹریری کمال کے اظہار سے بہت غرض نہیں ہوتی۔ زیادہ تر اعداد اور نقشہ جات سے علاقہ رہتا ہے ٭ اس رپورٹ میں جو پنجاب کے الفرمیشن بیورو نے آر ددمیں شایع کی بہت سی لٹریری خوبیاں ہیں اور ساتھ ہی تاریخی تحقیق و معلومات کا اچھا ذخیرہ ہے ٭

آغاز میں دیباچہ کی جگہ بہت اچھا عنوان تجویز کیا۔ یعنی "حرفِ گفتنی" اس کے نیچے کا شعر بھی نہایت پاکیزہ ہے ؎

درسِ عنوانِ تماشہ بہ تغافل خوشتر ٭ ہے نگہ رشتۂ شیرازۂ مژگان مجھ سے

یہہ مضمون محققانہ اور فلسفیانہ ہے جس نے اس رپورٹ میں جان ڈال دی۔ آگے چل کے بعض جرایم پیشہ اقوام کے دلچسپ حالات لکھے گئے ہیں: ان کے حسب ونسب۔ رسوم وعقائد۔ (خاص کر شادی کے عہد بانہ قواعد) عادات وخصائل وغیرہ کا حال پڑھنے کے لائق ہے ٭ بوریئے قوم کے لوگ صغر سنی کی شادی کے خلاف ہیں۔ اندھے کی شادی اندھی کے ساتھ اور کانے کی کانی عورت کے ساتھ ہوتی ہے۔ خوبصورمرد

کے لئے خوبصورت عورت تلاش کی جاتی ہے اور بدصورت کو بدصورت ملتی ہے ؛ طریقہ گویا اہلِ کتاب کی شریعت کا جواب ہے کہ سزا میں دانت کے بدلے دانت اور آنکھ کے بدلے آنکھ جو توریت کا حکم ہے ؛ بوریئے گدھے کا بہت احترام کرتے ہیں۔ گدھی کی قسم کبھی نہیں کھاتے ؛ مسٹر ولیمس صاحب لکھتے ہیں کہ

"کربوریوں کو گدھے کی سواری سے منع کیا گیا ہے۔ اور اس کے احترام کی ہدایت کی گئی ہے۔ افسوس کہ گدھا گدھا ہے ورنہ آج اسے یہ علم ہو جائے کہ اس "بیسویں صدی" میں بعض اشرف المخلوقات ایسے ہیں جو اسے متبرک و مقدس خیال کرتے ہیں تو "یقین کامل" ہے۔ اگر اور کچھ نہیں تو کم از کم "گھاس کھانا" ضرور چھوڑ دے ؛"

سانسیوں کے حال میں ہے کہ :-

"تمام سانسی اقوام اپنے آپ کو سانس مل کی اولاد بتاتی ہیں اس شخص کے متعلق سوائے اس کے اور کچھ نہیں بتایا جاتا۔ کہ وہ بھرتپور کے علاقہ کا رہنے والا تھا۔ ایک چوہان راجپوت عورت کا بیٹا تھا۔ جس نے کسی نیچ ذات کے مرد سے شادی کر لی۔ "ذات" کے قواعد کے ماتحت اس عورت کی تمام نسل اور اولاد نیچ قرار دی گئی۔ اور راجپوت برادری سے خارج کر دی گئی۔ "ذات" کی رسوم نے بھی ہندوستان میں عجیب طرح یہاں کے تمدن و معاشرت پر اثر کیا ہے۔ ایک ایک نسل ایک ایک قوم کی سینکڑوں نسلیں اور ہزاروں قومیں بنا دی ہیں۔ وہ نسلیں اور قومیں جو خانگی اور وراثتی رواج۔ بیاہ شادی اور مرگ کی رسوم میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ایک دوسری سے جدا ہو گئیں۔ یہ بھی رسوم "ذات" ہی کی پابندیوں اور سختیوں کا ایک ادنٰے کرشمہ کہئے جس نے ہندوستان میں "جرائم پیشہ" اقوام پیدا کر دیں۔ اعلیٰ ذات کی عورت اگر ادنٰے ذات کے مرد سے شادی کا تعلق پیدا کر لیتی۔ تو اس کے بچوں اور اس کی اولاد کو شہر میں داخل ہونے کی اجازت نہ تھی۔ بے گھرے دربدر آوارہ پھرنے لگتے اور جن حیلوں سے بھی پیٹ بھرتے

کر کچھ ہاتھ لگتا۔ انہیں اختیار کرنے میں دریغ نہ کرتے۔ آہستہ آہستہ خانہ بدوشی۔ دشت نوردی چوری۔ راہزنی کی عادتیں طبیعتوں میں راسخ ہو گئیں اور عام سرکش لٹیروں کے ساتھ مل کر لوٹ و غارت اور چوری کو کسب معاش کا ذریعہ بنا لیا"۔

اقوام جرائم پیشہ کی تہذیب و تمدن میں صاحب رپورٹ لکھتے ہیں کہ:۔

"یہی لوگ ہیں جنہوں نے سب سے پہلے ہندوستان میں زراعت کا کام شروع کیا۔" کہا جاتا ہے۔ کہ پنجاب کے اصل باشندوں کو زراعت کا فن ڈاؤنیس[۱] نے سکھایا۔ زمین میں ہل چلانا۔ دو بیلوں کا ایک جوئے میں جوڑنا۔ اور باقی زراعت کی ترکیبیں سب اسی نے سکھائیں۔ مختلف دیوتاؤں کی پرستش بھی اسی نے سکھائی۔ اور پگڑی کا سر پر باندھنا بھی اسی نے شروع کیا۔" ڈاؤنیس قدیم باشندوں کا بڑا مشہور بادشاہ تھا۔ سکندر کے حملے سے پیشتر یہ لوگ زراعت کا فن سیکھ چکے تھے۔ اور اس وقت شمالی ہندوستان یعنی پنجاب وغیرہ میں ان کی حکومتیں قائم تھیں۔ یونانی مورخوں کا بیان ہے کہ جب سکندر" اسواکون" کے ملک میں داخل ہوا تو اس کے دربار میں" نیاسوں" کا ایک سفیر حاضر ہوا۔ جس نے اس کو بتایا کہ ہمارے شہر کا بانی ڈاؤنیس تھا اور اسی بادشاہ نے ہمارے شہر کا نام "نیاسا" رکھا تھا"۔

لفظ قلی کی تحقیق میں رپورٹ لکھنے والے نے ذرا غلطی کی ہے کہ شملہ کی پہاڑیوں میں کوئی قوم کوہلی آباد ہے۔ یہ اکثر مزدوری کرتے ہیں جنرل برگس صاحب بہادر کا خیال ہے کہ یہی کوہلی قوم کے مزدور صاحب لوگوں کی زبان میں قلی سمجھے گئے یعنی کوہلی کا قلی ہو گیا۔

قلی دراصل ترکی لفظ ہے جس کے معنی ہیں غلام و بندہ (از مؤید و مدار) سلطنت مغلیہ کے زمانہ میں ترکی الفاظ روز مرہ میں بہت آ گئے۔ ہر مزدور پیشہ

[۱] نام ہمارا مقتدر یونانی اس لئے ہے۔ کہ یونانی مورخوں کے ذریعہ ہم تک یہ نام پہنچے ہیں۔

کلامِ بے محل

(سعدی)

کمال است در نفس انسان سخن ؛ تو خود را بگفتار ناقص مکن

کلام بلا توجہ مخاطب کلام جو بے محل زبان سے نکلے کچھ وہ خود ہی بے وقعت نہیں ہوتا بلکہ متکلم کو بھی بے قدر بنا دیتا ہے اور حاملِ کلام کچھ بھی نہیں ہوتا یعنی منشائے کلام بالکل زائل ہو جاتا ہے ؎ بسیح سخن گفتن آنگاہ کن ؛ کہ بینی کہ در کار گیرد سخن۔

اگر بے موقع اور بے محل بات کی جائے تو اُس کا ایسا ہی حال ہوتا ہے جیسا کہ کسی شاعر کا مقولہ ہے ع بات بھی کھوئی التجا کر کے۔ جب تک سامع مخاطب و متوجہ نہ ہو کسی بات کا اُس سے کہنا گویا ہوا سے باتیں کرنا ہے۔ کیوں کہ متکلم کیسی ہی پُر مغز گفتگو کیوں نہ کرتا ہو اگر سامع مخاطب نہیں تو سامع کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آ سکتا۔ اور متکلم کی ساری گفتگو کو وہ اِس کان سن کر اُس کان اُڑا دیتا ہے اور جب سامع خود کسی خیال میں ڈوبا ہے اور اُس کو توجہ نہیں ہے تو وہ باوجود اس کے کہ متکلم اپنی داستان پوری کہہ سناوے وہ یہہ کہہ دیتا ہے کہ "کیا فرمایا" یعنی جب سامع نے سننے میں دل ہی نہیں لگایا تو اُس کا جواب ہی کیا دے سکتا ہے اور جواب باصواب دینے کے بجائے وہ بار بار متکلم سے یہی کہہ سکتا ہے کہ "کیا فرمایا" گویا کچھ سنا ہی نہ تھا اور سامع عاقلانہ طرز خاموشی کا ایسے محل پر اختیار کر لیتا ہے کیوں کہ وہ خوب سمجھتا ہے کہ ؎ ہر کہ تامل نہ کند در جواب ؛ بیشتر آید سخنش ناصواب جب کچھ سنا ہی نہیں تو اودھر متکلم کا کلام رائیگاں اور بے محل ہو چکا اور اِدھر سامع کو موقع جوابِ کلام کا اور تامل کا نہیں ملا۔

غیر متعلق باتیں علےٰ ہٰذالقیاس جو باتیں کہ غیر متعلق اور خلاف وقت کہی جاویں وہ بھی ناکارہ

ہوتی ہیں۔ او سکہنے والا کوتہ بیں اور خارج از عقل گنا جاتا ہے اور خاص مخاطب کے علاوہ جملہ دیگر سامعین کی نظروں میں بھی وہ حقیر اور بے مغز شمار ہوتا ہے۔ جن باتوں کا کوئی بھی تعلق نہ ہو اُس کا ذکر کرنا محض اوقات کا ضایع کرنا اور فضول گویوں میں شمار ہونا ہے۔ چنانچہ سعدی علیہ الرحمتہ کا ایسی ہی فضول باتوں کے متعلق یہ کلام ہے کہ ؎

آدمی را زبان فضیحہ کند ✤ جوز بے مغز را سبکساری

خفیہ باتیں | بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں کہ وہ صرف اپنے ہی دوستوں میں کہنے سُننے کے لایق ہوتی ہیں۔ ایسی باتوں کے کہنے کے واسطے بھی محل درکار ہے۔ کیوں کہ تا وقتیکہ اپنے دوستوں میں یکجائی اور خلوت نہ ہو ایسی باتوں کے کرنے سے پورا اندیشہ بلکہ یقین ہے کہ اُن لوگوں کے کان تک ضرور پہونچ جاویں گی جن سے اُن کا اخفا منظور ہے پس ایسا مقام محلِ کلام ہرگز نہیں ہو سکتا۔ **قطعہ** در سخن با دوستاں آہستہ باش ۞ تا ندارد دشمنِ خونخوار گوش ۞ پیش دیوار انچہ گوئی ہوش دار ۞ تا نباشد در پسِ دیوار گوش اور صرف اسی قدر احتیاط کی ضرورت نہیں ہے بلکہ دوستوں میں یہ امر دیکھ لینے کے قابل بالیقین ہے کہ کوئی اُن میں سے ہم نشین و ہم جلیس ایسے اشخاص کا تو نہیں ہے جن سے اخفاے ماجرا مدِ نظر ہے ؎ بشنوائے خردمنداں دوست دست ✤ کہ با دشمنانت بود ہم نشست۔

راز کی باتیں | یہہ بھی کلام بے محل میں داخل ہے کہ کسی راز کی بات کسی شخص سے بیاں کی جاوے اور اس پر یہہ ہدایت بھی اُس کو کی جاوے کہ اور سے مت کہنا۔ یہہ ناممکن ہے کہ ایسا راز جب ایک سینہ و زبان سے منتقل ہو کر دوسرے کے کان میں پڑے اور پھر بھی وہ مخفی رہے۔ مخفی رہنے کی جگہہ تو سینہ ہی تھی جب اُسی سے نکل گیا تو راز کے فاش ہونے میں کیا کسر باقی رہ گئی ؎ خامشی بہ کہ ضمیرِ دلِ خویش ۞ باکسے گفتن و گفتن کہ مگوے۔ ایسی چھپی بات کے کہنے سے بہتر یہی ہے کہ انسان خاموشی اختیار کرے اور خاموش رہنے پر قادر رہے۔ اکثر یہہ دیکھنے میں آیا ہے کہ بعض لوگوں کے پیٹ میں بات نہیں ٹھہرتی اور

اُس کا نتیجہ غالب تر یہی ہوتا ہے کہ انشائے راز خلاف مراد ہو جاتا ہے۔ اسی وجہ سے سعدی علیہ الرحمتہ نے فرمایا ہے کہ ؎ سخنے در نہاں نباید گفت ✤ کاں سخن بر ملا نشاید گفت

سخت کلام جو لوگ باوجود معقول بات کہنے کے سختی کے ساتھ کلام کر اُٹھتے ہیں وہ بھی کلام کے برجا اور برمحل ہونے سے دور جا پڑتے ہیں اکثر دیکھنے میں آیا کہ محض سختی کلام سے مخاطب شعلہ افگنی اور ترشروی کر اُٹھتا ہے اور خواہ مخواہ جدوجہد کے ہاتھ پڑ کر عقلی اختیار سے باہر اور غصہ میں بھر جاتا ہے پھر اُس کو سیدھی بات بھی اُلٹی سمجھائی دیتی ہے ؎

با مردم سہل گوے دشوار مگوے ✤ با آں کہ در صلح زند جنگ مجوے

کرخت آواز کرخت آواز گو قدرتی ہو اُس کو بانجہار استعمال کرنے سے اچھی اچھی باتیں اور کام کی باتیں بھی سودمند نہیں ہوتیں پس ایسے کریہہ الصوت کا ذکر خیر کرنا بھی ایک گونہ اپنے محل سے باہر ہو جاتا ہے اور اس کو بھی اگر بے محل کہدیں تو بے جا نہ ہوگا۔ یہاں تک تو چشم دید ہے کہ اگر کسی بد لہجہ واعظ یا کریہہ الصوت مطرب سے ایکبار واسطہ پڑ گیا تو پھر سامعین کی دوبارہ ہمت اُس کے سُننے کی نہیں پڑی۔ پس ایسے واعظ و مطرب اگر اپنی زبان کو بغرض وعظ و دل چسپی مردم نہ کھولیں تو بہت ہی اچھا ہے۔ کم سے کم اپنی بدنامی سے تو بچ جاویں گے ایک جگہہ تو سعدی علیہ الرحمتہ نے ایک قرآں خواں کی نسبت بھی یہ فرما دیا تھا ؎

گر تو قرآں بدیں نمط خوانی ✤ ببری رونقِ مسلمانی

نرم وگرم کلام بایں ہمہ یہہ ضرور ہے کہ نرم وگرم کلام دو طرح کے ہوتے ہیں مگر ہر ایک اپنا محل جداگانہ رکھتا ہے۔ یعنی جس موقع پر نرمی کلام درکار ہے وہاں گرماگرمی بالیقین بے محل ہی اور جہاں گرمی کلام کی مقتضی ہے وہاں نرمی بے محل ہے۔ نرمی کلام سے دلدہی پیدا ہوتی ہے اور جب کلام میں سختی یعنی گرماگرمی ہوتی ہے تو مخاطب کی بد دلی ہو جاتی ہے۔ اور اُس کو ناگوار ہوتا ہے قطعہ وقتے بلطف گوے و مدارا و مردمی ✤ باشد کہ در کمند قبول آوری دلے ✤ وقتے بقہر گوے کہ صد کوزۂ نبات ✤ گہ گہ چناں بکار نیاید کہ حنظلے ✤ حنظل تو زہر ہے مگر

بہت سے امراض کا علاج بھی ہے اور بہت سے مریض اس کی تاثیر سے شفا پا جاتے ہیں اور وہ باوجود زہر کے تریاق کا کام دیتا ہے۔

بھاری عیوب | دو عیوب کلام بے محل کے اور بھی بیان کر دوں تو مضمون کو ختم کروں اور وہ دونوں بہت برے ہیں اُن میں سے پہلا تو عیب ہے بات کاٹنا اور دوسرا عیب اپنی بات بالا رکھنا۔ یہہ کہہ دینا مناسب ہے کہ یہ تو سب ہی جانتے ہیں کہ جو شخص بات کرنا چاہتا ہے وہ کچھ نہ کچھ اس سے مقصود رکھتا ہے اور جو کچھ اس کا مقصود ہوتا ہے وہ اس وقت تک سینہ میں محفوظ رہتا ہے جب تک کہ زبان سے باہر نہ نکالا جاوے پس ہر متکلم کو پورا موقع اس کا ملنا چاہیئے کہ وہ اپنے منشاء دلی کو اپنے حسب دلخواہ بیان کرلے۔ ایسے کلام کرنے والے کو اُس کے سلسلۂ کلام میں چھیڑنا اُس کو اپنے خیال اور اپنے مفہوم گفتگو سے برگشتہ کر دینا ہے اور پھر وہ مشکل سے اپنے سلسلہ کو بدستور قایم کرسکتا ہے۔ اور ممکن ہے کہ اچھے خیالات جو اس وقت اُس کے ذہن نشین ہوں زائل ہو جاویں۔ بعض اشخاص ایسے بھی ہیں کہ وہ بات کو پہلے سوچ سمجھ نہیں لیتے اور گفتگو کرنے لگتے ہیں اور باوجود اس کے کہ اُن کی بحث معقول نہ ہو مگر اپنی بات بالا رکھنے کی کوشش میں بحث پر بحث کرتے چلے جاتے ہیں حالاں کہ بلا سوچے ہوئے کلام ہی نہ کرنا چاہیئے ؎

بیندیش آنگہ برآور نفس ⁂ وزاں پیش بس کن کہ گویند بس

بات کاٹنا | یہہ تو ظاہر ہے کہ باتیں مختصر بھی ہوتی ہیں اور طول بھی ہوتی ہیں لیکن وہ مختصر ہوں یا طول کچھ نہ کچھ منشا اپنا ضرور رکھتی ہیں اور جب تک کہ بات کرنے والا اُس بات کو پورے طور پر ادا نہ کرلے بات کا منشا بھی پورا نہیں ہوتا اور نہ سامع کی سمجھ میں آسکتی ہیں۔ اور جس حال میں کہ بات ختم نہ ہو مگر متکلم سے کوئی شخص درمیان کلام ہی میں چھیڑ چھاڑ کر اُٹھے تو وہ مخاطبات کو عجب پریشانی کا مبتلا بنا دیتا ہے گویا خبط بحث ہو جاتا ہے۔ متکلم تو اپنے سلسلۂ کلام کو بھول جاتا ہے اور سامعین ناسمجھی کے عالم میں پھنس جاتے

ہیں اور خود وہ شخص جو بیچ میں بول اُٹھا انگشت نمائی کا نشانہ بن جاتا ہے۔ شیخ سعدی نے نہایت اچھی نصیحت کی ہے کہ ؎

سخن راسر است اے خردمند و بن ٭ میاور سخن درمیان سخن

اپنی بات بالا رکھنا | یہہ تو اکثر ہوتا ہے کہ اگر ایک شے کے جاننے والے دو شخص یا زیادہ ہوتے ہیں اور ان میں سے اگر کوئی شخص ایسی شے کا بیان کرنا شروع کر دے تو دیگر اشخاص کو جو اُس سے واقفیت رکھتے ہیں بغیر بولے صبر نہیں آتا حتٰی کہ اگر متکلم اُن سے زیادہ کہیر سن۔ جہاں آزمودہ اور صاحب علم ہو مگر پھر بھی اُن واقف کاروں کا یہ حوصلہ ہوتا ہے کہ متکلم کو اگر اُس کے بیان میں زک نہ دیں تو بھی اعتراض کئے بغیر نہ رہیں۔ ایسا اعتراض اخلاق و اخلاص پر دھبہ ضرور لگاتا ہے اور معترض کو حدِ ادب سے باہر بالیقین کر دیتا ہے اور مخاطب لوگ اس کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے کیوں وہ متکلم کی سُبکی کا باعث ہوتا ہے ؎ چو بر آید مہ از تو بے سخن ٭ گرچہ بہ دانی اعتراض مکن

راقم مرزا عرفان علی بیگ از آگرہ

کلام جناب ظہیر دہلوی۔ (بے قدری شعر و سخن)

اے شاہدِ سخن تری الفت کو ہے سلام ٭ عمرِ عزیز تیری طلب میں ہوئی تمام ٭ افسوس ہے نہ دین کی دولت ہوئی نصیب
پورا ہوا نہ خیر سے دنیا کا کوئی کام ٭ سمجھے ہوئے تھے تجھکو وسیلہ معاش کا ٭ دنیا کی حرص و آز میں تیرے رہے غلام
یہ جانتے تھے نعمتِ عظمٰے ہے شاعری ٭ پایا ہے شاعروں نے بہت عز و احترام ٭ دنیا حصول ہوتی ہے کسب کمال سے
تیری طلب میں تھی طلب جاہ و احتشام ٭ کسبِ کمال کن کہ عزیز جہاں شوی ٭ بچپن سے سنتے آتے تھے یہ قول خاص و عام
کیا کیا تری طلب میں تھکے پائے جستجو ٭ کیا کیا نہ جستجو میں رہیں گردشیں مدام ٭ کیا کیا نہ بیخودی رہی تیری خیال میں
کیا کیا مراقبوں میں رہے گم علی الدوام ٭ دیوانہ وار محو رہی تیرے شوق میں ٭ تیری شراب عشق ہی پیتے رہے مدام
اک عمر بیٹھتے رہی پھیلا کے دام فکر ٭ شوق شکار طائرِ مضموں رہا مدام ٭ سب عمر صرف ہو گئی جب شوقِ صید میں
آیا ہے جب یہ وحشی رم خوردہ زیرِ دام ٭ تماشا نہیں ہے کھیل نہیں کسبِ علم و فن ٭ اک عمر کھو کے پاتے ہیں انسان جہاں میں نام

قدیم اُردو شاعری

کے

چند الفاظ و محاورے

قدیم شاعری میں بہت سے محاورات دیکھنے میں آتے ہیں جو آج کل صفحۂ ہستی سے بالکل معدوم ہیں۔ اُس زمانہ کی شاعری میں ہندی کے الفاظ بہت مروج تھے اور ہندی کے محاورات عام طور پر استعمال کئے جاتے تھے۔ آج کل جب کسی کی نگاہ اُن محاورات سے جا ہوتی ہے تو وہ بالکل انوکھے معلوم ہوتے ہیں مگر ساتھ ہی ساتھ اُن میں جداگانہ لطف رہتا میں نے ایک "لغت" میں ایسے محاورات دیکھے جو مجھے بالکل انوکھے معلوم ہوئے۔ یہ "لغت" سے انگریزی کا ہے۔ اور اس میں جا بجا اشعار بھی مندرج ہیں۔ اس "لغت" کا نام "اینگلو اور ینٹل ڈکشنری" ہے۔ شکسپیر کا مرتب کیا ہوا ہے۔ اور اس میں ۸۰۰۰ اُردو کے الفاظ ہیں۔ انگریزی الفاظ اس کے علاوہ ہیں۔ چھاپا بہت قدیم ہے۔ ۱۸۱۵ء کا طبع کیا ہوا ہے۔ اس "لغت" میں زیادہ تر میر تقی کے اشعار نقل ہیں۔ اِس سے پتہ چلتا ہے کہ اُس زمانہ میں میر سے لوگوں کو کتنی عقیدت تھی۔ مندرجہ ذیل اشعار قابلِ تذکرہ ہیں:۔

(۱) لفظ "سانگ" کا استعمال:۔ بن جو کچھ بن سکے جوانی میں ٭ رات تھوڑی ہے اور بہت ہے سانگ

(۲) "شاخ شانے":۔ شاخ شانے ہزار نکلیں گے ٭ جو گیا اس کی زلف کا یکتا (میر)

(۳) "شاخِ زعفراں":۔ نازِ چمن وہی ہے بلبل سے گو خزاں ہے ٭ ٹہنی جو زرد بھی ہے سو شاخِ زعفراں ہے

(۴) عقل کو عشق ہونا:۔ عشق اُن کی عقل کو ہے جو ماسوا ہمارے ٭ ناچیز جانتے ہیں معبود جانتے ہیں (میر)

(۵) گھر ہونا:۔ دُنیا کی نکر تو خواستگاری اس سے کبھی بہرہ ور نہ ہوگا
آخانہ خرابی اپنی مت کر قحبہ ہے یہ اس سے گھر نہ ہوگا (میر)

(۶) "لالے پڑنا":۔ ؎ اس اسیری کے نہ کوئی اے صبا پالے پڑے
اک نظر گل دیکھنے کے بھی ہمیں "لالے پڑے" (میرؔ)

(۷) لفظ "پیکا" کا استعمال:۔ ؎ اپنی تو جہاں آنکھ لڑی پھر وہیں دیکھو
آئینہ کو "پیکا" ہے پریشاں نظری کا (میرؔ)

(۸) "منہ دکھانا":۔ ؎ وصل میں رنگ اُڑ گیا میرا ✤ کیا جدائی کو "منہ دکھاؤں گا" (میرؔ)

(۹) "منہ سے پھول جھڑنا":۔ ؎ گالیاں دے کے اب گرتے ہیں ✤ واہ کیا منہ سے پھول جھڑتے ہیں (میرؔ)

(۱۰) "ہوتا رہیگا":۔ ؎ تو یوں گالیاں غیر کو شوق سے دے ✤ ہمیں کچھ کہے گا تو "ہوتا رہے گا" (میرؔ)

(۱۱) تجنیس خطی:۔ ؎ یہ نہو دریا کہ جس سے گزرے پل باندھ کر
موج چشم عاشقاں دے توڑ پل میں پل کے پل (سوداؔ)

(۱۲) "سہرنا":۔ ؎ گیا جو پوس کھجا مگس پہ ✤ لگے جاڑا بدن آوے سہر کر۔ (نامعلوم)

(۱۳) "طوطی کے سے ہونٹھ مل ڈالنا":۔ ؎ بولا نکرا ے یار تو ہر اک سے بگڑ کر
مل ڈالے گا طوطی سے کوئی ہونٹھ پکڑ کر (نامعلوم)

(۱۴) "طوفان ہونا":۔ ؎ اشک گلگوں جیب داماں پہ مرے غلطاں ہیں
اس زمانہ کے تو لڑکے بھی کوئی طوفان ہیں (ہدایتؔ)

(۱۵) "فلک کو خبر ہونا" اور "تجھ رو":۔ ؎ تجھ رو بن لطف ہے سو فلک کو خبر نہیں
خورشید کیا ہے اس کی فلک کو خبر نہیں (میر عبد اللہ تجردؔ)

(۱۶) "کڑیال میں غلیلا لگانا":۔ ؎ بیٹھے اگر خوشی سے آکر چمن میں بلبل
کڑیال میں غلیلا ایسا لگے کہ اڑ جائے (سجادؔ)

(۱۷) گھر بیٹھنا:۔ ؎ جس سمت کو تو نے آنکھ اٹھا کر دیکھا
مانند حباب گھر کے گھر بیٹھ گئے ✤ (میر دردؔ)

(۱۸) "پائیں" (معنی پاؤں) :- یہہ تو بوجھے لال بجھکڑ اور نہ بوجھے کوئی
پائیں چکّی باندھ کر مت ہرنا کودا کوئی (نامعلوم)

(۱۹) "دانت نکالنا" :- مستزاد :- سن سوز عبث دیکھ کے حیراں ہوگا - خوباں کا جمال
دل زلف میں اُلجھے گا پریشاں ہوگا - مت لے یہ وبال
یہہ چال بُری ہے تجھسے نہ نبھے گی - نہیں آ مان کہا (میر سوز)
کیا ہنستا ہے تو بہت پشیماں ہوگا - مت دانت نکال

(۲۰) موج مارنا :- ؎ سیلِ سرِ شک اپنا جب سر باوج مارے
طوفانِ نوح بیٹھا گوشے میں موج مارے (محمد بقا)

(۲۱) مُنہ لیکے رہجانا :- ؎ دیکھا جو اُس کے چشم و دہن کو تو شرم سے
مُنہ لیکے اپنا پستہ و بادام رہ گئے (نامعلوم)

(۲۲) "میں خوش میرا خدا خوش" :- ؎ گر ناخوشی سے میری ہوتا ہے جی ترا خوش
جس میں تری خوشی ہو میں خوش مرا خدا خوش (نامعلوم)

(۲۳) "نام دھرنا" - اور "ناشاعر" :- ؎ کبھی بولیں عقیق اور کبھی نگینِ لعل ٹھیرا دیں
یہہ ناشاعر ترے ہونٹھوں کو کیا کیا نام دھرتے ہیں (نامعلوم)

(۲۴) "ہاتھ پر کسی چیز کا دھرا رہنا" :- ؎ چاہو جو چھینو دستِ حنا بستہ سے یہ دل
ایسا سو دل کسی کا - دھرا ہاتھ پر نہیں (تپش)

(۲۵) ہاتھ اُٹھانا :- ؎ ہاتھ اُٹھا جور اور جفا سے تو
یہی گویا سلام ہے تیرا (مصطفٰے خاں یکرنگ)

(۲۶) لفظ "ہار" معنی والا :- ؎ بہار آئی نہ دیکھن ہار آیا
انار آیا نہ چاکھن ہار آیا (نامعلوم)

راقم - قاضی محمد فرید - معتمد اعزازی انجمنِ ترقی اُردو - پٹنہ

خفتگانِ گور

سمجھوگے ہمارے بعد ہم کو — پر حیف کہ رو برو نہ سمجھے

حال میں حسنِ اتفاق سے میرا جانا حیدرآباد دکن میں ہوا۔ مسلمانوں کو زیارتِ قبور کی اجازت پرستش یا استمداد کی غرض سے نہیں بلکہ اس غرض و غایت سے دی گئی ہے کہ اُس سے دنیا کی بے ثباتی اور اپنی موت آنکھوں کے سامنے دکھائی دیتی ہے جس کا اثر بہت اچھا دلوں پر پڑتا ہے اور وہ دل جو سخت ہیں وہ بھی نرم پڑ جاتے ہیں میں اکثر قبرستانوں میں جاکر گھنٹوں اسی اُدھیڑ بُن میں سرگرداں رہتا ہوں۔ اس مرتبہ یوسف صاحب شریف صاحب کی درگاہ پر گیا جو اندرون آبادی ہے۔ یہ دونوں بزرگوار اورنگ زیب کی اُس فوج میں سپاہی تھے جب کہ قلعہ گولکنڈہ کا محاصرہ کرکے اورنگ زیب نے تاناشاہ کو قید کرکے سلطنت قطب شاہیہ کا نام صفحۂ دنیا سے مٹا دیا۔ ان کا احوال کتب تواریخ میں یوں درج ہے کہ یہ دونوں صاحب بسا بزرگ، عابد و زاہد اور متشرع تھے۔ محاصرۂ قلعۂ گولکنڈہ کے زمانے میں جب کہ فوج قلعہ کے باہر پڑی ہوئی تھی ایک سخت طوفان شب کو باد و باراں کا ایسا آیا کہ سارے خیام شاہی اُکھڑ گئے اور لشکر میں سارے چراغ گل ہو جانے سے چوطرف اندھیر اگھٹ ہوگیا۔ اورنگ زیب نے جو نظر دوڑائی تو صرف ایک چھوٹی سی راؤٹی میں ایک چراغ ٹمٹما رہا تھا۔ خبر منگائی معلوم ہوا کہ یہ دونوں بھائی بیٹھے نہایت اطمینان سے تلاوتِ قرآن پاک میں محو ہیں۔ صبح کو دربار میں یاد ہوئی۔ یہ دونوں گھبرائے کہ ہمارا راز کھل گیا اور اسی دن نوکری چھوڑ چھاڑ شہر میں چلے آئے اور جس جگہ اب آپ کی درگاہ کا عالیشان سر بفلک گنبد آسمان

سے باتیں کر رہا ہے وہیں رہ پڑے اور آخرکار وہیں دُنیا کو خیرباد کہا۔ اس درگاہ کے اطراف ایک وسیع قبرستان ہے اور سالانہ عرس بھی ہوتا ہے۔ درگاہ کے دروازۂ داخلی پر یہ شعر نہایت خوش خط کندہ ہے :-

بے ادب پا منہ این جا کہ عجب درگاہ ہست ٭ سجدہ گاہِ مَلک در روضۂ شاہنشاہ ہست

سامنے اس گنبد کے ایک نہایت خوش وضع سائبان بطور برآمدہ کے زمانۂ حال کا بنا ہوا ہے۔ جس پر یہ کتبہ ہے :-

"سائبانِ گنبدِ درگاہ حضرت یوسف صاحب و شریف صاحب قبلہ قدس سرہٗ
بنا ساختۂ نواب شمس الامرا، امیر کبیر سر خورشید جاہ بہادر سنہ ۱۳۲۳ہجری"[1]

ہم کو داغ دہلوی اور امیر مینائی کی قبروں کے کتبے لکھنا ہے۔ آخر زمانے کے ان دونو شعرائے نامدار کا ساتھ رام پور میں بھی رہا اور مدتوں کے بچھڑے ایسے ملے کہ جس کے بعد بچھڑنا نہیں ہوا یعنی دونوں صاحب سرزمینِ دکن میں پیوند خاک ہوئے۔ داغ صاحب اور اُن کی اہلیہ محترمہ کی قبر پہلو بہ پہلو اسی درگاہ میں ہے۔ اور حضرت امیر کی ذرا فصل سے۔

لوحِ مزار داغ دہلوی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ

رفت از دہر چوں فصیح الملک ٭ لرزہ افتاد در تمامی ہند
اوستادِ نظام آصف جاہ ٭ موردِ لطفِ شاہِ حامیِ سند
راست بر قامتش قبائے سخن ٭ زیب بر روے خطابِ جامیِ ہند
سلکِ نظمش لسان سلکِ گہر ٭ جوہریِ سخن نظامیِ ہند
شد وفاتش لشام یوم الحج ٭ دفن شد روزِ عید سامیِ ہند
آہ دل برکشید و سالش گفت ٭ مدفنِ پاک داغ نامیِ ہند

سنہ ۱۳۲۲ ہجری

[1] یہ وہی سال ہے جب کانگڑے میں سخت زلزلہ آیا۔ ۱۲

لوحِ مزار اہلیۂ داغ صاحب مرحوم

هوالغفار

(۲) بروزِ جمعہ چو ہمنامِ فاطمہ بیگم ÷ پسِ نماز بدرگاہ زیرِ خاک نہفت
بفکرِ سالِ دلِ داغدار داغِ حزیں ÷ مزارِ اہلیۂ داغ آہ آہ بگفت
۱۳۱۶ھ

غفر لہا ۱۳۱۶ء

قطعۂ اوّل جناب ابو المعظم نواب سراج الدین احمد خاں صاحب سائل کا کہا ہوا ہے جو داغ مرحوم کے خویش ہیں اور قطعۂ ثانی خود داغ صاحب کا۔

حضرت امیر کے مزار کی رونق ہی کچھ اور ہے جو دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے کیوں کہ اُن کی بزرگی اور تقدس مقدم تھی اور شاعری موخر۔ آپ کی لوح مزار کے دونوں طرف کندہ ہے بجانب شمال سڑک کی طرف۔ امیر مینائی

(۳) ابھی مزار پہ احباب فاتحہ پڑھ لیں * پھر اس قدر بھی ہمارا نشاں رہے نہ رہے

یہ شعر خود حضرتِ امیر کا ہے۔ پتھر کی دوسری طرف بجانب قبر شریف۔

قطعۂ تاریخِ رحلت مفتی میر احمد امیر مینائی لکھنوی

امیرِ کشورِ معنی امیر مینائی * خدائے عاشقِ صادق درِ نبی کے فقیر
گئے جو خلدِ بریں کو تو اُن کی تربت پر * جلیل نے یہ لکھا روضۂ جنابِ امیر
۱۳۱۸ھ

لوحِ مزار پر یہ قطعہ آڑا لکھا ہوا ہے۔ یہ کتبہ نہایت خوش خط اور شربتی رنگ کے سلیٹ کے پتھر پر کندہ ہے۔ دو بڑے نامی گرامی شعراء کے قطعات وفات آپ نے ملاحظہ فرمالئے لگے ہاتھوں اوروں پر بھی ایک نظر ڈال لیجئے۔

هوالمحمود

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(۴) تاریخِ وفات حضرت حافظ شاہ محمد منیر الدین چشتی رح خلیفۂ حضرت قبلۂ عالم شیخ محمود میاں صاحب چشتی

والدم حافظِ کلام اللہ * قلب در عشقِ حق نمود گداز

نامِ پاکش منیرِ دیں بودہ * کرد با خلق خُلقِ نیک انداز

بود حاصل خلافتِ محمود * داشت با پیرِ خویش راز و نیاز

متقّی با خدا و صاحبِ حال * بستہ دل را بشغلِ صوم و نماز

مہر تحریر کرد سالِ وصال

بجناں رفت عاشقِ جانباز

۱۳۲۱ھ

(۵) ان یوم السابعین الذین ذا القلب السلیم * عاش محموداً مع الخلان فی خلقٍ عظیم

کان مرتاضاً سعیداً تبتغی وصل الحبیب * جنۃ فی روحٍ و ریحانٍ و جنتِ النعیم

۱۲۹۸ھ

(۶) شد ز دنیا مؤید الدین جاں * عالمِ بے نظیر و بے ہمتا

گفت تاریخِ رحلتش والا * از جہاں رفت عادلِ یکتا

۱۲۸۳ھ

(۷) مہر برج معدلت ماہ سماء معرفت * آں کہ ذاتِ پاکِ او دینِ متیں را شد امیں

آمد ز ... چوں بحق وصل شد و ... انتقالش ہما * آفتابِ عز و جاہ و عدل شد زیر زمیں

۱۳۰۸ھ

(۸) اشجع نظم میرزا محسن * با وضو شد بملکِ روحانی

بہر تاریخ از سر طاعت * ہاتفم گفت "رستمِ ثانی"

۱۲۸۰ھ

(۹) عائشہ بیگم نقشبندیہ مجددیہ دختر مولوی محمد نور اللہ تعلقہ دار مرحوم اہلیہ محمود علی

چوں عائشہ بیگم نکوخو * رو کرد بحق ز دارِ حسرت

بود بصفاتِ نیک موصوف * زاں یافت چو خویش جاہ و رحمت

شد سالِ وفات از سرِ انس * جا یافتہ عائشہ بجنت

۱۳۴۲ھ

(۹) بست و ہفتم از رجب وقتِ نمازِ عصر بود * ہم ہزار و سہ صد و ... ہجرت در شمار

روز آں روزے کہ خورشید و قمر قربان او * یعنی از ... شبِ معراج ... آشکار

کرد رحلت او کہ گفتندش ہمہ حاجی امام * ...

فکر درسالِ وفاتش کردم ہاتف بگفت * مرحبا شد او بجنت گاہ چوں بادِ بہار

۱۲۱۷ھ

(۱۰) ھو الحفیظ الاکرام مقبرۂ منیری

۱۳۲۳ھ

تاریخِ وفات حضرت مولانا مولوی سید شاہ منیر الدین صاحب مرحوم و مغفور حسنی الحسینی مشائخ اورنگ آباد

جب کہ سید شاہ منیر الدین سدھارے خلد کو * مغفرت صادق بہ سالِ عیسوی تھا ہم کو یاد
حضرتِ یوسف کی جب بے گاہِ والا میں رکھا * دی دعا سب نے سن ہجری بحق مغفور باد"

۱۳۲۳ھ *

(۱۱) جو تھیں مریم عصر بنتِ امیر * سدھاریں جہاں سے وہ مرحومہ آج
ندا غیب سے آرہی ہے جلیل * بہشتِ بریں میں ہے معصومہ آج

۱۳۳۹ھ

یہ جناب امیر مینائی مرحوم و مغفور کی صاحبزادی کی قبر ہے۔

(۱۲) گیارہ تھی ذیقعد کی اور یوم شنبہ تھا بخیر * جانبِ خلدِ بریں جس دم گئی با امن و چین
از طفیلِ مصطفیٰ و پنجتن کی جائیں گی * جنت الفردوس میں بس زاہدہ امراؤ بی

۱۳۱۲ھ

(۱۳) اِن رحمۃ اللہ قریبٌ من المحسنین

زہے ڈاکٹر میر ہاشم علی * بصورت بہ سیرت سعادت شعار
یکے مردِ حق بود در فضل و مجد * بشد زیں جہاں سوئے دار القرار
بہ سوم جمادیٔ دوم بہ یوم جمعہ * کشیدہ زبر جامۂ مستعار
خدا ایش بجشند چو بخشندگاں * بہ بخششِ کرم نزلِ آں دوستدار
پسِ رحلتش گفت ہاتف ز غیب * بفردوس جنت بشد پایہ دار

۱۳۳۴ ہجری *

(۱۴) فاطمہ نام جو نیک بی بی کی ہے یہ تربت * صالحہ عابدہ دنیا میں رہی باعصمت

موت کے پنجے سے آزاد نہیں کوئی بشر * ہوئی دُنیا سے لبصد حیف جو اُس کی رحلت
جو کہ دنیا میں بہت رنج والم دیکھی ہے * کیا عجب حق سے ملے دین کی از بس راحت
سائباں ہو چتر مغفرتِ حق سر پر * روح پر دائماً نازل ہو خدا کی رحمت
فکر یہ تھی کہ کہاں ہوگا مقام و مسکن * تا عوض درد کے حاصل ہو سرور و فرحت
با سر جاہ معاً غیب سے آئی یہ ندا * فاطمہ بنتِ محمد ہے مقیم جنت
۱۳۴۰ھ

از سر نام الہ گفت سروش
شد ابداً ساکنِ خلدِ بریں

۱۳۴۰ھ

مادۂ تاریخ بہت خوب ہے۔ اشعار دکنی اردو کا نمونہ ہیں۔

(۱۴) ہوا پایہ بلند بیٹی کا * حق نے احمد کو جب کہ دی دختر
آلِ احمد تھی آصفِ ناداں * اور تھی باپ ماں کی نورِ نظر
ساتواں ماہ کب ہوا پورا * اس نے دُنیا سے جب کیا تھا سفر
۳ ربیع الاول ۱۳۴۲ھ ہجری

(۱۵) ماں باپ کی آنکھوں میں تھی تیرہ و تاریک * ذلحجہ کی سترہویں رحلت سے علی کی
افسوس کہ بس ایک سال اور آٹھ مہینے * کیا گھر میں اُجالا تھا طلعت سے علی کی
اس واقعہ کی اک نظم فصلی ہے یہ تاریخ * اندھیر ہے دُنیا میں فرقت سے علی کی
۱۴۴۰ - ۱۱۰ یعنی علی ۱۳۳۰ فصلی

موزونیتِ اشعار کا میں ذمہ دار نہیں۔ نقل راچہ عقل۔ اگلے لوحِ مزار کا شعر بھی اسی قبیل کا ناموزوں ہے۔ یا اسے نثر سمجھ لیجیے۔

کمترینِ شاہِ دو عالم مریدِ شاہِ جیلانی * زوجۂ شہاب الدینِ حسام خوانی
۲۴ - محرم ۱۳۳۲ھ ہجری

اس درگاہ کی ساری قبروں کے کتبے ختم ہوئے اب درگاہِ حضرت شاہ نورالدین قادری اور درگاہِ حضرت شاہ خاموش کے باقی ہیں، وہ پھر کبھی۔

خاکسار بشیرالدین احمد دہلوی غفرلہٗ

(مولوی بشیرالدین احمد تعلقہ دار ریاست حیدرآباد دکن رئیس دہلی)

صلائے عام - یہ مضمون مجھے بہت پسند آیا کہ یادِ رفتگان کے تازہ اور پائدار رکھنے کا طریقہ اس سے زیادہ مؤثر اور نہیں۔ حضرت **امیر مینائی** اور جنابِ **داغ** کے کلام کا جن دلوں پر نقش ہے وہ لوحِ مزار کی تاریخیں آنکھوں سے لگائیں گے۔ اہلِ سخن کی نگاہ میں ایسی چیزوں کی جس قدر قدر ہو تھوڑی ہے :-

---

قطعہ۔ جناب ظہیر دہلوی

(یہہ مختصر قطعہ دلی کی زبانِ خاص کر زبانِ اساتذہ کا شاہدِ حال ہے)

چلو نظر گزر کی ادھر بھی کبھی کبھی + ساقی بقائے عمر تری جاوداں رہے
دلی کے انتخاب تھے جو موجدِ زباں + افسوس ہے نہ اب وہ فصیح البیاں رہے
ہاں بعد اُن کے ہم نے بنایا زبان کو + پیرو انہیں بزرگوں کے پس ماندگاں رہے
زندہ ہیں اُس سے آج تک اُن نامیوں کے نام + دنیا میں ذوق و مومن و غالب کہاں رہے

اُردو زباں کے لطف ہمیں تک ہیں اے ظہیر
آئندہ ہم رہیں نہ ہماری زباں رہے

صلائے عام - نثر میں صلائے عام کو بھی انہیں لوگوں کی زبان کی ایک بچی کھچی یادگار سمجھ لیجیے۔ مگر

جوانی لے گئی جوشِ طبیعت
ظہیر اس سن میں کیا لطفِ بیان ہے

کلامِ فردوسی

نام منصور کُنیت ابوالقاسم تخلص فردوسی۔ ساکن موضع شاداب از مواضع طوس تعلقہ ایران۔ فردوسی کے باپ کا نام مولانا فخرالدین ہے۔ اُنہوں نے ایک خواب دیکھا تھا اُس کی تعبیر شیخ نجیب الدین رحمتہ اللہ علیہ سے لی جو بہت بڑی معتبر تھے۔ انہوں نے فخرالدین سے فرمایا کہ تمہارے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوگا وہ بہت بڑا شاعر ہوگا۔ اُس کا کلام بہت ہر دل عزیز ہوگا۔ چنانچہ فردوسی پیدا ہوا تھوڑے عرصہ میں کُتبِ درسیہ اور علوم متداولہ سے اس نے فرصت پائی۔ ایسا صاحبِ علم ہوا کہ اگر شاعر نہ ہوتا تو حکما میں اس کا شمار ہوتا۔ ابتدائے عمر میں شعر و سخن کا زیادہ شوق ہوا اور اپنے زمانہ کے شاعروں میں سب سے زیادہ فنِ شعرگوئی میں ممتاز ہوا۔ اور سچ پوچھو تو آج تک بھی فردوسی کا ہم مرتبہ دوسرا شاعر پیدا نہیں ہوا شعرگوئی کی جان مقتضائے حال کا نظم کرنا ہے اس میں کوئی فردوسی سے نہ بڑھا۔ اس کو شاہنامہ کے نظم کرنے کا خیال آیا تو اس کے ایک دوست محمد لشکری نامی نے اس سے کہا کہ میرے پاس تاریخ عجم موجود ہے شوق سے اپنے ارادہ کو پورا کر۔ اسی عرصہ میں فردوسی نے حضرت شیخ محمد معشوق طوسی رحمتہ اللہ علیہ سے استمداد ہمت کی شیخ نے فرمایا کہ جو ارادہ کیا ہے پورا کر خدا کامیاب کریگا چنانچہ اس نے فریدون اور ضحاک کی داستان کو نظم کیا پھر سلطان محمود کے میر منشی بدیع الدین نامی سے خط و کتابت کی۔ اُس نے لکھا کہ رودکی۔ عنصری۔ فرخی۔ عسجدی۔ خرمی بڑے بڑے شاعر یہاں موجود ہیں مناسب سمجھو تو غزنی آجاؤ۔ اس نے جواب میں لکھا ؎

چہ سنجی بمیران من عنصری + گیا چوں کند پیش گُل ہمسری
زبید النشی باشد و کودکی + کہ رائے فزونی کند رودکی

بگوشش از سرو شم بسے مژدہ ہاست ٭ ولم گنج گوہر زباں اژدہاست

اس کے بعد عزنی آیا۔ معلوم ہوا کہ اس کے آنے سے اوّل شاہنامہ کو نظم کرنے کا عنصری کو حکم ہو چکا ہے۔ کیوں کہ بادشاہ کو دو شعر اُس کے امتحان مقابلہ میں بہت پسند آئے۔ وہ دو شعر یہ ہیں ؎

ہر آنگہ کہ تشنہ شدی تو بخوں ٭ بیالودی ایں خنجر آب گوں

زمانہ بخون تو تشنہ شود ٭ ہمہ موئے اندام دشنہ شود

پھر فردوسی نے رستم اور اسفندیار کی لڑائی کو نظم کیا اور ماہک نامی کے ذریعہ سے سلطان محمود کی خدمت میں پیش کرایا۔ سلطان فردوسی کا کلام سُنکر سب کچھ بھول گیا اور فردوسی کو دربار میں طلب کیا۔ اس نے تمام شعرا دربار کی موجودگی میں اپنا کلام پڑھا۔ پھر سلطان نے ایاز کی تعریف میں فی البدیہہ شعر کہوائے۔ اس نے ایاز کے وصف خط میں کچھ شعر اُسی وقت کہے۔ وہ یہ ہیں ؎

مست است بتا چشمِ تو تیر بدست ٭ بس کس کہ ز تیر چشمِ مستِ تو بخست

گر پوشد عارضت زرہ عذرش ہست ٭ کز تیر بترسد ہمہ کس خاصہ ز مست

بادشاہ نے کل شعر پسند کئے اور بہت خوش ہوا۔ موجودہ شاعروں نے متفق اللفظ ہو کر فردوسی کو اُستاد مانا۔ بادشاہ نے شاہنامہ کے نظم کرنے کا حکم دیا اور ایک مکان برابر محلات شاہی کے بنوا دیا جہاں تصاویر کے ذریعہ سے پہلوانوں کی صورت و شکل لڑائی کا رنگ ڈھنگ ہتھیاروں کا استعمال سب کچھ دکھلایا گیا تھا۔ انہی تیس ہزار شعر لکھے بعض کا قول ہے کہ ساٹھ ہزار ٭

یہاں حسبِ منشاء خان بہادر سید ناصر علی صاحب فردوسی کے تاریخی حالات سے زیادہ بحث نہیں کی جاتی ہے بلکہ اُس کا جو پسندیدہ کلام ہے وہ کہیں کہیں سے بطور نمونہ کے نذرِ ناظرین کیا جاتا ہے۔ تمام کلام کو دیکھنا ہو تو شاہنامہ موجود ہے۔ عام خیال ہے کہ فردوسی کا رزمیہ کلام بہت بلند ہے اور بزمیہ پست ہے۔ چند شعر رزمیہ فردوسی

سالنامہ

کے یہاں اسی شاہنامہ سے نقل کئے جاتے ہیں۔ غور کرو کس قدر بلند پایہ شاعری ہے۔

سہراب عین عالم شباب میں ہے تورانیوں کی فوج لیکر ایران فتح کرنے کے ارادہ سے سرحد ایران پر پہونچ چکا ہے۔ ایک سرحدی قلعہ سے لڑنے کے واسطے گرد آفرید نامی ایک خوبصورت حوروش لڑکی مردانہ لباس میں سہراب سے لڑنے آئی ہے سہراب نے اُسے مرد سمجھکر گرفتار کرلیا اُس نے اپنا چہرہ سہراب کو دکھایا سہراب اُس کے حسن و خوبی کو دیکھکر ازخود رفتہ ہوگیا۔ وہ لڑکی دم دیکر نکل گئی اور راتوں رات اپنے باپ کے ہمراہ سرحدی قلعہ سے ایران بھاگ گئی۔ سہراب اس امید پر کہ قلعہ میں اُس کی دل رُبا موجود ہے خوشی خوشی قلعہ میں آیا یہاں اُسے نہ پایا۔ بدحواس ہوگیا اور یہہ کہنے لگا ؎

همی گفت از آن پس دریغا دریغ ٭ که شد ماه تابنده در زیر میغ۔
مرا چشم زخمے عجب رو نمود ٭ که دہر آنچناں صید از من ربود
غریب آہوے آمدم در کمند ٭ که از بند جست و مرا کرد بند
پری پیکرے ناگہاں رو نمود ٭ دلم را ربود و غمم را فزود
زہے چشم بندی که آں پرفسوں ٭ بہ تیغم نجست و مرا ریخت خون
مرا تلخ شد زندگی بے رخش ٭ تنم شد اسیر شکر پاسخش
ندانم چه کرد آں فسوں گر بمن ٭ که ناگہ مرا بست راه سخن
بآں رزم و آں روی برآں گفتگوئے ٭ نہ بینم دگر دلبرے ہمچو اوے
ازاں گفتنش ہر گہ آرم بیاد ٭ زداغش شود سوز دردم زیاد
مرا محنتے بیکراں رو نمود ٭ که از یار دوری مرا گشت سود
بہ زاری مرا خود بباید گریست ٭ که دلدار خود را ندانم که کیست
یکے بوستاں بود اندر بہشت ٭ بہ بالائے او سرو دہقاں نکشت
دو چشمش گوزن و دو ابرو کماں ٭ تو گفتی ہمی بشگفد ہر زماں

ہمی گفت و می سوخت از غم بسے ؛ ہمی خواست رازش نداند کسے
ولے عشق پنہاں نماند کہ راز ؛ بمردم نماید ہمی اشک باز
غم جاں برآرد خروشش از دروں ؛ اگرچند عاشق بود ذوفنوں
زبس مہر انداخت با فرہنگ ؛ نماند ایچ بر روے سہراب رنگ

ان اشعار کی وہ شخص زیادہ قدر کریگا کہ جو خود کسی پر عاشق ہوا ہوگا اور اُس کو یہ مصیبت پیش آئی ہوگی۔ ان اشعار کی تعریف کرنے کو بھی بڑی قابلیت کی ضرورت ہے میں نے چاہا تھا کہ فردوسی کا بہ نسبت دوسرے شاعروں کے جو ایک خاص وصف ہے اس کو کچھ ظاہر کروں۔ مگر سمجھا کہ چھوٹا مونہہ بڑی بات۔ کم مائیگی کی وجہہ سے بن نہ آئے گا سخن فہم خود سمجھ لیں گے اس لئے یہہ ارادہ ترک کیا ؛ باقی آیندہ

(خان صاحب مرزا محمد علیخاں صاحب نفیس دہلی)

بقیہ صفحہ ۱۷ کا

جاں کاہیوں سے کام رہا سالہا ہمیں ؛ خونِ جگر پیا کئے اک عمر صبح و شام ؛ افسوس جب کہ صرف ہوئی سب متاعِ عمر دلخواہ جب حصول ہوئی دولت مرام ؛ انجام کو جو دیکھا تو باطل ہے سب گماں ؛ بے سود کاہشیں تھیں سراسر تھی حرص خام مانا کہ ایک عمر رہا جاں کنی سے ربط ؛ اس شوق و ذوق میں ہے گو خواب و خور حرام ؛ مانا کہ دل کو خون کیا فکر شعر میں پارہ ہائے دل سی دیا نظم کو نظام ؛ مانا کہ جوڑ کر جگر لخت لخت کو ؛ مضمونِ مختلف کو دیا حسنِ انصرام مانا کہ اپنے فن میں ہوئی فرد روزگار ؛ مانا کہ آبِ زر سے لکھا خلق نے کلام ؛ مانا کہ چار دانگ میں ہے شہرت کمال مشہورِ روزگار ہوئی تا بہ روم و شام ؛ مانا کہ اپنے فن میں ہیں اُستاد روزگار ؛ مانا کہ بیحساب ہیں شاگرد خاص و عام یہ سب بجا صحیح مگر اس سے فائدہ ؛ ہے کون قدرداں جو کرے وقعتِ کلام ؛ صورت نگر ہیں سب نہیں معنی شناس ایک افسوس تیری حال پہ اے شاہد کلام ؛ وہ دن گئے کہ تیرا زمانہ تھا ناز کا ؛ ای ترکِ من ستمگر ترکی ہوئی تمام مختل دل و دماغ ہوئے باختہ حواس ؛ اور آفتابِ عمر ہے پہونچا کنارِ بام ؛ افسوس بیٹھے دادکے ہوں حرف گیریاں بے سود محنتیں یونہی ضایع ہوئیں تمام ؛ رشک و حسد ہے شیوۂ اربابِ روزگار ؛ اپنا تو بس کلام ہوا ختم والسّلام

اس وقت انحطاط میں سچ تو یہ ہے ظہیر ؛ وقعت سخن کی کھوتی ہے لینا سخن کا نام

قطعہ۔ جناب نواب صاحب بہادر فرمانروائے ریاست لوہارو

قمری و سرو کرتے تھے باتیں چمن میں کل ٭ اُس وقت اتفاق سے میں بھی اُدھر گیا
قمری یہ کہہ رہی تھی کہ اے سرو نازنیں ٭ آخر سُنے گا بھی تو کبھی میری التجا
نالہ کناں ہوں صبح سے میں روز شام تک ٭ مانند آبشار ہے جاری مری بُکا
کیا یہ ہے شرطِ عشق کہ جو اپنی جان دے ٭ الٹا عذاب میں رہے اُس کا ہی دم سدا
میرا ہی عشق نام کا تیرے ہوا سبب ٭ آزادی اس کا نام ہے مجھ سے رہی خفا
سُن میری اور اپنی کسی دن تو مجھ سے کہہ ٭ اے دلبرِ عزیز مرے یارِ دلربا تو تو
اک آہ کھینچی جب یہ سُنا سرو نے بیاں ٭ قمری سے پھر جواب میں یہ درد سے کہا
غافل نہیں میں تجھ سے مگر اس کا کیا کروں ٭ اس غم سے زندگی نہیں بھاتی مجھے ذرا
اتنا تو نام باغ میں میرا اور ایسا قد ٭ لیکن ثمر جو جان ہے مجھ کو نہیں ملا
بے بار زندگی کا مری کچھ مزہ نہیں ٭ شیریں نہ ہوتا ترش ہی وہ رکھتا و اُلقا
گلشن میں چھوٹے چھوٹے سے پودے ہیں باردار ٭ اور بے ثمر چمن میں ہوں جلنے کو میں کھڑا
احساں کا اِن درختوں کے مخلوق پر ہے بار ٭ بے بر ہوں میں چمن میں اگر ہوں تو کیا ہوا
کیا تیری میں سنوں کہوں جب اپنی تجھ سے کچھ ٭ اس قیدِ غم سے گر میں کسی طرح ہوں رہا
اعظم یہ اک فسانہ ہے لیکن نتیجہ خیز ٭ پہونچے گا اس کی تہ کو رکھے عقل جو رسا
کیا اُس کا جینا خاک ہے ایسے کی زندگی ٭ حاصل نہ جس سے فیض کسی کو کبھی ہوا

محمد معین احمد۔ دہلی

صلائے عام۔ اس میں لفظ نازنیں ہے سرو کے ساتھ ذرا کھٹکتا ہے سرو مذکر ہے اور صفت کی صورت سے تانیث نکلتی ہے [illegible] شعرا اعتراض نہ کریں تو بدل دینا بُرا نہیں [illegible]

دلّی کی شاعری

یہہ مضمون بڑا اور بیشانی مختصر۔ ایسا مضمون تو دو چار جلدوں میں بھی ختم ہونا مشکل ہے: اس کی وہی مثل ہے کہ اونچی دکّان پھیکا پکوان:: اول تو محض شاعری کا ایسا مضمون ہے جس کے لئے کُتب خانہ کے کُتب ملنے چاہیئے۔ دوسرے دلّی کی شاعری کی بحث ہمیشہ جھگڑے کی چیز سمجھی جاتی ہے کہ شاعری میں کس کو کس پر ترجیح دیجائے: اس میں یک طرفہ کارروائی کا اعتبار نہیں: یہہ مضمون بطور قولِ فیصل ہرگز نہیں سمجھنا چاہیئے۔ بلکہ جہاں اور سیکڑوں مضمون اس بحث پر لکھے جا چکے ہیں ایک یہہ بھی سہی:

دلّی اور لکھنؤ کی شاعری میں مُدت سے بحث چلی آرہی ہے۔ اور اب تو جا بجا سے شاعری کے دعوے پیش ہو رہے ہیں: خاصکر پنجاب سے: مگر یہہ مُسلمہ ہے کہ اُردو کی شاعری کی جڑ دلّی ہے: تذکرہ نویسی کے طور پر مجھے یہاں کی قدیم و جدید شاعروں کا حال لکھنا منظور نہیں ہے۔ جس قدر مجھے یہاں کے دَور آخر کے شعرا کا حال معلوم ہوا وہ ذاتی و شخصی ہے: اسی پر قناعت کی جائے گی:

دورِ آخر میں آپ مومن۔ ذوق۔ غالب اور اُن کے ہمعصر سمجھ لیں: ان میں غالب سب سے زیادہ مشکل پسند سمجھے جاتے ہیں۔ غالب کو فارسی

نیں وہ کمال حاصل تھا کہ ان کی اُردو کی شاعری فارسی میں داخل ہے۔ بلکہ فارسی جلدی سمجھ میں آجاتی ہے۔ جن کو فارسی زبان میں دخل ہے اُن کے لئے غالب کے اشعار فارسی بہت دقت طلب نہیں کیوں کہ اُن کے لئے فارسی کے محاورے اور ترکیبیں بیگانہ نہیں۔ جن کو فارسی میں پورا دخل نہیں اُن کو اُردو میں فارسی کے بعض محاورے والفاظ مشکل معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً غالب کے دیوان اُردو کا پہلا شعر کس قدر بحث ومباحثے میں پڑ گیا ؎ نقش فریادی ہے الخ۔ اسی طرح ایسے اور فارسی کے خاص محاورے وترکیبیں اور الفاظ جن کا رواج اس ملک میں بہت کم یا بالکل نہیں۔ پھر بھی انکا طرز اُردو زبان کی وسعت کے لئے بے کار نہیں گیا۔ غالب کا یہہ شعر اُردو میں کتنا اچھا ہے جو اپنے زماں کی شکایت میں ہے ؎

پانی سے سگ گزیدہ ڈرے جس طرح اسدؔ ۔ ڈرتا ہوں آئینہ سے کہ مردم گزیدہ ہوں

مومن خاں گو فارسی لب ولہجہ کے ایسے بہت گرویدہ نہیں۔ لیکن اظہارِ مطالب میں مشکل پسند ضرور ہیں۔ حضرت عمرؓ کی مدح میں ان کے قصیدہ کا ایک شعر ہے کہ ؎

گل ہوا غنچہ کہ تھا صورتِ جام ۔ باغ میں دیکھ کے مستانہ صبا کی رفتار

یہہ مرزا نوشہ کے مشکل مضامین سے کم نہیں کہ خلیفۂ ثانی رض کے دورِ سیاست واحتساب کی تعریف اس سے زیادہ ممکن نہیں۔ اور لطف یہہ ہے کہ کمالِ شاعری بھی ہاتھ سے جانے نہ پایا: صبا کی رفتار مستانہ شاعری کا کمال ہے: جس کے چلنے سے باغ کی کلیاں کھلتی ہیں۔ کلیاں بصورت غنچہ جام کی شکل تھیں۔ اور جام کو مے ومستی

سے تعلق ہے: کلیاں (یعنی غنچے) کھلکر گل کی صورت ہو گئے اور مے کشی کا سامان بگڑ گیا؛ یہہ غایتِ فصاحت ہے کہ سیاست واحتساب کا مضمون صبا اور جام وگل سے دکھا دیا؛ استاد ذوق کا شعر ہے ؎

یہہ نیچے پائنچے جاروب کش ہیں اتنے لئے ؛ کہ نقشِ پا بھی کہیں سجدہ گاہ خلق نہ ہوں

نیچے پائنچے کا فائدہ از روے شاعری اس سے بہتر بیان کرنا مشکل ہے کہ نیچے پائنچوں نے جاروب کشی کا کام دیا نقشِ پا پائنچوں سے مٹتے گئے ورنہ خلق سجدہ کرنے لگ جاتی؛

اساتذہ کو یہہ فکر بھی رہتا تھا کہ جہاں تک ہو سکے مشکل مضمون باندھا جائے جسے عام سمجھ سکیں یا نہ سمجھ سکیں مگر خاص لوگ سمجھ کر داد دیں؛ شاہ نصیر دہلوی نے ہرن کے سینگوں کا مضمون پاؤں سر میں نکلنے کا کتنا مشکل باندھا ہے:-

یہہ مجنوں سے نہیں آہوے لیلےٰ ؛ یہن کر پوستیں نکلا ہے گھر سے

جسے تو سینگ سمجھی ہے یہاں پہ خار

لگے تھے پاؤں میں نکلے ہیں سر سے

تصویر نے جو پڑھے لکھے نہ تھے کمال کیا کہ حضرت قدسیؔ کی غزل کو جو نعت میں مشہور ہے معرکۂ کربلا کا نقشہ دکھا دیا:-

شہ نے فرمایا لعینوں سے دمِ تشنہ لبی ؛ آتشِ بغض تھی تم لوگوں کے سینہ میں دبی

ظاہرا کہتے تھے تم سب دمِ حاجت طلبی ؛ مرحبا سیدِ مکی مدنی العربی ؛؛

دل وجاں باد فدایت چہ عجیب خوش لقبی

رن کے جانے کو مسلح ہوئے اکبر جس دم ٭ اللہ اللہ وہ جوانی وہ پھبن کا عالم
کہا کے کہتی تھی قضا اُس رُخِ زیبا کی قسم ٭ من بیدل بجمال تو عجب حیرانم
اللہ اللہ چہ جمال است بدیں بوالعجبی

شہ نے فرمایا کہ اے فرقۂ گم کردہ شعور ٭ ہوں نواسہ میں جہاں میں اسی شہ کا مشہور
جس سے جبریل نے اکثر یہ کیا ہے مذکور ٭ ذات پاکِ تو دریں مُلکِ عرب کردظہور
زاں سبب آمدہ قرآں بزبانِ عربی

شمر سے شہ نے کہا تیغ ذرا اے بدذات ٭ کیا ہمیشہ کے لئے سمجھا ہے دُنیا کو ثبات
میرے نانا سے کہے ہے یہ یقیں وقتِ نجات ٭ ماہمہ تشنہ لبانیم و توئی آبِ حیات
لطف فرما کہ زحد می گزرد تشنہ لبی

اسی طرح ایک مُعشّر محمد شاہ و نادر شاہ کی لڑائی کا حافظ رحم کی مشہور غزل پر صلائے عالم ماہ اگست ۱۹۱۹ء میں چھپا تھا ٭

فارسی کا شعر ہے کہ :-

رفتنِ جاں را بچشمِ خود نہ دیدہ ہیچ کس ٭ من بچشمِ خویش مے بینم کہ جانم میرود

اس کی تضمین ہے :-

جب علی اکبر نے کی ترکِ جوانی کی ہوس ٭ اور سوئے مقتل چلا وہ ہو کے اسوارِ فرس
راوی کہتا ہے کہ فرماتے تھے شاہ دادرس ٭ رفتنِ جاں را بچشمِ خود ندیدہ ہیچ کس
من بچشمِ خویش مے بینم کہ جانم میرود

اس سے بہتر موقع اس شعر کے کہنے کا ممکن نہیں ؛

گو دورِ آخر کے دلی کے تمام شعرا کے نام کی فہرست بھی دامانِ نگہ سے زیادہ وسیع نکلے گی۔ لیکن جہاں تک اس مضمون میں گنجایش ہے عمداً ترک کرنا مناسب نہیں ؛

اصغر علی خاں نسیم دہلوی کا کیا کہنا جن پر دلی و لکھنؤ دونوں کی شاعری کو ناز ہے۔

جناب داغ کا ذکر محتاج بیان نہیں ؛ ظفر بادشاہ کا کلام ہر شخص کی زبان پر ہے ؛ سالک و ضیا برادر راقم و مجروح۔ ظہیر۔ محمد علیخاں تشنہ و مضطر و نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ بڑے مرتبہ کے شاعر سمجھے ؛ اسی طرح یہہ لوگ :۔

استاد ذوق کے شاگردوں میں۔

ا۔ سید شجاع الدین۔ انور۔ مرزا دارا بخت دارا خلف ظفر بادشاہ۔ مرزا فتح الملک افسر۔ ولیعہد ظفر بادشاہ۔ مرزا عزیز الدین سرور۔ داماد ظفر بادشاہ۔ حافظ عبد الرحمن سوزش۔ مرزا غیاث الدین شرر۔ نبیرۂ شاہ عالم بادشاہ مرزا قمر الدین شیدا۔ میرن شاہ صفا۔ سید ظہیر الدین ظہیر خوشنویس استاد ظفر بادشاہ۔ منشی دولت رام عبرت مرزا علی بخش۔ قابل۔ حفیظ اللہ۔ لطیف۔ نواب غلام حسن خاں۔ محو۔ شاہزادہ کبیر الدین۔ وحشت۔ حکیم خیر الدین یاس

مومن خاں کے شاگردوں میں۔

محمد اکبر خاں۔ اکبر برادر نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ۔ میر عبد الرحمن خاں۔ آہی۔ سعادت علی خاں۔ راسخ۔ غلام احمد خاں۔ شورش۔ میر جیجو خاں۔ شیدا ؛

اور اُستادوں کے شاگردوں میں

منشی گلاب سنگہ آشفتہ۔ پنڈت امرناتھ آشفتہ۔ شاگرد تنویر۔ آغا مرزا آغا۔ سید غلام نبی۔ احقر۔ حکیم اکرام اللہ خاں۔ اکرم۔ مرزا امیر بیگ۔ امیر۔ محمد عبدالحکیم بسمل۔ صفدر علی بیگ۔ بلند۔ شاگرد صابر۔ محمد حسین خاں تحسین۔ مالک مطبع مصطفائی واقع دہلی۔ مرزا مُغل بیگ بشیر۔

یہہ فہرست ناتمام و نامکمل سمجھئے۔ کہ اخباری مضامین میں اس کی تکمیل مشکل ہو۔ پھر بھی جب دلی والوں میں سے کوئی صاحب شعرا دہلی کا تذکرہ لکھیں تو بہت کار آمد ہوگی۔ اس میں تقدیم و تاخیر کا لحاظ نہیں رکھا گیا۔ نہ کلام میں امتیاز سے بحث ہے۔ مگر ہیں سب دلی والے۔

بہت دور کے اساتذہ اور قریب کے اساتذہ کو چھوڑ کر اس وقت دلی میں مجھے دو باکمال شاعروں کی خدمت میں نیاز حاصل ہے۔ ایک جناب سائل دوسرے جناب بیخود۔ جناب بیخود کو غزل میں ید طولے ہے۔ اور جناب سائل کو ہر طرز کے کلام میں کمال حاصل ہے۔ ان دونوں ذی کمال شاعروں نے دلی کی شاعری کا نام ہو رہا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ یہہ لوگ ابھی زندہ ہیں۔ ان کے کلام کی جسقدر تعریف کی جائے تھوڑی ہے۔

جناب مائل دہلوی عرصہ سے باہر تشریف فرما ہیں اس وجہہ سے ان کا نام رہ گیا۔ یہہ میرا قصور ہے ورنہ از روے شاعری اُن کا کلام لاجواب ہے۔

صلائے عام کی ڈاک

× × × × × × × × × × × × × ×

× × × × × × × **صلائے عام** ماہِ اپریل اگرچہ ماہ رمضان المبارک میں عین روزہ داروں کے ہاتھ سے نکلا ہے مگر عید کرتا ہوا صادر ہوا۔ اس کے دلدادہ فی الواقع آپ کے سرتا پا ممنون ہیں کہ آپ اُردو زبان کی حمایت اور اس کی ترقی میں کسی پہلو سے فروگزاشت نہیں فرماتے؛

دیباچہ میں آپ نے یہ لکھکر خوب ذمہ داریوں سے اہلِ مطبع کو بچایا کہ "جو غلطیاں ہیں وہ روزوں کے سر سمجھئے"۔ مگر حضور یہ کہے رہا نہیں جاتا کہ غلطی درکنار اب کی دفعہ تو **صلائے عام** کا نمبر بھی ندارد ہوگیا ہے۔ روزون کی بھول یہ بھی ہے؟

حضرت **مائل** نے یہ شعر لاجواب لکھا ہے کہ؎ وہ تو گئے ہوا ہوئے مشتِ غبار اب کہاں؛ ہاتھ بڑھائے لاکھ تو دامنِ اب کہاں؟؛ **خارستان** کو میں تو کیا کوئی بشر **گلستاں** پر ترجیح نہیں دے سکتا۔ خار تو ملٹری پولس کی طرح گُل کی حفاظت میں سنگیں چڑھائے پہرہ دیتا ہے۔ پس تحفظ کے لئے اچھی باڑ بندی کرتا ہے یہ بالکل انصاف سے بھرا ہوا فقرہ ہے کہ "جو خوبیاں شیخ سعدی کی گلستاں میں ہیں یہ حضرت ہی کا حصہ ہے" × × × × × × × × × × × × ×

"**ہماری نازک خیالیوں**" میں جو شعر بازم الخ ابتدا میں لکھا گیا اُس میں مرض وہ مرض ہے جو مریض کو ہوتا ہے۔ مومن خاں کا شعر ہے "مریضِ حسن.. مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی"۔ مجھے تو ہرگز اس رائے سے اتفاق نہیں کہ "فارسی میں نثر ایسی نہیں جو یورپ کی زبانوں کی نثر سے بازی لیجا سکے"۔ مجھے اس موقع پر یہ بھی کہہ لینے دیجئے کہ نثر ہی شاعری کی جان ہے؛ "**اُردو زبان پر انگریزی زبان کا اثر**" بہت مختصر پیرایہ میں بڑی خوبی سے یہ مضمون لکھا گیا ہے اور یہ بالکل راست ہے کہ

"جس طرح گلاب میں پانی ملنے سے گلاب کی مقدار بڑھ جاتی ہے۔ اسی طرح بیگانہ لب ولہجہ لے جانے سے زبان کی وسعت کو گو فائدہ ہو مگر اس زبان کی پاکیزگی میں فرق آجاتا ہے"۔ میں اس قدر اور بھی تائید میں کہدوں کہ پانی ملانے سے گلاب پھیکا پڑجاتا ہے ۔ **سوال وجواب** کے مضمون میں میری سمجھ میں بیمعنی ہے کہ "حیات وممات انسانی ہے" کیا مصاحب صاحب خدا کی خدائی سے باہر سوال کررہے ہیں؟ **عورتوں کے دلدادہ**۔ غضب کا عبرت خیز مضمون ہے سمجھ دار کے واسطے پورا تازیانہ ہے۔ ایسے مضامین دل پر اثر کرنے والے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ جناب مرزا محمد علیخاں صاحب حسب وعدہ" (باقی آئندہ) اس مضمون میں اضافہ فرماتے رہیں گے۔ اخلاق انسانی ایسے ہی مضامین سے درست ہوتے ہیں۔ **ایک پرانے یار کا خط**۔ یہ تو میرے حسب حال ہے اس سے زیادہ کیا کہوں؟ کیا خوب ہدایت کی ہے کہ "مذہبی جھگڑے چھوڑیئے میاں میں وصیان لگائیے! × × × × × × × × × × ×

آپ کا نیاز مند عرفان علی (مرزا عرفان علی بیگ آئی ایس او۔ اناگرہ)

رنگہائے رنگ رنگ سے ہے زینت چمن ¤ اے **ذوق** اس جہاں کو ہے زیب اختلاف سے

میرے **نظم ونثر** والے مضمون پر جناب مولوی مرزا عرفان علی بیگ صاحب نے ایک شعر کی تقطیع فرماکر اُسے ساقط الوزن لکھا ہے اگر یہ صحیح ہے تو پھر یہ کیا کہ "اس میں ایک لطف یہ بھی ہے کہ اگر مصرع اولیٰ کو زبان دباکر پڑھو تو مصرع ثانی کے ہم وزن ہوجاتا ہے"۔ تو پھر سقوط وزن کا اعتراض کہاں رہا۔ آپ کی زبان تو آپ کے اختیار میں ہے زبان اُبھار کے یا زبان دبا کے جس طرح چاہئے پڑھ لیجئے۔ یہ شعر میرا نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ مصرع اولیٰ کے اعادے میں میری غلطی ہو۔ ٹھیک یاد نہ رہا ہو۔ جناب مرزا صاحب کا میں بہت احترام کرتا ہوں۔ پہلا جواب تو میرا خاموشی ہے مگر بقول **شیفتہ** ؎ یہ ضبط راز کی تعلیم شیفتہ بیجا ہے زبان ہم کو ملی ہے اگر بیاں کے لئے۔ میرا جواب تو صرف اسی قدر ہے کہ میرے مضمون میں غالباً اور غلطیاں بھی ہونگی مرزا صاحب نے چشم پوشی کیوں فرمائی۔ میں یہ کہہ کر اپنی جگہ بیٹھ گیا کہ ؏ ہر چہ از دوست می رسد نیکوست۔ امید ہے کہ یہ معذرت تشفی بخش ہوگی اگر آپ سے کافی خیال نہ فرمائیں تو مولینا آزاد کی **آب حیات** سے اپنی تشنگی دفع فرمائیے شعری گہیم بہ از آب حیات۔ مستفعلن فاعلات فاعلات۔ یہ بھی انہیں کا قول ہے "فصاحت اور بلاغت کے لئے *

* کوئی قاعدہ نہیں جس کی زبان میں خدا مزہ دیدے ہزار اصول وقواعد کی کتابیں اُس پر قربان ہیں"۔ معروضہ بشیر الدین بشیر

صلائے عام

(زبانِ اساتذہ کی فردوس)

پیرایۂ آغاز اور مضمون پریشان کے بعد اب کوئی مضمون صلائے عام کی وضع کا اس پرچہ میں نہیں۔ پرچہ ختم ہونے کو آیا اور نہ انتظار باقی ہے ؎

چلے کہاں یہہ حنا ہاتھ کی دکھاکے مجھے ✽ ابھی تو آپ سے دعوے ہیں خوں بہا کے مجھے

حنا کے ساتھ یار کے نہ آنے کے بہانوں میں مجھے سب سے زیادہ وہ وہ بہانہ پسند ہے جو مشہور رہے کہ پاؤں میں مہندی لگی تھی اس لئے آنا نہ ہوا: پاؤں کی مہندی تو نہ آنے کا بہانہ ہو سکتی ہے۔ ہاتھ کی مہندی میں یہہ عذر نہیں چل سکتا: اوپر کے شعر میں یہہ بڑی خوبی ہے کہ ہاتھ کی حنا کا ذکر ہے۔ پاؤں کی نہیں: پاؤں کی مہندی سے چلنے کا لطف نہ رہتا کہ "چلے کہاں"؟

وہ قدم رنجہ کریں گے جو کیا ہے وعدہ ✽ مہندی ہاتھوں ہی میں تو ملتے ہیں مل لینے دو

یہہ ہندوستان کی نازک خیالی ہے کہ یار کے نہ آنے کے بہانوں میں پاؤں میں مہندی کا لگانا معقول عذروں میں داخل ہے ؎

آہٹ پہ کان در پہ نظر تھی کہ ناگہاں ✽ آئی صدا کہ پاؤں میں مہندی لگی وہاں

یاں خوں ٹپک پڑا نگہِ انتظار سے

عرب کی شاعری میں ایک جگہ شوق و انتظار کی گفتگو میں کوئی ماہ وش اپنے

چاہنے والے سے آنے کا وعدہ نہایت اصرار سے یوں کر رہی ہے کہ دُنیا میں کچھ کیوں نہ ہو جائے میں ضرور آؤں گی۔ آسمان گردش کرنا چھوڑ دے اور زمین اپنے مرکز سے ہٹ جائے۔ آفتاب مشرق کے عوض مغرب سے نکلنے لگے اور چاند پورا مہینہ بھر نہ نکلے تو بھی مگر میں ضرور آؤں گی۔ صرف ایک ہی عذر ممکن ہے کہ میری اونٹنی نہ بیاہ جائے ۔ واقعی اونٹنی اگر بیاہ جائے تو کس پر سوار ہو کر آنا ہوگا۔ ناقہ لیلے کی طرح یہی تو ذریعہ ملنے کا ہے ۔

یہہ اپنے اپنے ملک کی خوبی ہے کہ ہمارے ہاں پاؤں میں مہندی لگانے کا عذر معشوقانہ اور وہاں اونٹنی کے بیاہ جانے کا عذر قوی۔ شاعرانہ تخیل کی مثالیں ہیں ۔

یہہ میں پہلے عرض کر آیا کہ "صلائے عام کی وضع کی زبان سے میری غرض زبانِ اساتذہ سے ہے جو مست رہی ہے۔ جس کی نسبت حضرت ظہیر دہلوی فرماتے ہیں

وہ زباں ہی رہی نہ وہ اردو ۔ دل میں باقی گمان ہے گویا ۔ جو زبان ہے بچی کچھی باقی ۔
کوئی دن میہمان ہے گویا ۔

صلائے عام اُس زبان کا ٹوٹا پھوٹا یادگار ہے ۔

دعوےٰ نہیں ہے اس کا کہ اہلِ زباں ہیں ہم ۔ ہاں یادگارِ قافلہ رفتگاں ہیں ہم (حیدر علی ...)

"آزمایش" کی غزل پر جس میں اکثر شعرا نے طبع آزمائی کی ہے۔ حضرت ظہیر دہلوی فرماتے ہیں ؎ حریفانِ سخنداں میں سخن کی آزمایش ہے ۔ عیارِ فہم اہلِ انجمن کی آزمایش ہے۔

اس میں شک نہیں کہ کثرت سے رسالوں کے نکلنے سے ثابت ہے کہ اُردو
طرف توجہ ہو چلی ہے۔ اور ہر طرح کے خیال اور مضمون اس میں اکھٹا ہو چلے
ہیں: یہ بھی ایک طریقہ ترقی کا ہے اور وسعتِ زبان کے لئے بڑے کام کا ہے۔
جس طرح عمارت میں بنیاد کی مضبوطی کا زیادہ خیال رکھا جاتا ہے کہ بنیاد مضبوط
و تو جس قدر جی چاہے دیوار اُونچی لے جائیے۔ اسی طرح اُردو میں زبانِ اساتذہ
کا خیال رکھنا ضرور ہے کہ اساتذہ کی زبان پر اُردو کی بنیاد ہے ؎

بہت باتیں بنائیں اپنے مذہب کی ✤ مرے مطلب کی بھی کہہ دو زباں سے

زبانِ اساتذہ اس وقت مرنیوالے کی گویا نگاہِ واپسیں ہو رہی ہے۔ نئے نئے بلکہ
بیگانہ لب و لہجہ اس میں نظر آرہے ہیں: میکدہ میں گو بادہ خوار نئے ہوں مگر پیرِ مغاں اور
شرابِ کہن کا پُرانا ہی ہونا اچھا ہے ؎

مستوں کے دل سے یادِ جوانی بھلائے کون ✤ پیرِ مغاں کہاں وہ شرابِ کُہن کہاں

نئی اُردو گو کیسی ہی کیوں نہ ہو زباں اساتذہ کو نہیں پہونچتی ؎

آج بھی تارے گنوں گا اے شبِ تارِ لحد ✤ نیند آنے کی کوئی صورت نئے گھر میں نہیں

جہاں آپ اُردو کی وسعت کی فکر کریں زبانِ اساتذہ کو مٹنے نہ دیں ؎

عریاں ہی رہیں گے صفتِ نکہتِ گُل ہم ✤ غنچہ سے قبا لالہ سے دستار نہ لیں گے

حالِ دل کا ہم کہے دیتے ہیں خوش ہو یا نہ ہو
داستاں اچھی بری اس کے سوا آتی نہیں

مہتمم کی طرف سے۔

اِطّلاع

صلائے عام کی قیمت پیشگی چھ روپیہ سالانہ ہے۔ قیمت بذریعہ منی آرڈر عنایت فرمائی جائے: مضمون نگار بھی صلائے عام کی قیمت سے بری نہیں۔ نہ یہ ضرور ہے کہ ہر مضمون خواہ مخواہ شایع کیا جائے: جامع اوراق کو مضمون میں کمی بیشی کا اختیار رہے۔ جو مضمون شایع نہ ہو سکیں اُن کے واپس کرنے کا ذمہ نہیں:

صلائے عام میں ہر طرح کے مضامین نظم و نثر شایع ہوتے ہیں۔ زیادہ تر نثر کہ اس وقت نثر کی زیادہ ضرورت ہے: اور نثر بھی ایسی جس میں زبان کی خوبی و فصاحت کے ساتھ مضمون کی پاکیزگی و نازک خیالی ضرور ہو یعنی بسان عروسِ جمیل دلباسِ حریر۔ شرط ہے کہ مضمون پاکیزہ اور اداے بیان لاجواب چاہیئے:

اکثر اصحاب نمونہ کا پرچہ مانگتے ہیں۔ اوّل تو ایک پرچہ سے صلائے عام کی ساری خوبیوں کا حال معلوم ہونا مشکل ہے دوسرے صلائے عام اتنے عرصہ سے جاری ہے کہ اہلِ علم میں شاذ ہی کوئی ایسا ہوگا جو اس سے واقف نہ ہو: پھر بھی اگر کسی کو نمونہ یا سال سے کم کی خریداری منظور ہو تو ایک روپیہ فی پرچہ کے حساب سے قیمت لی جائے گی:

صلائے عام کا پتہ اس قدر کافی ہے کہ:

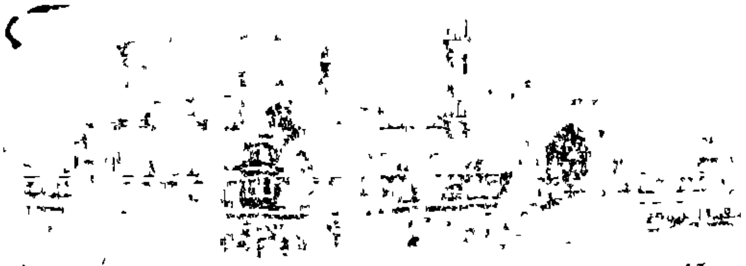
دہلی۔ فراشخانہ: مکان میر ناصر علی خاں بہادر

حسب الارشاد میر ناصر علیخاں بہادر مطبع ناصری واقع فراشخانہ دہلی میں باہتمام میر احمد چھپا اور شایع ہوا:

Printed and Published by Mir Nasir Ali Khan Bahadur (Editor) at the Nasri Press, Farrash-Khana, Delhi

سر لوح رکھکر بیاضِ جبیں — تجھا دوسرا کوئی تجھسا نہیں

June 25



نمبر

جلد ۱۳

SALÂ-I-ÂM, DELHÎ.

A high class Monthly Magazine devoted to the cause of Urdu literature, the preservation of the old Indian, especially Mohammadan culture and refinement, and the assimilation of the best features of the new civilization.

[illegible] ناصر علی [illegible] اہتمام [illegible] فراشخانہ [illegible] چھپا اور [illegible]

فہرستِ مضامین

جلد ۱۳ — نمبر ۶

بابت ماہ جون سنہ ۱۹۲۵ء مطابق ماہ ذیقعدہ سنہ ۱۳۴۳ ہجری

صلائے عام

یارب نہ آئے یار کی باتوں کا رنگ ڈھنگ ؛ ہر غنچہ کو نصیب دہن ہو زباں نہ ہو ؛

جس طرح شعر میں ہر ذی کمال کا رنگِ سخن علیحدہ علیحدہ ہے نثر میں بھی یہی صورت ہے۔ مرزا رجب علی بیگ سرور کی نثر کا طرز انہیں کا حصہ سمجھیے اور میر امن دہلوی نے جس طرز پر چہار درویش لکھی پھر کسی سے نہ لکھی گئی۔ غالب نے خطوط میں جو بات پیدا کی پہلے کسی کو نہ سوجھی ؛ سر سید احمد خاں نے اردو میں بہت پاکیزہ وضع اختیار کی۔ صرف اتنی قباحت ہوگئی کہ عقائدِ اسلام کی تاویل و ترمیم پر زیادہ زور دیا : اس وجہ سے ان کا نام لٹریچر سے زیادہ عقائد کے بحث مباحثہ میں شہرت پذیر ہوا : لیکن ایک خوبی ان میں بڑی تھی کہ نظم کی طرف متوجہ نہ ہوئے ؛ نظم و نثر دونوں میں دعوے کرنے والے بڑی غلطی کرتے ہیں کہ نثر لکھتے لکھتے شعر کہنے لگ جاتے ہیں یا شعر کہتے کہتے نثر لکھنے لگتے ہیں۔ اس دھن میں دونوں ادھورے رہ جاتے ہیں۔

بہر حال۔ اس تمہید سے میری غرض یہہ ہے کہ جن کی طبیعتیں نظم کی طرف مائل ہیں وہ نظم میں کمال پیدا کریں۔ جن کو نثر پسند ہے وہ میری طرح نثر کے پیچھے پڑے رہیں ✦ ہر طرح کے علوم و فنون میں ترقی کرنے کا ذریعہ نثر میں ہے ؛ نظم میں

صرف ایک فن شعر و شاعری کی گنجائش ہے - اور وہ بھی اکثر عاشقانہ: وہی پرانی لکیر پیٹے جانا ہر طرح کی معلوماتِ علمی کے لئے کافی نہیں ::

اس وقت اُردو میں بہت اچھے اچھے لکھنے والے ہیں۔ اس کے ثبوت میں آپ آج کل کے اخبار و رسالے و گلدستے دیکھ لیجئے کہ نظم و نثر کے کیسے کیسے پاکیزہ مضامین نکلتے ہیں: شعر و شاعری میں ایسی پاکیزہ زبان پیدا کی کہ اساتذہ سے بہتر نہیں تو کسی طرح کم نہیں۔ بلکہ اکثر غیر زبانوں سے بدرجہا بڑھی ہوی ہے :: نثر میں میں دیکھتا ہوں کہ ہم اور زبانوں سے گرے ہوئے ہیں۔ زیادہ تر تو انگریزی زبان کے ترجمے اور بیگانہ لب و لہجے اپنی زبان میں لا رہے ہیں جس سے اپنی زبان پرائی ہوئی جاتی ہے :: پہلے آپ اپنی زبان کی خوبیاں دکھائیں۔ پھر اوروں کی: اور اب تو انگریزی اس قدر رائج ہو گئی ہے کہ ہم اُن کی خوبیاں خود انگریزی میں دیکھ سکتے ہیں + اپنا مال ضایع کر کے محلہ والوں کے سامان پہ ناز کرنا دولت و اقبال کے ثبوت میں داخل نہیں ؎

خدا نالوں کو رکھے اور اثر کو + سمجھ لیں گے کبھی چرخِ کہن سے

دہانِ زخمِ قاتل پہ نہ ہنستے
جو سی دیتا کوئی تارِ کفن سے

لسان الملک حضرتِ ریاضؔ

حضرتِ ریاضؔ کے کلام کی داد میں جناب رگھوپت سہائے صاحب بی اے۔ ایل ایل۔ بی رئیس گورکھپور نے زمانہ نامی رسالہ میں ایک بہت اچھا مضمون لکھا ہے: وہ مضمون میں نے اخبار مشرق میں دیکھا۔ دیکھ کر جی خوش ہوا کہ اہل ہنود میں اردو شاعری کے بڑے بڑے قدر داں ہیں۔ وہ مضمون صلائے عام میں اس غرض سے نقل کیا جاتا ہے کہ اہلِ کمال کے کلام کی داد اس طرح دینی چاہئے جس طرح کہ صاحبِ مضمون نے دی ہے:

حضرتِ ریاضؔ کے کلام پر تبصرہ کرنا کچھ آسان کام نہیں۔ آج کل اردو شاعری کی دنیا وسیع ہو گئی ہے۔ لیکن ریاضؔ اس سے بالکل الگ ہیں۔ عام شعرا اپنے اوپر کیفیتیں طاری کرتے ہیں لیکن ریاضؔ کی شخصیت کل کیفیات پر حاوی ہے وہ جذبات فطرت کے ساتھ کھیلتا ہے اس کی روح شاعری کی وسیع دنیا میں اٹکھیلیاں کرتی رہتی ہے وہ حسن اور عشق کے معرکہ میں نہایت آزادی سے دلکو سینہ سپر کرتا ہے۔ اور جہاں چوٹ کھا جاتا ہے وہاں ایسی چٹیلی مسکراہٹ سے اس کا جواب دیتا ہے کہ جیت اسی کے ہاتھ رہتی ہے۔

ریاضؔ کے پہلے جرأتؔ۔ انشاؔ اور داغؔ نے شوخی و شرارت کی مصوری حسن و عشق کی معاملہ بندی میں کمال دکھایا ہے۔ لیکن ریاضؔ کے یہاں یہ رنگ اور بھی چوکھا اور گہرا نظر آتا ہے۔ اور لطف یہ کہ اسی کے ساتھ ہی وہ تصوف کے لطیف سے لطیف رموز اور فلسفۂ حیات کے عمیق سے عمیق اور مشکل سے مشکل مسائل باتوں باتوں میں بیاں کر جاتے ہیں۔ ریاضؔ کی چھیڑ

اور معنی خیز ظرافت اس بلا کی ہوتی ہے کہ سُننے والا بے خود ہو جاتا ہے۔ اور سننے والے پر کیا منحصر ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خود شاعر اپنی شوخ بیانی اور نکتہ سنجی پر مٹا ہوا ہے اور اپنی شان کو یہ کہکر اغیار کی مدح سرائی سے بے نیاز ثابت کرنا چاہتا ہے کہ ؎ شاعری ہے ریاض کے دم تک ۔ پھر کہاں لوگ اس طبیعت کے

ریاض اپنے تخیل کے کبھی شکار نہیں ہوتے وہ اپنی ہستی اپنے تخیل میں نیست و نابود نہیں ہونے دیتے جس طرح ایک پھول سے بو پھوٹتی ہے اسی طرح ریاض کے دل سے ایسے ترانے نکلتے ہیں جو کبھی اس دنیا کی اور کبھی دوسری دُنیا کی یاد دلاتے ہیں۔ جرأت۔ انشا،۔ داغ کی چھیڑوں میں وہ گہرائی وہ بلند پروازی وہ نزاکت وہ لطافت نہیں ہے جو ریاض کے یہاں موجود ہے اس کی شخصیت شاعری مجسم ہے جس پر ہر لحظہ نیا رنگ چڑھتا رہتا ہے۔ اس کی مُسکراہٹ میں نہ جانے کہاں کا راز چھپا ہوا ہے جس کی مستی میں بے شمار شوخیاں مضطرب ہیں۔ اس کی عشق و حُسن پرستی پر زہد اور اتقا نثار ہوتا ہے۔ اس کے چوٹ کھائے ہوئے دل میں بہار خُلد کی شگفتگی ہے جس کا جادو سب پر اثر کرتا ہے۔ مگر اس پر کسی کا جادو نہیں چلتا وہ ایسا عاشق کامل ہے کہ عالم کو درس عاشقی دیتا ہے۔ اگر حسن سدا سہاگ ہے تو اس کی عاشقی سدا بہار ہے۔ وہ ایک پیار کی چتون سے حُسن مجازی اور حُسن حقیقی دونوں کو والہ و شیدا بنا لیتا ہے۔

اس کی متوالی آنکھوں سے عشق و مستی کی ہزاروں کیفیات چھلکی پڑتی ہیں وہ ایسا گناہ گار ہے جس کی معصیت پر مغفرت کو پیار آتا ہے۔

عاشقانہ رنگ میں اس کی گل فشانیاں قابلِ دید ہیں۔ وہی الفاظ ہیں وہی باتیں ہیں وہی زمینیں ہیں جو ہر ایک کے کلام میں ملتی ہیں۔ لیکن ریاض کے دم قدم سے یہی زمینیں آسمان کا مقابلہ کر رہی ہیں۔ اپنے عاشقانہ کلام سے ریاض نے خود حُسن کو تسخیر کر لیا ہے وہ معشوق کو چھیڑ چھیڑ کر اپنے بس میں کر لیتا ہے۔

حسن کی شوخی اور شرارت اس کے عشق کی بے باکی کے سامنے حسرت اور بیچارگی میں تبدیل ہو جاتی ہیں وہ معشوق کو چھیڑ چھیڑ کر خفا کرتا ہے اور پھر اپنی سحر بیانیوں سے اپنا گرویدہ

لیتا ہے اسی کا نام سحر ہے معشوق خود اس کے سامنے کی اداؤں پر نثار ہو جاتا ہے اور خود وہ پرستار حسن اتنا نازک مزاج ہے کہ بات بات پر حسینوں سے روٹھتا ہے۔ کہتا ہے ؎

چھیڑ کیسی بات کہتے روٹھ جاتے ہیں ریاضؔ ؛ اک حسین ہر وقت ہو ان کے منانے کے لئے

اندازِ بیان ملاحظہ ہو۔

فتنے کا گزر اس بھری محفل میں نہیں ہے ؛ چل اے نگہِ ناز جگہ دل میں نہیں ہے
کیوں تجھ سے چھپاؤں ترا ارمانِ شبِ وصل ؛ قرباں ترے جو مرے دل میں نہیں ہے
بے موت مرے موت کہاں مر رہی جا کر ؛ ہم آئے تو وہ کوچۂ قاتل ہی نہیں ہے

اس کی بدمست روح کو صدمہ بھی ہو جاتا ہے تو اس کے منہ سے قافیے ترانے بنکر نکلتے ہیں ؎

کون دل ہے مرے اللہ جو ناشاد نہیں ؛ کون گھر ہے مرے اللہ جو برباد نہیں
اے نسیمِ سحری ساتھ لئے جا سوئے بام ؛ نفسِ سرد ہے نالہ نہیں فریاد نہیں
چپ سے ہیں کچھ مری آغوش میں وہ حشر کے دن ؛ یہ وہی ہیں جنہیں پیمانِ وفا یاد نہیں

آہ! "یہ وہی ہیں جنہیں پیمانِ وفا یاد نہیں" کا ٹکڑا کیا غضب ڈھا رہا ہے۔ ایک دوسری غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

ہمارے دل پہ جو داغ ایسا کم نکلتا ہے ؛ یہ بن کر چراغِ محفلِ ماتم نکلتا ہے
جہاں ہم خشتِ خم رکھ دیں بنائے کعبہ پڑتی ہے ؛ جہاں ساغر پٹک دیں چشمۂ زمزم نکلتا ہے
سحر ہوتے وہ اپنا چاکِ دامن لیکے بیٹھے ہیں ؛ رفو کرنے کو تارِ دامنِ مریم نکلتا ہے

پہلے شعر میں "ایسا کم نکلتا ہے" بے پناہ ٹکڑا ہے جس کے بعد دوسرے مصرعے نے قیامت ڈھا دی ہے دوسرے اور تیسرے اشعار میں سارے عالم کے زہد و اتقا اور پاک طینتی کو للکارا ہے اپنی سیہ مستی اور ہوا پرستی میں نہ جانے کیا کیا اس نے دیکھ لیا ہے۔ کعبہ۔ زمزم۔ اور حضرت مریم کا تارِ دامن اس کے خشت و خم اور ساغر اور اس کے معشوق کے چاک دامن پر قربان ہو رہے ہیں۔ تیسرے شعر کے پہلے مصرعے کی سج دھج بجائے خود ایک نئی چیز ہے۔

ریاض کا ایک شعر ہے ؎

ہم سوئے کوہ گئے قیس کو دینے آواز ؛ یار آ جاؤ ذرا ماتم فرہاد کریں

دامن کوہ میں کھڑے ہو کر قیس کو پکارنا عجیب و غریب شاعرانہ انداز ہے جنون عشق کی اس سے بڑھ کر تصویر نہیں کھینچی جا سکتی دوسرے مصرعے کے بے ساختہ پن میں کتنا درد کوٹ کوٹ کر بھر دیا ہے ریاض کی مستی میں کبھی کبھی وہ درد بھرا ہوا ہوتا ہے جو نزع کی اُلٹی سانسوں میں محسوس نہیں ہوتا۔ ذیل کے دو شعر ملاحظہ ہوں ؎

یہ محشر ہے یہاں اب ہوش میں دیوانہ آتا ہے ؛ خداوندا مرے لب پر مرا افسانہ آتا ہے

فرشتے عرصہ گاہِ حشر میں ہم کو سنبھالے ہیں ؛ ہمیں بھی آج لطف لغزش مستانہ آتا ہے

پہلے شعر میں ایک سماں باندھ دیا ہے جس کا لوٹنا آسان نہیں ذرا لفظ "اب" کو ملاحظہ فرمایئے۔ پہلے مصرع میں "دیوانہ" کا ذکر کر کے اور دوسرے مصرعے میں اپنے آپ کو وہ دیوانہ بنا کر اس قادر الکلامی کا ریاض نے ثبوت دیا ہے جس کی مثال کم ملتی ہے۔ دوسرے شعر کا کیا کہنا اس بدمست ازل کو عرصہ گاہِ حشر میں فرشتے سنبھالے ہوئے ہیں۔ سبحان اللہ مستی عشق کی تصویر کھینچ دی ہے کتنی معنی خیز کیفیت ہے۔

ایک دوسری مشہور غزل کے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں۔

۱۔ اُنہیں کے کام الٰہی مرا لہو آئے ؛ رنگیں جو ہاتھ لہو میں حنا کی بو آئے

اُترنے والے ابھی تک نہ بام سے اُترے ؛ تڑپنے والے تڑپ کر فلک کو چھو آئے

۲۔ وہی زبان سے میرا بھی ذکر کر دینا ؛ کلیم طور پر ان سے جو گفتگو آئے

نہ ہو بیہ کہنے کو ہم بے کہے گئے واعظ ؛ حرم کو جاتے ہوئے منہ بتوں کا چھو آئے

۳۔ ریاض تھی جو مقدر میں بازگشت شباب

جوان ہونے کو پیری میں لکھنؤ آئے

پہلے شعر میں کتنے پامال مضمون کو کیسی شوخ اور شگفتہ طرز میں بیان کیا ہے اس سے بڑھ کر

عاشق کا لہو معشوق کے کیا کام آسکتا ہے کہ اس کے ہاتھ کی پوری پوری تزئین ہو جائے اور حنا کی بو دینے لگے۔ دوسرے شعر کا اندازِ بیان کتنا اچھوتا اور کتنا سادہ ہے۔ دونوں اشعار میں طنز کا لطیف پہلو بھی موجود ہے جس سے سوز و گداز کے مضامین میں بھی ایک ہی شگفتگی پیدا ہوگئی ہے۔ تیسرے شعر میں "دبی زبان" اور "ان سے" ریاض کے سوا اور کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس امرِ ستائش حقیقت کی چھیڑیں تصوف کی جان ہیں۔ ہائے ہائے "دبی زبان سے میرا بھی ذکر کر دینا"۔ چوتھے شعر میں ایک معمولی بات یعنی بتوں کا منہ چھو دینا کسقدر گہرے معنی رکھتا ہے بظاہر عاشق بتوں کو منا کر اُن کا منہ چھو کر (اُن کی خوشامد کر کے) حرم کو جاتا ہے۔ اور کبھی نہ بولنے والے بتوں سے محض خاموش "اجازت" لے لیتا ہے۔ لیکن اس چھیڑ اور اٹکھیلی میں جو درد بھرا ہوا ہے وہ اہلِ مذاق کو بے تاب کر دینے کے لئے کافی ہے۔ ریاض نے بتوں کا منہ چھو کر صرف ان کو الوداع ہی نہیں کہی ہے بلکہ اپنا کلیجہ بھی مسوس کر رکھ دیا ہے۔ "بتوں کے لئے بھی یہ کتنا سخت عالم ہے۔ اس شوخ اور چلبلے شعر میں شاعر نے ایک ہنگامہ برپا کر دیا ہے۔ شعر درد دل میں ڈوبا ہوا ہے "نہ ہو یہ کہنے کو" اس موقعہ پر اس سے زیادہ پُر درد الفاظ ناممکن ہیں۔ پانچویں شعر میں لکھنؤ کی چہل پہل کی طرف اشارہ ہے ورنہ یہ تو معلوم ہی ہے کہ ریاض کے شباب کے ساتھ کس شہر کا نام وابستہ ہے۔

معشوقانہ اداؤں کو جیسا ریاض نے سمجھا ہے بہت کم شعرا نے سمجھا ہوگا۔ اس کی نگاہ سے معشوق کی کوئی ادا بچ نہیں سکتی۔ کم سنی کی اداؤں کی جتنی سچی تصویریں ریاض کے یہاں ملتی ہیں اور کہیں نہیں ملتیں۔ دراصل ریاض پر ہر وقت شباب ہی کا رنگ چڑھا رہتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس کی شاعری میں جوانی کا رنگ جھلکتا رہتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نشۂ جوانی سے سرشار ہے ہر وقت حسن کی بہار لوٹنے ہی کو وہ اپنا حاصلِ زندگی سمجھتا ہے۔ یہی اس کی چشمِ بینا کے لئے خلدِ بریں اور اس کی بے چین روح کی آخری آرام گاہ ہے مذہب اور تصوف کا بھی یہی مقصد ہے کہ دنیا کو ایک سدا بہار باغ بنا دیں جس کے برگ و پھول پتے پر حسنِ ازل

کا ازلی جلوہ

کا رنگ جھلکتا ہے۔ خواہشات نفسانی کو کوسنے سے فطرت کی اصلاح نہیں ہوتی۔ آخر نفسانیت سرشتِ انسانی کے رازہائے پنہاں کے اُبھار ہی کا نام ہے۔ جسے جوان ہونا نہیں آیا اُسے کیا آیا۔ کہنے کو چاہے کچھ کہیے لیکن جوانی کو روتے سب ہیں۔ حالی جیسا ریفارمر کہہ گیا ہے

گو جوانی میں تھی کج رائی بہت ÷ پر جوانی ہم کو یاد آئی بہت

دل دردمند کے لئے شوخ سے شوخ شعر میں بھی سوز و گداز موجود ہے۔ اب اس رنگ میں رؔیاض کے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں

آتے آتے ترے لب تک وہ تبسم بنجائے ÷ اس ادا سے کبھی ہم سے بھی ہو پیماں کوئی

کہہ گئے پھیر کے منہ ظلم کی آخر حد بھی + ان کے گھر آکے نہ اب ہو کبھی مہماں کوئی

اُبھرے جوبن کے لئے آپ کو آخر نہ ملا ÷ خمِ گردن کے سوا اور نگہباں کوئی

شام ہی سے وہ شبِ وصل یہ کہکر سوئے + جو ستائے ہمیں سوتے میں کبھی شاد نہ ہو

سحر ہوتے گیا کوئی تو یہ کہتا گیا کوئی ÷ یہی تو ہیں کہ ان کے گھر کوئی پھر مہماں ہوگا

ذیل کی غزل ملاحظہ ہو۔

کوئی منہ چوم لے گا اس نہیں پر ÷ شکن رہجائے گی یونہی جبیں پر

یہ خوں ہکس کا مقتل کی زمیں پر ÷ نہ دامن پر نہ اُن کی آستیں پر

یہ قسمت۔ داغ جس میں درد جس میں ÷ وہ دل اور لوٹ دستِ نازنیں پر

ارے او چرخ دینے کے لئے داغ ÷ بہت ہیں چاند کے ٹکڑے زمیں پر

دھری رہ جائے گی یوں ہی شبِ وصل ÷ نہیں لب پر شکن تیری جبیں پر

مجھے ہے خون کا دعویٰ مجھے ہے ÷ انہیں پر ہاں خدا وندا انہیں پر

ان اشعار کے تیور ملاحظہ کیجئے۔

نگہ سے بڑھ کے ہیں گستاخ دستِ شوق مرے ÷ نہ کوسئے گا ذرا ہاتھ اُٹھا اُٹھا کے مجھے

یہ کیا مذاق فرشتوں کو آج سوجھا ہے ÷ ہجومِ حشر میں لے آئے ہیں چلا کے مجھے

قیامت اور قیامت میں آئی قہر ہوا ؞ بتوں نے چھیڑ دیا سامنے خدا کے مجھے

ریاض کی ایک غزل کے دو شعر یہ ہیں۔

ہم تو اس کی ادا پہ مرتے ہیں ؞ منہ چھپائے جو کو ستا جائے
ہے ریاض اک جوان مست خرام ؞ نہ پیئے اور جھومتا جائے

یہ غزل ملاحظہ ہو۔

نہ آیا ہمیں عشق کرنا نہ آیا ؞ مرے عمر بھر اور مرنا نہ آیا
یہ دل کی تڑپ کیا لحد کو ہلاتی ؞ تمہیں قبر پہ پاؤں دھرنا نہ آیا
بناکر وہ کہتے ہیں کس بھولے پن سے ؞ ہمیں وعدہ کر کے مکرنا نہ آیا
بنے نقش پا ان کے کب گل لحد پہ ؞ صبا جا تجھے گل کترنا نہ آیا

عاشقانہ رنگ کے کچھ اور اشعار ملاحظہ ہوں۔

بہار نام کی ہے کام کی بہار نہیں ؞ کہ دست شوق کسی کے گلے کا ہار نہیں
ہم آگئے ہم پلٹ گئے ہم لیگئے اُن کو ؞ وہ کھوئے گئے کوچۂ دشمن سے نکلکر
حشر ہے حشر کوئی قتل گہ ناز نہیں ؞ آج کیوں مہندی لگے ہاتھ میں خنجر ہوتا
آستیں رنگ پہ لے آئی لہو دے نکلی ؞ نہ چھپا لاکھ چھپا حشر میں قاتل میرا
بار ہوتا نہ شبِ وصل نزاکت کو تری ؞ لب مرا شل تبسم ترے لب پہ ہوتا
نزع میں یار سے پیمانِ وفا کرتے ہیں ؞ اس دغا باز سے ہم آج دغا کرتے ہیں
سونپے جاتے ہیں اللہ کو اُن کی باتیں ؞ ہم نہ شکوہ نہ شکایت نہ گلہ کرتے ہیں
وہ بھی کیا وقت ہے جب دل میں شگفتہ ہوتے ؞ وہ بھی کیا وقت ہے جب پھول کھلا کرتے ہیں
بے شبِ وصل کہاں ہائے یہ کافر انداز ؞ ہو رہا ہے مری چھیڑوں سے پریشاں کوئی
چھو گئی گوشۂ داماں سے تو چھا جائے گی ؞ خاکِ تربت سے بچائے ہوئے داماں کوئی
اب وہ دل نکلے ہمارا کہ کوئی فتنۂ حشر ؞ کھولتا ہے گرہِ گوشۂ داماں کوئی

..رسے کچھ کہہ شوق نے چھیڑا ہے ریاض ؛ اپنی زلفوں کی طرح کیوں ہے پریشاں کوئی

تم اپنے بام سے فریاد کی اجازت دو ؛ یہاں سے تو نہیں سنتا ہے آسماں میری

تمہارے کوچے میں کچھ طور والے بیٹھے ہیں ؛ ذرا تم آ کے لب بام مسکرا دینا

چمک رہی ہیں نگاہوں میں بجلیاں پیہم ؛ یہ پردہ آنکھ سے میری ذرا اُٹھا دینا

نہ ..د کے طور تو ہم جائیں عرش سے اونچے ؛ ہماری راہ سے پتھر ذرا ہٹا دینا

اخیر کے تین اشعار کے تیور قابلِ ملاحظہ ہیں۔ ایک ایک شعر ایک اک عالم ہے۔ ریاض کا ایک مطلع ہے

مجھ سے بے پردہ ملے ملکے کیا گم مجھ کو ؛ ایک اس ساری خدائی میں ملے تم مجھ کو

اسے شاعری کہیں یا ساحری دوسرے مصرعے میں "ایک" کا لفظ قیامت پیدا کر رہا ہے۔ طنز آمیز شوخی کے پردے میں شکر و شکایت اور رنج و راحت کے کتنے پہلو چھپے ہوئے ہیں "ایک اس ساری خدائی میں ملے تم مجھکو"۔ دوسرے مصرعے میں "ملے" کا لفظ بھی غضب کا ہے۔

اُن کے آنچل میں ادا بن کر قیامت چھپ چکی ؛ وہ مری جانی ہوئی وہ میری پہچانی ہوئی ؛

شوخی سے چمک کر ادھر آئے اُدھر آئے ؛ محشر میں بھی دیکھا تو تمہیں تم نظر آئے

ملا ہو خون جسمیں کچھ وہی تو کام آتا ہے ؛ کلیجہ مُنہ کو آتا ہے جو دل کا نام آتا ہے

آخری شعر کتنا چٹیلا اور کتنا اچھوتا۔ شعر کے معنی بھی قابلِ غور ہیں۔ دل کتنی عزیز چیز ہے اور انتہائے محبت کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ محبوب چیز کا نام لیتے ہی کلیجہ مُنہ کو آجائے۔ ایک اور لطیف پہلو شعر کا ہے کہ مصرعۂ اول میں دل سے جو شکایت شاعر نے کی ہے۔ ہائے ہائے کلیجہ مُنہ کو آتا ہے جو دل کا نام آتا ہے"

شعر کے دونوں پہلو ایک دوسرے سے وابستہ ہیں۔ انتہائے محبت انتہائے امید بھی تو شکایت کی جان اور ایمان ہیں۔ شاعر کی ہستی دلکو یاد کر کے ہمہ تن درد بن گئی۔ کلیجہ مُنہ کو آ گیا لیکن اس کی شخصیت نے اپنی آن نہیں چھوڑی۔ اور سر کی ایک بامعنی جنبش کے ساتھ ایک انداز خاص سے کہہ اُٹھتا ہے۔ "کچھ وہی تو کام آتا ہے"؛

گل وبلبل کے مضامین میں بھی ریاضؔ نے جو شگفتگی پیدا کر دی ہے قابلِ ملاحظہ ہے۔

چھائے پھولوں سے بھی صیاد تو آباد نہ ہو ✤ وہ قفس کیا جو تہِ دامنِ صیاد نہ ہو

بہار آتے ہی پھولوں نے چھاونی چھائی ✤ کہ ڈھونڈھتا ہوں تو اب آشیاں نہیں ملتا

گیا چمن میں تو جھک کر بہت ملیں شاخیں ✤ لیا گلوں نے مجھے میرے آشیاں کی طرح

ارے صیاد ہمیں گل ہیں ہمیں بلبل ہیں ✤ داغِ دل ہے کہ قفس میں ہے گلستاں کوئی

ریاضؔ کا مشہور شعر ہے۔

پہلے جب وادیٔ غربت میں قدم رکھا تھا ✤ دور تک یادِ وطن آئی تھی سمجھانے کو

پہلے مصرعہ میں "کسنے" اور دوسرے مصرع میں "کسکو" کو حذف کر کے شعر کو ریاضؔ نے کتنا پر درد بنا دیا ہے۔

کچھ نمونے ریاضؔ کے عاشقانہ کلام کے جس میں معاملہ بندی حسن وعشق کے راز و نیاز اور چھیڑ چھاڑ کے ساتھ سوز و گداز کی کیفیتیں جوشِ شباب کی بلا خیز آندھیاں اور شامِ جوانی کی کیفیات سبھی نظروں کے سامنے پیش ہو جاتی ہیں۔ عجب رنگ ہے کہ ریاضؔ کے شامِ جوانی کی خود فراموشی میں صبحِ ازل انگڑائیاں لیکر اُٹھتی ہوئی نظر آتی ہے تخیل کی بجلیوں نے چاروں طرف کوند کوند کر اس شامِ جوانی کے جلوے کو اور بھی نکھار دیا ہے۔

شراب کا مضمون فارسی اور اُردو شعرا برابر باندھتے چلے آئے ہیں لیکن ریاضؔ کا انداز بیان سب سے نرالا ہے شراب کا نام لیتے ہی ریاضؔ اُردو شاعری کے آسمان پر ایک متوالی گھٹا کی طرح منڈلانے لگتے ہیں اور ان کی شوخ طبیعت بجلی بن کر چمکتی اور چنگاریاں اڑاتی ہوئی نگاہ سے اوجھل ہو جاتی ہے۔ لفظ لفظ سے بدمستی وخود پرستی ترشح ہونے لگتی ہے اور پڑھنے والے کو معلوم ہوتا ہے کہ شراب کی بو اُڑتے ہوئے جوش کی طرح اُڑ رہی ہے اور کبھی کبھی تو یہ کیفیت نظر آنے لگتی ہے کہ گویا شاعری کے آسمان پر ایسی کالی اور متوالی گھٹا چھا گئی ہے بحرِ عالم کیا کوثر و تسنیم کی موجوں میں جوار بھاٹا آ جاتا ہے وہ اس کے قریب پہونچنا ہی چاہتی ہیں۔ لیکن

اس سمندر سوکھ بادل کو دیکھ کر خشک ہو جاتی ہیں۔ اس بدمست ازل کی تہ کسی کو بھی نہیں ملتی۔ اس کی تشنہ لبی پر بادۂ ازل کی اُمنڈتی ہوئی لہریں قربان ہونے لگتی ہیں ہجر و وصال کے اکثر مضامین میں بھی وہ تاثیر اور وہ درد دیکھنے میں نہیں آتا ہے جو ریاض کے یہاں شراب کے مضامین میں موجود ہے۔ اس کی کسک اس کی ٹیس دلوں کو تڑپا دیتی ہے۔ جس وقت ریاض شراب خوار بنکر ہمارے سامنے آتا ہے تو اسے ساغر صہبا ساقی میکدہ وغیرہ کے نام لینے کی ضرورت نہیں ہوتی اس کی مدبھری آنکھوں اور اس کی متوالی چال سے شراب چھلکی پڑتی ہے۔ اس کے اشارے وکنائے اس کے حرکات و سکنات خود بخود بزم مے کی تصویر کھینچ دیتے ہیں اور شراب سے وہ کبھی محض "وہ" کہکے کبھی "میکدہ والی" کبھی محض پانی کہہ کے خطاب کرتا ہے۔

شاعر ساقیٔ ازل کی آنکھیں دیکھے ہوئے معلوم ہوتا ہے۔ چھائی ہوئی گھٹا کی طرح شیشۂ جام ساغر و خم کی طرف جب وہ دیکھتا ہے تو اُمید و یاس کی وہ کیفیتیں درد و راحت کے وہ احساس اس پر طاری ہو جاتے ہیں جو اب تک شاید ہی کسیکو نصیب ہوئے ہوں۔ لیکن یہاں بھی اس کی خصوصیت اس کی شخصیت اس کا ساتھ نہیں چھوڑتی۔ ساغر و صہبا ساقی و میخانہ سے بھی بڑھ کر آپ شراب خوار ازل کی شخصیت سے متاثر ہوتے ہیں جس کی شوخی جس کا بانکپن اور جس کی بے تابیاں شرابِ آتشیں کو بھی مات کئے ہوئے ہے جو چھری سے زیادہ تیز اور بجلی سے زیادہ بے تاب ہے۔ ریاض کی بے تابیوں کے سامنے موجِ مے بھی لڑکھڑانے لگتی ہے۔ سچ ہے اس بدمستِ ازل کا بیقرار دل ساقیٔ ازل کی نگہِ شوق کا پورا پورا جواب ہے۔

دیکھیئے ریاض نے اس صنف میں کیا کیا کہا ہے۔

گھٹا چھائی یہ بوچھاڑیں ہمیں پر ؛ ارے واعظ کہاں تک ہم لپٹے جائیں
دیدے تو میری جوانی ترے صدقے ساقی ؛ ہے وہی تیرے چھلکتے ہوئے پیمانے میں
سمجھا تھا جن کو پھول وہ نکلے شرارِ سنگ ؛ شیشے مرے نصیب سے پتھر کے ہو گئے
نشے کے پینگ میں سوجھی نہ کسی کو ساقی ؛ موجِ مے بنکے چھری چل گئی میخواروں میں

پی پی کے اس نے سجدے کئے ہیں تمام رات ؞ اللہ رے شغل زاہدِ شب زندہ دار کا

نہ پیاسے ہوں تو دینے سے ہو پانی کو دریغ ؞ زاہدِ خشک سا دیکھا نہیں انساں کوئی

انہیں میخانوں میں ہیں پیرِ مغاں ایک سو ایک ؞ قبلۂ دیں ہے کوئی کعبۂ ایماں کوئی

اب مجھے پیرِ خرابات کا ہے حکم ریاضؔ ؞ جا کے آباد کرو مسجدِ ویراں کوئی

بزم متوالی تھی کیا خم سے اڑا لی میں نے ؞ ہاتھ تھاما نہ کسی نے سرِ محفل میرا

ہم سے مے نوش جو لب کھولتے واعظ کی طرح ؞ صحنِ مسجد میں رواں چشمۂ کوثر ہوتا

ایک ہی چلو کے تھے کوثر و تسنیم ریاضؔ ؞ خاک اڑتی جو لبِ خشک مرا تر ہوتا

حرم و دیر میں ہوتی ہے پرستش کس کی ؞ میکشو یہ بھی کوئی نام ہیں مے خانوں کے

جام مے توبہ شکن توبہ مری جام شکن ؞ سامنے ڈھیر ہیں ٹوٹے ہوئے پیمانوں کے

ان چکنا چور "پیمانوں" کا انبار بھی قابلِ دید ہے

جہاں ہم خشتِ خم رکھ دیں بنائے کعبہ پڑتی ہے ؞ جہاں ساغر ٹپک دیں چشمۂ زمزم نکلتا ہے

کبھی کی پی ہوئی کام آج آئی حشر کے دن ؞ خدا کے سامنے میخوار سرخرو آئے

دیکھا کئے وہ مست نگاہوں سے بار بار ؞ جب تک شراب آئے کئی دور ہو چکے

وہ آرہا ہے عصا ٹیکتا ہوا واعظ ؞ بہا دے اتنی کہ ساقی کہیں نہ تھاہ ملے

مر گیا ہوں پہ تعلق ہے یہ میخانے سے ؞ میرے حصہ کی چھلک جاتی ہے پیمانے سے

فرشتے عرصہ گاہِ حشر میں ہم کو سنبھالے ہیں ؞ ہمیں بھی آج لطفِ لغزشِ مستانہ آتا ہے

پاک و صاف ایسی ہے جس نے پی فرشتہ بن گیا ؞ زاہدو یہ حور کے دامن میں ہے چھانی ہوئی

بیٹھے ہوئے ہیں ہاتھ دھرے ہاتھ پر ریاضؔ ؞ واعظ کے سر پہ آج سبو ہم اچھال کے

کاٹے کٹتی نہیں مجھ رند سے برسات کی رات ؞ میکدہ الٰہی جو مل جائے تو کچھ کام چلے

اتنی تو پی لی ہے کہ بہکے ہوئے ہم تھے ؞ مجرم ہیں جو واعظ کی کہیں سے خبر آئے

لو اک عمر کے میخانے میں آئے ہیں ریاضؔ ؞ آپ بیٹھے ہیں بچائے ہوئے دامن کیسا

نااہل ضرور ہیں وہ مے کش ٭ جن پر یہ حرام ہو گئی ہے
توبہ سے ہماری بوتل اچھی ٭ جب ٹوٹی ہے جام ہو گئی ہے
کچھ ہوا میں عجیب مستی ہے ٭ کہیں برسی ہے آسمان سے آج

ریاض نے ان اشعار میں لپٹی ہوئی بجلیاں ملا دی ہیں۔ اس پیکر بیتابی سے موج شراب کی لغزش مستانہ پناہ مانگتی ہے۔ صدائے قلقل و مینا سے نوائے الاماں اٹھتی ہوئی سنائی دیتی ہے۔ اس کی للچائی ہوئی نگاہ اس کے نعرۂ مستانہ۔ اس کی طبیعت کا چلبلا پن۔ اس کا کچھ کہہ کے چپ ہو جانا اس کے اشارات و کنایات سب ہی میں وہ راز چھپے ہوئے ہیں۔ جن کا انکشاف شہود غیب الغیب ہے۔ مذاق سخن رکھنے والے ان اشعار کو سن کے تلملا تلملا اٹھتے ہیں اور دل تھام تھام لیتے ہیں۔ درد ہستی بجلی بن کر گرتا ہے اور اس برق جولانی کے سامنے پردہ ہائے حقیقت سمٹ سمٹ جاتے ہیں اس کے اضطرار درد میں شعلے کی لپک ہے اور اس کے آغوش یاس میں کچھ اس طرح بھری ہوئی ہے کہ اگر ایک دم کو نکل بھی جائے تو شعلہ بہ داماں ہو کے نکلے گی۔ شاعری کا اصلی مقصد روح کی خوابیدہ طاقتوں کو بیدار کرنا ہے۔ اور ریاض نے انہیں کچھ اس طرح سے بیدار کیا ہے کہ حیات انسانی فضائے عالم میں ایک سحر لرزاں کی طرح جلوہ نما ہو کر تسخیر عالم کر رہی ہے۔ اور ایک لحظہ کے لئے عزم نشاط عقل و بیخبری زہد و سیہ کاری سجدہ اور سرکشی کا اتصال ہو جاتا ہے اور آن کی آن میں ہزاروں بجلیاں آنکھوں کے سامنے کوندتی ہوئی نکل جاتی ہیں

× × × × × × × × × × × × × ×

ریاض کو گورکھپور سے اپنے وطن خیرآباد گئے ہوئے بیس برس کے قریب ہو گئے ہیں لیکن پیرانہ سالی میں "داغ کہنہ تازہ کرنے کو" ہر سال وہ اس شہر کی زیارت کر جاتے ہیں جہاں ان کے دل نے غالبًا پہلے پہل چوٹ کھائی تھی۔ راقم الحروف کو آج سے چار سال پہلے حضرت ریاض کی زیارت نصیب ہوئی تھی جب وہ استاد وسیم خیرآبادی

کے ساتھ راقم کے غریب خانہ پر آئے تھے۔ پیرانہ سالی میں بھی وہی سیدھی چال تھی وہی ابھری آنکھیں تھیں وہی نورانی چہرہ تھا جس کا ذکر اکثر لوگوں سے سنا تھا۔ بال سب سفید ہوگئے تھے اور وضع سادہ تھی راقم کے ساتھ نہایت شفقت سے پیش آئے اور راقم کو دیکھ کر کہا "آپ کو یہ دیکھ کر آپ کے والدِ مرحوم حضرت عبرت کی یاد آتی ہے"۔ راقم اس وقت تحریک ترکِ موالات میں شریک ہو چکا تھا۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ اصلی شاعری یہی ہے۔ شعر و سخن سے راقم کا شوق دیکھ کر فرمایا کہ سیدھی سادی سامنے کی باتیں شعر میں ہونا چاہئے۔ مہملات سے بچنا چاہئے۔ ریاض کو اپنے شعر بالکل یاد نہیں رہتے۔ چنانچہ راقم کی خاطر بڑی کاوش سے دو تین اشعار یاد کرکے سنائے۔ اس کے بعد سے اب تک تین چار بار استادی وسیم کے ساتھ حضرت ریاض غریب خانہ پر آچکے ہیں۔

ریاض کی طبیعت تکلف سے بالکل معرا ہے۔ وہ اپنی شاعرانہ عظمت سے بھی واقف نہیں۔ ہاں اس کا حال کچھ وہی جانتے ہیں جن کے دلوں پر ان کے کلام کا گھاؤ لگا ہے۔

ریاض سے ملاقات کی یہ گھڑیاں یاد کرکے راقم الحروف اکثر آب دیدہ ہوگیا ہے آئندہ نسلیں رشک کریں گی ان آنکھوں پر جو بت۔ ہونے کے بیشتر اس پیکر نورانی پر جس کا نام ریاض ہے زیارت کر چکی ہیں۔ ریاض کا نام دُنیائے شاعری میں ہمیشہ قائم رہیگا۔

ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما۔

(از مشرق)

صلائے عام۔ اتفاق سے میں بھی نیازمندانِ حضرتِ ریاض میں داخل ہوں شعر میں حضرت ریاض کو میں خداوندانِ سخن میں سمجھتا ہوں۔ بقول میر

پیدا کہاں ہیں ایسے خداوندِ طبع لوگ ؛ افسوس تم کو میر سے صحبت نہیں رہی

صلائے عام

(نازکخیالی و پاکیزہ بیانی)

فصاحت و خوش بیانی کے لئے دو باتوں کی ضرورت ہے۔ پہلے تو کوئی پاکیزہ خیال ذہن میں پیدا ہو۔ دوسرے پاکیزہ طرز پر بیان کیا جائے: فی البدیہہ اور گاہ باشد کہ کودکِ ناداں ٭ بغلط بر ہدف زند تیرے۔ کا میں قائل نہیں ٭ مجھے یاد نہیں کہ میں ایک مضمون بھی تمام عمر میں اپنی مرضی کے موافق جیسا کہ میرا دل چاہتا ہے لکھ سکا ٭ میر حسن کی نسبت کہتے ہیں کہ یہہ اپنی مثنوی میں ٭ پچیس برس برابر روز دیکھ جاتے تھے کہ کہیں کوئی نقص رہ گیا ہو تو بار بار دیکھنے سے درست ہو جائے ٭ دلّی کے ایک پرانے سادہ کار کی نسبت سُنا ہے کہ دو دن کا کام سال بھر میں بھی تیار کرکے نہ دیتا تھا کہ چلا ہو رہی ہے پر کار باقی ہے یہہ بات رہ گئی ہے وہ رہ گئی ہے اور اخیر تک کہے جاتا تھا کہ فلاں کام رہ گیا ہے ٭ سُنار زیور کو مہینوں کھٹائی میں ڈالے رکھتے ہیں کہ آج دیں گے کل دیں گے ٭ وَالنَّظِیرُ ایک دستاربند کا حال لکھتا ہے کہ جو چیز شملہ۔ چیرہ یا پگڑی اُس کو بنانے لئے دیجائے تو دو چار دفعہ عذر کئے بغیر واپس نہیں کرتا تھا۔ پہلی دفعہ جو آپ لینے جائیں تو کہتا تھا۔ جناب کا شملہ[1] بندھ گیا ہے

---

[1] شملہ کا رواج پہلے شاہی درباروں میں تھا۔ جس طرح انگریزی میں اعلےٰ مرتبہ کے ججوں کے لئے وِگ کا دستور ہے

بتانہ ٹھیک نہیں ہے۔ دوایک دن کے بعد پھر جاتے تو کہتا کہ شملہ تیار ہوگیا ہے مگر ناقص ہے۔ پھر جاتے تو کہتا کہ تیار ہوگیا ہے مگر جیسا چاہئے ویسا ابھی تیار نہیں ہوا ہے۔ کام کتنا ہی چھوٹا ہو اُسے فکر رہتا تھا کہ یہہ کسر رہ گئی وہ کسر رہ گئی ؛

یہی حال ہر کمال کا ہے۔ معرفت الٰہی کی طرح کہ جو حق اُس کے جاننے کا ہے کسی سے نہ جانا۔ ما عرفناک حق معرفتک ذی کمال جو کچھ کرتے ہیں اُنہیں خیال رہتا ہے کہ فلانی بات رہ گئی فلانی کسر رہ گئی ؛ سہ

از کردہ کس خجل نہ شود روزِ بازخواست ؛ گر پرسشِ گناہ ز من ابتدا کنند

معمولی اس باب میں مجھے لکھنے پڑھنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن جن کو ظاہری ضرورت نہ ہو اُن کو اور بھی کسی نہ کسی طرح کی ضرورت پیدا کرنی ضرور چاہئے اور لکھنے پڑھنے سے بہتر کوئی ضرورت نہیں: خاص کر بیکاری میں سہ

اُفتادگاں چو تکیہ بدستِ دعا کنند ؛ صد درد را بہ قطرۂ اشکے دوا کنند

میں اُردو میں لکھنا پڑھنا سب سے اچھے شغلوں میں سمجھتا ہوں۔ خاصکر اِس وجہہ سے کہ اپنی زبان ہے اور اپنی چیز سے غفلت شرافت کے خلاف ہے۔ دوسرے یہہ آپ کی توجہہ کی محتاج ہے کہ آپ کے سوا دوسرا سہارا نہیں: گورنمنٹ کی زبان غیر ہے۔ اور زبانیں کثرت سے ہیں: گورنمنٹ کس کس کی پچ کرے؟ تیسرے ہندوستان کی قدیم و جدید زبانوں میں یہی قابل توجہہ ہے۔ پُرانی زبانوں میں عدمِ استعمال سے پُرانے لوہے کی طرح زنگ آگیا ہے۔ نئی از روئے حیثیت اِس قدر

ظرف نہیں رکھتیں: اُردو میں عمر عیّار کی زنبیل سے زیادہ گنجائش ہے ۔ اور اس کی بنیاد ایسی پاکیزہ زبان پر ہے یعنی فارسی پر جو زندہ ہے ۔ قدیم زبانوں مثل سنسکرت ۔ یونانی لاطینی زبانوں کی طرح مُردہ نہیں ۔ اُردو خود زندہ اور جس زبان پر اس کی بنیاد ہے وہ زندہ پھر اس کا حق تلف کرنا کتنا بڑا ظلم ہے کہ دو پاکیزہ جانوں کا خون ہوتا ہے ؂

ہر لالۂ سیراب کہ سر بر زند از سنگ ۔ بے خونِ دل و دیدۂ فرہاد نباشد

اُردو کی بنیاد شروع سے فارسی پر رکھی گئی کیونکہ پٹھانوں اور مُغلوں کی زبان جن کی سلطنت ہندوستان میں انگریزوں سے پہلے تھی ۔ فارسی تھی: معمولی کام کاج کے الفاظ گو ہندی کے بنے رہے مگر علمی مشاغل خاص کر شعر و سخن کے لئے ہندوؤں اور اور مسلمانوں دونوں کو فارسی کی ضرورت ہوئی ۔ کیونکہ دل و دماغ کی قوتوں اور خوبیوں کے اظہار کے لئے کوئی اور ذریعہ نہ تھا ؂

کوئے یار است ازیں جا بہ تکبّر نگذر ۔ سر بنہ ۔ سجدہ گہِ گبر و مسلماں اینجاست

آپ کچھ کہے جائیں اُردو کے لئے اب بھی فارسی سے بہتر کوئی طریقہ ادائے بیان کا نظر نہیں آتا ؂

سخنِ مدّعیاں راکند از من پنہاں ۔ انچہ از من شنود با ہمہ اظہار کند

جس طرح مکتب کی پُرانی تعلیم میں میاں جی لڑکوں کی تختی پر نقطوں سے حروف کے لکھنے بنا دیتے تھے جس پر ہندی ہاتھ پھیرتے پھیرتے خوشنویسی کے دھرّے پر پڑ جاتے تھے ۔ گو ؂

بر لوحِ دل چو تختۂ تعلیم کودکاں ❖ ہر حرفِ آرزو کہ نوشتم خراب شد

اسی طرح آپ فارسی کی نازکخیالیوں اور پاکیزہ بیانیوں کی مشق پر اپنے طرزِ بیاں کو اگر ڈھالیں تو غیر اور مُردہ زبانوں کے لب ولہجہ سے فارسی کو زیادہ مانوس پائیں گے ❖ تمثیل کے طور پر چند شعر عرض ہیں :۔ مُلّا خیالی بخاری کا شعر ہے ؎

چہ آبرو ازیں بہتر شہیدِ عشق را فردا ❖ کہ از خاکِ سرِ کوئے تو گرد بر کفن دارد

(کوئے یار کی گرد کفن پر مرنے والے کی آبرو کا باعث ہے۔ اس سے زیادہ اور کیا عزت ہو سکتی ہے ؟)

گیسو بُریدہ شد فزوں حیرتِ من گمراہ را ❖ گم کردہ رہ داند بلے قدرِ شبِ کوتاہ را

(یہہ مضمون آج کل کے حسینانِ فرنگ کے سر کے بال کتروانے پر بہت پاکیزہ تشبیہ ہے کہ ولایت کی عورتیں سر کے بال اب زیادہ کتروانے لگی ہیں ❖) ؎

غم زہر جا کہ رسد سر زدہ آید بہ دلم ❖ چہ کُنم خانۂ من بر سرِ رہ افتادہ است

حاجت روانہ گشت ومرا حاصلِ دو کوں ❖ صرفِ چراغِ مسجد و شمعِ مزار شد

(حاصلِ دین و دنیا خرچ کر دینے پر بھی کام نہ نکلا جو کچھ تھا مسجد کے چراغ و شمعِ مزار پر خرچ ہو گیا)

؎ گر در سرِ کوئے تو نالم عجبے نیست ❖ در جائے خطرناک نہ بندند جرس را

(جہاں قافلہ کے لٹ جانے کا ڈر ہوتا ہے وہاں گھڑیال نہیں باندھتے کہ گھڑیال کی آواز پر لوٹنے والے پہونچ جائیں گے)

؎ مریضِ عشق دوائے بغیرِ صبر نداشت ❖ ولے کُشندہ تر از درد بود درمانش

(مرض سے زیادہ علاج نے نقصان کیا)

؂ بلا سجود کند پیشِ درِ حرمانم ؛ اجل پیادہ رود در رکاب ہجرانم

(درِ حرماں کے سامنے بلائیں پانی بھرتی ہیں)

؂ شود گُل بر مزارِ کوہ کن پژمردہ از غیرت ؛ نسیمِ گر بہ گِردِ لالہ زارِ بیستون گردد

؂ لب پُر از آہ و دروں پُر ز خیالِ رخِ دوست ؛ در نفس دوزخ و در سینہ گلستاں دارم

(دوزخ و بہشت سب یہیں دیکھ لیجئے) ؂

بمستی چاک کردی پیرہن در بزمِ میخواراں ؛ درے بکشودی از فردوس بر روئے گنہگاراں

؂ عہد بستم کہ ازیں پس غمِ عالم نہ خورم ؛ توبہ کردم کہ دگر بادہ خورم غم نہ خورم

(غم کھانے سے شراب پینا اچھا ہے) ؂

نیاز بوالہوس را گر محبت نام خواہی کرد ؛ وفا را سست پیماں آرزو را خام خواہی کرد

(ع محبّت دل میں ہوتی ہے زباں پر یہ نہیں ہوتی) ؂

ز الطافِ نہانِ او شدم اکنوں بدیں راضی ؛ کہ گر لطفِ کند با دیگراں از من نہاں دارد

(مرزا قاسم بیگ حالتی) ؂

گفتی کہ کنم فکرِ دلِ حالتی آخر ؛ او جاں ز غمت داد تو فکرِ دگرے کن

فارغ ؂ منادی می کند امروز زنارِ سرِ زلفش ؛ کہ بے ایماں بمیرد ہر کہ ایماں را نگہ دارد

(بے ایمانی و ایمانداری)

؂ گر جاں سپرد ذوقِ حیاتِ ابد گرفت ؛ از ہیچ کُشتہ قاتلِ ما شرمسار نیست

حاجیؔ

؎ بہ عاشق گفتگو او را ازاں نیست ٭ کہ عاشق را زباں او را دہاں نیست

(یار بے دہن ہے اور چاہنے والا بے زبان۔ اب گفتگو ہو تو کس طرح؟)

؎ رفت است ز بیداد تو جورِ فلک از یاد ٭ مرہم شدہ داغِ نو ما داغِ کہن را

(انسان بڑی مُصیبت میں چھوٹی مصیبت بھول جاتا ہے)

مولانا باقی کرانی فرماتے ہیں ؎

عمرے است کہ تیرِ فقر را آماجم ٭ بہ تارکِ افلاس و فلاکت تاجم

یک شمّہ ز حالِ خویش ظاہر سازم

چنداں کہ خدا غنی است من محتاجم

(خدا سے نسبت اچھی نکالی)

؎ از جنوں منّت پذیرم زانکہ یارم عمرہاست ٭ از نظر رفت است و با او گرمِ گفتارم ہنوز

(محمود بیگ سالم)

؎ نفس بستم و لے از رنگ بوئے راز می آید ٭ فغاں زیں پردہ گر زدے نغمہ بے آواز می آید

سالم کی یوسف زلیخا کا شعر ہے ؎

چناں خو کردہ با جانم غمِ او ٭ کہ جاں است ایں ندانم یا غمِ او

(یہ غم غضب ہے)

؎ زخمے بہ نوا تازہ نہ کردیم دریں باغ ٭ افسوس ازیں نغمہ کہ در پردہ کہن شد

(ملا اسیری مشہدی) ؎

گر سینۂ من شعلہ بدوزخ نہ فروشد ٭ تا حشر اگر جوش زند خام برآید

میر حیدر معمائی کاشی ؎

داغم بہ نمک خشک شد و زخم بہ الماس ٭ آگہ کن ازیں تجربہ مرہم طلباں را

گلگشت داغ و نشیمن آہ و سرو شعلۂ آتش ٭ بیا سامان بستان محبت را تماشا کن

بہائے خون من و خوں بہائے صد چو منت ٭ کہ من بہ خوں طپم و قاتلم نظارہ کند

خانخاناں عبدالرحیم خاں ؎

گفتی کہ چنیں والہ و شیدائی کہ کرد ٭ دانی غم تو و گرنہ دانی غم تو

(آپ جانیں یا نہ جانیں)

فارسی کی نازک خیالی کا آپ اس سے اندازہ کرلیں کہ میں اندنوں ایک قلمی تذکرہ فارسی کا دیکھ رہا ہوں جس میں پانچہزار سے زیادہ شاعروں کا ذکر ہے اور ایک ایک شاعر کا دس دس بارہ بارہ ہزار اشعار کا دیوان بیاں کیا جاتا ہے۔ ایسے تذکرے سو پچاس سے کم نہیں: اس پر آپ شعرائے فارسی کی تعداد کا قیاس فرمالیں۔ شعرائے فارسی کی تمثیل اُس حسنِ دلربا کی طرح ہے جس کا بیان کرنا مشکل ہے ؎

آن حسن دلرباست کہ ہنگام دیدنش
بے دست و پا شود دل و بے اختیار چشم

ع ورق تھا ایک جس پہ لکھ کے ساری داستاں رکھدی

(از حضرت آرزو لکھنوی)

پھٹے دامن میں شرحِ حالِ چشمِ خوں فشاں رکھدی ✽ ورق تھا ایک جس پر لکھ کے ساری داستاں رکھدی
مٹا کر اُس کے اک فقرہ نے ساری داستاں رکھدی ✽ کہ تاثیرِ سخن پر تہمتِ حُسنِ بیاں رکھدی
وہ تھے پُرسانِ حالِ سوزِ دل ہمنے زباں رکھدی ✽ کہ جلتی شمع لیکر اپنے اُن کے درمیاں رکھدی
سکونِ دل نہیں جس وقت سے اس بزم میں آئی ✽ ذرا سی چیز گھبراہٹ میں کیا جانے کہاں رکھدی
مبارک اے نگاہِ یاس پہلی فتح کا سہرا ✽ چڑھی تیوری مرے قاتل کی دھر کر کماں رکھدی
کیا پھر تم نے رونا دیکھکر دیدار کا وعدہ ✽ پھر اک بہتے ہوئے پانی میں بنیادِ مکاں رکھدی
درِ دل آرزو دروازہ کعبہ سے بہتر تھا ✽ یہ او غفلت کے مارے تو نے پیشانی کہاں رکھدی

(از علیگڈہ گزٹ)

صلائے عام۔ یہہ آرزو کی نازکخیالی و پاکیزہ بیانی کا نمونہ ہے ✽

دادِ صلائے عام

صلائے عام آیا۔ مضمونِ پریشان دیکھتے ہی ساری پریشانیاں دور ہو گئیں سینے میں دل پھولا نہیں سمایا۔ "انسان کے لئے پیری بُری نہیں۔ مگر پیری میں جوانی کی ہوس بُری ہے" سبحان اللہ۔ سبحان اللہ کیا کہنا ہے ان فقروں کا۔ جو آبِ زر سے لکھنے کے لایق اور موتیوں میں تولنے کے قابل ہیں۔ کیا کوئی دو سطریں بھی اس رنگ میں لکھ سکتا ہے ؏

گو پیر ہیں شباب کا عالم سخن میں ہے ✽ ہر وقت کیفِ تازہ شرابِ کُہن میں ہے

"زندگی خواہ آپ کیسی ہی کیوں نہ گزاریں آخر میں اجیرن ہوئے بغیر نہیں رہتی" بغیر تجربہ ایسی نایاب اور بے مثل باتیں لکھنا ناممکن ہے ؏

آفت کا تو ڑ یار کے تیرِ نظر میں ہے ٭ دل میں اگر سری ہے تو پیکاں جگر میں ہے

تکلیف سے زیادہ آرام میں بسر ہونے والی زندگی زیادہ اجیرن معلوم ہوتی ہے۔ آرام کی زندگی اس لئے زیادہ اجیرن گزرتی ہے کہ ایک سی حالت کیسی ہی کیوں نہ ہو اُلجھن پیدا کرتی ہے۔ اُلجھن کا علاج تغیر ہے اور آرام کا تغیر تکلیف اور آخر میں سب کا نتیجہ موت کے سوا کچھ نہیں"۔ سچ ہے۔ بالکل سچ ہے۔ اب سکوت میں ہوں کہ اور آگے کیا لکھوں ع ناطقہ بند ہے گویائی کا

ہے عجب چیز ترا شاہدِ رعنائے سخن ٭ جس کی بے مثل جوانی کبھی ڈھلتی ہی نہیں

حضرت ظہیر دہلوی مرحوم کا قطعہ دیکھ کر دل خوش ہو گیا۔ ہائے! اب ایسے بزرگ ہندوستان میں کہاں!

کلامِ بے محل کے عنوان سے مرزا عرفان علی بیگ صاحب پنشنر ڈپٹی کلکٹر نے بھی بہت اچھا مضمون لکھا ہے آپ کے اور مرزا صاحب کے اسی قسم کے مضامین انتخاب کر کے ایک کتاب مرتب کیجائے اور اس کا نام **چمنستانِ ہند** رکھا جائے جس طرح فارسی میں گلستاں ہے اُردو میں اس کو ہونا چاہئے۔ جو گلستاں سے کسی طرح کم نہ ہوگی٭

اس مرتبہ ہمارے مولوی محمد بشیر الدین احمد صاحب پنشنر کلکٹر نے **خفتگانِ گور** ہی لکھ کر ٹال دیا حالاں کہ مولوی صاحب نثر بڑے پائے کی لکھتے ہیں جس کو اُنہیں **صلائے عام** میں ہمیشہ لکھتے رہنا چاہئے٭

ناچیز شمشیر بہادر برتر

کلامِ برمحل

حدیثِ دوست نگویم مگر بحضرتِ دوست ٭ کہ آشنا سخن آشنا نگہدارد ۔ حافظ

بات کرنے کو کلام کہتے ہیں اور بات کرنے کے واسطے یہ لازم نہیں ہے کہ لفظ زبان

ـسے ادا ہو اگرچہ نحوی تو جب تک جملہ نہ بنجاوے کلام کو کلام کہنے میں انکار کر جاویں گے۔ ہمارا مقصود نحو کے مباحثات سے مطلق نہیں بلکہ اتنا ہی مقصود ہے کہ ایک شخص کے مطلب کو ایک شخص سمجھ جاوے۔ چنانچہ جب ہم دنیا میں قدم رکھتے ہیں تو بالکل خاموشی کے عالم سے آتے ہیں[1] اور خاموش ہوتے ہیں مگر دُنیا کی ہَوا کھاتے ہی چلا اُٹھتے ہیں اور اس ہمارے چلانے سے سب سے پہلے تو ہماری ماں اپنے تمام درد دُکھ کو بھول جاتی ہے اور مسرت سے بھر جاتی ہے بالیقین ہم آتے کے ساتھ ہی یہ کہہ اُٹھتے ہیں کہ ہم خیریت سے جیتے جاگتے آگئے اور اب تمہاری گود میں والدہ صاحبہ ہم لیٹیں گے اور صرف ماں ہی کو یہ خوشخبری تازہ دم نہیں کر دیتی تمام گھر کے آدمیوں کو مہمانوں کو اور ہمسایوں کو ہماری آواز کی بھنک پورے طور پر مسرت بخش ہو جاتی ہے اور جابجا سے مبارک بادی کے پیام سلام ہماری ماں کو اور اُن کے بعد ہمارے باپ و دیگر رشتہ داروں کو پہونچتے چلے جاتے ہیں حتیّٰ کہ نقارے بج اُٹھتے ہیں اور یہ سارا کرشمہ محض ہماری ایک ہی چیخ کا ہوتا ہے۔ پس یہ ہمارا دُنیا میں پہلا کلام ہے جو قدرت کے ہاتھوں ہر طرح سے برمحل ہے۔ لیکن یہ ہماری چیخ پورا کلام اور والدہ کے واسطے بشارت کا پیام ہے۔

ہم دنیا میں نشو ونما پاکر معاملات و کار و بار کے لحاظ سے ہر قسم کی باتیں کرتے رہتے ہیں لیکن جو بات ہمارے یا ہمارے مخاطب کے یا دونوں کے کار آمد نہیں وہ تو کسی کام ہی کی نہیں ہوتی اُس کی تمثیل تو ایسی ہے جیسے کہ ایک گانے والا اس طرح سے نغمہ سرا ہو جس سے نہ اُس کو فائدہ پہونچے نہ سامع کو لُطف آوے بقول سعدیؒ ع مغزِ ما خورد و حلقِ خود بدرید۔ لیکن جو بات کہ متکلم اور مخاطب میں سے کسی کے لئے یا جو دونوں کے لئے سودمند ہے وہ کلام برمحل بالیقین ہے ÷ خاموشی اعلیٰ درجہ کی صفت ہے بشرطیکہ انسان اپنی زبان قابو میں رکھ سکے لیکن ایسے مواقع بھی پیش آجاتے ہیں جہاں خاموشی بھی اپنے محل سے متجاوز ہو کر گناہ گاری کی حد تک پہونچ جاتی ہے۔ جب موقع زبان کشائی کا ہے تو بالیقین ایسے وقت میں کلام کرنا برمحل ضرور ہے جیسا کہ ایک موقع پر سعدیؒ نے اپنی گلستاں میں بیان فرمایا ہے کہ ؎

[1] وانما ہر کرا اصلی گنگ بود ÷ ناطق آنکس شد کہ از مادر شنود ÷ مولانا روم

اگر بینم کہ نابینا و چاہ است ٭ اگر خاموش بنشینم گناہ است

کہیں خاموشی زیب دیتی ہے اور کہیں تکلم کام دیتا ہے اور جہاں اور جس طرح ان اوصاف کا مقصد پورا ہوتا ہے وہیں اور وہی کلام برمحل ہوتا ہے ورنہ عقل ماری جاتی ہے جیساکہ فرمایا ہے ؎

دو چیز طیرہ عقل است دم فروبستن ٭ بوقت گفتن و گفتن بوقت خاموشی

جو کلام برمحل ہوتا ہے وہی کارآمد ہوتا ہے اس کو اہلِ غرض خوب سمجھتا ہے کہ اُس کی بات کیوں کر کارگر ہوگی پس وہ اس کے کہنے کا محل بھی دیکھ لیتا ہے جب زبان سے نکالتا ہے اور وہ اپنی غرض کے نکال لینے میں تا بہ امکان نہیں چوکتا۔ ایک مثل یہ مشہور ہے کہ ع سلام روستائی بے غرض نیست۔ اسی قسم کی اور کچھ اسی میں ملتی جلتی ایک ہندی مثل بھی ہے کہ بنئیہ کچھ دیکھکر گرتا ہے۔ بہرحال اگر اُسکی ہوئی غرض نکلتی ہے تو ایسا کلام اہلِ غرض کا بھی برمحل ہے۔ اگرچہ اہلِ غرض کی وقعت ضرور گھٹتی ہے اور بے غرض کا کلام کیسا ہی مخلصانہ ہوبے کار ضرور ہوجاتا ہے ٭

شادی وغمی انسان کے ساتھ دونوں رہتی ہیں پس متکلم کو محلِ کلام پر نظر رکھنا واجب ہے۔ شادی کے موقع پر خوش کلامی زیب دیتی ہے اور متکلم اور مخاطب دونوں کو خوش مزاج بنائے رکھتی ہے۔ غمی کی حالت میں وہ کلام پسندیدہ ہوتا ہے جو غم غلط کرنے والا اور تسکینِ دل بخشنے والا ہوتا ہے۔ پس شادی وغمی کے کلام اپنے اپنے محل پر بالیقین برمحل ہوتے ہیں ٭

راقم مرزا عرفان علی بیگ از آگرہ۔ (مرزا عرفان علی بیگ صاحب ای ایس او)

کلامِ فردوسی

(گزشتہ سے پیوستہ)

اس سے پہلے ناظرینِ صلائے عام نے فردوسی کے بزمیہ کلام کی خوبی کو ملاحظہ کیا ہوگا کہ فردوسی نے سہراب کے ایک ایرانی لڑکی پر عاشق ہونے کو اور اُس کے فراق میں سہراب کے سوزو

گداز عاشقانہ کو کس خوبی سے نظم کیا ہے۔ آج اُس سے زیادہ ایک مشکل مضمون کے نظم کرنے کو دکھلایا جاتا ہے
پہلے مذکورہ اشعار کے سلسلہ بیان میں ان اشعار کو ملاحظہ فرمائیے علاوہ پاکیزگی کلام کے مضمون کی عمدگی کو
بھی غور فرمائیے کہ کیا حکیمانہ نصیحت ہے۔ اور مقتضائے حال کو بھی ذرہ پیش نظر رکھئے۔ کہ یہاں ایک عاشق
مزاج شوریدہ سر کو ایسے مؤثر الفاظ میں سمجھانا پیش نظر ہے کہ وہ گرفتار بلا عشق جیسی چیز کو بھول بھال
جائے یہاں فردوسی ہومان کی زبانی سہراب کو نصیحت کرتا ہے کہ جس سے وہ اپنی حالت کو دفعتاً بدل لیتا ہے ۞

ہُماں کار ہومان بود ش خبر ۞ کہ سہراب راہست خوں درجگر ۞ وے از فراست بدل لقش لبت ۞ کہ او را پریشانی داد دست
بدام کسی پائی بند آمدست ۞ ز زلف کسے دلکمند آمدست ۞ نہاں میکند درد و خونی جاست ۞ ہوس میر ود راہ و پاہ گل است
یکے فرصتے جست و گفتش براز ۞ کہ ای شیر دل مرد گردن فراز ۞ بزرگان پیشین بآئین و کیش ۞ گرامی ندیدند کس را چو خویش
ندادند بیہودہ دل از دست ۞ نہ گشتند از بادۂ مہر مست ۞ صد آہوی مشکین بخم کمند ۞ گرفتند و دل را نکردند بند
فریب پری پیکران جواں ۞ نخواند کسی کو بود پہلواں ۞ کسی را بود گردی و سروری ۞ کہ مہر فلک با کند مشتری
تو ای شیر دل مہتر دیو بند ۞ زمہر کہ گشتی چنیں مستمند ۞ نہ رسم جہاں گیری و سروری ست ۞ کہ از مہر لعبت بباید گریست
ترا خواند فرزند افراسیاب ۞ توی سرور امروز بر خشک و آب ۞ ز توران بکاری برون آمدیم ۞ شناور بدریای خوں آمدیم
سر مرز ایراں گرفتیم تنگ ۞ چنیں ورنہ بہ آسانی آمد بجنگ ۞ اگر چند این کار با شد بہ کام ۞ ولے ہست در پیش رنج تمام
بباید شہنشاہ کاؤس طوس ۞ چو رستم کہ با شیر سازد فسوس ۞ سپہ دار گودرز و گیو دلیر ۞ فرامرز و رہام و بہرام شیر
چنیں نرہ شیران پولاد جنگ ۞ کمر بستہ کیں پے نام و ننگ ۞ بیایند یک رہ بہ پیکار ما ۞ کہ داند کہ چوں خود شود کار ما
توی مرد میدان این ہم ورا ۞ چہ کار است بعشق پری پیکراں ۞ بدل سرد کن مہر شوخان شنگ ۞ کہ فرماندہی زمردان جنگ
تو ای نوجواں از دلیری خویش ۞ گرفتی یکے کار دشوار پیش ۞ اگر یک دلی کام حاصل کنی ۞ وگرنہ سراندر سر دل کنی
یقیں داں کہ کاری دارد دوام ۞ بلندی پذیرد ازاں کار نام ۞ تو کاری کہ داری نہ برد و لبہ ۞ چرا دست بازی بکار دگر
بہ نیروی مردی جہاں را بگیر ۞ ز شاہاں بدست آر تاج و سریر ۞ چو کشور بدست تو آید فراز ۞ بہر جائے خوباں برندت نماز
کسے خستۂ مہر دلبر بود ... ۞ کہ او از زر و زور لاغر بود .. ۞ ہر آن کس کہ شد کامراں در جہاں ۞ پرستش کنندش کہاں و مہاں
چو ہوماں بدیساں سخن پیش برد ۞ سراسر بہ سہراب یل بر شمرد ۞ ازاں گفتہ سہراب بیدار شد ۞ دلش بستہ بند پیکار شد
بگفتا او مرز ناموران چنیں ۞ بگفتار خوبت ہزار آفریں ۞ شد این گفت تو دارو ی جان من ۞ کنم با تو نو گشت پیمان من ... جہاں را سراسر ز خشک و ز آب ۞ در آرم بفرمان افراسیاب ۞ بگفت این و عل راز دلبر بکند ۞ بر آمد بر افراز تخت بلند ۞ ۞ مرزا محمد علی

عجیب توارد

مولانا عبدالرحمٰن صاحب راسخ مرحوم دہلوی بڑے پائے کے شاعر تھے اور صرف شاعر ہی نہ تھے بلکہ شاعر گر بھی تھے دہلی اور دیگر مقامات پر اس وقت صد ہا لائق شاگرد مرحوم کے موجود ہیں مثنوی معنوی شریف کی بے مثل شرح لکھی ہے وہ مرحوم کے نام کو ہمیشہ زندہ رکھے گی شاعری میں بھی مرحوم جمیع اصناف سخن پر قادر تھے ۱۹۰۲ء میں مولانا نے قضا کی سید وجاہت حسین صاحب وجاہت جھنجھانوی جو اُس زمانے میں اصلاح سخن کے ایڈیٹر تھے انہوں نے اکتوبر ۱۹۰۲ء نمبرہ جلد ا کے اصلاح سخن میں مرحوم کے حالات اور کلام کا انتخاب مع قطعات تاریخ کے شایع کئے حالات کے بعد "عبرتِ موت" کے عنوان سے پہلے ایک نظم درج ہے اس کے بعد غزلیات کا انتخاب ہے۔ اور شروع ہی میں ایک غزل کے یہ سات شعر درج ہیں جس کی سرخی "نئی غزلیں" ہے۔

رازِ توحید زمانے نے ترا کیا جانا ہُو ہُو ÷ ہُو ہُو کچھ نہ جانا جو تجھے بیکس و تنہا جانا
خشک و تر کو تری چاہت نے سکھایا کیا کیا ÷ ڈوبنا مچھلیوں نے شمع نے جلنا جانا
آبِ کوثر میں اگر دستِ کرم دھونا ہے ÷ ہاتھ کا میل ہے پیسہ اسے دیتا جانا
مفت بکتا نہیں فردوسِ بریں محشر میں ÷ ہاتھ خالی نئے بازار میں کیسا جانا
حوروں کے واسطے مرتا ہوں میں کیا فرمایا ÷ کچھ نہ سمجھا جو مجھے مردہ دل ایسا جانا
ہم بھی ہیں۔ تم بھی ہو۔ محشر بھی ہے۔ اللہ بھی ہے ÷ بڑے سچے ہو تو کل معرکے میں آجانا
بے خودی ترک کروں میں تو سزا لازم ہے ÷ شوق سے ہاتھ سے کھونا جو مجھے پا جانا

یہ شعر اُس وقت مجھے پسند آئے تھے یاد کر لئے وہ تیں اب تک حافظے میں محفوظ ہیں اور رسالہ بھی اچھا تھا مفید اور کارآمد مضامین شایع ہوا کرتے تھے اس لئے سال کے بارہ پرچوں کی جلد بندھوا لیتا تھا۔ جو اب تک میرے پاس محفوظ ہیں مجھے ایک زمانے سے منشی منیر مرحوم شکوہ آبادی کے کلام کے دیکھنے کا بہت شوق تھا اس لئے حال میں ریاست رام پور سے مرحوم کے دو دیوان منگوائے۔ پہلے کا نام منتخب العالم اور دوسرے کا تنویر الاشعار ہے! ہائے کیا کلام ہے کس کس شعر کی داد دوں منتخب العالم کو دیکھ کر تنویر الاشعار کو دیکھ رہا تھا کہ تینوین صفحہ پر ایک غزل سات شعر کی

رسالوفوبیا

ہیڈرو فوبیا (سگ گزیدہ کا پانی سے ڈرنا) کا چھوٹا بھائی رسالوفوبیا ہی یعنی رسالوں کا جنون۔ کچھ دنوں سے رسالوں کی وہ بھرمار ہی کہ الٰہی تیری پناہ۔ ترکِ موالات اور حمایتِ خلافت کا وہ زور نہ تھا۔ جو رسالوں کا ہی۔ یہ پڑھنے کے رسالے نہ ہوتے فوج کے رسالے ہوئے۔ کوئی مہینا، کوئی ہفتہ بلکہ کوئی دن خالی نہیں جو ایک نیا رسالہ نہ ٹپکتا ہو۔ بعض صاحبوں کا خیال ہی کہ یہ شوقِ مطالعہ اور ترقیِ علم کی دلیل ہی۔ میرا خیال (ممکن ہی کہ وہ غلط ہو) اس کے برعکس ہی۔ میں اس حرکت اضطراری اور تنزل کی دلیل سمجھتا ہوں۔ لوگ علمی مذاق کے ابھرنے سے رسالے نہیں نکالتے بلکہ پیٹ بھرنے کا کوئی مشغلہ نہ ملنے سے مجبوراً ادھر رخ کرتے ہیں۔ دنیا میں دو چیزیں ہیں ڈمانڈ اور سپلائی یعنی بقدر ضرورت شی، محتاج کا مہیا کرنا۔ اب ہم کو دیکھنا یہ ہی کہ ضرورت کتنی ہی اور جس چیز کی ضرورت ہی وہ کتنی۔ ضرورتِ واقعی کا یہ حال ہی کہ عموماً رسالوں کی آمدنی اُن کے خرچ کو کسی حال میں کافی نہیں۔ الا ماشاءاللہ۔ وہ رسالہ بڑا خوش نصیب ہی جس کی اشاعت ہزاروں کے لگ بھگ ہی اور اپنے پاؤں پر آپ کھڑا ہی۔ منافعہ دنافعہ خیرسلا۔ گھی کہاں گیا کھچڑی میں اور کھچڑی کہاں گئی بیاری کے کلیجے میں" غرض کوئیں کی مٹی کوئیں ہی کو لگ جاتی ہی۔ اگر گرہ سے کچھ دینا نہ پڑے تو یہی غنیمت ہی۔ مگر ایسے پیٹ بھرے رسالے بھی سارے ہندوستان میں دو چار ہی شاید نکلیں تو نکلیں ورنہ جس کو دیکھو اشاعت محدود۔ خریدار کم، اور جو ہیں اُن میں بیشتر نادہند۔ دور کیوں جائیے دلّی کے دلّی ہی میں صلائے عام ہی کو لیجئے۔ خدا جانے سچ یا جھوٹ مگر لوگ اُس کے مضامین کو پسند کرتے اور تعریف کرتے ہیں مگر ہم کو اُس کا کچا چٹھا معلوم ہی۔ جناب میر صاحب ایک اعتبار سے امیر ہیں کہ معقول پنشن پاتے ہیں۔ محتاط ہیں کفایت شعار ہیں اُن کو ذاتی شوق ہی مذاق ہی دُھن ہی عشق ہی وہ گرہ کا پیسہ خرچ کرتے ہیں رسالہ چلاتے ہیں۔ اگر پنشن نہ ہوتی تو رسالہ کبھی کا بند ہو جاتا

اس سے تو لوگوں کے مذاق اور قدر دانی کا اندازہ ہو سکتا ہی۔ **خان بہادر** صاحب صاف
صاف نہ کہیں مگر دبی زبان سے ہر رسالے میں کسی نہ کسی پیرایہ سے وہ کساد بازاری اور
خسارے کا ذکر ناظرین کے کان میں ڈال ہی دیتے ہیں۔ مگر آج تک کسی کے کان پر
جوں بھی نہ چلی۔ ہموں آتش در کاسہ۔ ہر رسالے کا مدیر میر صاحب کی طرح امیر نہیں۔
نتیجہ یہ ہوتا ہی کہ رسالے رینگ رینگ کر اُمیدوار پودہ بمانند کی طرح چلتے ہیں کلیاں کھلنے
نہیں پاتیں کہ قلت آبیاری سے مُرجھا جاتی ہیں۔ ابھی پوری طرح نشو و نما نہ پایا کہ جھڑ گئیں
ہمارے دیکھتے دیکھتے صدہا رسالے بن موت مر گئے جیسے **ادیب**۔ **العصر**۔ **افادہ**
مخزن۔ **معارف**۔ یادش بخیر اور کون کون اور جو ہیں بیچ مانیے یا مریض ہیں یا جاں بلب
ہیں۔ آج نہیں تو کل مریں گے اور اپنا داغ مفارقت بے طرح دے کر جائیں گے۔
با ایں ہمہ ایسی کساد بازاری میں **حشرات الارض** کی طرح رسالے برابر نکلے چلے
آتے ہیں۔ یہ رسالے نہیں پردار چیونٹیاں ہیں کہ پر نکلے اور مریں۔ میرا خطاب
کسی خاص رسالے کی طرف نہیں ہی بلکہ وہ حالت عرض کر رہا ہوں جو بالعموم ہی اگر اس
عموم سے کوئی مستثنیٰ ہو تو اندھا کیا چاہے دو آنکھیں چشم ما روشن دل ما شاد۔ ابھی حال
میں جو نئے رسالے میری نظر سے گزرے ہیں وہ یہ نکلے ہیں **جام جہاں نما** حضرت
طالب سلطان کی ادارت سے **لائل پور** سے۔ **شادمان** مدیر نور الحسین صاحب صدیقی
جی پور سے۔ **تحفۂ خوشتر**۔ حضرت وسیم خیر آبادی کی نگرانی میں **گورکھ پور** سے۔
نشتر۔ زیر نظر سرپنچ افغان مولانا عیسیٰ خان نشتر احمد آباد سے۔ **شفق**۔ زیر سرپرستی
منشی فاضل پروفیسر مولوی محمد نعیم الرحمٰن ایم۔ اے۔ ایچ۔ بی وغیرہ وغیرہ **مدراس** سے۔
دل وصی حسن صاحب شباب نے آگرے سے نکالا ہی۔ خدا اُس کے شباب کو قائم و
برقرار رکھے اور عمر طبعی کو پہنچائے۔ **سرتاج** حاجی تاج بیگم صاحبہ اور نواب قمر جہاں
صاحبہ نے ملتان سے نکالا ہی خدا کرے کہ یہ اسم با مسمی ہو۔ **سود مند**۔ مولوی طفیل احمد صاحب

نے علی گڑھ سے نکالا ہی دیکھیں اس کی چند ہائے سودمند کن کن کے دلوں میں خریداری کا شوق پیدا کرتی ہی. خدا کرے کہ جیسا اس کا نام ہی ویسا ہی یہ مدیر کی مالی حالت کے بھی سودمند ہو.
اس میں شک نہیں کہ نوعمر رسالوں میں بھی اکثر ہر اعتبار سے قابلِ ملاحظہ اور مستحقِ قدر افزائی ہیں. دل ہمارا بھی للچاتا ہی کہ بمصداق کلُّ جدید لذیذٌ ان رسالوں کو خریدیں مگر دو امر مانع ہیں ایک تو اتنی فرصت نہیں کہ ہم سب کام چھوڑ کر رسالے ہی پڑھتے رہیں اور دوسری سچی بات تو یہ ہی کہ ؎ گر جاں طلبی مضائقہ نیست ٭ گر زر طلبی سخن دریں ست.
گرانی کا یہ حال کہ بلامبالغہ روپیہ چار آنے کا رہ گیا. جس کی تنخواہ سو کی ہی وہ پچیس نہیں تو پچاس کے پیٹے میں آگیا اور خرچ وہی کا وہی. پھر لائیں کہاں سے "لیے زرِ عشق میں ٹیں" لوگ رسالے بھیجتے ہیں اس اُمید پر کہ ہم خریدیں یہاں اپنا یہ حال ہی کہ ع
"چیل کے گھونسلے میں ماس کہاں"
مجبوراً خریداری سے دست بردار ی اور معافی چاہی جاتی ہی. جو ضرور ناگوار ہوتی ہی. اور ہونی بھی چاہیے. پھر وہی بات کہنی پڑتی ہی رسالے بہت خریدار کم. اس پر بھی جو صاحب جدید رسالہ نکالیں وہ مالہٗ و ماعلیہ کو اچھی طرح دیکھ بھال لیں آگے اختیار بدست مختار

گر ضرورت بود روا باشد ٭ بے ضرورت چنیں خطا باشد

معروضہ ملک بشیر
(مولوی بشیرالدین احمد صاحب دہلوی تعلقہ دار)

پُرانی دِلّی کی لُوہے کی لاٹھ

(گزشتہ سے پیوستہ)

جہاں کہ اب نصب ہی اسی کے ساتھ مسٹر ونسنٹ کا یہ امر مفروضہ کہ ستون متھرا سے منتقل کیا گیا ہی مدہم بہم ہو جاتا ہی. کیوں کہ اگر واقعی یہ ستون وہلۂ اوّل میں دہلی یا متھرا میں ایستادہ کیا گیا ہوتا

ناء میں ایسولا رسالۂ گرو سیوک جو دہلی سے بہ سرپرستی جناب خواجہ ... جناب محمد دین صاحب المنسار نظامی نکلتے ہیں نام ہندو دانی نہایت ملنی. میرے دوتوں میٹھے. بشیر

تو ضرور گپتا طرز کی مغربی خطاطی کا طرز اختیار کیا جاتا نہ کہ مشرقی[1]۔ اور جب کہ یہ طرز تحریر مشرقی ہے تو صاف طور پر ظاہر ہے کہ ستون کا ابتدائی مقام بھی لا محالہ مشرقی ہی ہوگا یا یوں سمجھو کہ آہنی ستون کا وطن حقیقی و قدیم مگدھ دیس حال کا ملک بہار یا کوئی اور قرب جوار کا خطہ ہوگا۔ بہار ہی اصل مرکز اور جڑ گپتا خاندان کی تھا اور یہ ایک معقول وجہ معلوم دیتی ہے کہ گپتا خاندان کے راجہ نے "خواہ وہ کوئی بھی رہا ہو" اس نے اپنے باپ کی فتوحات کی یہ یادگار کسی ایسے مقام پر جو کہ دارالسلطنت سے قریب رہا ہو" طیار کرائی ہو۔

بہ ظاہر حال اس بات کی توقع نہیں ہے کہ اس ستون کا ابتدائی مقام کبھی متحقق ہو سکے لیکن آثار قدیمہ کی جو چھان بین ہندوستان میں ہو رہی ہے اس نے بہت سی حیرت انگیز و بیا فتیں کی ہیں (?) اور ایسے میں کامیابی حاصل کی ہے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہم اس معاملے میں بالکل نا امید ہو جائیں۔ یہ بالکل ممکن ہے کہ "وشنو پد" پہاڑی جس کا ذکر کتبے میں ہے اس کا اصلی نام اب تک بھی قایم ہو اور کوئی پرانا وثیقہ یا دستاویز آگے چل کر کبھی نہ کبھی گپتا کے ابتدائی زمانے کا کسی وشنو کے مندر کے کھنڈر میں مل جائے اور اس سے یہ گتھی قطعی طور پر سلجھ جائے۔

"اس آہنی ستون کو کب اور کس نے دہلی میں منتقل کیا؟" یہ ایک دوسرا راز سربستہ ہے۔ مقامی روایات تنور خاندان کے راجہ اننگ پال کو اس ستون کا بنانے والا قرار دیتے ہیں۔ کیا ہم اس سے اس نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں کہ وہ شخص جو اس ستون کو اپنی نو ساختہ دارالسلطنت میں لایا تھا یہی اننگ پال تھا؟ ہم کو سنسکرت کے کتبوں سے کم سے کم اتنا تو معلوم ہوتا ہے کہ دہلی کے ہندو راجاؤں کا آخری خاندان چوہانوں کا تھا اور ان سے پہلے تنور یا تمارا کے خاندان تھے۔ اس روایت کا سراغ تو ابتدائی زمان حکومت مسلمانان سے ملتا ہے کہ دلی کا بانی تنور خاندان تھا۔ و کرمی سمت (۱۳۸۴) مطابق ۱۳۲۸ء کے ایک کتبے

---

[1] یہ بات خیال میں رہے کہ متھرا۔ بلسار۔ تسام۔ اندور اور گوالیار ان تمام مقامات کے کتبے گپتا خطاطی کے مغربی طرز کے ملے ہیں۔ (دیکھو نقشہ جات جو ڈاکٹر ہوائنلی کے مذکورہ بالا آرٹیکل کے ساتھ ہیں) ۱۲

میں جو عجائب خانہ آثارِ قدیمہ دہلی میں موجود ہے، قدیم زمانے کی تاریخ ان الفاظ میں مندرج ہے:-

"یہاں[1] ایک ملک ہے جو ہریانہ کہلاتا ہے۔ جو زمین پر عین مین بہشت (بربیں) کا نمونہ ہے۔ اس میں ایک شہر واقع ہے جو ڈھلّی کہلاتا ہے۔ جس کو تماروں نے بنایا تھا جہاں بعد تماروں سے چاہامانا راجاؤں نے، اپنی رعایا کی حفاظت کے لیے، ایک سلطنت کی بنا ڈالی جس میں امن اماں کے تمام دشمن مار دیئے گئے۔ اس کے بعد وحشی سہابا دینا (شہاب الدین) نے غنیم کی قوموں کے جنگل کو اپنی جواں مردی کی آگ سے جلاکر اس شہر پر جبراً قبضہ کرلیا۔ اس سے آگے (چل کر) یہ شہر ترکشاؤں (ترکوں) کے قبضے میں آج تک ہے فی الحال شاہزادہ محمد اشاہی (محمد شاہ تغلق) اس پر حکمراں ہے" کچھ ذرا پہلے کا ایک اور کتبہ سمت وکرمی ۱۳۳۷ (۱۲۸۰ یا ۱۲۸۱ء) بھی اسی طرح کا دہلی کے عجائب خانے میں محفوظ ہے۔ جس میں یہ واقعہ مختصراً یوں درج ہے:-

"اس[2] ہریانے کے ملک پر پہلے تمار حکمراں تھے پھر چوہان اب سُکا (یعنی مسلمان) شاہزادوں کے زیرِ حکومت ہے۔ اسی سلسلے میں ستونِ آہنی پر کے زمانے مابعد کے کتبوں کا تذکرہ مختصراً کیا جاتا ہے، جس کے متعلق جنرل کننگھم صاحب نے سب سے پہلے بحث کی تھی اور اب حال میں رائے بہادر پنڈت دیا رام ساہنی ملازم محکمۂ آثارِ قدیمہ صیغۂ پیمائش نے بھی اُن کو دوبارہ امتحان کیا ہے۔ مابعد کے گھسیٹ میں صرف دو کتبے ہیں جن میں[3] اننگ پال کا نام سنہ ہے۔ لیکن ان دونوں کتبوں میں سے جو لمبا ہے وہ مقابلتہً زمانۂ حال کا ہے جو سمت (۱۸۸۳) میں کسی مہاراجہ چتر سنگھ چوہان نامی کے حکم سے کھودا گیا، جو اپنے آپ کو ہندوؤں کے نامور سورما پرتھی راج کی نسل میں ہونے کا مدعی تھا۔ یہ کتبہ جیسا کہ پنڈت ساہنی نے کہا ہے اور درست کہا ہے تاریخی اعتبار سے کچھ بھی وقعت

[1] ماخوذ از کیٹالاگ آثارِ قدیمہ عجائب خانے دہلی۔ کلکتہ۔ سنہ ۱۹۰۸ء صفحہ (۳۶) [2] ماخوذ از کیٹالاگ محولۂ بالا صفحہ (۳۶)

[3] ڈاکٹر ووگل یہ بات چھوڑ گئے کہ اب حال کا ایک کتبہ چھ سطری بہ خطِ ناگری سمت ۱۸۸۶ (۱۸۲۹ء) بندیل راجہ چندیری کا ہے اور اس کے نیچے دو فارسی کے کتبے سنہ ۱۰۶۰-۱۰۶۱ھ (۱۶۵۱-۵۲ء) کے ہیں۔ یہ صرف اُن لوگوں کے نام ہیں جو اس ستون کو دیکھنے آئے تھے۔ ۱۲ البشر

نہیں رکھتا اور اس میں جو سال اننگ پال اور پرتھی راج کے درج ہیں یعنی سمت (۴۱۹) اور (۱۱۵۱) علی الترتیب دونوں کے یہ بھی فرضی ہیں۔ دوسرا کتبہ جو ناگری میں ہے وہ تو بالکل زمانۂ حال کا ہے، اسے بھی اُسی مہاراجہ چیتر سنگھ چوہان نے کھدوایا ہے۔ لیکن یہ کتبہ ایک قدیم زمانے کی تحریر کے تسلسل میں بڑھا دیا گیا ہے جس کو پنڈت ساہنی نے یوں پڑھا ہے "سموت دہلی ۱۱۰۹ امگا پالا ودی"۔ یہ کتبہ گو وہ کتنا ہی مختصر ہو لیکن تاریخی لحاظ سے بڑے کام کا ہے کہ اس سے اننگ پال کا سال ملتا ہے اور ہم اس امر کے اختیار کرنے میں حق بجانب ہیں کہ امگا پالا سے مراد اننگا پالا ہے (صرف) ایک حرف سہوِ کتابت سے چھٹ گیا ہے۔ سمت (۱۱۰۹) کا سال ہر حالت میں تنور خاندان کے حکمراں کے لیے موزوں ہے۔ جو، جیساکہ ہم جانتے ہیں چوہانوں سے پہلے گزرا ہے۔ لیکن اس کتبے سے بھی باقی باتوں یعنی آہنی ستون کو ایک مقام سے دوسرے مقام پر منتقل کرنے کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ اس کتبے سے ہم صرف اس قدر صاف طور پر استنباط کر سکتے ہیں کہ سمت (۱۱۰۹) میں یہ ستون اننگ پال کی دارالسلطنت میں کھڑا ہوا تھا اور بس۔ اس بات کا معلوم کرنا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ جنوبی ہندوستان میں کندہ شدہ دستاویز کی ایک دوسری مثال بھی موجود ہے کہ ایک ستون کا سابقِ جنگ کی یادگار میں منتقل کیا گیا تھا۔ ویلوور پلے یم کی سندِ عطا میں جو تانبے کے پتّر پر کندہ ہے، اس میں پلّاوا کے راجہ نرسمہا ورمن کی نسبت لکھا ہوا ہے کہ اُس نے چلوکیا پلکیشن ثانی کے شکست دینے کے بعد اُس (یعنی فاتح) نے (مفتوح سے) فتح کا وہ ستون جو وسطِ (شہر) واٹاپی (حال بادامی) میں کھڑا ہوا تھا، لے لیا[1] (یعنی چھین لیا)۔ میں یقین کرتا ہوں کہ اس قسم کی اور ایک مثال ایک سنگین ستون کی ہے، جس پر کتبہ بھی ہے جو اب بجے گڈھ کے پہاڑی قلعے میں جو بیانے کے پاس بھرت پور (راجپوتانہ) کی ریاست میں ہے، موجود ہے ڈاکٹر جے۔ ایف۔ فلیٹ نے اس کتبے کی تنقیح کے وقت کہا تھا کہ "چبوترا جس پر یہ ستون ایستادہ ہے وہ

---

[1] ہلش ساؤتھ انڈین انسکرپشنز۔ جلد دوم صفحہ ۵۰۸۔ مصرعۂ دوم۔۱۲

اصل ستون کی بہ نسبت بداہتہً زیادہ تر حال کے زمانے کا بنا ہوا معلوم دیتا ہی اور اس سے یہ بات ممکن معلوم ہوتی ہی کہ ستون کا حالیہ مقام ابتدائی مقام نہیں ہی۔ میرے ذہن میں یہ بات خطور کرتی ہی کہ خود کتبے کی صورتِ حال اور زیادہ اس بات کو تقویت دیتی ہی کہ یہ ستون کسی دور دراز مقام سے (یہاں) لایا گیا ہی۔ کیوں کہ ہم کو معلوم ہوتا ہی کہ اُس کی طرزِ تحریر جنوبی ہند کے حرفِ ابجد میں ہی[1]۔ "اپنی لکچر کے دوران میں" میں کہہ آیا ہوں کہ یہ آہنی ستون جیسا کہ کتبے میں صاف طور پر بیان کیا گیا ہی وہلۂ اوّل میں اس کی غرض و غایت یہ تھی کہ وہ بطور وشنو اوتار کے ایک نشان کے رہے۔ یہ ایک اُسی قسم کا "دھواجا استمبھا" ہی جیسا کہ کتبے سمیت ایک ستون ایران میں ہی جو گپتا خندان کے راجہ بُدھا کی سلطنت کے زمانے کا ہی۔ جس کے کتبے میں یہ ستون اسی لقب سے منسوب ہی[2]۔ ہم شاید یہ کہہ سکتے ہیں کہ آہنی ستون پر کسی زمانے میں گرڈا کی شکل بنی ہوئی ہو۔ کیوں کہ یہ پرند وشنو کا باناہی[3]۔ علاوہ دھواجا استمبھا کے یہ ستون فتح کی یادگار (جی ستمبھا) کے لیے بھی کام آتا ہی اور نیز ایسے ستون سے اظہارِ شہرت و ناموری بھی (کیرتی ستمبھا) مقصود ہوتا ہی۔ اس آہنی ستون کے بنانے کی غرض و غایت چندرا کی اُن فتوحات کی یادگار قایم کرنا تھا جو اُس نے ونگوں اور واہلیکوں پر حاصل کی تھیں اور نیز اس ذریعے سے فاتح کو ایک غیر فانی (ابدی اور دوامی) شہرت دینا مرکوزِ خاطر تھا۔ کتوبی اور علمی دونوں ذرائع سے مستنبط ہوتا ہی کہ گپتا خاندان کے ٹھیک عروج کے زمانے میں اس قسم کے ستون بطورِ یادگارِ فتح بنانے کا دستور شاہی طرزِ عمل کی متابعت کی بنا پر تھا۔ (یعنی راجہ خود ہی چاہتا تھا کہ اس قسم کے ستون بنائے جائیں)۔ سمدرا گپتا کے جانشین نے

---

[1] فلیٹ صاحب کی کتاب "گپتا انسکرپشنز" کے صفحہ (۲۵۲) ایف سے لیا گیا [2] ڈاکٹر فلیٹ کی کتاب نمبر ۱۰ صفحہ (۸۹)۔

[3] عبارت اگر کہیں کہیں اُکھڑی اُکھڑی یا غیر مربوط ہو تو ناظرین ترجمے کی مشکلات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے معاف فرمائیں۔ ایک طرف تو یہ خیال ہے۔ کہ ترجمہ اصل عبارت سے الگ نہ ہو دوسری طرف یہ کہ تسلسلِ عبارت بھی ہاتھ سے نہ جائے۔ ۱۲ بشیر

اسوکا کی لاٹھ کو جواب الہ آباد میں کھڑی ہی عملی طور پر جیا ستمبھا پر اپنے ماسبق راجہ کا دگ وجیا (کارنامۂ فتوحات) کندہ کرانے سے، اُس کی نوعیت کو تبدیل کر دیا[1]۔

بھٹری مقام پر جو سکند اگپتا کا ستون ہی وہ صرف اس مقدس مقصد کے لیئے (ایستادہ) کیا گیا تھا کہ اُس پر وشنو کی مورت کے بیٹھانے کی تقریب کا حال لکھا جائے لیکن اسی کے ساتھ وہ یقیناً جیا ستمبھا کی غرض کو بھی پورا کرتا ہی کہ اُس سے راجہ کی اُس فتح کی تشہیر مقصود ہی جو اُس نے پشیا متروں اور ہُنوں[2] پر حاصل کی تھی[3]۔ دو جُڑواں ستون جو مندا سور میں یاسودھرمن نے بنوائے ہیں وہ کھُلی طور پر فتح کی یادگار ہیں۔ یہ بات سچ ہی کہ گو کتبے میں اس امر کا اظہار نہیں کیا گیا لیکن ان کے (بنانے کی) اصلی غرض بلا شک و شُبہ ایک دیر پا یادگار اس شکست کی قایم کرنا تھا جو ہُنوں کے بادشاہ مِہرا کُلا نے یاسودھرمن کے ہاتھوں سے پائی تھی[4]۔ علمی ثبوت کے لیئے مشہور شاعر کالی داس کے کلام کا اقتباس کافی ہی کیوں کہ یہ امر عام طور پر یقین کیا جاتا ہی کہ وہ بعض گُپتا خاندان کے راجاؤں کا درباری شاعر تھا اور شاید خاص کر اسی چندر گُپتا ثانی کا جو وکرما دِتیا کے نام سے مشہور ہی اس لیئے ہم اُن فتوحات کو اس کی طرف منسوب کرنے کو مائل ہیں جن کا ذکر الہ آباد ہی ستون کے کتبے میں ہی۔ رزمیہ مشہور نظم "رگھو ومشا" کے چوتھے باب میں خود اسی شاعر نے رگھو کے ایک دگ وجیا کا ذکر کیا ہی جو رام چندر جی کا مورثِ اعلیٰ تھا۔ اغلب طور پر خیال کیا جاتا ہی کہ جب کالی داس نے یہ مضمون لکھا تھا تو اُس کی پیشِ نظر اپنے آقائے نامدار کی فتوحات تھیں اور رگھو کی لڑائی کے بیان کے دوران میں اُس نے دو جگہ فتح کے ستونوں کا ذکر کیا ہی۔ یہ بات نوٹ کرنے کے قابل ہی کہ پہلا تذکرہ (باب چوتھا[۵]) اُس فتح کے متعلق ہی جو رگھو نے ونگا کے ملک پر حاصل کی تھی۔ (باقی آیندہ) بشیر الدین احمد

[1] فلیٹ صاحب کے گُپتا خاندان کے کتبے صفحہ (۱) الیف الیف۔ [2] شمالی ایشیا کی ایک خانہ بدوش قوم کا نام ہی جنہوں نے پانچویں صدی میں یورپ پر حملہ کیا تھا۔ [3] فلیٹ صاحب کی کتاب محولہ بالا صفحہ (۵۲) الیف الیف۔ [4] فلیٹ صاحب کی کتاب تذکرہ صفحہ (۱۴۲) الیف الیف۔ ۱۲

شذرہ ۵ — سوتر ان شاء اللہ اشاعت آیندہ میں تمام ہو جائے گا ۱۲

صلائے عام کی ڈاک

× × × × × × × × × × × ×

صلائے عام کل ۱۲ مئی کو مجھے مِل گیا۔ اتوار تھا۔ پڑھ کر چھوڑا۔ اس دفعہ تو آپ نے جملہ مضامین کی داد اعلیٰ ترین طریقہ پر دیدی ہے اور کلام فردوسی کی داد دینے کا آپ نے آئندہ بھی اپنا حق قایم رکھا ہے۔ یہ تو دوسروں کے استحقاق پر اچھی خاصی دست بُرد ہے خاں صاحب۔ مرزا محمد علی خاں صاحب رئیس دہلی نے مصنفِ شاہنامہ کا ذکر بہت ہی خوبی کے ساتھ بیان فرمایا ہے جس سے کلام فردوسی کو پوری رونق ہوگئی ہے اور ناظرین کے واسطے عجیب پُرلطف ہے۔ آپ نے مضمون پریشان میں یہ فقرہ غضب کا کانٹے کی تول لکھا ہے اور بالکل حق بجانب ہے کہ "غلطیاں دانائی کی بنیاد ہیں" × × × × ×

جادو وہ جو سر چڑھ کے بولے ٭ کیا لطف جو غیر پردہ کھولے

مئی کا صلائے عام ختم ماہ سے تین دن پہلے پہنچا۔ رسالہ آنے پر جناب مرزا عرفان علی بیگ صاحب کا مضمون "کلامِ بے محل" دیکھا۔ اگر میں پہلے یہ مضمون دیکھ لیتا تو صفحہ (۴۰) پر جو چند سطریں میری درج ہوئی ہیں وہ میں نہ لکھتا۔ مرزا صاحب کی ذیل کی تحریر ہی میرا جواب ہے جو اُن کے قلم سے اور میرے دل سے نکلا ہے اُس کا اقتباس میں ذیل میں درج کرتا ہوں مگر اس کے ساتھ یہ ضرور کہوں گا کہ لِمَ تقولون ما لا تفعلون :۔

"مگر پھر بھی اُن واقف کاروں کا یہ حوصلہ ہوتا ہے کہ متکلّم کو اُس کے بیاں میں زک نہ دیں تو بھی اعتراض کئے بغیر نہ رہیں۔ ایسا اعتراض اخلاق و اخلاص پر دھبہ ضرور لگاتا ہے اور معترض کو حدِّ ادب سے باہر بالیقین کردیتا ہے اور مخاطب لوگ اُس کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے وہ متکلّم کی شُبکی کا باعث ہوتا ہے سے چوں برآید سہ از لوحِ سخن جو گرچہ بہ دانی اعتراض مکن"۔ گرت چشم خدا بینی بہ بخشند ٭ نہ بینی ہیچ کس عاجز تر از خویش۔

عبدہ بشیر

صلائے عام۔ یہ بحث اب ختم کیجاتی ہے۔ تنقید میں اعتراض سے غرض نہیں ہوتی حُسن و قبح بے لگاؤ لکھے جاتے ہیں: اس میں کسی کو بُرا نہیں ماننا چاہیئے ٭

× × × × × میرے حصّے کا پرچہ صلائے عام اس دفعہ اور اگلے ماہ کے آخر میں آپ براہ عنایت یہاں بھیجیں۔ پچھلے مہینے کے پرچہ میں "شعرائے کشمیر" کے عنوان والے مضمون کے کیا کہنے۔ اُسی میں نے دو دفعہ پڑھا پھر بھی دل نہیں بھرا۔ اُس سے اگلا مضمون بھی اچھا ہو۔ میرے حصّے کے پرچے اس لئے اس پتہ سے براہ عنایت بھیجئے کہ لوہارو جانے اور وہاں سے یہاں آنے میں کہیں ڈاک میں ضائع نہ ہوجائیں" × × × × × × × ×

الراقم۔ اعزالدین احمد (نواب صاحب بہادر لوہارو)

صلائے عام۔ اس میں یہہ بات داد کے قابل ہے کہ صلائے عام جو نواب صاحب خرید فرماتے ہیں اُس کو "اپنے حصّہ کا پرچہ" ارشاد فرمایا۔ ورنہ معمولی طرز پر اور کوئی لکھتا تو اپنے پرچہ خریداری کا اظہار کرکے لکھتا

× × × × × "خدا آپ کے دم کو رکھے جینے دہلی کی زبان زندہ ہے۔ یوں تو دہلی میں صدہا نثر نگار ہیں۔ مگر یہ بات کہاں۔ نثر میں نظم کی سی نازکخیالیاں اور لطیف استعارے دکھلانا آپ کے سوا دوسرے کا کام نہیں دو سطریں تو کوئی آپ کے رنگ میں لکھدے تو میں جانوں زیادہ کا تو نام نہ لیجئے" × × × × × × × × × × × ×

(نواب شمشیر بہادر برتر)

جناب مائل صاحب لکھتے ہیں کہ اُن کی غزل میں یہ مصرع غلط چھپ گیا مصرع اسطرح تھا ع وہ تو گئے ہوا ہوئے مشت غبار اب کہاں۔ بجائے مشت کے مثل لکھدیا مطلب بے معنی اور خراب ہوگیا اگر پڑھا نہ جائے تو شعر کے معنی تو دیکھ لیا کریں ٹھیک بیٹھتے ہیں یا نہیں۔ مرزا محمد تقی بیگ از جے پور

غزل۔ جناب مائل دہلوی

آسماں اُس کے آستانہ کا ؛ ایک ٹکڑا ہے شامیانہ کا ؛ اُس کے نزدیک کُنز مانہ کا ؛ طائر جاں ہے اک نشانہ کا
شوق ہو جائیگا اُسے پیدا ؛ رفتہ رفتہ مرے فسانہ کا ؛ جب سے عاشق کُشی کا ڈھب آیا ؛ خون سر پہ ہے اک زمانہ کا
بُر قفس میں وہ شاخ گل پر ہے ؛ یہ بعقدہ ہے آشیانہ کا ؛ نقش ہے دل پہ دردمندوں کے ؛ فقرہ فقرہ مرے فسانہ کا
بحر رحمت نے عجب کیا ہے ؛ قطرہ قطرہ شراب خانہ کا ؛ ایک تیرے لئے لیا ہم نے ؛ سر پہ احسان اک زمانہ کا
قیس دیوانگی کے عالم میں ؛ قصہ خواں تھا ترے فسانہ کا ؛ رہ گیا ہے نشان سا دل میں ؛ مرغ ہمت کے آشیانہ کا
؛ اک نمونہ ہے خاک کا پُتلا ؛ اس کی قدرت کے کارخانہ کا ؛ اپنے مرنے سے خوش نہ ہوں کیونکر ؛ ہے بہانہ ترے لُبھانہ کا ؛
کیوں نہ سمجھوں اشارۂ ساقی ؛ رازداں ہوں شراب خانہ کا ؛ برق گرنے لگی ہے گلشن پر ؛ اب خدا حافظ آشیانہ کا ؛ کیوں نہ دیں خضر عشق مائل کو ؛ رہنما تھا شراب خانہ کا ؛
چلد یا میں عدم کو جب دیکھا ؛ یہ طلسم جہاں جو غور کیا ؛ متصل ہے جناں بھی رضواں بھی ؛ جا لگتا ہے حوض کوثر پر ؛ سن کے ہوتے ہو آبدیدہ کیوں ؛ فتنۂ حشر ہو متا اٹھا ؛ نکلے دیر و حرم سے چلتا ہوں ؛
رنگ بدلا ہوا زمانے کا ؛ ایک ورق ہے مرے فسانہ کا ؛ ذکر سنکر شراب خانہ کا ؛ یہی رستہ شراب خانہ کا ؛ کیا اثر ہے مرے فسانے کا ؛ شور سنکر شراب خانہ کا ؛ شوق ہے کس کے آستانہ کا ؛

صلائے عام

(مختصر و مختلف و متفرق خیالی)

"سرو نازنیں" جناب نواب صاحب بہادر فرمانروائے ریاست لوہارو کے قمری و سرو کے قطعہ میں جو پچھلے پرچہ میں شایع ہوا سرو کو "نازنیں" کے لقب سے مخاطب کرنے پر کنایتاً اعتراض ہوا۔ اس اعتراض کا معقول جواب یہہ ہے کہ قمری کی زبان سے سرو کو نازنیں کہنا زیب دیتا ہے: چاہنے والے کو زیب دیتا ہے کہ اپنے معشوق کو جس طرح چاہے مخاطب کرے ع نازت بکشم کہ نازنینی؛
شاہنامہ میں فردوسی کو دعوے تھا کہ کوئی عربی لفظ نہیں آنے دیا۔ فردوسی کے اس مصرع پر اعتراض ہوا کہ ع فلک گفت احسن ملک گفت زہ: "احسن" عربی ہے؛ فردوسی نے جواب دیا کہ فلک نے "احسن" کہا میں نے نہیں کہا؛

اسی طرح قمری نے اگر سرو کو "نازنیں" کہدیا تو کیا گناہ کیا؟

کلام فردوسی کلام فردوسی کی داد میں جو اس پرچہ میں فردوسی کے اشعار صاحب مضمون نے (صفحہ ۲) پر لکھے ہیں آج کل کے نوجوانوں کو سنانے اور انکو یاد رکھنے چاہئیں کہ عورتوں کے پیچھے زندگی خراب کرنی مردانگی کے خلاف ہے۔ ناظم ہروی کا قول ہے کہ ع عقدِ زن طلاق ننگ و نام است انسان کے لئے اور بڑے بڑے کام اقبال و علم و فضیلت کے کیا تھوڑے ہیں جو عورتوں کے پیچھے جان دیتا پھرے؟

زبان اردو اس پرچہ کے "نازک خیالی و پاکیزہ بیانی" والے مضمون (صفحہ ۱۸) میں اس بات کے ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اچھی اردو کے لئے سب سے زیادہ فارسی کی ضرورت ہے۔ فارسی بغیر اردو فصیح نہیں ہو سکتی: جب تک فارسی میں کامل محاورت نہ ہو پاکیزہ

اُردو لکھنی مشکل ہے ؎

قسم بہ گل کہ کہن بلبلے زباغ توام ؛ برگِ شعلہ کہ پروانۂ چراغ توام

رسالوں کی کثرت | جناب مولوی بشیر الدین احمد صاحب نے رسالوں کی کثرت پر جو مضمون (صفحہ ۲۱) پر لکھا ہے اُس سے غرض یہہ ہے کہ محض تعداد بڑھ جانے سے زبان کی ترقی متصوّر نہیں ہو سکتی۔ تعداد میں رسالے گو کم نکلیں مگر جو نکل رہے ہیں اُن کو زیر باری سے بچانے کی تدبیر زیادہ ضروری ہے ؛

"شمع" | اِس نام کا رسالہ آگرہ سے جاری ہوا ہے جواز روئے اہتمام اور مضامین تعریف کے قابل ہے۔ لیکن رونا اِس بات کا ہے کہ جب پُرانے رسالے و اخبار زیر باری کی وجہہ سے روز بروز بند ہو رہے ہیں نئے نئے رسالے کس کے بھروسے پہ چلیں گے؟ کیوں کہ پڑھنے والوں کی طرف سے آمدنی کی اُمید خیریت ہے ؛ مجھے تجربہ ہو رہا ہے کہ صلائے عام کو پڑھنے والے مانگ کر پڑھتے ہیں اور ایک ایک پرچہ تلاش کرنے پر بھی نہیں ملتا۔ مگر معمولی قیمت بھی دیتے جی چُراتے ہیں ؛

تحقیق و تنقید | مجھے افسوس ہے کہ تحقیق و تنقید کے معاملے میں بعض اصحاب رنجیدہ ہو جاتے ہیں۔ رنج وہی کے خیال سے نہ تو تحقیق و تنقید سے کام لیا جائے نہ تو مقابل ایسے مضامین سے برہمیِ مزاج کو دخل دینے دیں۔ صلائے عام کو تحقیق سے غرض ہے اور تحقیق کے لئے ہر طرح کی تنقید ضرور ہے : لیکن اس کا فیصلہ کہ یہہ بحث کہاں تک مناسب ہے صلائے عام کی رائے پر موقوف ہے ؛ مرزا اشرف جہاں فرماتے ہیں ؎

پس از عمرے کہ احوالِ منِ بیمار می پُرسد ؛ نمی پرسد زمن بیرحم از اغیار می پُرسد

بقیہ

لب فرو بند سخن چیں کہ قبول است مرا
ہرچہ در حقِ من آں غنچہ دہن میگوید

چاند کا حساب | ہندو مسلمانوں کے قمری حساب پر ایک مدت سے اعتراض تھا کہ چاند کے گھٹنے بڑھنے سے چودہ دن کے حساب سے ۲۸ دن کا مہینہ قرار دے رکھا تھا جس سے تیوہاروں اور دینی و دنیوی تقریبوں میں بہت اختلاف پڑ جاتا ہے۔ اب سُنا ہے کہ ولایت میں چاند کے حساب سے ماہ و سال قرار دینے کی تجویز ہو رہی ہے کہ ہندی مہینوں کی طرح لوند کا مہینہ ایجاد میں بڑھا دیا جائے جس کو کبیسہ کہتے ہیں ؛ ولایت والے آخر کو ہمیں کے طرز و طریقے رفتہ رفتہ اختیار کر رہے ہیں کہ ہندی حساب سے تیرہ مہینے کے سال سے سال کا حساب آخر کو ٹھیک بیٹھتا ہے ؛

غایتِ عیش | ولایت میں گو خوبان پرپوش کے بالوں اور آنکھوں کے رنگ کے موافق مکان کے فرش فروش اور کمروں کے سامان کا دستور رائج تھا اب کھانے اور اقسامِ طعام کے مطابق لباس اور لباس کے رنگ کا خیال بھی ہو چلا ہے کہ جیسا کھانا ہو اُس سے لباس کا جوڑ ملنا چاہیے: فواکہ کے جوڑ کے لئے علیحدہ۔ اور کیک بسکٹ اور شوربے و کباب وغیرہ کا علیحدہ ؛ اس سے پہلے صبح کے کھانے۔ حاضری و چاء اور رات کے کھانے کا لباس مدت سے علیحدہ علیحدہ تھا سواری شکاری ہوا خوری مہمانداری و مہمان نوازی کیلئے تو خاص پوشاک ضروری تھی ؛ یہ نفاستیں غایتِ عیش کا ثبوت دے رہی ہیں جو اعلےٰ تہذیب و تمدن کا مقتضےٰ ہے: اس کے لئے دولت و فرصت لازمی سمجھئے کہ طبیعت کی نفاست کے لئے عیش درکار ہے: بقول جناب اسمٰعیل منیر ؎

شفقی ہونٹھ چمپئی رنگت ؛ سُرمئی آنکھیں ڈورے گلناری ؛ لغزشِ برق و جلوۂ طاؤس ؛ چالِ رفتار کبکِ کہساری
مہندیوں سے ہتھیلیاں گلنار ؛ ہاتھوں میں دھانی چوڑیاں پیاری ؛ پہنے ہیں رنگ رنگ کے جوڑے ؛ دستِ نازک میں ہیں پہنچے بھاری
پائنچے ناز سے اُٹھائے ہوئے ؛ عرقِ شرم جسم سے جاری
کچھ رکھائی ہے کچھ لگاوٹ بھی
چتونوں سے عیاں ستمگاری

مہتمم کی طرف سے۔

اِطّلاع

صلائے عام کی قیمت پیشگی چھ روپیہ سالانہ ہے۔ قیمت بذریعہ منی آرڈر عنایت فرمائی جائے: مضمون نگار بھی **صلائے عام** کی قیمت سے بری نہیں۔ نہ یہ ضرور ہے کہ ہر مضمون خواہ مخواہ شایع کیا جائے: جامع اوراق کو مضمون میں کمی بیشی کا اختیار رہے۔ جو مضمون شایع نہ ہو سکیں اُن کے واپس کرنے کا ذمّہ نہیں:

صلائے عام میں ہر طرح کے مضامین نظم و نثر شایع ہوتے ہیں۔ زیادہ تر نثر کہ اس وقت نثر کی زیادہ ضرورت ہے: اور نثر بھی ایسی جس میں زبان کی خوبی و فصاحت کے ساتھ مضمون کی پاکیزگی و نازکخیالی ضرور ہو یعنی بساں عروسِ جمیل ولباسِ حریر۔ شرط ہے کہ مضمون پاکیزہ اور ادائے بیان لاجواب چاہیئے:

اکثر اصحاب نمونہ کا پرچہ مانگتے ہیں۔ اوّل تو ایک پرچہ سے **صلائے عام** کی ساری خوبیوں کا حال معلوم ہونا مشکل ہے: دوسرے **صلائے عام** اتنے عرصہ سے جاری ہے کہ اہلِ علم میں شاذ ہی کوئی ایسا ہوگا جو اس سے واقف نہ ہو: پھر بھی اگر کسی کو نمونہ یا سال سے کم کی خریداری منظور ہو تو ایک روپیہ فی پرچہ کے حساب سے قیمت لی جائے گی +

صلائے عام کا پتہ اس قدر کافی ہے کہ:

دہلی۔ فراشخانہ: مکان میر ناصر علی خاں بہادر

حسب الارشاد میر ناصر علیخاں بہادر مطبع ناصری واقع فراشخانہ دہلی میں باہتمام میر احمد چھپا اور شایع ہوا:

Printed and Published by Mir Nasir Ali Khan Bahadur (Editor) at the Nasri Press, Farrash-Khana, Delhi

در نوح رکھکر بیاضِ جبیں   کبھی دوسرا کوئی سمجھا نہیں

جلد ۱۳

نمبر

صلائے عام

SALÂ-I-ÂM, DELHI.

A high class Monthly Magazine devoted to the cause of Urdu literature, the preservation of the old Indian, especially Mohammadan culture and refinement, and the assimilation of the best features of the new civilization

حسب الارشاد میر ناصر علی صاحب مدیر مطبع احمدی واقعہ فراشخانہ میں چھپا اور شائع ہوا

جلد ۱۳ — نمبر ۷

فہرست مضامین

بابت ماہ جولائی سنہ ۱۹۲۵ء مطابق محرم سنہ ۱۳۴۴ ہجری

نالۂ جاں سوز گوید شعلہ افشاں کن مرا ٭ آہ با من گفت چوں دودِ پریشاں کن مرا

مضمونِ پریشان

لوگ کہتے ہیں کہ علمائے عام نے مضمونِ پریشان کے سلسلہ میں فلسفیانہ خیالات کے ساتھ حُسنِ بیان کا بھی لطف پیدا کر دیا۔ پریشانی دلجمعی کے اسباب میں داخل ہو گئی اور اُلجھن دل کشی کے سامان میں: خوابِ پریشان خوابِ زلیخا کا جواب بن گیا، اور ہجر کے صدمے اُمیدِ وصل سے بدل گئے؎

تماشا می کنم ہر شب جمالِ غیرتِ یوسف ٭ نہ دیدم چوں زلیخا من گہے خوابِ پریشاں را

لیکن مضمونِ پریشان سے مجھے حُسنِ بیان کا خیال نہیں۔ خیالاتِ خاص کا پیش کرنا منظور ہے جو کبھی کبھی انسان کے ذہن میں خود بخود پیدا ہو جاتے ہیں: ہماری زبان کی شاعری میں (جس سے میری مُراد شعرائے فارسی و اردو کا کلام ہے) اس طرح کے مضامین کہیں کہیں دیکھنے میں آجاتے ہیں مگر نثر میں ان کا پتہ نہیں۔ خاص کر ہماری زبان کی نثر اس طرز سے خالی ہے؎

اسی لئے ہوئے کام و لب و زباں پیدا ٭ کہ ذکرِ یار رہو اِن سب سے ہر زماں پیدا

خدا کے لیئے آپ دُنیا کو بُرا نہ سمجھیں۔ دنیا آپ کو بُرا نہ سمجھے گی۔ حضرت جعفر

(جو مرزا نوشہ کے اچھے شاگردوں میں تھے) ساقی نامہ میں خوب فرماتے ہیں ؎

تو اپنے منہہ سے نہ رندوں کو کہہ بُرا ساقی ۔ انہیں کی ذات سے ہوگا ترا بھلا ساقی
ہمیں دے ساغرِ مے ہم سے لے دُعا ساقی ۔ کہ کام آئے گا تیرا لیا دیا ساقی

یہہ ایک جام اور اس میں بھی اس قدر خالی
نہ آئی دیتے ہوئے بھی تجھے حیا ساقی

(ساقیٔ ازل نے ساغرِ حیات پورا بھر کر کسی کو نہ دیا۔ اور آدھا تہائی جو کچھ دیا اُس کے حساب کا جھگڑا لگا دیا) ؎

پڑیں گے لینے کے دینے نہ مانگ قیمتِ مے ۔ جو کوئی مستی میں تجھسے اُلجھ پڑا ساقی

حساب کا تو اتنا ڈر نہیں ۔ مگر حساب کے قاعدہ سے حساب لیا گیا تو جب میاں کا بہت کچھ ہماری طرف نکلا تو ہماری بساط کے موافق ہمارا بھی کچھ نہ کچھ نکلنا چاہیئے ۔ اور خدا نے چاہا تو ماشاءاللہ ہمارا تھوڑا بھی اُن کے لمبے چوڑے حساب سے کم نہ نکلے گا کہ کہاں انسان ضعیف البنیان اور کہاں قدرتِ مطلق العنان۔ ("مطلق العنان" محض قافیہ کے لئے) : اسی خیال سے جوشِ رحمتِ ایزدی کی آڑ لیکر پڑے گی ؎ تیرے دیوانے کہاں شورش مچائیں ۔ عرصۂ ملکِ بقا بھی تنگ ہے

جب ہم خلاقِ دو عالم کے اسرار کے سمجھنے سے قاصر رہے تو لاچار اوہام وقیاسات میں مبتلا ہونا پڑا کہ جو بات ہماری سمجھ سے باہر نکلی اُس کے عوض اپنے دل سے کچھ نہ کچھ گھڑنا ضرور ہوا کہ "لال بجھکڑ" بننے کی آبرو بنی رہے۔ ان ڈھکوسلوں کا نام سحر

جادو ہوا کہ "جادو برحق۔ کرنے والا کافر" پرانی مثل ہے ؎

دشوار یار سے ہے گلہ انجمن میں کیا ؛ کیوں چپ رہوں زبان نہیں ہے دہن میں کیا

سبب یہہ کہ خدا نے ہماری عقل محدود رکھی ہے اور ہم لامحدود کام لینے لگے۔ ساغر سے خم کا کام لینا چاہتے ہیں اور حباب پر دریا کا گمان کرتے ہیں: ساغر کو آپ نے اس کے ظرف سے زیادہ بھر دیا تو جو کچھ ساغر میں ڈالا چھلک پڑا۔ نہ آپ کے کام کا رہا نہ میرے کام آیا ؛ درخت کوہ ہمالیہ سے اکھاڑ کر آپ نے ریگ بیابان میں لگائے۔ پہاڑ سے اکھڑ کر وہاں سے برباد ہوئے اور ریت میں سو کر گئے ؛ آپ گرم آب و ہوا کے پھول سرد موسم میں لگا کر دیکھ لیجئے ؛

جس طرح زمین کا ذکر آسمان کے ساتھ اور رات کا سماں دن میں بے جوڑ باتیں ہیں اسی طرح زندگی کا جھگڑا مرنے پر چھوڑنا عقلمندی میں داخل نہیں کہ ع کار امروز بہ فردا مگذار ؛ انسان زندگی میں آسمان و زمین کے قلابے نہ ملائے کہ دونوں کا ملنا ناممکن نہیں تو آسان بھی نہیں ہے ؎

نماز کا اگر اے پیر میکدہ ہے قصد ؛ ہمارے نام کا جام شراب دیتا جا

یہہ دنیا تمام برائیوں کے ساتھ بھی اچھی ہے۔ یورپ کے لوگ کہتے ہیں کہ سفید طاعون و وبا وغیرہ بلائیں ایشیا سے یورپ میں گئیں۔ کروسیڈ (جنگ صلیبیہ) میں جو لوگ یورپ سے بیت المقدس کے لینے کو آئے یہہ بیماریاں یہاں سے یورپ لے گئے: لیکن قہوہ۔ چاء۔ نیشکر وغیرہ جیسی نعمتیں بھی یورپ کو یہاں سے نصیب ہوئیں

آپ نے خیال کیا ہوگا کہ خدا سے خوف کرنے والے اکثر محتاج و جاہلوں میں زیادہ نظر آتے ہیں۔ اِن کو اُس کا ظہور ہر ذرہ میں نظر آتا ہے۔ برخلاف اِن کے فلسفی (فلاسفر) اکثر دہریئے ہو جاتے ہیں: دہریوں کو زمین سے آسمان تک بلکہ آسمان کے اُدھر بھی اندھیرا ہی اندھیرا دکھائی دیتا ہے: جاہل چاند سورج کو گرہن دیکھ کر ڈر جاتے ہیں اور سائنس والے خاصکر دہریئے قیامت سے بھی نہیں ڈرتے + بڑے بڑے دہریئے یونانیوں اور رومیوں میں پیدا ہوئے جو علم و عقل میں شہرۂ آفاق تھے۔ اور بُت پرست اقبالمند قوموں میں سب سے زیادہ ہوئے: اس کی وجہہ یہہ ہے کہ العلم حجاب الاکبر کے موافق عالم و فلسفی کو اپنے علم کا غرور اور دعوے ہوتا ہے اور مذہب کا مدار خوف پر ہے۔ جاہلوں کو خدا کا خوف زیادہ ہوتا ہے + ہمارے نبی حضرت پیغمبر اسلام صلے اللہ علیہ وسلم اُمّی تھے۔ حضرت موسیٰؑ فرعون سے گفتگو کرنے کیلئے اپنے بھائی حضرت ہارونؑ کو ساتھ لے گئے۔ حضرت عیسےٰؑ کے حواری بے علم تھے + یہہ لوگ اور مذہبوں کے عالموں سے بازی لے گئے ؎

تیشہ نے اے عشق جائے بیستوں + خوب کاٹا کوہِ غم فرہاد کا

لوکر لیشیلس (یونان کے بڑے فلاسفر) کا قول ہے کہ باز کبوتر کو فضائے آسمان میں اپنے چنگل کا شکار کر لیتا ہے۔ آسمان پر ہم خدا کو سمجھتے ہیں کہ ذرّہ ذرّہ کی خبر رکھتا ہے۔ بیچارے کبوتر پر جو ظلم ہوا آسمان سے فرشتے دیکھا کرتے ہیں اور بولتے نہیں + "چراغ کے نیچے اندھیرا"۔ سبب یہہ ہے کہ ؎

بہ یادش گر بنا شد کبک دم ساز ؛ بخارد سینہ اش را چنگلِ باز

ہیں ہزاروں آرزوئیں ایسی دی گئیں جن کا پورا ہونا اکثر تو ناممکن ہے۔ اس پر غضب یہ ہے کہ ان میں سے اکثر آرزوؤں کا خون ہونا عین ثواب ہے ؛ ہماری آرزوؤں کا خون عجیب دردناک سانحہ ہے کہ ہماری حسرتوں کے گلے پر جب چھری پھرتی ہے تو خوفِ خدا ہمارے ہاتھ پاؤں باندھے رکھتا ہے کہ ہم تڑپنے نہ پائیں ؎

عاشقوں کا کوئی پرساں عہدِ خوباں میں نہ تھا ؛ پھول بلبل کے ہوئے ماتم گلستاں میں نہ تھا

ایسی باتوں کا جواب عقل سے مشکل ہے۔ ان کا جواب محض عقائد و ایمان کی خوبیاں دے سکتی ہیں جن پر مذاہب کا مدار ہے ؎

غائبانہ ہی محبت نے جمائے نقشے ؛
میں نے اس بُت کو نہ زاہد نے خدا کو دیکھا

× × × × × × × × × × × × ×

" میں نہیں کہہ سکتا کہ میں آپ کے رسالہ کو کس شوق کے ساتھ پڑھتا ہوں اور خاص کر آپ کے مضامین کو ؛ صلائے عام کی آمد کے انتظار کا حال یا تو میں جان سکتا ہوں یا خود صلائے عام کا پرچہ کہ اس کے آنے کے ساتھ میں کس بے چینی سے جھپٹ کر ڈاکیئے کے ہاتھ سے لیتا ہوں اور کس محویت کے ساتھ اس کے مطالعہ میں مصروف ہو جاتا ہوں" ؛

× × × × × × × × × × × ×

" بس اتنا کہنا کہ میں آپ کے پرچہ کی قدر کرتا ہوں ۔ ہاں۔ بس اتنا ہی میرے کمزور قلم کی نوک زبان سے نکل سکتا ہے ؛ کیونکہ واقعی میں صلائے عام کی تعریف و توصیف کے لئے کافی الفاظ نہیں پاتا "

ناصر علی سرہندی کی مثنوی

شاعری میں سب سے مُشکل غزل کو سمجھتے ہیں کہ غزل کے دو مصرعوں میں سارا مضمون ختم ہو جانا چاہئے۔ یہہ ہر وقت اور ہر حالت میں مشکل ہے کیونکہ ہر وقت طبیعت حاضر نہیں ہوتی۔ اور حاضر ہوتی ہے تو دیر پا نہیں: اس تھوڑی سی حاضری میں جو بات سوجھ جائے سوجھ جائے پھر وہی حالت پیدا ہو اس کا اجارہ نہیں ہو سکتا ؛

قطعہ میں ذرا آسانی ہے کہ دو چار شعروں میں اپنا مطلب ادا کرے ... مل جاتا ہے ؛ قصیدہ میں اس سے زیادہ گنجایش ہے کہ جس قدر شعر ذہن میں آئیں کہے جائے: لیکن قصیدہ میں مضمون مقرر ہیں۔ تشبیب۔ گریز۔ شجاعت کی تعریف۔ شمشیر میں تلوار کی تعریف۔ گھوڑا بادِ صبا سے زیادہ تیز۔ ہاتھی شب دیجور سے سیاہ ... ہوا اور قد میں کوہِ طور سے اونچا (کوہِ طور سے اس لئے تشبیہہ دی کہ جلالِ ا... سے کوہ طور سیاہ ہو گیا تھا)۔ آخر میں دُعائے عمر و دولت و اقبال پر خاتمہ ؛ ان ... کے سوا قصیدہ میں اور مضمون کم دیکھنے میں آئے ؛

لیکن مثنوی میں سب سے زیادہ گنجایش ہے۔ رزم۔ بزم۔ وصل و ہجر ...

عشق کے سارے مرحلے۔ پھر مصائب کے بعد دونوں کا ملنا اور شادی وخانہ آبادی ۔

میری نگاہ میں شاعری میں مثنوی کا سب سے بڑا مرتبہ ہے۔ چوٹی کے اُستادوں نے مثنویوں میں سب سے زیادہ کمال دکھایا ہے: شاہ نامہ۔ سکندر نامہ۔ قران السعدین۔ یوسف زُلیخا۔ لیلےٰ مجنوں۔ وامق وعذرا۔ شیریں وفرہاد وغیرہ بہت گواہ ہیں ۔ ہمارے ہاں کی مثنویاں قدیم زبانوں مثل سنسکرت ویونانی ولاطینی زبانوں کے ڈراما کا جواب ہیں: بلکہ ڈراما میں اسلام کے خلاف بے پردگی کا جھگڑا ہے کہ عورت ومرد یکجا ہو جاتے ہیں اس لئے مثنویاں زیادہ مقبول ہوئیں کہ پردہ کی آبرو رہ گئی ۔ دوسرے ہمارے ہاں کی مثنویوں میں تصوف واخلاق اور پاکیزہ خیالی کا خیال زیادہ رہتا ہے: چنانچہ مثنوی مولانا روم ؒ۔ مولانا جامیؒ کی مخزن الاسرار۔ حضرت فریدالدین عطارؒ کی منطق الطیر اور ایسی ہی اور بہت لاجواب مثنویاں ۔

میری دانست میں فارسی واُردو زبان کی مثنویوں سے زیادہ کسی زبان میں اتنی مثنویاں نہ ہوں گی۔ میرا ارادہ اکثر نامور مثنویوں کی خوبیاں دکھانے کا ہے: آج ناصر علی سرہندی کی مثنوی لیکر بیٹھا ہوں۔ اس کی نازکخیالیوں کی داد جس قدر ایک نشست میں لکھا جائے گا عرض کرتا ہوں ۔

یہہ مثنوی صوفیاء کرام میں بہت مقبول ہوئی۔ یہانتک کہ علماء متشرع نے اس کا حوالہ دینا زہد وتقوے کی تصانیف میں اکثر جگہہ پسند کیا ۔

ناصر علی کے کلام کا طرز شوکت بخاری۔ مرزا جلال اسیر۔ غنیمت۔ مرزا بیدل

دیم ہری لما

وغیرہ سے ملتا ہے: شاعری کا یہ اسکول نازکخیالی میں بڑے مرتبہ کا سمجھا جاتا ہے۔

ناصر علی کا تخلّص علیؔ تھا۔ فرماتے ہیں:۔

علیؔ اے قبلۂ خمخانۂ نوشاں ۔ جنوں سرمایۂ گم کردہ ہوشاں ۔ سروسرکردۂ دیوانہ چیند۔
شکست شیشہ و پیمانہ چند ۔ گریباں ہا بہ بدنامی دریدہ ۔ بیاباں ہا بہ ناکامی بریدہ
خراب کوچہ و رسوائے بازار ۔ ملامت حاصلی بے ننگ و بے عار ۔ چنیں بدمست ولایعقل چرائی
۔ بہ بیباکی سخن گفتن نہ شائی ۔

شکستن شیشۂ از مستی نہ نیکوست ۔ کہ اینجا محتسب ہم غیرت اوست ۔ بہر سو انتظارت میکشد دار
سرت خواہی زبانت را نگہدار ۔ مزن غافل بہ مینائے پری سنگ ۔ انا الحق می گدازد در دل تنگ

علیؔ اے بے تکلف نغمہ پرداز ۔ حریف بلبل نالان شیراز ۔ چہ دانی درد نوشاں در چہ کارند
۔ دو عالم دوش ایشاں یک سوارند ۔ بجز لغزیدن پا کام شاں نیست ۔ چو موج مے رگ آرام شاں نیست

علیؔ اے سلسبیل خود فروشی ۔ بہ زہر آلودہ نوش عیب پوشی ۔ بہ عیب خلق دیدن مذہب کیست
ہنر در خود فزودن مشرب کیست ۔ دلے داریم از عیب ہنر دور ۔ بہ ہیچ از جلوۂ کونین مسرور
بجز نقد فنا دربار ما نیست ۔ من و ما رائج بازار ما نیست ۔ اگر مائیم آخر از کجا ئیم
سبک پرواز رفتن ہا چرا ئیم ۔ ظہور عشق باشد مغز تا پوست ۔ ز ہر جا من تراوش میکند اوست
چہ باشد عشق اصل الاصل ہر چیز ۔ تبسّم ہائے برق نیستی نیز ۔ خرد گر بشنکا ۔ قدرت اوست
جنوں ہم پردہ دار خلوت اوست

فضیلتِ عشقِ حقیقی

اگر ہمید است وگر صبا دعشق ست ٭ اگر داد است وگر بیداد عشق است ٭ ہمہ عشق است و باقی این و آں ہیچ
ہمہ شور است و محفل و میاں ہیچ

دُعا در طلبِ عشقِ حقیقی

الٰہی یک شررِ عشقم برافروز ٭ تجلّی کردہ دیدن بیاموز ٭ تمنا خام ظرفِ ناصبور است
شدا ہم مید ہی ساغر ضرور است ٭ منم آں قطرۂ حسرت در آغوش ٭ محیطِ آرزو با جوش در جوش
کہ از دریائے بیچونی جدا شد ٭ چراغش کُشتۂ موج ہوا شد ٭ نہ از مغزِ صدف شورے برانگیخت
نہ رنگِ بادگی در تاکہار ریخت ٭ برافروزا زکرم مشعل دگر بار ٭ چو گوہر شمعم از مُردن نگہدار
حیات جاوداں تحویلِ من کن ٭ بہ عشقِ بے فنا تبدیلِ من کن ٭ کزیں ویرانہ بیروں رخت بستن
نہ گردد مانعِ برگشتنِ من ٭ تماشا دار دارے رفت پاہا ٭ شکوہ دولتِ بے دستگاہاں
چو صبح از ہستیٔ خود رخت بستن ٭ شدن خورشید و جائے خود نشستن

نمیدانم چہ سحر انگیخت ساقی ٭ کہ مے ماند از شکستِ شیشہ باقی ٭ چہ افسوں صاحب این انجمن خواند
کہ شمع آخر شد و پرتو بجا ماند ٭ بیالے ساقیِ میخانہ اشراق ٭ بحکمت چوں فلاطوں در جہاں طاق
بدہ جامے و رنگِ ہستیم دہ ٭ اماں از شعلۂ بدمستیم دہ ٭ کہ خونم در رگ و پے میزند شور
چراغاں میکند گلبانگ منصور ٭ بیا اے خم نشینِ خامیٔ ظرف ٭ خمار آشفتۂ ناکامیٔ ظرف
ز اشراقِ دروں فیضے نبردہ ٭ بہ شمعے زیں چراغاں برنخوردہ ٭ خرد بیگانہ در جہل کوشی
کدورت نشۂ مستِ لائے نوشی

دل وجاں از فروغ عقل خالی ؛ فلاطونی دگر و رہے کمالی

حمد و توحید کے شعر ہیں:۔

بنام آنکہ دارم در کنارش ؛ ولے خوں گشتہ ام در انتظارش ؛ از و ہر ذرۂ پیمانہ دیدہ
از و ہر شبنمے فانوس خورشید ؛ تہی در سینۂ ہر ذرّہ جالیش ؛ نمیدانم کجا باشد سرایش
نگنجد ہیچ در پیراہنِ رنگ ؛ قبا پوشد ولیکن از دلِ تنگ ؛ چہ حُسن است اینکہ با آن جوہرِ پاک
تجلّی کردہ از ہر ذرۂ خاک ؛ از اں دردے کہ نالد بلبلِ مست ؛ تپے در استخوانِ شاخِ گل ہست
از آں آتش کہ می سوزد دلِ سنگ ؛ پر و بال سمندر ہست گلرنگ ؛ بہ نطقِ اوست عالم جملہ گویا
خروشِ خُم بود از جوشِ صہبا ؛ ز قانون دلم می آید آواز ؛ درونِ پردہ است آن مایۂ ناز
ولے در پردہ مے بیں صورتِ دوست ؛ سخن رانیست افزوں از سخن پوست ؛ اگر ایں پردہ گردد از میاں دُور
شود چوں معنیٔ بے لفظ مستور ؛ ز غیرت عارفاں دل میخراشند ؛ صفا ز آئینۂ خود می تراشند
کہ خود را خود تماشائے کند یار ؛ نہ گنجد در میانِ چشمِ اغیار ؛ بہ مسجد آں یکے بنشستہ خاموش
بدیر آں دیگرے اُفتادہ بے ہوش ؛ غرض کیں ہر دو از یک بادہ مست اند ؛ تجلّیِ ساقی را می پرستند
ہماں آتش کہ زد بر سینۂ طور ؛ تراوش کرد باز از خونِ منصور ؛ تسلّی کردہ ہر یک را بہ رنگے
ز آتش نیست خالی ہیچ سنگے ؛ ہماں وحشی کہ مجنوں را جگر سوخت ؛ بہ لیلیٰ سر بصحرا دادن آموخت
گرفتارانِ دامش صید و صیاد ؛ ہلاکِ غمزہ اش شیریں و فرہاد ؛ زلیخا را اگر تابے است در دِل
بود دریاے یوسف ہم سلاسل ؛ در آں ساعت کہ حُسنش بود روپوش ؛ چراغ ہستیٔ ما بود خاموش
نہ جاں را از جدائی ہا خبر بود ؛ نہ دل را از طپیدن ہا اثر بود ؛ نہ دریا بود نے گوہر نہ کاں بود

علامہ اقبال

طلسمِ غیب را گنج نہاں بود ٭ صدائے خواست زاں گنجِ نہفتہ ٭ کہ جست از خوابِ عشق نیم خفتہ
ہماں یک نغمہ جست از پردۂ راز ٭ بہر گوشے بہ رنگِ ریخت آواز ٭ شرابے کردہ ذوقِ وجد در جام
کہ در ہم ریختند ارواح و اجسام ٭ تحیّر کرد تعلیم جمادات ٭ کہ تا برقص آوردہ اعضائے نباتات
گرہ زد بر لبِ حیواں کہ خاموش ٭ درونِ پردہ با صد راز میجوش ٭ بیادش گر نباشد کیک دمساز
بخاردسینہ اش را چنگلِ باز ٭
بہ گُل گفت از شگافِ دل خبر گیر ٭ بہ بلبل گفت راہِ نالہ بر گیر ٭ دلِ ہر ذرہ را افروخت داغے
کہ از مہر و ز نشش میکُن سُراغے ٭ دریں ویرانہ گنجِ بے نشان است ٭ مئے صافی بہ ظرفِ گل نہان است
الٰہی بر دلِ زارم گزر کن ٭ نفس را حیرت آبادِ نظر کن
کہ برقِ بیخودی اُفتد بجانم ٭ سخن چوں شمع سوزد بر زبانم ٭ شوند نذرِ کنارِ دل سرِ ہوش
چکیدن ہا کند اشکم فراموش ٭ تو معبود و صنم محرابِ من حیف ٭ تو موجود و فنا اسبابِ من حیف
توئی چوں شمع دل ظلمت نشین چند ٭ توئی چوں قبلہ بُت در آستیں چند
دریں محفل کہ پندار است ساقی ٭ نفس تا ہست زنّار است باقی ٭ توانم گر ز خود دامن کشیدن
من و در کوچۂ عشقت دویدن ٭ کفِ خاکے بہ صد عیش خریدی ٭ دگر بہ صورتِ خویش آفریدی
کرم ہر چند نافرماں گزار است ٭ کرم را ہم کرم دنبالہ دار است ٭ بنالم امشب از بیمارئ دل
چہ خواہی داد مُزدِ زارئ دل
ندارم طاعتے جز شورشِ دل ٭ نمازِ عشق باشد وجدِ بسمل ٭ بدہ تیغ گر ز ہستی ہست مستم
سمندر مشربم آتش پرستم ٭ درِ جنت کشادن بارِ عام است ٭ بہ مرگِ ایں چنیں مُردن حرام است

مرا از جنس مردان ساز ممتاز ؛ نقابے گر بیفتد زنده کن باز ؛ در جنت گشادن ہم چہ دور است
کرم در عشق عصیاں نا صبور است ؛ زند چوں بر کمر لطف تو داماں ؛ شود باران رحمت گرد عصیاں
ولے عشق و کدورت آشنا نیست ؛ تمنا تا بود در دل صفا نیست ؛ توئی مقصود من زیں گفتگوہا

توئی مقصود من زیں آرزوہا

یہ شعر تصوف کے رنگ کے جا بجا سے نمونہ کے طور پر عرض کئے گئے - ساری مثنوی اس رنگ سے بھری پڑی ہے : مگر مجھے زیادہ تر شاعرانہ نازک خیالی سے غرض ہے ؛ کم سنی کے حسن کی تعریف میں ہے کہ :-

ہنوز آں شوخ طفل نے سوار است ؛ ہنوزاں برق بے پروا شرار است ؛ ہنوزاں غنچہ خندیدن ندا ند
نگہ دزدیدن و دیدن نداند ؛ نگاہش لذت گشتن نبرداست ؛ خدنگش خون دلہا را نخورد است

ازیں رعنا تدرواں داد بیداد ؛ کہ می شویند بال از خون صیاد

کسی مصور کی تعریف میں فرماتے ہیں ؎

بنوک خامہ جاں در تن دمیدی ؛ نفس در قالب صورت کشیدے ؛ رگ جاہا بموئے خامہ اش بند
بہ تصویرش نزاکت خوردہ سوگند ؛ برنگے شاخ گل را نقش بستے ؛ کہ از لرزیدن کاغذ شکستے
کشیدے چوں شبیہہ نیم بسمل ؛ نمی آسود از بے تابیٔ دل ؛ اگر تمثال ابرے نقش می بست
ترشح می نمود و برق می جست ؛ غزالے را اگر تصویر کردے ؛ ز بیم رم بہ پا زنجیر کردے

بنوعے می کشیدی چشمۂ آب ؛ کہ مستسقی از وی گشت سیراب

شعرائے فارسی کے کمالوں میں ایک طرز قسمیہ کا ہے - ظہوری نے ساقی نامہ میں -

عرفی نے شیریں و فرہاد کی مثنوی میں غالباً سب سے اچھی مثنوی لکھی۔ عہد دوران کے اور نامور شاعروں نے اس طرز میں بہت زور دکھایا ہے۔ ناصر علی اس رنگ میں لکھتے ہیں:۔

کمر پیچیدہ ام در خدمت او ÷ قسم ہا خوردہ ام در حضرت او

بذاتِ واجب و یکتائیے او ÷ بہ افزوں از جہاں تنہائیے او ÷ بہ بسم اللہ قرانِ محبت ÷ بہ کو
نہ آں شمشیر عریانِ محبت ÷ بہ الحمد و داعِ خویش گفتن ÷ بہ اخلاص رخ از عالم نہفتن
بہ حسنِ یار و جوشِ لالہ زارش ÷ بہ اندک جابہ حسنِ شمارش ÷ بہ آں کم اختلاطی ہائے طرزش
بہ الفتہائے با جاں تنگ ورزش ÷ بہ آں رہائے الفت اختراعش ÷ بہ گلبازئے آغوش و داعش
بہ چشمِ نیم بیمارے کہ دارد ÷ بخوابِ فتنہ بیدارے کہ دارد ÷ بہ آں دنبالۂ چشمِ سیاہش
کمندِ فتنہ بر دوشِ نگاہش ÷ بہ مژگانے کہ از الماس جستہ ÷ بخونم سینے برشکستہ
بہ گیسوئے کہ پاکاں را بود دام ÷ بہ زنارے کہ بندد شیخِ اسلام ÷ بروئے از لطافت آفریدہ
عرق یک پیرہن رنگش گزیدہ ÷ بہ خونِ وحشی از دامانِ قاتل ÷ بہ پئے گم کردہ صیدِ زخمئے دل
بہ آہے در شکنجِ دل نشستہ ÷ بہ اشکے خنجرِ مژگان بستہ ÷ نہ ناسور رہ بیروں نہ دیدہ
و دل چنداں کہ نیخواہی چکیدہ ÷ بہ مکتوبے کہ دل نامش نہادند ÷ دریدن بود گرمہرش کشادند
بہ آرامے کہ ایں عالم ندارد ÷ بہ آشوبے کہ محشر ہم نہ دارد ÷ بہ آں رسوائیے عصمت فروشی
بہ عریانیِ ماہ از جامہ پوشی ÷ بہ صہبائے کہ صوفی در نہاں زد ÷ دماغش جوشِ گل بر آسمان زد
بمینائے شرابِ من کہ صد بار ÷ شکستن کرد گل در عین بازار ÷ بہ ماہے نو کہ پیراہن نہ دارد
گریباں گر بود دامن نہ دارد ÷ بہ جودِ از سخن گوہر طرازاں ÷ بہ نخلِ کیمیا از خاک سازاں

بہ ہمت ما یہ گان کبریا تاج ٭ بہ درویشانِ حاجت مند محتاج ٭ بہ ایں سوگند ہائے پاک سوگند

بہ کہ نشناسم کسے را جز خداوند ٭

نشانم بر در راہ حاجتِ خویش ٭ مدد جویم از و در طاقتِ خویش

میں سمجھا تھا کہ میں ایک دفعہ ایک ہی مضمون میں اس مثنوی کی داد ختم کر سکوں گا یہ خیال غلط نکلا: میں جس قدر اس کو دیکھتا ہوں دل نہیں چاہتا کہ کیا چھوڑوں کیا لکھوں؟ اس کا علاج یہی ہے کہ "باقی آئندہ" یا آپ خود یہ مثنوی منگا کر یا مانگ کر دیکھ جائیں ٭ مانگنے کی صلاح بہ لاچاری دیتا ہوں ورنہ یہ مثنوی ہمیشہ پاس رکھنے کی چیز ہے ٭

غزل ۔ جناب مائل دہلوی

زلیخا خاک اُڑاتی ایسی بے توقیر پھرتی ہے ٭ کہ جیسے آسماں پر آہ بے تاثیر پھرتی ہے

اُدھر ہو کر وہ جاتے ہیں جدھر تاثیر پھرتی ہے ٭ دُعائیں سچ تو کہتی ہیں کہ اب تقدیر پھرتی ہے

سحر سے شام تک در در مری تقدیر پھرتی ہے ٭ خدا جانے کہ کیا کرتی ہوئی تدبیر پھرتی ہے

نہ سمجھو خاک اُڑاتی کیسی بے توقیر پھرتی ہے ٭ زلیخا خواب کی بیتی ہوئی تعبیر پھرتی ہے

بتوں کی جستجو ہے یا خدا کی کہہ نہیں سکتا ٭ حرم کے گوشہ گوشہ میں مری تقدیر پھرتی ہے

خدا سے خیر مانگیں آپ اپنے سینہ و دل کی ٭ دُعائے دردمنداں بنکے شکلِ تیر پھرتی ہے

خدا جانے ہوا کیا ابروے قاتل کی غیرت کو ÷ سوئے قبلہ مری گردن تہِ شمشیر پھرتی ہے

بہار آنے کا مژدہ ہے بسیگا اُس کا دیوانہ ÷ تری تقدیر اب اے خانۂ زنجیر پھرتی ہے

چلے جادو بیانی حضرتِ ناصح کی کیا مجھ پر ÷ کہ میرے دل میں اُس کی شوخیٔ تقریر پھرتی ہے

بیابانِ جنوں میں کوئی دیوانہ نظر آئے ÷ اسی چکر میں برسوں سے مری زنجیر پھرتی ہے

بس اب ڈوبا ہوا سمجھو سفینہ ناامیدی کا ÷ کہ میرے بحرِ غم میں تیری تاثیر پھرتی ہے

مجھے کیوں کر یقیں آئے تمہارے عہد و پیماں کا ÷ صلاحیں غیر سے ہو کر مری تحریر پھرتی ہے

اُٹھاؤں وقتِ آخر کس لئے احسان توبہ کا ÷ تری رحمت کے کوچہ میں مری تقصیر پھرتی ہے

خیالِ ابرو کیوں جائے کوچہ میں محبت کے ÷ وہاں تو ٹھوکریں کھاتی ہوئی تو تیر پھرتی ہے

ہزاروں سجدے کرنے سے نہیں پھرتی نہیں پھرتی ÷ جو پھرتی ہے تو پھر باتوں ہی میں تقدیر پھرتی ہے

حرم میں شان و شوکت سے بڑا پھرتا ہے کیا واعظ ÷ تری توبہ تو میخانہ میں بے توقیر پھرتی ہے

بنا ہوں ناتوانی سے جو کاغذ سا تو کہتے ہیں ÷ پڑی بے جان کیونکر کس طرح تصویر پھرتی ہے

بہت برسوں سے پہلو میں دلِ بیتاب رکھتا ہوں ÷ بہت مدت سے میری آہ بے تاثیر پھرتی ہے

خدا جانے پھر گئی کب یہی ارشاد ہوتا ہے ÷ تری تقدیر پھرتی ہے تری تقدیر پھرتی ہے

جو دیکھ آتا ہے مجنوں کو کہا کرتا ہے وہ مجھ سے ÷ کہ دشتِ نجد میں لیلیٰ آپ کی تصویر پھرتی ہے

نگاہِ کفر تو حسن و جمالِ کعبہ کیا دیکھے ÷ کہ آنکھوں میں ترے بتخانہ کی تعمیر پھرتی ہے

خبر لایا ہے یہ مائلؔ سواری پاس آ پہونچی

تری تقدیر اب اے آسمانِ پیر پھرتی ہے

دلّی کے ۱۸۵۷ء کے مفسدہ کا حال

یہہ مفسدہ غدر کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے متعلق خواجہ حسن نظامی صاحب نے چند رسالے[1] مختلف وضع کے شایع کئے ہیں: ان میں بعض ان کی انشا پردازی کے نمونے ہیں ۔ خواجہ صاحب کی طرز تحریر خاص سمجھی جاتی ہے جس میں صاحب تصنیف کو بہت شہرت حاصل ہے ۔

ان رسالوں میں بہادر شاہ بادشاہ کے مقدمہ کا حال پڑھنے کے قابل ہے۔ اس مقدمہ کا حال اُردو میں اب تک شایع نہیں ہوا تھا: گو انگریزی میں ایک دفعہ چھپ چکا ہے ۔ پہلے میں مترجم صاحب کی محنت کی داد دینی چاہتا ہوں کہ انگریزی سے اُردو میں ترجمہ مشکل تھا مگر ترجمہ عمدہ ہوا ۔

غدر کے حالات انگریزی میں اکثر صاحبان انگریز نے لکھے اور ہر نقطۂ تحقیق سے مختلف رائیں پیش کیں ۔ بعض نے تازہ رنج و غصہ سے ذرا جلدی میں رائے قایم کی۔ بلکہ وکیل صاحب بہادر سرکاری کی تقریر بمقدمہ کی پیروی میں بیان ہوئی غصہ کے شائبہ سے خالی نہیں ۔ مگر کیا کیا جائے؟ جب باغیوں کی طرف سے معصوم بچوں اور بے گناہ عورتوں پر اس طرح کے شدید ظلم کئے جائیں کہ نہایت بے دردی میں جان سے مارے جائیں تو کس سے دیکھا جا سکتا ہے؟ اس کا افسوس جس قدر کیا جائے تھوڑا ہے ۔

[1] یہہ رسالے سات آٹھ حصوں میں ہیں ۔ یہ چوتھا حصہ ہے۔

لیکن یہہ بات تحقیق طلب رہ گئی کہ غدر کا الزام مسلمانوں پر زیادہ لگایا گیا۔ یہہ دیکھکر سر سید احمد خاں بہادر نے مسلمانوں کے سر سے اس الزام کے مٹانے میں بہت کوشش کی۔ اور اس کوشش میں کامیابی بھی ہوئی ۔ ان کی تصنیف "Loyal Muhamnidans" (وفادار مسلمان) بہت مقبول ہوئی اور اُس پر عمل درآمد بھی ہوا ۔

لیکن ابتک کوئی مستند تاریخ غدر کی اُردو میں جس میں مفصل حالات ازروئے تحقیق بے لگاؤ لکھے گئے ہوں دیکھنے میں نہیں آئی۔ مجھسے ایک معزز انگریز نے کہا کہ ہندوستانی نقطۂ نظر سے غدر کا حال اگر لکھا جائے تو ولایت میں ضرور پسند ہو۔ جتنی کتابیں اور رسالے اُردو میں غدر کے متعلق نکلے اکثر انگریزی تصانیف کی ترجمے ہیں ۔ اس وقت مجھے اس سے بحث نہیں : میری غرض یہہ ہے کہ بعض کا جو خیال مسلمانوں کی طرف ہے کہ فساد کے باعث مسلمان تھے اس کی ازروئے تحقیق و تاریخ صفائی ہوجانی چاہیئے۔ یہہ خیال پالیٹکس سے بالکل بے تعلق سمجھنا چاہیئے بلکہ محض مورخانہ اور منصفانہ نظر سے دیکھا جائے کہ آئندہ مسلمانوں کی نسلوں پر کسی کے تعصب کا اثر نہ ہو ۔

مسلمانوں کا ازروئے معاشرت اور طرز زندگی صاحبان انگریز سے بہت کچھ لگاؤ ہے۔ ان کی طرف غدر کا الزام تعجب کا مقام ہے ۔ وہ انگریزی کتابیں جن میں اس بات کا الزام ہے دھوکہ میں ڈالتی ہیں۔ اب گو غدر کو ایک پُشت سے زیادہ گزر گئی لیکن چند بزرگ اس وقت ابھی زندہ ہیں۔ یہہ اس تحقیق میں مدد دے سکتے ہیں ۔

جون ۱۹۲۵ء کے صلائے عام کی رسید

× × × × × × × × × × × ×

جون کا صلائے عام × × × × × × × مجھے حفاظت سے پہونچ گیا۔ صلائے عام اسی طرح آنجناب بھجواتے رہیں مجھے یہاں نہایت حفاظت سے پہونچتا رہے گا

× × × × × × × × × × × ×

بابو رگھوپت سہائے صاحب بی۔ اے۔ ایل ایل بی۔ نے یہہ بات لسان الملک حضرت ریاضؔ کی شاعری کے تبصرہ میں بہت اچھی لکھی کہ۔

"وہ ایسا گنہگار ہے جس کی معصیت پر مغفرت کو پیار آتا ہے"

انتخاب بھی بہت اچھا درج کیا ہے۔ مگر ہم ایسے ریاضؔ کے کلام کے شیدائی اور تشنہ دہانوں کو اتنے انتخاب میں سیرابی نہیں ہوتی۔ خدا کرے دیوان جلد شایع ہو × × ×

آپ نے نازکخیالی اور پاکیزہ بیانی کے عنوان سے فارسی کی نازکخیالیاں خوب دکھائیں۔ یہہ آپ نے بہت صحیح فرمایا کہ اچھی اردو کے لکھنے کے واسطے فارسی جاننا ضروری ہے۔ اچھی اردو تو اچھی اردو ہے۔ معمولی اردو بھی بغیر فارسی جانے کوئی نہیں لکھ سکتا اور اب تو صحیح اور پاکیزہ اردو ہندوستان سے روز بروز نابود ہوتی جاتی ہے۔ جن کی زبان ہے ان کو خود اس سے اُنس نہیں رہا دوسروں کو کیا کہیے۔ ایک مختصر سی داستان عرض کرتا ہوں۔ سننے کے قابل ہے۔ جس زمانہ میں اعلےٰ حضرت

ملک معظم حضور الاجارج پنجم کا دہلی میں دربار ہونے والا تھا میں دھوم دھام دیکھنے کو دہلی جا رہا تھا۔ جب باندہ پہونچا وہاں کے احباب سے ملنے کے لئے ایک روز کو ٹھہر گیا۔ اُس وقت باندہ میں لکھنؤ سے ایک رئیس ڈپٹی کلکٹر ہو کر آئے تھے جن کے بزرگوں کی بات لکھنؤ میں سند مانی جاتی تھی۔ وہ ایک مجرم کو ڈانٹنے لگے تو بولے کہ "تم کیا کرنا سکتا ہے"؟ مجھے یہ فقرہ سنکر بہت ہنسی آئی۔ جب دو تین گھنٹے کے بعد اُن کا غصہ فرو ہوا تو میں نے پوچھا۔ کیوں جناب! تم کیا کرنا سکتا ہے؟ آپ کے بزرگوں کی یہی مستند و صحیح زبان ہے"؟ جھینپ کر بولے کہ اگر اس طرح نہ بولیں تو ان لوگوں پر رعب نہیں قایم ہو سکتا۔ میں نے کہا کہ حضرت۔ اگر انسان کی شکل و شمائل سے رعب داب قائم نہ ہوا تو "کرنے سکنے" سے کیا رعب قایم ہو سکتا ہے؟ شرمندہ ہو کر سر نیچا کر لیا"۔

" اب فرمائیے اُردو جن کی زبان ہے جب اُن کی یہ حالت ہے تو آیندہ کے لئے اُردو کی ترقی کی کیا اُمید ہو سکتی ہے؟ جو کچھ بچی کھچی رہ گئی ہے اس کو بھی چند دن کے بعد ندارد سمجھئے۔ خدا اُردو کی حالت پر رحم فرمائے۔ البتہ۔ خدا آپ کے دم کو رکھے جن سے اُردو کی عزّت و رونق ہے"۔ × × × × × ×

× × × "اس پرچہ میں جناب مائل دہلوی کی غزل کے بعض بعض شعر بہت اچھے ہیں"۔

صدائے عام۔ یہ خط گورنج کا ہے لیکن اس میں دو ایک لکار آمد باتیں

ہیں لسان الملک

ہیں۔ لسان الملک حضرت ریاضؔ کے دیوان کا اشتیاق تمام سخن فہم و سخن سنج اصحاب
کو مجبور رہا ہے + دوسرے اُردو کے لئے فارسی میں لیاقت کی ضرورت ہے۔ ہندوستان
جیسے نامور ملک کے لئے ایک پاکیزہ زبان درکار ہے۔ یہاں کی زبانوں میں اس وقت
اردو سے بہتر کوئی زبان نہیں : لیکن اُردو کو اس ملک کے لایق بنانے کے لئے آپ
کو اس کی بنیاد کسی نہ کسی مستند زبان پر رکھنی پڑے گی اور فارسی سے بہتر اس
کے لئے اور کوئی زبان نہیں کہ عرصہ سے اس کا تعلق بہت گہرا ہے ÷ معمولی بول
چال کے لئے تو ہندی الفاظ سے شاید کام چل جائے لیکن اعلےٰ مضامین اور اعلےٰ
سوسائیٹی کی ضرورتیں بازاری باتوں سے نکلنی مشکل ہیں۔ خاصکر اس زمانہ میں
جب کہ آپ کو قومی اور مُلکی مسائل میں ترقی کی فکر ہے اور قومی ترقی بغیر اعلےٰ درجہ
کی لٹریچر کے ع ایں خیال است و محال است و جنوں ÷

اربابِ لسان

قدرت کا گراں بہا عطیہ یعنی زبان مسلمہ طور پر حیوان اور انسان میں ذریعۂ امتیاز ہے۔ اگر زبان نہ ہو تو ناممکن ہے کہ ہم کسی انسان کے مافی الضمیر سے کما حقہ مطلع ہو سکیں۔ مگر اس کے بھی درجے ہیں۔ آپ روزانہ مشاہدہ کرتے ہیں کہ ہر چیز ایک زبان رکھتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اُسکو وہ زبان نہیں ملی جو آپ کے لیے ذریعۂ اظہار ہے۔ لیکن ہے ضرور۔ اس کو آپ "زبان حال" کہا کرتے ہیں۔ کہ قال کی محتاج ہو کر اس سے ایک حد تک بے نیاز ہوتی ہے۔

اب آپ درجۂ "زبان حال" سے ترقی کرتے ہوئے انسان فصاحت و بلاغت کے معجزات دکھانے والوں کی زبان کی سیر کیجیے۔ ان سب مراحل اور منازل میں آپ کو ایک ہی اصول کام کرتا ہوا نظر آئیگا۔ کہ ہر چیز تیار ہی ہے۔ اور کچھ اسرار کی حامل ہے جن کا انکشاف کرنا چاہتی ہے۔

مگر باوجود اس کے آپ ہر چیز یا ہر شخص اور ہر انسان کو "زبان داں" نہیں کہہ سکتے۔ جماد و حیوان سے قطع نظر کرکے انسانوں پر نگاہ ڈالیے ان میں بھی ایک اصول فعال کے ہوتے ہوئے درجات و مراتب کا ایک سلسلہ عظیم ہے۔ جس میں انسان اپنی اپنی بولیاں بول رہے ہیں۔ بولنے کو وہ بچہ بھی جو آج ہی پیدا ہوا ہے بولتا ہے مگر کیا اس کی زبان دو برس کے بچہ کے برابر ہے۔ اور پھر کیا دو برس کا بے تربیت بچہ۔ اس دو سالہ معصوم کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ جسے اس دنیا میں قدم رکھتے ہی۔ تربیت یافتہ آغوش اور با سلیقہ گہوارہ ماں کی شکل میں عطا کیا گیا۔

یہاں سے دو باتیں ہمارے سامنے آگئیں۔ اول ہر انسان کی زبان ایک نہیں۔ دوم اور اس میں عطیہ قدرت کے علاوہ تربیت و اصلاح کا بھی بہت کچھ دخل ہے۔ ہم ایک چند اُلٹی سیدھی سطریں لکھ لینے والے کو ادیب و انشا پرداز نہیں کہہ سکتے۔ اور نہ ہر ایک غوغائی کو خطیب و

لیکچرار کا خطاب دے سکتے ہیں۔ یہ دونوں چیزیں درجہ خاص اور رتبہ امتیاز رکھتی ہیں۔ اور جو لوگ کسی خصوصیت سے تخصص اور امتیاز سے ممتاز ہوتے ہیں۔ ہم اُن ہی کو "ارباب لسان اور خداوندان سخن" کہتے ہیں۔ کہ وہی زبان کو زبان اور اس آوارہ و سرگرداں کس مپرس صوم کو محفل ادب کی رونق اور ادیبوں کی آنکھ کا تارا بنا دیتے ہیں۔

مگر یہ عجیب بات ہے کہ وہ وجود ہائے محترم جو آئندہ نسلوں کے لئے روشنی کا مینار ہوتے ہیں عموماً اپنے وقت میں عام پسند نہیں ہوتے۔ اس کلیہ میں کم سے کم استثنا ہے۔ عربی کے بعد فارسی بھی وہ زبان ہے جو صدیوں تک مسلمانوں کی تمام علمی و روحانی کوششوں کی سرمایہ دار رہی ہے۔ مگر جب آپ اس زبان کو آسمان پر بٹھانے والوں کی فہرست دیکھئے گا تو ان میں شیخ سعدی آپ کو نمایاں اور بلند مقام پر تشریف فرما نظر آئیں گے۔ مگر کیا سعدی کو وہ درجہ جسکے وہ مستحق تھے اُن کی زندگی ہی میں مل گیا تھا۔ ؟

تاریخ آپ کو بتائے گی کہ عوام سے گزر کر بعض خواص بھی سعدی کے مقابلہ میں اُن بزرگوں کو نلبہ ادب بتاتے تھے جن کے نام آج بجز تاریخی دفتروں کے اور کہیں نہیں ملتے۔ مگر آنے والے زمانے نے بتا دیا کہ سعدی سعدی ہی تھا۔ اور خواجو وغیرہ کے نام کرم خوردہ اوراقِ تاریخ کے سوا بالکل ناپید ہیں۔

انگریزی زبان کا ادیب ہے ہمتا۔ جس کے لئے من چلے انگریزوں نے آج یہاں تک کہدیا کہ اگر ہم سے ہندوستان یا شیکسپیر دونوں میں سے ایک طلب کیا جائے۔ تو ہم خوشی سے ہندوستان دیدیں گے۔ جس کی آج یہ قدر و قیمت ہے اپنی زندگی میں آپ کو معلوم ہی ہے کہ غریب کی کیا کیفیت تھی۔ تھیٹر کا معمولی ایکٹر تھا اور بس۔ جب مرگیا تو اُس کی قیمت لوگوں کو معلوم ہوئی۔ اگر اس کے دستخط کہیں مل گئے تو ادب پرستوں نے لاکھوں روپے میں انہیں حاصل کرلیا۔ اس لئے کہ یہ شیکسپیر کا سوادِ خط ہے۔ جو لوگ بڑے ناموں ہی کو ادب و علم کا مالک خیال کیا کرتے ہیں۔ اُن سبوں نے اس بے نظیر ادیب کو محض ایکٹر سمجھ کر

کہہ۔ بلکہ وہ ادبی کارنامے جو شیکسپیر کے نام سے شہرت پذیر ہیں درا صل لارڈ بیکن کے روحانی ملفوظات ہیں۔ جو موصوف نے شیکسپیر کے نام سے مصلحتاً شایع کئے تھے۔ مگر اس سے بڑھکر اور کیا ظلم ہوسکتا ہے ؛

ایران اور انگلستان تو دُور ہیں۔ آپ کے ہندوستان میں بھی اسکی نظیر موجود ہے **غالب و ذوق** کے نام زبانوں پر عام ہیں۔ اس میں کلام نہیں دونوں بزرگ واجب التعظیم ہیں۔ اگر ان کی زندگی پر ایک نگاہ غلط انداز ڈالتے ہیں تو نظر آتا ہے کہ ذوق اُستادِ شاہ ہونے کے باعث ملک الشعرا کے خطاب سے مخاطب تھے۔ اور غالب کرایہ کے مکان میں کس مپرسی اور بیچارگی کی حالت میں پڑے تھے۔ لیکن مستقبل نے بتادیا کہ غالب اور ذوق میں کیا فرق ہے اور غالب کون ہے۔

یہاں پر مجھے ایک جملہ عرض کرلینے دیجئے۔ کہ حقیقت میں وہ لوگ جو اپنے وقت میں بے قدر اور مستقبل میں گل سرسبد قرار پاتے ہیں۔ اپنے وقت سے ذرا پہلے دنیا میں آتے ہیں۔ اس لئے لوگ اُن باتوں سے آشنا نہیں ہوتے جو اُن سے سنتے ہیں یہی وجہ ہے کہ بے خبر لوگ اپنی ناواقفی سے تو بے علم ہوتے ہیں مگر ان بزرگوں پر تہقہہ لگاتے یا اُن سے سردمہری سے پیش آتے ہیں۔ لیکن جب اُن کی قدر ہونے کا زمانہ آتا ہے تو وہ اس دنیا میں نہیں رہتے۔ مگر معنوی طور پر وہ یہاں سے جدا بھی نہیں ہوتے۔ ظاہری آنکھ ان کو نہیں دیکھتی مگر باطنی آنکھ اُن کو دیکھتی اور اُن ہی سے کسب فیض کرتی ہے ؛

جب وہ لوگ آتے ہیں تو صرف لفظوں کی جنگ اور حرفوں کا توڑ جوڑ دکھا کر خاموش نہیں ہوجاتے۔ بلکہ وہی اُنہی معمولی لفظوں کو ایسی ترکیب اور تراش و خراش کے ساتھ ترتیب سے بٹھاتے ہیں۔ کہ دُنیا اس لفظی سحر سے یقیناً مسحور ہوجاتی ہے۔ اور ان کا چلتا ہوا جادو اپنے اندر کوئی پیغام بھی پوشیدہ رکھتا ہے۔ سعدی صرف شاعر ہی نہیں تھا نہ صرف ادیب تھا۔ بلکہ اس کے شعروں میں ایک خاص چیز تھی اگر آپ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ سعدی

کے کلام میں کیا چیز تھی تو چھ سو برس کی اسلامی تاریخ پر نگاہ ڈال لیجئے۔ آپ کو مسلمانوں پر گلستان اور بوستان کا اثر زیادہ نظر آئیگا۔

اسی طرح شیکسپیر نے صرف تھیئیٹر میں تماشا ہی نہیں دکھایا بلکہ انگریزی قوم کے اخلاق۔ معاشرت۔ ادب۔ تعلیم۔ تمدن وغیرہ پر نمایاں اثر کیا۔ یہی وجہ ہے کہ آج اُس کی پرستش کی جاتی ہے۔ یہی حال غالب کا ہے۔ ہندوستان کا کوئی ادیب اور شاعر نہیں جس کے کلام کو یہ درجہ حاصل ہوا ہو جو غالب کو حاصل ہے۔ گزشتہ بیس برس کے عرصہ میں متعدد شروح دیوان غالب کی اعلےٰ سے اعلےٰ طریق پر شایع ہو چکی ہیں۔ کیونکہ غالب نوجوانان ہندوستان کے لئے ایک بات کہتا تھا جسے گو اُس وقت سُننے والا تو کوئی نہ تھا اور اب سُننے اور سمجھنے والے سیکڑوں کی تعداد ... میں پیدا ہو رہے ہیں۔

آج بھی اُردو زبان کا ایک محترم اور قابلِ عزت ادیب موجود ہے۔ یہ تو سراسر خلاف واقعہ ہے کہ میں کہوں۔ لوگ اس سے واقف نہیں۔ ضرور واقف ہیں۔ مگر جس رتبہ اور مقام کا وہ ادیب ہے افسوس ہے کہ عام لوگ اس رتبہ کو سمجھ بھی نہیں سکتے۔

ہندوستان کا ادبی حلقہ **صلائے عام** اور اس کے محترم مدیر جناب خان بہادر میر ناصر علی خاں صاحب دہلوی سے خوب واقف ہے۔ مگر اس پیکرِ ادب کے رشحاتِ کمال سے لطف لینے والے۔ نہیں ان سے فائدہ اُٹھانے والے کتنے ہیں۔ وہ **صلائے عام** کے خریداروں کے رجسٹر سے معلوم ہو سکتا ہے۔

"**صلائے عام**" نام جہاں جناب محترم میر صاحب قبلہ کی بلند نظری کا پتہ دیتا ہے۔ وہاں یہ بات بھی کہہ دینے میں کوئی مضایقہ نہیں کہ اس کا نام "صلائے خاص" ہوتا تو خوب تھا اور اس پہلو میں میں مرحوم مہدی حسن افادی الاقتصادی سے بالکل متفق ہوں۔ کہ خاصہ کی چیز کو عام کیوں کر دیا۔

خان بہادر میر صاحب کا جو مطمح نظر ہے وہ بہت بلند اور نہایت نادر ہے۔ جس بلندی

پہ کھڑے ہوکر موصوف کلام کرتے ہیں اسکا تقاضا یہی تھا کہ اس کا نام "صلائے عام" ہوتا۔ کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ متکلم اپنے کمال میں منفرد ہے اور جانتا بھی ہے کہ میں منفرد ہوں۔ دعوے تو عام ہے مگر اس کو پذیرا کرنے والے کتنے ہیں؟ یہی وہ بات جسے غالب نے یوں ادا کیا ؎

کون ہوتا ہے حریف مئے مرد افگنِ عشق: ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد

جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ جناب خان بہادر کا مطمح نظر بہت بلند اور میدان خاص ہے اس میں یکہ تازی آپ ہی کا کام ہے — یہہ میرا ہی قول نہیں علامہ شبلی مرحوم بھی میرے ہمنوا ہیں۔ مکاتیب شبلی میں آپ نے پڑھا ہوگا۔ جہاں صلائے عام کے ذکر میں مولانا مرحوم فرماتے ہیں کہ "یہہ کمال خان بہادر میر ناصر علی خاں کے ساتھ خاص ہے کہ ایک ہی بات کو سو طرح بیان کریں گے" (مفہوم) اور ہر پیرایۂ بیان لطیف سے لطیف تر ہوگا۔

"مضمونِ پریشان"۔ صلائے عام کا مشہور اور زندۂ جاوید عنوان ہے یہ محدود بھی ہے اور ناپیدا کنار بھی۔ محدود ہے ہمارے آپ کے لئے۔ مگر ناپیدا کنار ہے قبلہ میر ناصر علی خاں بہادر کے لئے۔ کیا کبھی ایسا ہوا ہے کہ آپ کے سامنے صلائے عام آیا ہو اور آپ نے "مضمونِ پریشان" کو مسرت و بہجت سے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ نہ پڑھا ہو اور پڑھ کر مسرور نہ ہوئے ہوں۔ ایک گزشتہ پرچہ جو اس وقت میرے سامنے نہیں۔ میرے سامنے تھا۔ حسبِ دستور "مضمونِ پریشان" پہلے پڑھنے لگا۔ اس کا ایک فقرہ جو بادنیٰ تغیر یہ تھا کہ "مضمونِ پریشان" سے میری مراد پریشانی خیال نہیں۔ کتنا بلیغ فقرہ ہے جو اس مضمون کی تقریب کے لئے آپ نے لکھا اور پھر اس کے آگے جو بحث ہے وہ اپنی ندرت میں خاص چیز ہے۔

اسی طرح "تازگیٔ خیال" کا مضمون صلائے عام محترم ایڈیٹر کا خاص مضمون ہے جتنے پرچے اب تک اس رسالہ کے شایع ہوئے ہیں۔ کم و بیش سب میں یہ مضمون

موجود ہے۔ مگر ہر دفعہ نئی شان اور نئی لطف انگیزیوں کے ساتھ ۔

مجھے یقین ہے کہ اگر اور کچھ نہیں تو فقط "مضمون پریشان" اور "نازک خیالیوں" کے دونو مضمون صلائے عام کے تمام مجلدات سے انتخاب کرکے اگر کتابی صورت میں محفوظ ہو جائیں تو مستقبل قریب میں اُردو ادب میں اس کتاب کو وہ درجہ حاصل ہوگا جو کسی زبان کی ادب العالیہ کی بہتر سے بہتر کتاب کو کبھی حاصل ہوا ہے۔ اس لئے میں اپنے خیال اور یقین کے مطابق اگر جناب میر صاحب قبلہ کو اُردو زبان کے ارباب لسان میں ممتاز خیال کرتا ہوں تو یقیناً حق بجانب ہوں۔

خاکسار - میر محمد خاں - ص - مالیرکوٹلوی

(از دفتر رسالہ کوکب ہند)

گلزارِ نسیم اور رفعت و ریحان

چار پانچ روز ہوئے کہ بسبیل تذکرہ خان بہادر میر ناصر علی صاحب نے چند شعر مثنوی گلزار نسیم کے پڑھے اور تعریف کی اُسی سلسلۂ گفتگو میں مجھے یاد آیا کہ مولانا احمد علی صاحب شوق قدوائی نے جو ایک واقف کار اور سخن فہم آدمی تھے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ ریحان حسین خان متخلص بہ ریحان لکھنوی نے بھی گلزار نسیم سے ۲۷ برس پہلے ایک مثنوی لکھی ہے جس کا تاریخی نام باغ و بہار ہے اُس کا رنگ سخن اور بحر یہ ہی ہے جو گلزار نسیم کی ہے۔ پھر آگے یہ لکھا ہے کہ فارسی میں ایک مثنوی رفعت کی بھی موجود ہے جس نے گل بکاؤلی کے قصہ کو نظم کیا ہے اور اس کی بحر بھی یہ ہی ہے جو گلزار نسیم کی ہے اور کلام کی شوخی اور خوبی بھی یہ ہی ہے جو گلزار نسیم کی ہے۔ بعد میں اس امر کا بھی فیصلہ کیا ہے کہ رفعت کی مثنوی بھی گلزار نسیم سے اول کی ہے اور دونوں کے

اشعار مقابلہ سے دکھلائے ہیں۔ بہت اشعار دونوں کے ایسے ہیں کہ گویا ایک نے دوسرے کا نہ کہہ کیا ہے۔ اس کو توارد تو کہہ نہیں سکتے توارد تو دو چار شعر میں ہوتا ہے نہ کہ صدہا اشعار میں صاف معلوم ہوتا ہے کہ نسیم نے پورے مصرعے کے مصرعے رفعت کے اپنی مثنوی میں اُٹھا کر رکھدئے ہیں۔ بڑے تعجب کی یہہ بات ہے کہ نسیم یہہ لکھتا ہے کہ ؎ وہ نثر ہے وا دنظم دوں میں ؛ اس مے کو دو آتشہ کروں میں۔ اس شعر سے یہہ معلوم ہوتا ہے کہ گلزار نسیم سے اول یہہ قصہ گل بکاولی کا کسی زبان میں نظم نہ ہوا تھا نسیم پہلا شخص ہے جس نے اُردو میں اسے نظم کیا۔ اگر رفعت کی مثنوی کو نقش ثالث مانا جاوے تو اُس کے اس شعر کا مضمون بھی ڈنکے کی چوٹ پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ سب سے اول گُل بکاوُلی کا قصہ میں نے نظم کیا ہے ؎ یعنی چو کہن بشد زمانہ ؛ کم قدر شدہ است این فسانہ خواہم بگویمش دگر بار ؛ یارب بکشایم بہ گفتار۔ اگر اُن قیاسی دلائل سے قطع نظر کی جاوے جو شوق صاحب نے رفعت کی فارسی مثنوی کے اول ہونے کی لکھی ہیں تو ”باغ و بہار“ اور گلزار نسیم کی نسبت کیا کہا جاوے گا جن کے زمانۂ تالیف میں کچھ شک و شبہ نہیں ”باغ و بہار“ تاریخی نام ہے جس سے ۱۲۲۷ھ نکلتے ہیں اور نسیم کا مصرعہ ”توقیع قبول روز لیش باد“ ہے جس سے ۱۲۵۴ھ نکلتے ہیں، ۲۷ برس کا آگا پیچھا ہے۔ یہہ نسیم کی خوش قسمتی ہے کہ اس کی مثنوی کو شہرت اور قبولیت عام میسر ہوئی اور یہہ دونوں مثنویات گمنامی میں رہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ کوئی صاحب اس کے متعلق تسکین بخش اپنی رائے ظاہر فرمائیں۔ اگر رفعت کی مثنوی کو نقش ثانی مان لیا جاوے اور گلزار نسیم کو نقش ثالث تو پھر مندرجۂ ذیل اشعار کو دیکھتے ہوئے نسیم کی قابلیت کو بٹہ لگتا ہے۔ نسیم کی غیرت اس کی مقتضی کیوں کر ہوئی ہوگی کہ دوسرے کے مضامین کا سرقہ کرے اور آتش جیسا غیور اُس کا اُستاد دیدہ دانستہ اسے گوارا کرے۔ ہاں حُسن ظن کا تقاضا یہہ ہوگا کہ یہہ کہا جاوے کہ نسیم کو اس کی خبر نہ تھی کہ مجھ سے پہلے یہہ قصہ نظم ہو چکا ہے۔ باقی رہا مضمون کا توارد اس کو حُسن اتفاق کہا جاوے۔ ایک بات یہہ ہے کہ نسیم نے کلام کو اس قدر مختصر کیا ہے کہ کلام منتخب کی حیثیت مثنوی کی رہ گئی ہے جو مثنوی کے واسطے زیبا نہیں ہے اور رفعت اور باغ و بہار نے اس اختصار کو جائز نہیں رکھا گو میر حسن کی مثنوی کو وہ بھی نہیں پہنچتی ؛

ہم کو تو جناب میر ناصر علی خاں بہادر صاحب کے تعمیلِ ارشاد میں دونوں مثنویوں کے چند شعر مقابلہ سے دکھلانے ہیں۔ ملاحظہ کیجئے ؎

رفعت	نسیم
چوں مردمکش نگاہ دارند	پتلی سا نگاہ رکھ کے پالا
عازم بسفر شدند پر چار ؎ زیشاں بہ برید شاہ ناچار	شہزادے ہوئے وہ چاروں تیار ؎ رخصت کو شہ نے چار ناچار
گفتند کہ چشم شاہ شد کور ؎ تا چید زعارضِ پسر نور	سلطان زین الملوک شہ زور ؎ دیدار پسر سے ہوگیا کور
مے گشت چو گرد رہ بہ دستے	میداں میں خاک اڑا رہا تھا
در مشت تو باد را نپیچا	مٹھی میں ہوا کا تھامنا کیا
در دیدہ کنم چو مردمک جا	ہے چشمِ پری میں جائے مردم
چو سرو بہ ہر طرف خراماں	شمشاد رواں ہوا چمن میں
مشہور شدم بہ نامِ فرّخ	فرّخ ترے واسطے ہوئی میں
حالت بہ زبانِ تو شنیدم	سب تجھ سے سنے تری زبانی

تاج الملوک اور بکاولی کی گفتگو

پس گفت چگونہ دل ربودی ؎ گفتا کہ چہ خوش بہ خواب بودی
گفتا گلِ من بسنہ دہ چوں شد ؎ گفتا دلِ من چگونہ خوں شد
گفتا کہ چہٖ بہ ناز مغرور ؎ گفتا کہ ترا چہ ہست منظور

جمیلہ کا تاج الملوک اور بکاؤلی کو ایک جگہ دیکھنا

در باغ گلِ دگر شگفتہ ؎ دختر بہ کنار غیر خفتہ
بر گنج نہاں نشستہ مارے ؎ در دامنِ گل خلیدہ خارے
زد بانگ برا و جمیلہ کیں چیست ؎ ایں فتنۂ خفتہ دلبر کیست
ایں کیست کہ در برِ تو خفت است ؎ اے طاق بہ خفتہ ایں کہ جفت است

(مرزا محمد علی)

صرّافی و نقّادی

نہ ہرکو نقشِ نظمے زد کلامُ لپذیر آمد

صرافی و نقادی دونوں لفظ ہم معنی ہیں اگرچہ صرافی نے زیادہ تر رواج پکڑا ہے اور ہر شخص کی زبان سے یہ لفظ نکلتا رہتا ہے۔ مگر نقادی کا تعلق انشا پردازی سے زیادہ ہے۔ یہہ دونوں علم ہیں مگر کرتی ہیں بغیر عمل انکا جاننا اور نہ جاننا دونوں برابر ہیں۔ مہاجنوں میں یہ مثل مشہور ہے کہ پڑھتے پڑھتے پڑھیا ہو جاتا ہے۔ اور بالیقین نقدی اُچھالتے اچھالتے نقّاد بن جاتا ہے مگر انشاپردازی ایسی آسان نہیں ہے کہ ہر شخص اس کا نقّاد ہو جاوے اس کیواسطے تکمیلِ علوم مدونہ مقدم ہے۔ اب صراحتِ علوم کے لحاظ سے محض اسی قدر کہا جا سکتا ہے کہ جس علم میں مقصود نقّادی ہو اُسی علم کا ماہر ہونا لازم ہے۔

جہاں تک صرّافہ کے بازار کو زر و سیم سے واسطہ ہے وہ کھوٹے کھرے کی کسوٹی بالیقین رکھتا ہے۔ لیکن ہر گاہک اپنا نقد زر کھرا ہی جانتا ہے اور اُس سرمایہ میں سے حتّٰی کہ ایک ہزار اشرفی کی تھیلی سے ایک اشرفی بھی اگر صرّاف نے کھوٹی پاکر نکال پھینکی تو کاہک بُرا مانتا ہے اور صدہا دلیلیں اپنی اشرفی کے کھرا ثابت کرنے میں پیش کرتا ہے لیکن اس کو یہ خیال ہرگز نہیں رہتا کہ وہ اس فن کا اہل نہیں ہے اور اگر ماہر فن کوئی شخص ہے تو وہی صرّاف ہے جس نے اشرفی کو کھوٹا پاکر نکال پھینکا اور اپنی خاص خدمت کو باحسن وجوہ انجام دیا ع وفاداری و حق گوئی نہ کارِ ہر کسے باشد۔

صرافہ میں تو صرف اتنا ہی ہوتا ہے کہ کھوٹے کو کھرے سے علیحدہ کر دیتے ہیں مگر شاہی خزانوں میں اس وقت یہ ضابطہ موجود ہے کہ سکوں کو جب مشکوک و ملتبس پاتے ہیں تو توڑ کر لانے والے کے ہاتھ دھرتے ہیں۔ جسکا عظیم تر فائدہ یہ ہے کہ وہ سکہ

پھر چلنے کی قابلیت ہی نہیں رکھتا۔ مگر یہہ ظاہر ہے کہ گاہک جب اپنا سکہ بے کارشدہ واپس پاتا ہے تو کبھی خوش نہیں ہوتا اور اس کا سبب ظاہر ہے وہ یہہ کہ اُس سکہ کے کھوٹے ہونے کا اثر خود گاہک کی ذات تک پہونچتا ہے کیونکہ ناکارہ جنس ہونے سے اُس کو علاوہ نقصان مال کے پشیمانی بھی ہوتی ہے۔

ایک صراف کو سکوں کی اُلٹ پھیر سے کھوٹے کھرے کی تمیز ہوتی ہے اور وہ ٹھونک بجا بھی لیتا ہے۔ مگر اُس کو اُس ہنر اور اُس علم سے سروکار نہیں ہوتا جس سے سکہ بنانے کا مادّہ زمین سے پیدا ہوا ہے اور جو متواتر انقلابات کے ساتھ سکہ کی صورت میں ڈھالا جاتا ہے ؎ در خلوص منت اربست شکے تجربہ کن ✤ کس عیار زر خالص نشناسد چو محک

یہ بالیقین امر حق ہے کہ علم بیان اور علم عروض اپنے اپنے حدود رکھتے ہیں گو علم کلام سے جب اُن کو واسطہ پڑتا ہے تو کھچڑی کی طرح سے ملجاتے ہیں تاہم اہلِ بیان کو یہ پورا حق حاصل ہے کہ وہ علانیہ پکار دے کہ میں شاعر ہوں اور ؎

شعر میگویم بہ از قند و نبات ✤ من ندانم فاعلاتن فاعلات

مگر علم عروض والا تو اپنی میزان سیدھی کئے بغیر نہیں رہ سکتا اگر اُس کے آگے عروضی مسئلہ پیش ہوگا تو اُس کا فرض ہے کہ وہ اوزان رکھ کر میزان کے پلّوں کی نشیب و فراز دیکھ لے اور کمی بیشی بیان کردے اس کو ہرگز اس سے بحث نہ ہوگی کہ علت غائی شاعر کی کیا ہے

اب اگر فرض کیجیے کہ شعر واقعی "بہ از قند و نبات" ہے اور ساتھ ہی اُس کے عروضی محک میں پورا اُترا ہے تو سونے میں سُہاگہ اور نوراً علےٰ نور ہے۔ کیا اس میں کوئی شک بھی ہے؟

راقم مرزا عرفان علی بیگ از آگرہ

پُرانی دلّی کی لوہے کی لاٹھ

(بقیہ مضمون)

دوسرا بیان (باب چوتھا-۵۹) صرف بطور استعارے کے ہی۔ اس فقرے سے بہرحال یہ بات ظاہر ہی کہ لڑائیوں میں فتح کے وقت اس قسم کی یادگاروں کا بنانا کالیداس کے زمانے میں عام طور پر مروج تھا۔ علاوہ دھواجا ستمبھا اور جے ستمبھا کی اغراض پوری کرنے کے آہنی ستون کا ایک اور مقصد بھی ہی کہ وہ بطور پلیڈئیم Palladium کے بھی استعمال کیا جاتا ہی۔ یہ خیال زمانِ قدیم کی یونانی کتابوں سے لیا گیا ہی۔ گو یہ بات اس کے شاہی بانی کے مدِ نظر نہ رہی نہ ہو لیکن جوں جوں زمانہ گزرتا گیا ستون بلحاظ اپنی قدامت کے عوام کی نظروں میں عجیب و غریب رازوں (کرامتوں) کا مخزن ہوتا چلا گیا۔ اور عوام الناس اسی خیال سے اُس کی تعظیم و تکریم کرنے لگے اور یہ بات ہم نے سر سید اور جنرل کننگھم کی اُس روایت سے اخذ کی ہی جس کا ذکر ہم اوپر کر چکے ہیں جس کا ماحصل یہ ہی کہ جب تک یہ ستون اپنی جگہ پر اچھی طرح جما رہے گا سلطنت کی بنیاد ہل نہ سکے گی۔ لیکن جونہی راجہ کی بداعتقادی کی وجہ سے یہ ستون اپنی جگہ سے ہلا دینے سے ڈھیلا پڑ گیا، سلطنت کا زوال شروع ہو گیا۔

یہ خیال جو دہلی کے آہنی ستون کی نسبت ہی اس کی تشریح اچھی طرح ٹرائے کے پلیڈئیم سے ہوتی ہی جو پیلاس ایتھنی[1] کی مورت تھی، جس کی نسبت لوگوں کا اعتقاد تھا کہ آسمان سے اُتری ہی اور اس کو شہر کے امن و امان کا کفیل سمجھ کر بڑی حفاظت سے رکھا تھا جب تک دیوی کی مورت شہر کی فصیل کے اندر رہی یونانیوں کا قبضہ شہر پر نہیں نہ ہو سکا لیکن جب ڈیومیڈس اور اُڈیسی اس اس مورت کے چُرانے میں کامیاب ہو گئے تو شہر (ٹرائے) پر ...

[1] پیلاس ایتھنی (منروا) دیوی کی مورت جو بطور ردِّ بلا کے استاد کی جاتی ہی ۱۲

(Palladium) کے زوال کو روکنے والی کوئی چیز نہ رہی۔ اسی وجہ سے لفظ پلیڈیئم کا مفہوم قرار پا گیا کہ اس کا اطلاق کسی مقدس اور متبرک چیز پر کیا جاتا ہے جس کی نسبت عوام کا یہ عقیدہ ہو کہ یہ چیز شہر یا کسی علاقے کے امن و امان کی متکفل ہے۔

تاریخوں میں بہت سے شہر مثلاً ہلاس - آرگس - ایتھنز - سپارٹا اور ٹگیا، ایسے پائے جاتے ہیں جہاں پلیڈیئم موجود تھا اور ہر حالت میں اس مجسمے کی نسبت یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ یہ وہی اصلی مورت ہے جو کہ یونانی ٹرائے سے لائے تھے۔ اس کے برعکس بعد میں یہ روایت بھی پھیلی کہ جس مجسمے کو دیومیڈس اور اُڈیسی اُس نے چرایا تھا، وہ اصلی مجسمہ نہ تھا بلکہ وہ اصلی ٹروجن، پلیڈیئم کی دغابازی کی نقل تھی۔ اصلی مجسمے کو اِے نِی اَس (Aeneas) بچا کر اٹلی لے گیا۔

بہرحال یہ عقیدہ کہ کوئی خاص مقدس چیز جو مشتمل ہو کسی علاقے یا شہر کے امن پر اٹلی میں بھی پایا جاتا ہے۔ "نیوما کی ڈھال" رومن کی جمہوری سلطنت کا پلیڈیئم تھا اور پینٹیس (Penates = یونانیوں کے قدیم دیوتا) جن کی نسبت یقین کیا جاتا ہے کہ اسے نی اَس ٹرائے سے لایا تھا ان کے متعلق بھی یہی اعتقاد تھا۔ یہی اعتقاد اٹلی میں بھی زمانِ وسطیٰ میں تھا یہ بات بھی کچھ کم عجیب نہیں ہے کہ ڈانٹی کے زمانے تک بھی شہر فلارنس میں پانٹی وچیو مقام پر مریخ کا ایک ٹنجا مجسمہ کھڑا ہوا تھا جس کو یہ لوگ زمانِ جاہلیت میں خدا مانتے تھے اور عوام کا عقیدہ یہ بھی تھا کہ اس عجیب تبرک کے ساتھ شہر کا امن و امان وابستہ ہے اور اسی طرح سے شاعر نے اپنی نظم "ڈی ڈیتا کامڈیا" میں مخاطب کیا ہے آگے چل کر کہیں سنہ ۱۳۳۳ء میں یہ بت دریائے آرنو کی طغیانی میں مع اُس پل کے جس پر وہ نصب تھا بہ گیا۔ کننگھم صاحب نے اُس عام کہاوت کا بھی ذکر کیا ہے جو روم کے کالی سی یم[۲] کی نسبت مشہور ہے

[۱] دیکھو "پیراڈائز" باب (۱۵) نظمیں ۱۴۶-۱۴۵ اور "اِن فرنو" باب (۱۳) نظمیں ۱۴۶-۱۴۷- [۲] روم میں ویس پے سی اَن نامی بادشاہ کا تھیئٹر جو دنیا میں سب سے بڑا تھیئٹر تھا۔ ۱۲

۲ جیمز ۰۷

جو لیٹن زبان میں یوں ہی :- Quamdue stabit Colyseus stabit et Rome
جسے لارڈ **بیرن** نے یوں نظم کیا ہی:-

While stands the Colisium, Rome shall stand
When falls the Colisium, Rome shall fall

بشپ ہیبر نے اسی قسم کی روایات **سکاٹ لینڈ** والوں کے "**کارونیشن سٹون**" (سنگِ تاج پوشی) کی نسبت بھی اپنے سفرنامے میں بیان کی ہیں۔

اگر یہ دریافت ہو سکے کہ ہندوستان کی تاریخ میں بھی کوئی اور مثال پلیڈیم کی موجود ہی تو بڑی دلچسپی کا موجب ہوگا۔ ہم پیش از پیش کہہ سکتے ہیں کہ یہ خیال اس قسم کا ہی کہ اس ملک کے لوگوں کے دلوں میں بھی ضرور مقبول رہا ہوگا۔ اب میں اپنے مضمون کو دسویں عیسوی صدی کے ایک کتبے کو نقل کرنے پر ختم کرتا ہوں جو چلوکیا خاندان کے راجہ تیلا دوم کے متعلق ہی :- "کالاٹ کھنڈیتا راشٹر اکُتا کا کُلا میری دَلی جاٹاں کراؤ کوناوبے۔ سکھناکرؤ کڑ رتنا ستمبھو رن بیران گئے"[2]

اس مضمون میں میں اس بات کا ادعا نہیں کرتا کہ میں نے دہلی کی قدیم لوہے کی لاٹھ کے متعلق کُل امور کو حل کر دیا بلکہ یہ معلوم رہنا مفید ہوگا کہ ابھی دارالسلطنت ہند کی اس عجیب و غریب یادگار کی نسبت بہت سے امور غیر متیقن حالت میں ہیں۔ میرا مقصد اس مضمون سے صرف یہ ہی کہ میں بھی کچھ ایسی باتیں کان میں ڈال دوں جو آیندہ کی تفتیش اور دریافت میں ممد و معاون ہوں۔

---

[1] جب تک کالی سیم موجود ہی روم (کا ملک) برقرار رہے گا۔ جب کالی سیم گر جائے گا تو روم کو بھی زوال ہو جائے گا۔

[2] ترجمہ۔ جس نے بہ آسانی میدانِ جنگ میں گڑگڑا (راشٹراکُتا) کے زمانے کے دو ستون کو جن سے راشٹراکُتاؤں کے گھرانے کی خوش تقدیری متعلق تھی ہوا۔ اِن کا ٹ کر پھینک دیا۔ ماخوذ از انڈین انٹیکوئیری جلد سولھویں صد (۱۸) ۱۰۰

آہنی ستونوں کے کتبے کے دو ترجمے ڈاکٹر ووگل چھوڑ گئے
ڈاکٹر ووگل صاحب نے مسٹر پرنسپ کا سب سے ابتدائی ترجمہ اور اُس کے بعد **بھاؤ صاحب** کا مرمّمہ ترجمہ اور آخری ڈاکٹر **فلیٹ** کا ترجمہ اس طرح تین ترجمے دیئے ہیں **سر سید** کا ترجمہ جو سنہ ۱۸۴۷ء کا ہے اور مہامہوپادھیا پنڈت **بانکے رائے** صاحب دہلوی کا ترجمہ سنہ ۱۹۰۳ء کا ہے شاید اُن کی نظر سے نہیں گزرے سر سید کا ترجمہ زیادہ مستند اس وجہ سے نہیں ہے کہ وہ زبان سنسکرت سے واقف نہ تھے، اُنہوں نے لامحالہ کسی پنڈت یا شاستری سے مدد لی ہوگی، البتہ پنڈت بانکے رائے صاحب کا ترجمہ جو کہ ان سب ترجموں کے بعد چھن چھنا کر ہوا ہے سب سے زیادہ معتبر سمجھا جا سکتا ہے۔ **سر سید**[1] کا ترجمہ۔ سر سید نے سنسکرت کے کتبے کی نقل بخط ناگری کرا کے یہ ترجمہ کیا ہے (۱) اُس شخص نے کہ جس نے یہ خبر سنی کہ میرے دشمن اچھی سپاہ اور رفیقوں کے ساتھ مجھ سے لڑائی اور مورچے بندی کی تیاری کرتے ہیں۔ یہ ایک آلہ شہرت کا کھدوایا۔ جس طرح کہ اس کی تلوار اعضائے دشمنوں پر جو شخص کہ مالک سات سلطنت کا تھا اُس نے دریائے سندھ سے عبور کرکے سندھیوں کی قوم و ہلیکار کو دبا لیا اُس کی باقاعدہ فوج اور گھاتیں جو بطرف جنوب اس دریا کے تھیں اس زمانے میں بھی پاکیزگی کے ساتھ یاد ہیں۔ (۲) جس طرح کہ شیر ایک شکار چھوڑ کر دوسرا شکار پکڑتا ہے اُسی طرح اُس نے اس دُنیا کو چھوڑ کر اس عالم پر قبضہ کیا یعنی مر گیا مگر اُس کی ناموری اب تک بھی زمین پر بسبب اس کے پہلے کاموں کی شہرت کے اگرچہ وہ اب مر گیا ہے لیکن اثر کے ہتھیار کرنے کی طاقت جو دشمنوں کو تباہ کرنے والا تھا۔ اب تک عالم میں باقی۔ (۳) اُس شخص نے جس نے بوسیلہ اپنی تلوار کی مدد سے مدت تک زمین کی بادشاہت کی اور اُس نے اپنے میں سورج اور چاند کی خاصیتیں اکٹھی کی تھیں اور اُس کے چہرے خوب صورتی مثل پورے چاند کے تھی۔ اُسی راجہ دھاوا کا جس نے اپنا سر جھکایا پاؤں ...

[1] سر سید کا ترجمہ آثار الصنادید سے نقل کیا گیا ہے۔ ۱۲

ہیں اور لگایا اپنا دل اُسی وشنوں پر تھا یہ اونچا ستھبہ یعنی لاٹھ وشنوں کے نام پر جو قابلِ پرستش کے ہیں بنایا ہوا دھارا کا۔[۱]

ترجمہ پنڈت بانکے رائے صاحب دہلوی (وہ راجہ)[۲] جس کے بازو پر تلوار نے ناموری نقش کر دی جب کہ ملک ونگ (بنگال) کی لڑائی میں اُس نے (اپنی) سینہ زوری سے اُن دشمنوں کو جو جمع ہو کر اُس کے مقابلہ کو آئے تھے جس نے سندھ کے سات دہانوں کو عبور کر کے قوم واہلک پر فتح پائی جس کی شجاعت کی نسیم سے بحرِ جنوبی آج تک مہک رہا ہے۔ جس مالکِ اعظم نے افسردہ خاطر ہو کر دُنیا کو چھوڑ سفرِ آخرت اختیار کیا اور بشخص خود اُس (عالمِ بہشت) کو سدھارا جس کو اُس نے اپنے اعمال سے حاصل کیا تھا (مگر) ناموری کے سبب اس عالم میں باقی ہے جس کی اعدا کش طاقت کا اثر ایک بڑے جنگل کی جلی بجھی آگ کی بڑی تیز حرارت کے مانند اب تک زمین پر سے زائل نہیں ہوا۔ جس نے اپنے بازو سے حاصل کی ہوئی شہنشاہی کو مدتوں قایم رکھا۔ جس کا نام چندر (اور) جس کے چہرے کا حُسن پورے چاند کی مانند ہے۔ اسی روئے زمین کے مالک (مہاراجہ) نے جو وشنو کا بڑا بھگت تھا۔ وشنو بھگوان کا یہ بلند نشان وشنو پد پہاڑی پر نصب کیا (چوتھی صدی سے ڈی) شری بیت پنڈت وشویشور ناتھ جی کے بیٹے شریمنت بانکے رائے نول گوسوامی نے اس لاٹ کے نعتیہ کتبے کا یہ اردو ترجمہ اس لوح پر لکھوایا۔ یکم جنوری ۱۹۰۳ء

ستون کے برباد کرنے کی کوشش کلکتہ جرنل میں ایک شخص نے جسے (۸۸) برس ہوئے کہ دلی گیا تھا ایک مضمون لکھا تھا کہ مقامی لوگوں کی زبانی معلوم ہوا کہ اس لاٹھ کے برباد کرنے کی دو مرتبہ کوشش کی گئی۔ نادر شاہ کا حکم نادری اس کو کھود کر پھینک دینے کا ہوا۔ لیکن

[۱] لوہے کی لاٹھ بناوٹ کے اعتبار سے تو کوئی نادر یا قابلِ قدر چیز نہیں ہے لیکن اس پر کا کتبہ ضرور عجیب و غریب اور قابلِ قدر ہے۔ اُن کئی کتبوں میں سے جو اِس ستون پر کھُدے ہوئے ہیں یہ بات تعجب کی ہے کہ جو کتبہ سب سے پُرانا ہے وہی سب سے زیادہ صاف اور واضح ہے۔ [۲] کتبے کا یہ ترجمہ اب اس ستون کی محاذ والی دیوار میں سنگِ مرمر کی تختی پر لکھوایا گیا ہے۔ ۱۲

نہ دور کام نہ کر سکے۔ سانپ نے اپنا پھن ہلانا شروع کیا جس کی وجہ سے ایک سخت زلزلہ بھی آیا۔ دوسرے دسہرے میں مرہٹوں نے اس پر ایک بھاری توپ لگا دی تھی لیکن اس سے بھی کچھ نہ ہو سکا۔ سوائے اس کے کہ گولے کا ایک نشان (گڑھا) تو پڑ گیا۔[۵]

خاتمہ جن لوگوں کو قدیم زمانے کے تاریخی واقعات معلوم کرنے کا شوق ہے وہ تو اس مضمون کو مزے مزے لے کے پڑھیں گے اور ڈاکٹر ددگل صاحب کی تحقیق اور تدقیق کو بہ نظرِ غائر دیکھیں گے۔ اور جن کو اس طرف توجہ نہیں وہ کہیں گے کہ **مُردوں کی ہڈیاں اُکھیڑنے سے فائدہ؟** اور میں یہ عرض کر کے ختم کرتا ہوں کہ۔ ع

"اتنا کچھ کہہ گئے لیکن بخدا کچھ بھی نہیں" فقط تمام شد

خاکسار بشیر الدین احمد۔ از دہلی۔
(مولوی بشیر الدین احمد صاحب میرٹھی)

غزل

(از مولوی [illegible] الدین [illegible] صاحب دہلوی)

گئی بہار تو باقی حراں رہے نہ رہے
یہ زندگی ہو رواں کیا گماں ہے نہ رہے

سرائے فانیِ دُنیا کا اعتبار ہی کیا
کوئی گھڑی کوئی دم یہ سماں رہے نہ رہے

یہی ہے حشر خرامی تری تو کیا اُمید
ہماری قبر کا دیکھیں نشاں رہے نہ رہے

یہاں تو سیکڑوں ہم نے مصیبتیں جھیلیں
وہاں بھی ہم کو میسر اماں رہے نہ رہے

جو اس سے کرتے ہو وعدہ تو اس سے ملتے ہو
تمہیں بتاؤ، کوئی بدگماں رہے نہ رہے

نگاہیں تیز چھری ہیں، ادائیں خنجر ہیں
یہ حال جب ہو تو دل نیم جاں رہے نہ رہے

جو عہد کر کے وہ عہد وفا سے پھر جائیں
تو کیا خبر وہ یونہیں مہرباں رہے نہ رہے

اگر یہ ہے تو طبیعت بہل ہی جائے گی
چمن سے ہم کو غرض آشیاں رہے نہ رہے

[illegible]

صلائے عام

(مختصر متفرق و مختلف ذکر اذکار)

اگلے مہینہ یعنی اگست ۱۹۲۵ء سے صلائے عام کے اہتمام میں زیادہ تکلف و احتیاط سے کام لینے کا سامان مہیا کرنے کا ارادہ ہے۔ لوح اور مضامین کی پیشانیاں نئی اور پاکیزہ تیار ہو رہی ہیں۔ مضمون نگاروں نے اچھے اچھے مضامین لکھنے کا وعدہ کیا ہے۔ اور جامع اوراق کی بھی صلائے عام کی وضع پر زیادہ لکھنے کی نیت ہے۔

یہہ باتیں ایسی بہت نئی نہیں مگر رسالوں کی بے قدری خاصکر اپنی زبان کی خوبیوں سے غفلت کے سامنے تعجب ہے۔ صلائے عام مدت سے خرچ کی طرف سے زیر باری گوارا کر رہا ہے۔ دکھانا یہہ ہے کہ ملک و قوم کے لئے سچی خیرخواہی جس کا نام ہے وہ دراصل اپنی زبان کی ترقی کو سب سے مقدم سمجھنا ہے۔

اے جذب عشق بات نہ جائے شب فراق ۔ ایسا نہ ہو ہم آہ کریں اور اثر نہ ہو

آتی ہے سیلِ اشک میں بہتی یہ کس کی لاش
اے آنکھ دیکھنا کہیں لختِ جگر نہ ہو

زبان اردو کی ضرورت اردو کی ضرورت نہ صرف ہندو مسلمانوں کو ہے بلکہ حکام انگریزی کو زیادہ ضرورت ہے۔ انگریزی میں جو احکام و قوانین جاری ہوتے ہیں اور اعلے دربار اور جلسوں میں تقریر و گفتگو کرتے ہیں اُن کا اثر عوام پر بہت کم ہوتا ہے۔

کیوں کہ اکثر تقریریں انگریزی میں ہوتی ہیں۔ انگریزی خواں خود سمجھکر اپنے مطلب کے موافق کام نکال لیتے ہیں۔ پنچایتوں میں بھی جو بحث وگفتگو ہوتی ہے اُس سے عوام محض ناواقف رہتے ہیں۔ ابھی عالی جناب لارڈ برکن ہیڈ وام اقبالہم کی تقریر جو ولایت میں ہوئی اُردو میں شایع ہونے کے قابل ہے کہ ہندوستان کی اصلاحات کے متعلق بہت خوب ارشاد فرمایا ہے۔ یعنی جب ہندوستان کی سلطنت اقتدار انگریزی کے زیر نگیں آئی اُس وقت اصلاحات کی ترمیم کا کسی کو خیال بھی نہ تھا اور اب بلاوجہ جلدی کا تقاضہ ہو رہا ہے۔ انتظام سلطنت میں رعایا کی طرف سے حضرت حافظؒ کی رائے کام کی ہے کہ

ع رموزِ مملکت خویش خسرواں دانند

اخبار مشرق نے "حکام اضلاع کو مذاہب کی تعلیم سے واقفکاری" ضروری لکھی ہے تاکہ ہندو مسلمانوں کی تکراریں (ضلع کے افسر دونوں کے عقائد سے عدم آگہی میں) ہر تکرار مذہبی فساد کی صورت نہ پکڑ سکے (اخبار مشرق ۹ جولائی ۱۹۲۵ء)

جب حکام دونوں قوموں کے عقاید اور خیالات مذہبی سے کماحقہٗ آگاہ ہوں گے تو دونوں کی غلط فہمیاں جلد درست ہو جائیں گی۔

یہہ میرے عیوب میں ہے کہ میں رسالوں کا ریویو لکھنے سے جی چُراتا ہوں لیکن رسالوں میں جو ہنر ہوں اُن کا ذکر کئے بغیر رہا بھی نہیں جاتا: جو رسالے میرے پاس آتے ہیں اُن کے بعض مضامین سے میں اس قدر خوش ہوتا ہوں کہ ھل جزاء...

الا الاحسان کی تعمیل میں مجھے چاہیئے کہ ان کی داد دینے میں دریغ نہ کروں ؛

رسالہ ہزار داستاں | ماہ مئی کے رسالہ میں حضرت امیر مینائی کا حال بہت اچھا لکھا گیا۔ حضرت کی تصویر بھی فوٹو کی رسالہ میں شائع ہوئی ہے اور شاعری کی نسبت نہایت انصاف سے اپنی رائے دی۔ آج کل کے تذکرہ نویس کسی کے کلام کی داد دینے میں مضمون نگار کی تقلید کریں تو بہت مناسب ہے ؛

''تذکرات'' وغیرہ الفاظ کی جگہہ جو آغاز میں دیباچہ کے طور پر لکھنے کا رواج رسالوں میں ہو گیا ہے ہزار داستاں نے ''دریا بہ حباب اندر'' کا عنوان بہت اچھا ایجاد کیا ؛

رسالہ شادماں | سلاطین اندلس اور مسلمانوں کے عہد کی سلطنت کا حال رسالہ شادماں میں بہت خوب شائع ہوا ہے۔ مضمون نگار نے اس ملک کا سفر کیا ہے۔ اور بہت محبت اور محنت سے وہاں کی اس زمانہ کی عمارات و معاشرت کا حال لکھا ہے ؛ ان مضامین کا سلسلہ اگر جاری رہے تو اس ملک اور اس زمانہ کی بہت پاکیزہ تاریخ تیار ہو جائے جس کا تعلق اسلام سے رہا تھا ؛

رسالہ نگار | اس رسالہ میں ''استفسارات'' کے جواب میں رسالہ کے رئیس التحریر کو انسائیکلوپیڈیا کا کام کرنا پڑتا ہے۔ پوچھنے والے تو ایک چٹکلا سا چھوڑ دیتے ہیں اور جواب میں تمام دنیا کی معلومات کا مسالہ جمع کرنا پڑتا ہے ؛ کیا یہ ممکن نہیں

کہ جن سوالا

کہ جس مسئلہ یا مضمون پر اڈیٹر بیچارے کو تکلیف دی جائے اُس کے متعلق پہلے وہ کتابیں دیکھ لی جائیں جن میں مسائل زیرِ استفسار کا ذکر ہو۔ اگر ایسا کیا جائے تو بہت کم اڈیٹر کو تکلیف دینے کی ضرورت پڑے ۔ رسالہ کے اڈیٹر کو صرف یہی ایک کام نہیں ہے کہ تمام دُنیا کے مستفسروں کو کتب بینی کی تکلیف سے بچائے۔ اڈیٹر بیچارے کی جان کو اور بہت دین و دُنیا کے جھگڑے لگے رہتے ہیں یہ میں جناب نیاز کی محنت ہائے شاقہ پر ترس کھا کر عرض کر رہا ہوں ۔

توسیع اشاعت صلائے عام

صلائے عام جس طرح ہندوستان کی اعلیٰ سوسائیٹی میں مقبول ہے اسیطرح ولایت کے اہل علم، ذی مرتبہ تاجر اور خاص و عام اسے پسند کرتے ہیں چنانچہ وہاں کے اشتہار صلائے عام میں شائع ہونے کے لئے آئے ہیں۔ اس لیے صلائے عام میں اشتہارات کی مد انگریزی، اُردو و ہندی میں شائع ہونے کے واسطے آئندہ سے بڑھائی جائے گی ۔

ایک بات اور بھی زیادہ کیجائیگی کہ مُلکی اور قومی خیالاتِ خاص و عام کے مضامین انگریزی اُردو فارسی میں لکھے جائینگے۔ مضمون نگار انگریزی، اردو و فارسی نظم و نثر میں جس طرح جی چاہے لکھیں۔ صلائے عام میں اس کا انتظام ہو رہا ہے ۔

صلائے عام

(رسالہ تحفہ و تاج اور الناظر کا انعامی مضمون)

رسالہ "تحفہ" اس رسالہ کے ماہ ذی قعدہ ۱۳۴۳ہجری کے پرچہ میں حدیقۂ سنائی کا ریویو مجھے پسند آیا۔ حکیم سنائیؒ کی نسبت ان کے شیعہ سُنّی ہونے کا سوال نہایت خوبی سے طے کیا گیا: ان کے عقائد کی نسبت جس کے جی میں جو آئے گفتگو کرے۔ مگر حضرت کے ایک بڑے زبردست عالم اور فلسفی ہونے میں کلام نہیں اور تصوّف میں تو ان سے بڑھ کر کوئی لکھ نہیں سکتا؛ حدیقۂ سنائی کی شرحیں اکثر لکھی گئیں۔ ان میں نواب علاءالدین خاں بہادر فرماں روائے ریاستِ لوہارو (پنجاب) کی شرح نہایت عالمانہ ہے؛ حدیقہ کی شرحوں کی اس لئے زیادہ ضرورت ہوئی کہ حضرت کا کلام تصوّف میں بہت دقیق سمجھا جاتا ہے؛ شرحیں تو ان کے کلام کی دقّتیں حل کرنے میں بکار آمد ہیں مگر ایسے مضمون جو "تحفہ" میں شایع ہوئے معلوماتِ علمی کے لئے بہت ضروری ہیں؛

رسالہ "تاج" رسالہ "تاج" اب کی دفعہ "اردوے قدیم کا نمبر" ہو کر نکلا اور اچھا نکلا یعنی حجم اور چھپائی اور کاغذ اور مضامین سب اچھے رہے۔ اُردوے قدیم کی تحقیق میں بہت معقول مضمون دیکھنے میں آئے؛ اس تحقیق کے متعلق "تاج" نے زیادہ مضمون درج

فہرست ہیں۔ جن کا مجموعہ معمولی رسالہ سے زیادہ اور معمولی کتاب سے کم نہیں : بلکہ میری دانست میں رسالہ کا نمبر کتاب کے لئے موزوں ہے ؛

رسالہ "النّاظر" کا انعامی مضمون اور اخبار مشرق

"الناظر" کے انعامی مضمون کے متعلق ۱۶ر جولائی ۱۹۲۵ء کے اخبار مشرق میں ایک معقول مضمون دیکھنے میں آیا کہ ادب اردو کے چار ہی عناصر قرار دینا انصاف کے خلاف ہے۔ سچ تو یہہ ہے کہ گمنامی میں جو زیادہ مشہور ہیں انہیں کا نام زیادہ نکل جاتا ہے کہ بقول امیر مینائی عنقا سے زیادہ مجہول العلم دنیا میں بہت ہیں مگر ع نکل گیا ہے زمانہ میں نام عنقا کا ؛ یا از روے دعوی مرزا اسد اللہ خاں غالب ہوں ظہوری کے مقابل میں خفائے غالب ؛ میرے دعوی پہ یہہ حجت ہے کہ مشہو نہیں جن ذی کمال لکھنے والوں کا احسان اردو پر ہے۔ اُن کے نام تھوڑے نہیں ہیں گو کوئی جانے یا نہ جانے ؛

یہہ بحث انعامی مضمون نگار صاحب کے بس کی معلوم نہیں ہوتی۔ میں چاہتا ہوں کہ جن کا ذکر انہوں نے چھوڑ دیا ہے اونکے اظہار کمال کے لئے صلاے عام نذر کردوں : مگر یہہ کام مجھسے اکیلے نہیں ہو سکتا جب تک کہ اور اصحاب اسکا بیڑہ نہ اُٹھائیں بحث دلچسپ ہے جسقدر مجھسے ہو سکتا ہے میں حاضر ہوں : اس خدمت کی لیاقت کے لئے مجھے

تحقیق میراثیاں

۱۴ جون سنہ حال کو ایک خط پالم پور ضلع کانگڑہ پنجاب سے بنام اڈیٹر صاحب موصول ہوا جس میں میراسیاں کی اصلیت دریافت کی گئی ہے۔ دراصل میراسی حرف (س) سے نہیں ہے۔ یہہ حقیقت میں میراثی ہے۔ جس کے معنی پشتینی کے ہیں۔ اور اس قسم کے میراثی لوگ ہندوستان ہی سے خصوصیت رکھتے ہیں۔ اور وہ صرف ذات کے برہمن ہیں۔ جو کہ اپنے ججمانوں کو پوجا پاٹ کرانے میں امداد دیتے ہیں اور یہ بات تو اظہر من الشمس ہے راگ اور مزامیر اہل ہنود کی عبادت کے جزو ہیں۔ وہ برہمن لوگ بھجن کرتے اور باجا بجاتے ہیں۔ غرض کہ گانے بجانے کا فن ہندوستان میں برہمنوں ہی سے تعلق رکھتا ہے اب اکثر یہہ دوسری ذاتوں نے بھی اختیار کرلیا ہے۔ اور میراثی کہلانے کی وجہ یہہ ہے کہ برہمن لوگ پروہت اور دیگر ذات والے ججمان کہلاتے ہیں مگر جس خاندان میں جو برہمن پشتہا پشت سے لگا بندھا ہوا ہے وہی اس کا پروہت کہلاتا ہے اور وہ خاندان والے اس برہمن کے ججمان۔ اسی طرح وہ پروہت اُن خاندان والوں کے پُشتوں سے واقف ہوتا ہے۔ جب ہندوستان میں مسلمانوں کا دور دورہ ہوا تو ہندوں کی دیکھا دیکھی مسلمانوں نے بھی اپنے ہاں کے مطربوں کو مُلا کر برہمنوں کی طرح اپنے ہاں کے شادیوں کی تقریبوں میں جیسے کہ ہندوؤں میں برہمن اور نائی "لگن" لیکر جاتے ہیں۔ مسلمانوں میں میراثی (ڈوم) اور نائی گانٹھ لیکر جانے لگے + مسلمانوں نے اپنی زبان کا لفظ میراثی قرار دیا۔

یہہ چند سطور اُمی خاں میراثی کی زبانی معلوم ہوئی ہیں۔ مگر یہہ بھی ضرور ہے کہ جس قدر دہلی میں میراثی ہیں ایک کو بھی اپنے حسب و نسب سے پوری واقفیت نہیں۔ ہاں اتنا تو کہتے ہیں کہ ہمنے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی شادی میں گانا گایا ہے۔ یہہ فقرہ ان لوگوں کا اگر سچا نہ ہو مگر اس بات کی دلیل ضرور ہے کہ یہہ لوگ اصلی باشندے ہندوستان کے نہیں ہیں۔

اس پرچہ میں تو اُسی قدر لکھا گیا جو کچھ کہ دہلی کے میراثیوں سے تحقیق ہوا۔ آیندہ ایک میراثی نے جو کہ جے پور میں ملازمت کے سبب رہتا ہے اپنا شجرہ نسب کی نقل دینے کا وعدہ کیا ہے۔ بشرط دستیابی شجرہ اُس شجرہ کا حال اور دیگر حال قوم گویّوں کا مُشرح لکھا جائے گا ÷

راقم میر احمد دہلوی

مہتمم کی طرف سے۔

اِطّلاع

صلائے عام کی قیمت پیشگی چھہ روپیہ سالانہ ہے۔ قیمت بذریعہ منی آرڈر عنایت فرمائی جائے۔ مضمون نگار بھی صلائے عام کی قیمت سے بری نہیں۔ نہ یہ ضرور ہے کہ ہر مضمون خواہ مخواہ شایع کیا جائے۔ جامعِ اوراق کو مضمون میں کمی بیشی کا اختیار رہے۔ جو مضمون شایع نہ ہو سکیں اُن کے واپس کرنے کا ذمہ نہیں۔

صلائے عام میں ہر طرح کے مضامین نظم و نثر شایع ہوتے ہیں۔ زیادہ تر نثر کہ اس وقت نثر کی زیادہ ضرورت ہے۔ اور نثر بھی ایسی جس میں زبان کی خوبی و فصاحت کے ساتھ مضمون کی پاکیزگی و نازکخیالی ضرور ہو یعنی لباس چو عروسِ جمیل و لباسِ حریر۔ شرط ہے کہ مضمون پاکیزہ اور ادائے بیان لاجواب چاہیئے۔

اکثر اصحاب نمونہ کا پرچہ مانگتے ہیں۔ اوّل تو ایک پرچہ سے صلائے عام کی ساری خوبیوں کا حال معلوم ہونا مشکل ہے دوسرے صلائے عام اتنے عرصہ سے جاری ہے کہ اہلِ علم میں شاذ ہی کوئی ایسا ہوگا جو اس سے واقف نہ ہو۔ پھر بھی اگر کسی کو نمونہ یا سال سے کم کی خریداری منظور ہو تو ایک روپیہ فی پرچہ کے حساب سے قیمت لی جائے گی۔

صلائے عام کا پتہ اس قدر کافی ہے کہ:

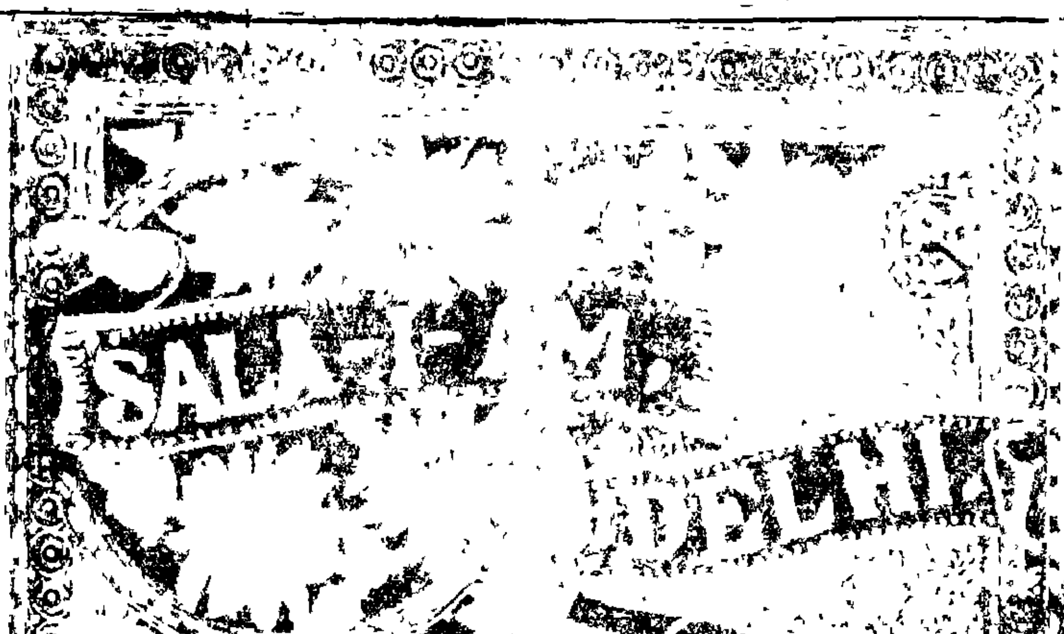
دہلی۔ فراشخانہ: مکان میر ناصر علی خاں بہادر

حسب الارشاد میر ناصر علیخاں بہادر مطبع ناصری واقع فراشخانہ دہلی میں باہتمام میر احمد چھپا اور شایع ہوا۔

Printed and Published by Mir Nasir Ali Khan Bahadur (Editor) at the Nasri Press, Farrash-Khana, Delhi

Regd. No. L. 1162 SALA-I-AM, Delhi.

Aug 25



A high class Monthly Magazine devoted to the cause of Urdu literature, the preservation of the old Indian, especially Mohammadan culture and refinement, and the assimilation of the best features of the new civilization

جلد ۱۳ فہرست مضامین نمبر ۸

بابت ماہ اگست سنہ ۱۹۲۵ء مطابق ماہ صفر سنہ ۱۳۴۴ ہجری

پیرایۂ آغاز

آپ کہیں گے کہ تو نے دیباچۂ مضامین لکھنا چھوڑا۔ گویا وعدہ یار تھا جو پورا نہوا: اس کی تشبیہ نکہتِ گل سے سمجھئے جو باغ سے نکل کر پھر نہ پھری ۔ اس کے بعد پیرایۂ آغاز لکھا کرتا تھا اس کی بھی پابندی نہیں کرتا ؎

رہ گئی قیس کو نظارہ لیلےٰ کی ہوس ۔ پردہ محمل کا اُلٹنے نہ ہوا بھی آئی ۔

لیکن افسانہائے عشق و محبت میں داستانِ وفا زیادہ دلکش ہوتی ہے اور روزمرّہ میں پابندیٔ وضع کی تعریف ہے۔ اس لئے پیرایۂ آغاز کا نباہنا ضرور ہوا ؎

فغاں کا کوئے صنم میں جو مل گیا موقع ۔ مچل کے بیٹھ گئی اور بھی صدا میری ۔

اس پرچہ میں پہلا مضمون مضمون پریشان (صفحہ ۵-۱۶) ہے اس کی نسبت یہی کہا جا سکتا ہے کہ معمولی و رسمی ہے۔ کیوں کہ عرصہ سے چلا آتا ہے ؎

کیا کہیں زیست کو کیا اے شبِ ہجراں سمجھے ۔ آنکھ جس دن سے لگی خوابِ پریشاں سمجھے

اس کے بعد ایک پاکیزہ حکایت ہے جو ناصر علی سرہندی کی مثنوی سے لی گئی۔ یہہ حکایت نازک خیالی و پاکیزہ بیانی میں صوفیائے کرام کی نگاہ میں بڑے مرتبہ کی ہے کہ پانی اسلئے نہیں برسا کہ مشتاقانِ الٰہی میں سے ایک ضعیفہ کے سر پر سایہ نہ تھا۔ اس ضعیفہ کے مرتے ہی بارش ہوگئی گویا ابرِ رحمت اسکے استقبال کیلئے بھیجا گیا۔

اے آہ تو چلی ہے اثر کی تلاش میں ۔ دونوں جہاں سے ڈھونڈھ کے لانا جہاں ملے

مرنے پر کیا گزرتی ہے (صفحہ ۱۷-۲۷) اس کا طرز فلسفیانہ ہے یہہ مسئلہ عقائد سے بچا کر لکھنا مشکل ہے

مشکل اس وجہ سے ہے کہ عقائد کے سوا اسکے سمجھنے کا کوئی ذریعہ نہیں۔ مشکل ہونے کے خیال سے اسکے متعلق دو مضمون لکھے گئے۔ اور دونوں ناقص رہ گئے۔

باکار پنشن یافتہ (صفحہ ۳۳) میں مرزا عرفان علی بیگ صاحب آئی۔ ایس۔ او نے بڑے کام کی بات لکھی ہے جو گویا اس شعر کی شرح ہے کہ ؎ قدیمانِ خود را بیافزائے قدر۔ کہ ہرگز زپروردہ آید نہ غدر۔ سرکاری ملازمت سے علیحدہ ہونے کے بعد صلاح و مشورہ کے معاملوں میں پنشن خواروں کی شرکت سے زیادہ فائدہ ہو سکتا ہے۔ اسکے لئے پنشن یافتہ خود اپنی طرف سے کوشش کریں۔

متروک الفاظ کا استعمال۔ (صفحہ ۳۸) زبان اردو کے ترقی خواہوں کو اس بحث کی طرف توجہ کرنی ضرور ہے۔ یہہ کام نظم و نثر کے اساتذہ کے ذمہ ڈالا جائے اور ان کی کثرتِ رائے پر اس کا فیصلہ ہونا چاہیے۔ شعر میں تو حضرت ناسخ زبانِ اردو کے الفاظ کی نسبت بہت کام کر گئے اب بھی اس کا انحصار زیادہ تر شعرا ہی کی رائے پر رکھا جائے۔ یہہ کام دلی و لکھنؤ دونوں شہروں کے اساتذہ کے اتفاق سے ہونا چاہیے۔ اگر ان میں اتفاق ناممکن ہو تو صرف دو اسکول قایم ہو جائیں۔ ان میں سے جس کو جو اسکول پسند ہو اس کا تتبع کرے۔ ہر شخص کو اختیار نہ ہو کہ

گندہ پیروزہ باخشکہ۔ گرچہ گندہ لیکن ایجاد بندہ۔

اس پرچہ کے باقی مضامین کی نسبت پڑھنے والے آپ اپنی اپنی رائیں لگائیں۔ میں زیادہ لکھنا نہیں چاہتا۔ گو آپ کہیں کہ ؎

ستم یہہ کیا کیا پھیرا کہاں سے ناقۂ لیلےٰ
رہا جب پشتِ مجنوں دو قدم اے ساربان باقی

مضمون پریشان

روایت ہی (راست و دروغ برگردن راوی) کہ کسی گاؤں میں کُتہ کا پلہ کنوئیں کے اندر گر کر مر گیا۔ دہقانی اکثر بیوقوف ہوتے ہیں مثل مشہور ہے ؎

دہ مردہ مرد را احمق کند ÷ عقل را بے نور بے رونق کند

گنوار گھبرا گئے کہ گاؤں میں کنواں ایک ہی تھا۔ پانی کے خیال سے گاؤں والے مولوی صاحب پاس دوڑے گئے کہ کیا کیا جاتے؟ مولوی صاحب نے از روئے کُتب شرعی جتنے ڈول پانی نکالنے کا حکم تھا فتوے دیا ÷ گاؤں والوں نے گو فتوے سے بھی زیادہ ڈول پانی نکال دیا مگر اس مُردہ بچۂ سگ کا خیال نہ رہا کہ پہلے اوسکو نکال لینا چاہئے تھا ÷ وہ مرا ہوا کتہ کا پلہ کنوئیں میں رہ گیا۔ دہقانی دہوکے میں پانی پیتے رہے کہ اتفاق سے دو ایک دن کے بعد کسیکو وہ مرا ہوا پلہ کنوئیں میں نظر آ گیا یا کسی کے ڈول میں نکل آیا۔ تمام گاؤں کو شرمندگی ہوئی کہ پہلے اُس کو نکال لینا تھا پھر مولوی صاحب سے فتوے پوچھنے جاتے

بیوقوفی

نہ مولوی صاحب نے انہیں یہ بات سمجھائی + انسان اپنے تئیں آلائش اور ظاہری گندگیوں سے صاف کرے تو اتنا فائدہ نہیں جتنا کہ پہلے سگِ نفس سے دل کو صاف کرنے سے فائدہ ہے +

اس تمثیل سے غرض یہ ہے کہ محض ترک علائق سے بہت فائدہ نہیں۔ بہادر شاہ بادشاہ کو جب پیری مریدی کی بھی تو کا؟ درویشی پر جو چوگوشیہ تھی ایک رباعی کڑھوائی جس کے اور مصرعے مجھے یاد نہیں رہے۔ اُن کا مطلب یہ تھا کہ درویشی کے لئے چار چیزوں کا ترک کرنا ضروری ہے ع ترکِ دنیا۔ ترکِ عقبےٰ۔ ترکِ مولیٰ۔ ترکِ ترک + اس اخیر ترک " سے مُراد حصہ وراثت ہے + چوگوشیہ تاج درویشی پر چار ترک " نہایت موزوں تھے + ؎

سب انقلاب دہر ہے انسان کے واسطے + پیری میں بھی کبھی نہیں ہوتے ہرن سفید

دُنیا میں کسی نے تمام دنیا کو ترک کیا تو کیا بڑا تیر مارا ؟ مرنے پر دُنیا تو خود بخود ترک ہو جائیگی: سب سے پہلے اپنے نفس کو ترک کرنا چاہیئے کہ نہ ہم ہوں گے نہ جھگڑا ہو گا؛ ہمارا مرنا عینِ عبادت ہے موت غایت نفس کُشی ہے + انسان کو زندگی سے موت میں زیادہ آرام ہے کہ تمام دنیا کے جھگڑوں سے چھوٹ جاتا ہے + ؎

گُل جہاں چٹکا تو آئی یہ صدا + کس کو غم ہے نکہت برباد کا

میرا قاتل جس کے ہاتھ سے میں مارا گیا اگر میرے خون کے قصاص میں مارا گیا۔ تو مجھے کیا ؟ اُسکی جان جانے سے میری جان تو مجھے پھر نہ ملی ؎

ہیں کیا جو مرقد پہ میلے رہے + کہ زیر زمیں ہم اکیلے رہے

شداد نے گو بہشت کا جواب بنا دیا مگر اُسے کیا ملا ؟ وہ تو اپنے بنائے ہوئے باغ میں قدم بھی رکھنے نہ پایا۔ بلکہ جان سے گیا + کشمیر میں ہمثل باغ ہیں مگر قیس کے نصیب میں تو خارِ مُغیلان تھے +

قیامت میں اگر قاتل ومقتول دونوں پھر زندہ ہوئے۔ تو اسمیں دونوں برابر رہے:

قاتل کو جو کچھ سزا ملے تھوڑی ہے مجھے میرے قتل ہونے کا عوض کیا ملے گا؟ میں بخشا جاؤنگا تو خدا پر محض ایمان رکھنے سے ؎

ہر زخم تن یہاں ہے دہن یار بے دہن ÷ خاموشیں مچاتے ہیں وہ بولتے نہیں

یہہ عجب تماشہ ہے کہ عالم اسباب میں ایک کی حیات کی زندگی دوسرے کی موت پر منحصر ہے زمین کی رطوبت نباتات چوس لیں کیڑے نباتات سے تمتع کریں۔ چڑیاں کیڑوں کی جان لے ڈالیں یہی چڑیاں ایک دوسرے کا شکار کریں۔ انسان ان سب کی جان کا دشمن بنے خاصکر حیوانات کا: یہہ سلسلہ زندگی و موت کا ازل سے چلا اور ابد تک چلا جائے۔ آپ اگر اس مٹی کو جس سے کہتے ہیں کہ انسان بنا ہے ہٹا دیں۔ تو نباتات فنا ہو جائیں گے۔ نباتات اگر فنا ہوئے تو یہہ بے شمار طیور اور کیڑے کس طرح جئیں گے؟ بلکہ جب زمین سے روئیدگی رخصت ہوئی تو حیوانوں خاصکر انسان کی زندگی مشکل ہے کہ جانداروں کی غذا کہاں سے آئے گی؟ غرض یہ سلسلہ کہ ایک کی زندگی دوسرے کی موت اور دوسرے کی موت ہماری زندگی ہے ازل سے ہے اور یونہی چلا جائے گا۔ باپ کا مرنا بیٹے کی زندگی ہے۔ بلکہ جن کے باواجان معمولی عمر سے زیادہ جئیں تو بڑے صاحبزادے کے دل سے پوچھئے۔ خاصکر اگر باوا کے مرنے سے دولت کی اُمید ہے ؎

جب تیر کو کمان میں جوڑا جدا ہوا
کیوں بے ثبات صحبت پیر و جواں نہ ہو

اسکی ایک حکایت شیخ سعدی رحمۃ نے گلستاں میں لکھی ہے) سُنا ہے کہ ایشیائی بادشاہوں میں ولیعہد باپ کی لاش پر پاؤں رکھ کر تخت پر چڑھتا تھا۔ اور یہہ تو اکثر تاریخوں میں ہے کہ بادشاہوں نے بھائیوں کو حتی الوسع زندہ نہیں چھوڑا۔

یہہ کیا بات ہے کہ روضۂ تاج گنج کے اندر جو لاش دفن ہے اُسپر اتنے آنسو نہیں بہتے جتنے کہ ایک کچی مٹی کی نئی سی قبر پر ماں بہنوں کے زار و قطار آنسو بہہ رہے ہیں کہ دیکھنے والوں کے

دل ہلے جاتے ہیں + روضہ تاج گنج پر جانے والے اکثر امیر کبیر خوش حال دولتمند ہوتے ہیں کہ
وہاں تکلف کی سوجھتی ہے چار پانی کی تقریبیں ہوتی ہیں۔ دوست آشناؤں کی صحبتیں ہوتی ہیں
یہ نہیں ہوتا تو عمارت کی خوبی سنگ مرمر میں پچی کاری۔ میناروں کی بلندی تو تا ب
اور ایسی ہی ہزار خوبیوں پر انسان ایسا محو ہو جاتا ہے کہ قبر کے اندر جو مدفون ہے اس پر کسی
کے آنسو نہیں بہتے + وہ بیوہ جسکو شوہر کے مرجانے کے بعد ننھے بچہ کی موت کا صدمہ
اٹھانا پڑا اُس کو بچہ کے قبر دیکھ کر رونے کے سوا اور کیا سوجھ سکتا ہے + عالیشان سنگین
مقبروں پر جانے والے وہ دل کہاں سے لائیں جو بیوہ اپنے بچہ کی ٹوٹی پھوٹی گور پر لیکر
گئی + وہاں مقبروں کے ٹھاٹھ پر نگاہ ہے اور زبان پر واہ واہ ہے یہاں آنکھوں سے
آنسوؤں کا تار اور دل سے آہ آہ ہے + سبب یہ کہ غم والم میں دل کے سوا کوئی ساتھ
نہیں دیتا +

دل کا تعلق محبت سے ہے اور محبت کا تعلق دل سے ہے۔ دولت و اقبال کو محبت
سے غرض نہیں + وہ محتاج بیوہ جو اپنے بچے کی قبر پر رو رہی ہے اُسکے دل سے تیمور و
چنگیز خاں کی قبر پر ایک آنسو بھی نہ نکلے گا ؎

بدی تھی عین نیکی پختہ کاران محبت کو
خیال خام ہے جب تک خیال نیک و بد ہوگا

محبت عجیب نعمت ہے۔ اسکا اثر ہر ملک اور آب و ہوا میں یکساں ہے پروانہ یہاں
ہو یا حبش میں جہاں شمع کو دیکھے گا جان دینے کو دوڑے گا ؎

پروانہ مجکو جان کے جلتا ہے وہ پری
اوس سے چراغ و شمع نے کچھ کہدیا غلط

فاختہ یہاں ہو یا ایران میں "کوکو" ہی پکارتی رہے گی۔ مور بنگال میں ہوں یا پنجاب میں برسات
میں "پیہو پیہو" پکارے جائیں گے + بچے کی ماں عرب میں ہو یا زنگبار میں بچہ کی جدائی میں بغیر

تروتازہ رہے گی + پھولوں کو آپ دیکھیں یا نہ دیکھیں پھول اگر کوہ ہمالہ پر ہیں یا لاہور کے شالامار باغ میں وقت پر بے کھلے نہ رہیں گے۔ پانی کو آپ کتنا ہی روکیں نشیب کو منہ کرے گا۔ شعلہ کو آپ کتنا ہی دبائیں اوپر ہی کو سر اٹھائے گا: سر آئیزک نیوٹن کو درخت سے زمین پر پھل گرنے سے سائینس کا بڑا مسئلہ سوجھا کہ ہر چیز کا ثقل زمین کی طرف لے جائے گا:

یہی حال محبت کا ہے + محبت انسان کی گھٹی میں پڑی ہوئی ہے۔ شروع میں ماں کو بچہ سے اور بچہ کو ماں سے کہ جس طرح ماں کو بچہ کی جدائی شاق ہے بچہ کو ماں کی جدائی قیامت ہو۔ گھوڑی کا بچہ آپ نے دیکھا کہ ماں کے ساتھ کوسوں بھاگا چلا جاتا ہے + جوان ہونے پر انسان کو عورت سے جو محبت ہوتی ہے اسکا ذکر آپ عشق و محبت کے افسانوں میں دیکھ لیجئے۔ بال بچوں کے ہونے پر ماں باپ کو اپنی اولاد سے وہ محبت ہوتی کہ اپنی جان سے زیادہ اولاد کو عزیز سمجھتے ہیں +

محبت کو ہوس سے واسطہ نہیں۔ ہوس کا تعلق نفس سے ہے اور ہوس خصائل رذیلہ میں ہے + مقناطیسی کشش کی طرح محبت کا تعلق روحانی سمجھا جاتا ہے + لیکن روح کا حال آجتک کسی پر نہ کھلا کہ روح کو جسم سے کیا تعلق ہے؟

میری روح مجھ سے سو برس پہلے کہاں تھی؟ مجھ سے پہلے جہاں تھی وہاں کیا کر رہی تھی؟ اور مجھ سے جدا ہوکر کہاں جائے گی؟ جاتی کیوں ہے؟ اور جاکر کیا کرتی ہے؟ یہاں تو ساتھ رہ کر میرا اور میرے قویٰ کا ساتھ دیا: بچپن سے جوانی تک میرے ہوش و حواس کے ساتھ بڑھی۔ جب میرے قویٰ گھٹے یہ بھی مضمحل ہونے لگی + ہے

نہ دنیا میں رہتے نہ آفت میں پھنستے
اسیری ہوئی آشیانے سے حاصل

ان سوالوں کا جواب بیچارے فلسفی سے ممکن نہیں۔ ان کے لئے عقاید کی ضرورت ہے، جہاں فلاسفی تھک جائے وہاں مذہب آڑے آتا ہے + جس طرح پہلے کسی مقام پر

جلدی پہنچنے کے لئے گھوڑوں کی ڈاک بٹھائی جاتی تھی کہ پہلا گھوڑا آٹھ دس کوس چلکر تھک جاے تو دوسرا گھوڑا موجود رہتا تھا۔ پھر تیسرا اور چوتھا بمنزل مقصود تک اس طرح جلد سفر طے ہوجاتا تھا۔ پہلے ڈاک کی چوکی کا نام میں نے فارسی لکھا ہے جب یہ تھک جاے نہ تھا یہ کی ڈاک منزل مقصود تک پہونچا دیتی ہے۔ لیکن دقت یہہ ہے کہ ڈاک میں جلدی کی وجہ سوار کو تکان زیادہ ہوجاتا ہے

بقدر ہر سکوں راحت بود بنگر دریں عالم
دویدن رفتن استادن نشستن خفتن و مردن

تضمین غزل حضرت قدسی رح

رن میں گھوڑے سے گرا جس گھڑی ابن حیدر + دی صدا جلد خبر لے کے لو ابن علی + بنگہ لطف و کرم سید عالی نسبی
مرحبا سید مکی مدنی العربی + دل و جان باد فدایت چہ عجب خوش لقبی

میں ہوتا ہوں فدا شمع امامت اسلام + مثل پروانہ ہوں بیتاب بصد رنج و الم + جلد ہو جلوہ نما قسمت فلسالا یجرم
من بیدل بجمال تو عجب حیرانم + اللہ اللہ چہ جمال است بدیں بوالعجبی

اے جگر بند علی راحت جان زہرا + مرتبے سے ترے واقف نہیں ظالم اعدا + بخدا تو ہی جگر گوشہ محبوب خدا
نسبت نیست بذات تو بنی آدم را + برتر از عالم و آدم تو چہ عالی نسبی

مجھکو خیمے میں نہ بھیجا دشہ نیک صفات + ہوں خجل پیاسے اطفال کی سولا پیہات یاد ہی پیاس مین بچون کا یہ کہنا دن رات
ما ہمہ تشنہ لبانیم تو ئی آب حیات + لطف فرما کہ ز حد میگزرد تشنہ لبی

یا حسین ابن علی رہبر و عالی نسبی + جز ترے کون مددگار سلیم عاصی + بخشوانا اسے اے ہاشمی و مطلبی
سیدی انت حبیبی و طبیب قلبی + آمدہ سوئے تو قدسی پئے درمان طلبی

سید نذر حسین سلیم۔ ریواڑوی۔

حکایت

یہہ حکایت میں ناصر علی سرہندی کی مثنوی سے نقل کرتا ہوں کہ دلچسپ اور عجیب ہے۔

کہتے ہیں کہ ایک دفعہ لاہور (پنجاب) میں بڑا قحط پڑا کہ خلقِ خدا چیخ اُٹھی ؎

گزشت از آسمانہا زاریٔ خلق ۔۔۔ گذشت ناسور زخم کاریٔ خلق

بہ قتلِ عام شد برقِ غضب تیز
نظر وزد دید ابرِ رحمت انگیز

یکے از آشنایانِ دردِ دست یعنی اہل اللہ میں سے کسی بزرگ خدا رسیدہ نے بارگاہِ الٰہی میں آہ وزاری کی کہ ؎

اے حاجت پناہِ جان خستہ ۔۔۔ کلید قفل ہائے زنگ بستہ

خدایا! اپنے بندوں پر رحم کر اور بارانِ رحمت سے زمین کو سیراب فرما؛ اسپر غیب سے آواز آئی ؎

کہ اے صاحبدل اصلاح نفس کن　　اجابت سوخت از فریاد بس کن

دریں گنبد کہ فانوس صدا نیست
نوا ہا میرسد گوش آشنا نیست

مخلوق الٰہی میں خدا جانے کتنے رات دن واویلا کیا کرتے ہیں۔ کس کس کی سُنی جائے؟ جسے دیکھئے رو رہا ہے ۔

زبان سنگ گر فہمیدہ باشی ✦ ہمہ شور قیامت دیدہ باشی
بود ہر برگ را شبنم در آغوش ✦ کہ با آئینہ طوطی نیست خاموش
نہ بینی عنکبوتے را رسن ساز ✦ کہ محرم نیست از یک پردہ راز
نداری درد خاموشاں ہیچ اند ✦ سلیماں نیستی موراں فصیح اند

مخلوق کی نالہ و فغان سُنتے سُنتے یہاں کان بہرے ہو گئے۔ تجھے (خطاب بہ بزرگ خدا رسیدہ) خبر نہیں کہ اس معمورہ گذرگاہ آفت یعنی اس مُلک کی سرزمین پر ایک ضعیفہ ہے جو محبت الٰہی میں لیلیٰ و شیریں و زلیخا سے بازی لے گئی! بازی لینے کا ثبوت یہہ ہے کہ زلیخا نے حضرت یوسف ع کو خواب میں دیکھ کر، لیلیٰ نے قیس کو مکتب میں دیکھ کر، شیریں نے فرہاد کا امتحان کر کے عشق کا دعوے کیا تھا۔ اس عورت بیچاری ضعیفہ نے بغیر دیکھے بھالے مجھے پہچان لیا ہے

یہہ انداز جنوں اچھا نکالا ✦ لیا پہچان گو دیکھا نہ بھالا
بہ داغ ابتلائے ما گرفتار ✦ بہ عشق بے فنائے ما گرفتار
اگر گل خانہ را گلشن ماست ✦ وگر خار است خار دامن ماست

اس بے خانماں کو گھر نصیب نہیں۔ فرش زمین اس کا بچھونا اور آسمان سایہ بان ہے

نشان گم کردگیہا خانہ اوست ✦ خرابی ساکن ویرانہ اوست

داش درفکر تعمیر وطن نیست ❖ شہید ماست محتاج کفن نیست

مقتضائے غیرت نہیں کہ ایسے بے خانمان پرجس کے سر پر سایہ نہ ہو بارش کی مصیبت ڈالی جائے۔ جس کے ہاتھ پاؤں ٹوٹے ہوں اُس کو چھت پر سے گرانا ظلم ہے کہ منڈھے سر پر اولے پڑنا بڑی مصیبت ہے شکار زخم خوردہ پر جب زمین پر گر جائے گولی نہیں چلاتے کہ مرے کو مارنا مردانگی نہیں ❖

غرض معلوم ہوا کہ بارش کو برسنے کا حکم اسلیے نہیں ہوتا تھا کہ اُس بیچاری عورت کو گھر نصیب نہ تھا۔ جس کی چھت کے نیچے بارش کی تکلیف سے پناہ ملتی ❖

ذات باری تعالےٰ گو ہر بات سے مستغنی ہے مگر مصیبت زدوں اور مظلوموں کا اُسے بڑا خیال رہتا ہے۔ رستم واسفندیار سے زیادہ اُسے مکڑی وچیونٹی کی فکر رہتی ہے ❖ بارش میں جو کبھی کبھی دیر ہوجاتی ہے اس کے اسباب بھی اوسکی رحمت والطاف میں سمجھئے! آپ نے نہیں دیکھا کہ بارش میں جتنی دیر ہو جوانسہ[1] زیادہ سرسبز ہوتا ہے۔ اوسکی نظر میں نخل طوبےٰ اور جوانسہ کے کانٹے برابر ہیں ❖

قصہ مختصر۔ اب ان بزرگ خدا رسیدہ کو اوس زن بے خانماں کی تلاش ہوئی تلاش کرتے کرتے اوس عورت کے پاس پہونچے اور کہا کہ:-

گزشت امسال باراں چشمہ نکشود ❖ برآورد از مزاج خاکیاں دود
سموم از ہر طرف آتش برافروخت ❖ زباں افشانئے انجم فلک سوخت
ہوا میسوزد از خورشید چوں تفت ❖ صفا شد آب و از گلشن بروں رفت

حصارے از برائے تن ضرور است
دل است آن دل کہ از آسیب دور است

دل کی تعریف میں ناصر علی نے چند اشعار نہایت پاکیزہ لکھے ہیں:-

[1] جنھیں خس کی ٹٹیاں میسر نہیں گرمیوں میں جوانسہ کی ٹٹیاں لگا لیتے ہیں ❖

دل ست آں دل کہ افسردن نداند شہیدشش گرکنی مُردن نداند
دل است آن دل کہ بے پرواز قوت است دل است آن دل کہ بے لاموت است
دل است آن دل کہ بر آتش گذر کرد دل است آن دل کز دوزخ حذر کرد
دل است آن دل کہ با آفت ستیزد ز زخم شیشہ خون سنگ ریزد

دل کے لئے کسی چیز کی ضرورت نہیں، تن کے لئے مگر حفاظت کی ضرورت ہے۔ مکان بنانے کی اجازت دیجئے کہ گوسے

جُدا از ہر دو عالم خانمانت اجازت دہ کہ بندم آشیانت

یہاں ذرا غور کرنے کا مقام ہے کہ گھر بنانے کی صلاح سنکر اُس بیچاری پر کیا گذری ہے

گریزے زیں ادا بر خاطرش ریخت صدائے طبل وحشی را برانگیخت
تو پنداری کہ آن نخچیر آزاد
کمندے دید و دامے دید و صیاد[1]
ز ہر سو بسلے پرواز میداد بخود لرزید نشش[2] اوازمیداد
کہ اے خلوت سرا نامحرم راز ادا نافہم عشق خانہ پرداز
نیامد خانہ آرائے ز عشاق کہ مے جویند یارے از مکان طاق
چو یارا ز ہر مکان ہنگامہ باشد وفا گم کردہ در خانہ باشد
نے بینم مکانے خالی از یار
کجا گنجایش سقف ست و دیوار

آہوئے رم کردہ کی طرح اُس زن بے خانماں کو گھر کے نام سے وحشت ہوئی کہ یار کا جب گھر نہیں تو چاہنے والے کا گھر کہاں؟ لیکن خیر میں کہاں کہاں گھر بناتی پھروں گی، میاں کو ہر جگہ بتاتے ہیں اور مکان کا پتہ نہیں،

[1] اور اس طایر کا اضطراب سمجھ لیجئے جو صیاد کو دیکھے کہ جال پھیلائے اور کمند لگائے بیٹھا ہو۔ [2] بخود لرزید نشش "بدن کانپ اٹھا" بولانہ [illegible]

جو میاں کی مرضی ؎
بخندانند قبولش موہویم ۔ بگردانند عتابش رنگ رویم
فنا نم پرورا و حاجت خویش
بدو جویم نزو درطاقت خویش

یہہ کہکرا وس بے خانماں نے بزرگ خدا رسیدہ سے کہا کہ باتیں تو بہت ہوئیں۔ اب تشریف لے جائیے کہ ؎

سخن بسیار و فرصت برق جہیز ۔ صباحت شام شد برخیز برخیز

کہتے ہیں کہ آسمان سے آواز آئی ؎

کہ بس کن عالم آشوبی ستم کرد ۔ عنایت از ہمہ شئ کرم کرد
برو در خلوت و مستور بنشیں
ز تست ایں شورہا اے شور بنشیں

یہہ سنکر اُس شوریدہ منش کو ہنسی آئی کہ اب میاں ہی کا رخ بدلا نظر آتا ہے۔ اُن بزرگوار سے کہا کہ آج تو آپ تشریف لے جائیں کل دیکھا جائے گا ؎

بیا صبحے وفکرے یہ امر کن ۔ ہمہ آرام جان سرمایہ امر کن

یہہ بزرگ گھر پہونچے ہی تھے کہ بارش زور سے شروع ہوگئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے جل تھل بھر گئے؛ حضرت کو حیرت ہوئی کہ الٰہی یہہ کیا معاملہ ہے؟ کہ اوس کمبخت بدنصیب کے سر پر ابھی سایہ نہیں اور یہہ طوفان برگ و باران کس لئے؟ ابھی تک تو سایہ کی تکلیف تھی۔ آپ اوس بیچاری کو جان کے لالے پڑ گئے ہوں گے ؎

ندا آمد کہ آشوب از جہاں رفت ۔ ہمائے قدس سوئے آشیاں رفت
باصل آں قطرہ دیگر بار رُو کرد

محیطِ رحمت استقبال او کرد

عورت کے لئے پردہ راز کا فاش ہو جانا قیامت کا سامنا ہے. اوس بیچاری سے وداعِ جسم و جان کے سوا کوئی چارہ نہ دیکھا. اس شوخیٔ ہمت کے استقبال کے واسطے پروردگار نے بارانِ رحمت کو حکم دیا کہ تہنیت میں سے

ہماں دریائے بے ساحل زند جوش
من و ما چیست یک خواب فراموش

سُنا ہے کہ دولتِ فقر سے پہلے حضرت فریدالدین عطار رح اپنی دوکان پر بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک درویش نے سوال کیا کہ "بابا! کچھ خدا کی راہ پر" جیسا کہ عموماً دستور ہے حضرت نے رُوکھے پن سے جواب دیا کہ "شاہ جی آگے دیکھو" فقیر کو غصہ آیا کہ "بابا! تجھے خدا کی راہ پر ایک پیسہ نہیں دیا جاتا. تو خدا کو جان کیسے دے گا؟" حضرت عطار رح نے درویش کو جواب دیا کہ "جس طرح تو جان دے گا ہم بھی دے دیں گے" درویش نے کہا کہ "بابا. دیکھو ہم تو اس طرح جان دیتے ہیں" یہہ کہکر کملی بجوا ہ ڑہے ہوئے نعاتان کروہ فقیر حضرت کی دوکان کے آگے لیٹ گیا. حضرت نے دیکھا تو جان بحق تسلیم کردہ بود[1]. اُس دن سے حضرت رح نے دنیا ترک کر کے درویشی اختیار کرلی

---

[1] یہہ حضرت کا قول ہو جو بجنسہٖ نقل کیا گیا

مرنیکے بعد کیا گذرتی ہی؟

زبردستی نکالا باغ سے بلبل کو گلچین نے ✦ وہاں سے پھر نہیں معلوم اڑ جانے پہ کیا گذری!

اس بات کا دعوے کرنا کہ مرنے کے بعد کیا گذرتی ہے؟ دعوے کرنے والے کی حماقت ہے۔ مگر حماقت ہو یا نہ ہو اس کی فکر سب کو لگی ہوئی ہے: زندگی سے زیادہ مرنے کا خیال رہتا ہے. گو اس سے کچھ فائدہ ہو یا نہ ہو ✦

عنوان کا شعر حضرت جنوں کا کچھ کچھ حسب حال ہے کہ موت نے زبردستی ہمیں دنیا سے نکالا تو پھر معلوم نہیں کہ مرنے والے پر کیا گذری؟ دار فانی سے گذر جانے پر کیا گذرتی ہے؟ دار فانی کا تماشہ تو کچھ دیکھنے میں بھی آیا۔ دار البقا کا حال تو آج تک سننے میں بھی نہ آیا ✦ مرنے کے بعد اگر اچھی گذری تو اس کا کیا کہنا بری کا ذکر ہی کیا ہے ؎

رسائی تو ہوئی ان گیسوؤں تک شانہ بننے سے ✦ دل صد چاک بتلا پھر الجھ جانے پہ کیا گذری؟

صفحہ ۱۷ سے ۲۲ تک مطبوعہ مستنصر پریس فراشخانہ دہلی

لیکن مرنے سے پہلے انسان کے لئے مناسب ہے کہ جس قدر اس پر غور کر سکے دریغ نہ کرے۔ یہہ تحقیق ازروئے عقائد مشکل ہے کہ عقاید کی حد نہیں اور مسئلہ کا تعلق تمام بنی نوع انسان سے ہے ✤ پہلا سوال یہ ہے ؎

اے روح تن کو چھوڑ دیا تو نے کس لئے؟
گھر کا ترے مکان تھا کرایہ کا گھر نہ تھا

آجتک یہہ معلوم نہ ہوا کہ روح جس نے تمام عمر ہمارا ساتھ دیا اکبارگی کیوں خفا ہو گئی؟ اور خفا ہوئی تو جسم سے بازی کس طرح لے گئی؟ جسم کے ساتھ پیدا ہوئی تو جسم کے ساتھ ہی فنا ہونا ضرور ہے ✤ اگر جسم سے پہلے فرض کیا کہ سو برس پہلے پیدا ہو چکی تھی تو اُس زمانہ کا حال جب معلوم نہیں تو مرنے کے بعد کا حال اور نہیں تو سو ہی برس کا بتا سکے ✤ پھر اگر بتایا جاتا ہے تو ایک دوسرے کے بیان میں اختلاف کیوں ہے؟ اور اختلاف بھی ایسا کہ اگر ایک کا بیان سچ ہے تو دوسرے کا سچ ہونا ممکن نہیں ؎

چند دن جی کے فقط فرض ادا کرنا تھا ✤ تیرا بیمار جو کرتا نہ قضا کیا کرتا؟

جب زندگی لاچاری کی چیز ہے تو لاچاری سے رہائی کا رونا کیا؟ مرنے کے بعد اگر کچھ نہ ملا تو لاچاری سے پیچھا چھڑانا کیا تھوڑی نعمت ہو ؎

مریض غم کے دل کو جب یقین ہو جائیگا ✤ گوارا پھر طبیبوں کا تو احسان ہو نہیں سکتا

مرنے کے بعد اگر ہماری نیکیوں کا صلہ ملنا ہے تو ہمیں صلہ دینے میں کیا قباحت ہے؟ نیکی کا عوض اگر زندگی میں مل جائے تو دیکھنے والوں کو بھی نیکی کی طرف زیادہ رغبت ہو مثل ہے۔ "سخی سے سوم بھلا جو دیوے ترت جواب" ؎

بتوں کے در سے نہ گردوں اگر اُٹھا دیتا
وہیں نہ بیٹھکے دو دن خدا خدا کرتے

اگرہم کو ہماری نیکیوں کا صلہ یہیں ملجائے تو ہم نیکیوں کی زیادہ خواہش کریں جب نیکیوں کا عوض مرنے کے بعد قیامت پر ٹھہرا تو معمول سے زیادہ دیر ہو جانے میں اگر کوئی شبہہ کرے تو اُس سے خفا ہونا کونسا انصاف ہے

کل کی ہے کس کو خبر حشر تلک جلد یا باقی رہے

آج تو سب اہل کا دامن قاتل ہی ہاتھ ہے

مرنے کے بعد انسان کو صرف رحمتِ ایزدی کا سہارا ہوتا ہے۔ یہ اس وجہ سے کہ نباتات میں جو کمزور بیلیں ہوتی ہیں وہ درخت کے سہارے اُوپر چڑھتی ہیں گلو، اکاس بیل، امر بیل۔ اور اور نازک بیلیں صنفِ نازک کی طرح تن آور درختوں سے لپٹتی رہتی ہیں کہ اکیلے زمین پر روند نہ جائیں ۞ رحمت کے لئے توبہ کی ضرورت ہے۔ حضرت عیسیٰؑ نے بے گناہی سے گناہ کے بعد توبہ کو زیادہ ترجیح دی کہ وہ خدا جو ہمارے گناہوں کو دیکھتا ہے گناہوں سے توبہ کا زیادہ خیال رکھتا ہے؛ ایک پیسہ جو گر جائے اُوس کے ڈھونڈھنے میں گو چار پیسے کا خرچ ہو جائے مگر اُسکے ملنے کی ایسی خوشی ہوتی ہے جو جیب کے محفوظ پیسوں میں نہیں ہوتی ۞

نیچر یعنے عالمِ اسبابِ الستُ بربکم سے بھی پہلے مسلمانوں کے بچوں کی طرح کہ ہنوز سُننے کی قوت نہیں اون کے کانوں میں اذان پکاری جاتی ہے۔ ہر ذیحیات کے کان میں پھونک رکھا ہے کہ جو کچھ ہے تو ہی ہے۔ تو اپنی ہی فکر میں لگا رہ ۞ تعلقاتِ خانگی کا حکم ہے کہ تو اور تیرے متعلقین یہی تیری دُنیا ہے۔ حب الوطنی کہتی ہے کہ اپنے ملک و وطن کی خیرخواہی بھی ضرور ہے ۞ مذہب کا ارشاد ہے کہ ہمارے عقاید درست ہیں باقی غلط ۞ زندگی کہتی ہے کہ جو کچھ ہوں میں ہوں۔ مرے بعد خیریت ۞ موت کہتی ہے کہ زندگی کا لطف مرنے کے بعد ہے ۞ غرض ہر کس بخیالِ خویش خبطے دارد ۞

لیکن جس طرح دنیا میں جمعیتِ اضداد یعنی اجتماعِ ضدین کا لطف زیادہ ہے۔ تیز دھوپ میں سایہ کا لطف ہے۔ پانی برستا ہو تو آڑ میں چھت کے نیچے آرام ملتا ہے۔ عالمِ اسباب کی ہمدردی کا اثر بالضد سامان میں زیادہ ہوتا ہے۔ جاڑے میں گرم بچار۔ اور گرمی میں برف۔ برسات میں پانی کی بوندیں ایسی معلوم ہوتی ہیں گویا کسی حسین کے آنسو ٹپک رہے ہیں۔ بجلی کا چمکنا برقِ نگاہِ یار سے کم نہیں۔ بادلوں کا گرجنا موروں کے چیخنے سے زیادہ لطف دیتا ہے۔ جب بالضد اسباب میں نتیجہ کو لطف آتا ہے تو ممکن ہے کہ جس طرح آغاز میں عدم کے بعد ہستی اور ہستی کے بعد پھر عدم تو اب یہ سلسلہ کیوں بند ہو جائے یعنے ہم مر کر پھر کیوں نہ پیدا ہوں؟

نگاہ پھیرے ہیں ناحق کو ساکنانِ عدم ✤ نظر کی طرح پھر آئے وہیں جہاں سے چلے

خالی ہاتھ آئے اور خالی ہاتھ چلے تو اس خالی ہاتھ آنے جانے میں عالمِ اسباب کا کیا لے لیا؟ دولت و اقبال علم و جہل رنج و راحت سب یہیں چھوڑا۔

خجل زمین سے نہ شرمندہ آسمان سے چلے

وہاں سے لائے نہ لیکر کچھ اس جہاں سے چلے

آثارِ قدیمہ یعنے پرانے کھنڈروں کے دیکھنے سے دیکھنے والے کے دل پر زیادہ اثر اُن آثاروں کا ہوتا ہے جو جتنے زیادہ پرانے ہوں۔ سلطنت مغلیہ کے پُرانے کھنڈروں سے زیادہ پٹھانوں کے وقت کے کھنڈروں کو دیکھ کر زیادہ عبرت ہوتی ہے۔ لال قلعہ کی عمارتوں سے زیادہ تغلق آباد کے اُجڑے قلعہ کی بنیادیں دیکھ کر دل پر زیادہ اثر ہوتا ہے۔ ان سے زیادہ رائے پتھورا کی تعمیروں کے کھنڈر اور اُن سے پہلے جین مندروں کے کھنڈر اگر باقی ہوں۔ ان تمام کھنڈروں میں یہ بات دیکھنے میں آئی کہ پچھلوں نے پہلوں کے مسالہ سے کام لیا ہے۔ قطب

مینار مندروں کے پتھروں سے بنا۔ شاہجہان آباد پرانی دلیوں کے اجڑنے سے۔ اس سے ممکن ہے کہ ہماری بربادی پھر آبادی کا دیباچہ ہو۔ یعنے موت سے پھر زندگی ہو پرانی ٹوٹی پھوٹی قبروں کو دیکھ کر ہمیں خیال ہوتا ہے کہ یہ لوگ بھی ہماری طرح زندہ تھے جو یہاں پڑے ہوئے ہیں ہو زندوں کو اپنے اپنے بزرگوں کی قبریں بہت عزیز ہوتی ہیں۔ سعادتمند اولاد کو بزرگوں کے مزار کی قدر جائداد مکانات و کارخانہ جات سے زیادہ ہوتی ہے۔ گھر میں چاہے اندھیرا رہے مگر عزیزوں کی قبر پر چراغ جلانا زیادہ ثواب ہے۔ اپنے کپڑے چاہے میلے کچیلے ہوں مگر کفن سپید ہونا چاہیئے۔ آپ کو پھولوں سے شوق ہو یا نہ ہو مگر مرنے والے کی قبر پر پھولوں کی چادر چڑھانے کو جی چاہتا ہے۔ یہ کیوں؟ اسلیئے کہ جسکو ہم چاہتے ہیں وہ آنکھ سے گو اوجھل ہے لیکن دل سے دور نہیں۔ لوح مزار گویا زندگی اور موت کا سرحدی پتھر ہے جو دیہات میں ایک گاؤں کی سرحد کو دوسرے گاؤں کی سرحد بنانے کے لیئے لگا دیتے ہیں۔ یا یوں کہئے کہ قبریں گویا موت و زندگی کا ڈانڈا ملانے کے نشان ہیں ؎

نشاں جہاں میں رہتا نہ بے نشانوں کا
رہا جو نام تو لوح مزار کے باعث

رومیوں میں ایک غریب بوڑھے غلام کا ذکر ہے جس کی بی بی دو ننھے بچے چھوڑ کر مر گئی۔ بوڑھا باپ جب محنت مزدوری سے پلٹ کر آتا تو دونوں بچوں کو لیکر اس مرنے والی کی قبر پر جاتا اور آنسو بہاتا۔ جب تک زندہ رہا اس کا یہی مشغلہ رہا ہو اب آپ ہی کہیں کہ اسکا یہ دردو ہزار نوحہ اور مرثیہ سے زیادہ دلخراش نہ تھا؟ اسمیں یہہ فضیلت ہے کہ آواز کا واسطہ نہ تھا ؎

بادِ خزاں سے زور نہ شبنم کا جب چلے

رہ جائے کیوں نہ آنکھ سے آنسو کال کے

سُنا ہے کہ جہاز جب ڈوبنے لگتا ہے تو مسافر پہلے تو بہت مضطرب ہوتے ہیں پھر طبیعت کو سکون سا ہونے لگتا ہے کہ ع

مرگ انبوہ بہ از جشن نشاطے دارد

مرنے والے ایک دوسرے سے بغل گیر ہوتے ہیں کہ اب رخصت کا وقت ہے۔ چھوٹوں بڑوں مرد عورتوں یگانہ و بیگانہ۔ اپنے پرائے۔ دوست و دشمن سب کا یکساں حال ہوتا ہے۔ دیکھئے دیکھتے دیکھتے سب تہ آب ہو جاتے ہیں ٭ یہ بہشت میں نہ جائیں تو کہاں جائیں؟ ؎

اگر اے آسمان کچھ بر سر انصاف تو ہوتا

قبائے گل میں تار رشک ہو بلبل رفو ہوتا

زندگی اضطراب کا نام ہے۔ مگر موت اطمینان کا نشان ہے ٭ جیتے جی جو کچھ گھبراہٹ ہو ہونے دیجئے۔ مرنے پر گھبراہٹ کیا معنے؟ ؎

موند لیں آنکھیں کٹی راہ حیات ٭ ایسا سیدھا راستہ ہوتا نہیں

عشق کے باعث سے یہ مُشت غبار

خاک صحرائے فنا ہوتا نہیں

مرنے پر کیا گزرتی ہے؟

(محض از روئے معلومات[1])

یہہ مضمون جس قدر بڑھائے بڑھ سکتا ہے۔ اس میں معلومات کے اظہار کی بہت گنجایش ہے: اس لئے پھر لکھنے کو جی چاہتا ہے ×

مرنے پر سب سے زیادہ ضرورت اس بات کی ہوتی ہے کہ مُردہ کسی طرح زندوں کی آنکھ سے اوجھل ہو جائے۔ گرم ملکوں میں تو اس کام میں جس قدر جلدی ہو سکے جلدی کرتے ہیں۔ مگر ٹھنڈے ملکوں میں چند روز کی دیر لگاتے ہیں کہ عزیز و یگانے شکل دیکھ لیں × مصریوں نے البتہ کسی مسالہ سے نعش کو عرصہ تک رکھنے کی تدبیر نکالی تھی۔ مگر وہ اُس زمانہ کے مردوں کی طرح اُن کے ساتھ فنا ہو گئی ×

مُردوں کا جلانا حفظانِ صحت کے خیال سے مناسب سمجھا گیا × کیخسرو بادشاہ نے اپنی نعش کی نسبت وصیت کی کہ میری نعش کھلے میدان میں آبادی سے دور جنگل میں چھوڑ دی جائے تاکہ جن عناصر سے انسان بنا ہے یہہ زمین و آسمان کے عناصر سے جلد مل جائیں اور کارخانۂ عالم کی پیدایش میں مدد دیں × چونکہ تمام مخلوق کی حیات کا مدار دوسرے کی موت پر ہے۔ انسان جو خلقت کی اکثر چیزیں فنا کر کے جیتا ہے اس کے فنا ہونے پر خیال ہوا کہ انسان خود بھی اور جان داروں کے غذا ہو کر اُن کی زندگی کا باعث ہو × اس کے لئے دریاؤں میں نعش کا

[1] اس مضمون میں عقائد سے بالکل غرض نہیں۔ حقیقت فقط معلومات عام +

دریاؤں

بہا دینا کہ مچھلیوں کی غذا ہو جائے اور دخموں میں گِدوں چیلوں مُردار خوار پرندوں کا طعمہ بنے معقول تدبیروں میں ہے ۞ یہہ طریق نیچر سے زیادہ ملتا ہوا ہے کہ موت سے زندگی کے اسباب پیدا ہو جائیں ۞

لیکن انسان نِری نیچر کا بندہ نہیں ہے۔ اس میں انسانیت کا بھی بڑا جزو ہے اور انسانیت کا بڑا جزو محبت ہے۔ مقتضائے انسانیت و محبت یہہ ہے کہ جن کا ہم سے ساتھ رہا ہے ہم اُن کو یک لخت بھول نہ جائیں: مرنے والے کی یاد قایم رکھنے کے لئے سب سے اچھا طریقہ قبر کا ہے کہ مرنے کے بعد یہی نشان کم و بیش باقی رہ سکتا ہے ۞ میں نہیں کہہ سکتا کہ یہہ نشان دیرپا ہے مگر اور طریقوں مثلاً جلانے سے۔ دخموں سے۔ دریا میں بہانے سے زیادہ قیام پذیر ہے۔ علاوہ اس کے ایسا یادگار ہے جو آنکھوں کے سامنے زیادہ رہ سکتا ہے ۞

ایک قدیم مورخ کی زبانی ہے کہ اگلی قومیں غیر لوگوں سے جو ان کو ستانے آتے کہا کرتی تھیں کہ ملک ہمارا ہے۔ ہمارے باپ دادا آبا و اجداد اس زمین میں دفن ہیں: اور جب لاچار ہو کر نکلنا پڑتا تو بزرگوں کی ہڈیاں اُکھاڑ کر ساتھ لے جاتے ۞ بزرگوں کی یاد کے لئے سب سے اچھا ذریعہ ان کی قبریں ہیں۔ ان کی جتنی حفاظت کی جائے تھوڑی ہے ۞ سعادتمند اولاد کی نشانی یہی ہے کہ اپنے بزرگوں کی قبروں کو مٹنے نہ دے ۞

قدیم مصریوں میں رسم تھی کہ مُردہ کو دفن کرنے سے پہلے **پبلک** میں جو اہل الرائے ہوتے نماز جنازہ کی طرح جمع ہوتے اور مرنے والے کے چال چلن کی نسبت رائے لگاتے کہ مردہ **پبلک** کی طرف سے رعایت کا مستحق ہے یا یوں ہی بے گور و کفن دریائے نیل میں پھینک دیا جائے اصحاب دولت و جاہ کی نسبت تو اُن کی فیاضی و داد و دہش کا سوال ہوتا۔ کہ دولتمند

میں اسی ایک صفت کی ضرورت ہے: دولتمند ہو۔ جو سخاوت سے خالی ہو وہ گناہ کبیرہ کا مرتکب سمجھا جاتا ۔ دولتمندوں سے نماز روزہ عبادت و ریاضت کا بازپرس نہ تھا ساری نیکیوں کا عوض سخاوت سے ہوجاتا۔

غربا اور متوسط الحال لوگوں کی صفات میں گفتگو ہوتی کہ مرنے والے نے بال بچوں کی پرورش میں بہت محنت کی۔ میاں بی بی میں اتفاق رہا۔ محتاج ہوکر امانت میں خیانت نہیں کی۔ ماں باپ کی خدمت کی۔ کسی کو تکلیف نہیں دی۔ اسی رائے کے موافق لوحِ مزار کے کتبے لگائے جاتے تھے۔ میری رائے میں بھی قبروں پر بڑے بڑے نظم کے قصیدے اور دوست و اقبال کے مرثیے بیکار ہیں۔ مُردہ کو اس سے کیا غرض کہ مادۂ تاریخ لاجواب ہے اور شاعری نہایت درجہ کی ہے۔ تاریخ وفات غالب کی کہی ہوئی ہے یا ذوق کی۔ داغ کی ہے یا امیر مینائی کی۔ کتبوں میں مرنے والے کی نیکیاں اور خوف خدا کی مثالیں زیادہ ضروری ہیں۔ عورتوں کی قبر ہو یا مرد کی دونوں کی نیکیوں سے سروکار رہے۔ نیکی میں مرد عورت دونو برابر ہیں بلکہ عورت رعایت کی زیادہ مستحق ہے کہ پارسائی میں عورت کو زیادہ لحاظ رکھنا پڑتا ہے۔ مرد کتنی ہی لغزشیں کریں اس قدر بدنام نہیں ہوتے جس قدر کہ عورت ایک خفیف سی لغزش سے مطعون ہو جاتی ہے۔

ابھی میں عرض کر آیا کہ لوحِ مزار کے کتبوں میں کمال شاعری کی ضرورت نہیں۔ ان کا طرز بیان یہہ ثابت کرے کہ گویا مرنے والے زندوں کو نصیحت کر رہے ہیں تاکہ ہمیں عبرت ہو۔ نہ کہ یہہ معلوم ہو کہ ہم مردوں کو سمجھا رہے ہیں۔ بلسانِ دیوانگانِ عشق مُردے ہمارے سمجھانے سے سمجھ چکے۔ فاتحہ درود نذر نیاز سیوم چہلم بھی بیکار نہیں۔ یہہ رسمیں یادگار کی تائید کرتی ہیں: بلکہ ان سے

ایک خاص تعلق زمانِ گزشتہ کا زمانۂ حال سے اور زمانہ حال کا نامعلوم آئندہ سے پیدا ہو جاتا ہے اور دُنیائے فانی کا رشتہ لازوال خیالات تک پہونچ جاتا ہے؛

یہہ بات قبول کرنے میں طبیعت ذرا ہچکچاتی ہے کہ انسان مرتے ہی ناپاک ہو جاتا ہے۔ مُردے کو چھونے یا تجہیز تکفین میں شریک ہونے سے غسل کرنا ضرور ہو: اکثر قدیم وجدید قوموں میں اس رسم کا دستور ہے؛ حفظانِ صحت کے لئے تو یہہ دستور بُرا نہیں مگر مقتضائے محبت نہیں کہ جو زندگی میں ہمیں عزیز ہو اُس سے مرتے ہی پرہیز کرنا فرض ہو جائے۔ حالاں کہ مرنے میں مرنے والے کا کیا قصور ہے؟ جانور کو جب ذبح کرتے ہیں تو ذبح کرنے سے غسل کی شرط عاید نہیں ہوتی۔ یوں آپ دن میں سو بار نہائیں مگر مرنے والے کو ناپاک سمجھنے سے کہ بغیر نہائے کھانا پینا جائز نہیں طبیعت اُلجھتی ہے کہ زندگی میں تو ہم جس پر جان دیتے تھے مر کر وہ ایسا نظر سے گر گیا کہ اس کو چھونا بھی پسند نہیں؛

انسان دُنیا میں خدا کی بنائی ہوئی چیزوں میں رخنہ زیادہ ڈالتا ہے۔ اس کو خبط ہے کہ جہانتک اس کا بس چلے عالمِ اسباب کی شکل حالتِ اصلی پر نہ رہنے دے۔ پہاڑوں کو کاٹ کر سڑکیں بناتا ہے۔ دریاؤں کا رُخ بدل کر نہریں نکالتا ہے۔ کانیں کھود کر خدا کی زمین میں قعر پیدا کرتا ہے۔ زمین پہ چلتے چلتے ہوا میں اُڑنے کا سامان کرتا ہے۔ جانوروں کی کھال کھینچتا ہے انگور سے شراب بنالیتا ہے۔ اپنے مطلب کے لئے کوئی چیز اصلی حالت پر نہیں رہنے دیتا نتیجہ یہہ کہ مرنے کے بعد اس کی بھی کایا پلٹ خاصی ہوتی ہے۔ مُردہ بدستِ زندہ؛ جناب اکبر کا شعر ہے ؎ تمہیں بتائیں کہ مرنے کے بعد کیا ہوگا؟؛ پُلاؤ کھائیں گے اور نام فاتحہ ہوگا؛

ہمارے ہاں کی سوسائٹی میں میں نے مرنے پر یہہ باتیں اکثر سُنی ہیں:-

جُمعہ کا دن تھا۔ مرنے والے کو بہت اچھا دن ملا: جنازہ کی نماز میں مسجد کی سیڑھیوں تک بھیڑ تھی ؛ ابر آگیا۔ بوندیں پڑنے لگیں: رحمت کا نشان ہے ؛

جائیداد اپنے سامنے تقسیم نہ کر گئے۔ اب نالشیں ہوں گی: ساری کمائی کچہری میں برباد جائے گی ؛ دو بی بیوں سے اولاد ہے۔ جوان کا خدا حافظ ہے ؛

مرنے والے کی عُمر اگر زیادہ ہے تو کہا جاتا ہے کہ عمر اچھی پائی۔ پوتا پوتی نواسے نواسی خدا کے فضل سے دیکھ لئے۔ بیاہ شادیاں دھوم سے کیں۔ اولاد کے لئے اتنی دولت چھوڑی کہ تمام عمر بیٹھے کھائے جائیں ؛ مرنے کے بعد کسی نے خواب میں دیکھا کہ باغ میں ٹہل رہے تھے ؛

کسی کا افسوس ہوتا ہے کہ دو بیٹیاں بے بیاہی چھوڑ گئے۔ بیٹا ناکتخدا ہے ؛ فلاں بزرگ بڑے محتاط تھے اپنے گور کفن کے لئے پہلے سے ایک معقول رقم علیحدہ رکھ چھوڑی تھی۔ یہہ نہایت پیش بینی کی بات سمجھی جاتی ہے ؛ غرض ہزار مُنہہ ہزار باتیں ؛

مجھے اندیشہ ہے کہ مرنے کے بعد کا مضمون اتنا وسیع ہے کہ دُنیا کے کتب خانے خالی ہو جائیں مگر اس کا ختم ہونا مشکل ہے ؛

اسپریچوئیل اِزم والوں نے اس معاملہ میں بہت دعوے کئے۔ حاضرات نقش و تعویذ۔ وظیفہ و ظائف۔ زیارات۔ مُردوں کو خواب میں دکھانا۔ صدہا باتوں کا رواج ہوا جن کے معتقد و منکر ہر زمانہ میں مانتے اور انکار کرتے چلے آئے ؛ بے شمار قیاسات اور بے گنتی خیالات کے بعد اب سائینس نے بھی پھٹے میں پاؤں دینے کا ارادہ کیا ہے۔ چنانچہ تازہ خبروں میں امریکہ سے یہہ خبر حال میں آئی ہے کہ:-

موت کے بعد حالات دریافت کرنیکا آلہ

دنیا میں آج تک جتنے موجد ہو چکے ہیں کسی کو اتنی شہرت نصیب نہیں ہوئی جتنی کہ مسٹر ٹامس ایڈیسن امریکہ کے مشہور و معروف موجد کو ہوئی ہے۔ مسٹر ایڈیسن نے کئی ایجادیں کی ہیں۔ جو انسان کی زندگی میں مفید اور کارآمد ہو رہی ہیں سنیما کی متحرک تصاویر فونوگراف سٹوایج بیٹری مکمل ڈائنمو۔ مسٹر ایڈیسن کی چند ایجادوں میں سے ہیں۔ مسٹر ایڈیسن نے اپنی تمام زندگی کچھ نہ کچھ ایجاد کرنے کے لئے وقف کر رکھی ہے۔

یہ شخص آج کل ایک حیرت انگیز اور انسانی خیالات میں انقلاب پیدا کرنے والا آلہ بنانے میں مصروف ہے اس آلہ کو صرف مرے ہوئے انسان چلا سکیں گے۔ بشرطیکہ مرنے کے بعد کوئی ہستی قائم رہتی ہو۔ مسٹر ایڈیسن کو اس بات کا علم نہیں اور نہ اس کا یقین ہے کہ مر جانے کے بعد شخصیت قائم رہتی ہے۔ لیکن چونکہ کروڑ ہا انسانوں کا اعتقاد ہے کہ مرنے کے بعد روح زندہ رہتی ہے اس لئے مسٹر ایڈیسن کہتے ہیں کہ اگر یہ خیال درست ہے تو ان کا آلہ ایسی تحقیقات کے لئے مفید ثابت ہوگا۔

اس زمین پر اربوں انسان موجود ہیں اور ان سب کو ایک نہ ایک دن اس دنیا سے کوچ کرنا ہے۔ مگر ان میں سے کسی ایک کو بھی اس بات کا علم نہیں کہ مر جانے کے بعد کیا حالت ہوتی ہے۔ اگر حیات بعد الموت کے بارہ میں تحقیقات ممکن ہے تو صرف سائنس کی مدد سے ہو سکتی ہے جس طرح کہ سائنس کی مدد سے علم طب اور سرجری علم کیمیا۔ علم اسٹرانومی۔ اور دیگر علوم و فنون میں ترقی ہوتی ہے اور آئے دن نئی معلومات دریافت ہوتی رہتی ہیں۔ اسی طرح انسان کے مرنے کے بعد کی زندگی کے متعلق بھی تحقیقات ہونی چاہئے۔

مختلف مذاہب کے خیالات کے مطابق مختلف خیالات بعد الموت کے متعلق رائج ہیں۔ جو محض گپ شپ ہیں اور ناقابل یقین ہیں۔ اور کسی شخص کی ان سے تسلی نہیں ہوتی۔ مسٹر ایڈیسن اپنا آلہ نیا اس مدعا سے بنا رہے ہیں کہ جن لوگوں کو ایسی تحقیقات کا شوق ہو ان کو آسانی مل سکے۔

جب امریکہ اور یورپ کے اخبارات میں اس آلہ کا ذکر شایع ہوا تو وہاں کے سائنس دانوں کو تعجب ہوا۔ دنیا کے زیادہ تر موجد اور سائنس داں روحانیت کے قائل نہیں۔ اس لئے مسٹر اڈیسن جیسے صفِ اول کے موجد کا مرنے کے بعد کی حالت کو دریافت کرنے کے واسطے آلہ بنانا باعثِ حیرت ہوا۔ فرانس کے اخبار نویسوں نے لکھا۔ کہ کس طرح ممکن ہو سکتا ہے کہ مرے ہوئے انسان زندہ انسانوں کے ساتھ آلہ کے ذریعہ بات چیت کر سکیں گے۔

اخبارات کے طرزِ عمل پر مسٹر اڈیسن کو افسوس ہوا۔ کہ وہ اپنے آلہ کے ظہور میں فی الحال کچھ نہیں کہنا چاہتے تھے۔ مگر اخبارات اور عوام کی آگاہی کے لئے انہوں نے اپنے آلہ کے متعلق مختصر طور پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اُن کا آلہ تجربہ کی حالت میں ہے۔ اور یقینی طور پر فی الحال اس کے بارہ میں کچھ نہیں کہا جا سکتا ہے۔ مسٹر اڈیسن کہتے ہیں کہ اس بات کا تصور کہ روح کیا چیز ہے انسانی سمجھ میں نہیں آ سکتا جس چیز کی نہ تو شکل ہے اور نہ وزن ہے وہ نفی ہے اور نفی کا تصور وہ کیا کرے وہ اس بات کو نہیں مانتے کہ روحیں دُنیا میں موجود ہیں اور خاص حالتوں میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ کچھ عرصہ سے ان کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ ایک ایسا آلہ بنانا ممکن ہے جس کو وہ شخص چلا سکیں گے جو مر چکے ہوں بشرطیکہ مرنے کے بعد کوئی شخصیت قایم رہتی ہو کسی فردِ بشر کو اس بات کا علم نہیں کہ مرنے کے بعد کوئی شخصیت قائم رہتی ہے یا نہیں۔ یہ آلہ اس انجن کی طرح ہوگا جس کے ذریعہ ½ گھوڑے کی طاقت پچاس گھوڑے کی طاقت پیدا کی جا سکتی ہے۔ یہ آلہ اسی اصولوں پر ہوگا۔ خفیف حرکت سے کئی گنا طاقت پیدا ہوگی اور اس طاقت کے ذریعہ جن جسم کا کارڈ لینا مقصود ہو حاصل کیا جا سکے گا اس سے زیادہ مسٹر اڈیسن اپنے آلہ کے بارہ میں کچھ نہیں کہنا چاہتے۔

(از دسٹرکٹ گزٹ علیگڈہ)

واقعاتِ دارالحکومتِ دہلی

یہہ کتاب جناب مولوی بشیرالدین احمد صاحب رئیس دہلی خلفِ شمس العلما جناب مولوی نذیر احمد صاحب مرحوم - ایل - ایل - ڈی - او - ایل کی تصنیف ہے - پرانی دلّی اور شاہ جہان آباد کے قدیم و جدید عمارتوں - حالات و واقعات کے بیان میں اس سے زیادہ مُفصّل و مکمّل تاریخ اُردو میں اب تک شایع نہیں ہوئی - گو انگریزی میں اس موضوع پر اکثر کتابیں موجود ہیں : اُردو میں سب سے پہلے سر سید احمد خاں بہادر نے آثار الصنادید لکھی - آثار الصنادید کے بعد یہہ کتاب دیکھنے میں آئی ؛ آثار الصنادید کو اول تو نام بہت اچھا ہاتھ آیا - دوسرے اُس وقت حکام انگریزی اکثر اس طرح کی تحقیق کی طرف متوجہ تھے - آثار الصنادید کی بہت قدر ہوئی ؛ آج کل ہندوستانیوں خاصکر مسلمانوں کا رُخ تحقیق و تاریخ کیطرف بہت کم ہے - پھر بھی مولوی بشیرالدین احمد صاحب کی محنت دلّی کی عمارتوں کی تحقیق و حالات میں نہایت قابلِ قدر ہے ؛ مُصنّف نے اس کتاب پر بہت وقت اور روپیہ خرچ کیا - مُجھے گمان نہیں کہ اس کے بعد کوئی اور اس قدر محنت اور خرچ گوارا کریگا ؛ دلّی والوں خاصکر مسلمانوں کے لئے یہہ تصنیف بہت بکار آمد اور ضروری ہے ؛ اس فن کی کتابیں انگریزی میں میں نے اکثر دیکھی ہیں اُن میں آثار قدیمہ کا حال تو بہت مُفصّل و محققانہ ہے - مگر عمارات و مقامات جدید

کا حال جو بعد تعمیر ہوئیں یا جو ترمیم ہوئی اُن کا ذکر گزشتہ تصانیف میں نہیں تھا اُن کا حال اور تحقیق اس کتاب میں بہت مفصل ہے۔ یہاں تک رسالہ صلائے عام کا ذکر بھی مجھے نظر آگیا۔ یہہ ذکر میرے والد ماجد قبلہ مرحوم مولوی سید ناصر الدین محمد ابوالمنصور امام المناظرہ کے حال میں ضمناً اس طرح آگیا کہ:۔

× × × × × ”آپ کے بڑے صاحبزادے مولوی سید ناصر علی مشہور ادیب اور رسالہ صلائے عام کے ایڈیٹر اور مالک ہیں۔ چوں کہ علمی شوق آپ کو اپنے والد سے ورثہ میں ملا ہے اس لئے محض اپنے علمی مذاق پورا کرنے کے لئے آپ نے یہہ رسالہ نکالا ہے جس میں عمدہ ادبی مضامین ہوتے ہیں اور بہت آب و تاب سے نکلتا ہے“ × × × × × × × × × × × × × ×

(از صفحہ ۱۹۴ حصۂ دویم واقعات دارالحکومت دہلی)

یہاں میں ضمناً یہہ عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں کہ حسن اتفاق سے مجھے جناب مصنف کی خدمت میں نیاز حاصل ہے۔ میں نے دیکھا کہ صلائے عام کی سالانہ جلدیں احتیاط سے مجلد آپ کے کتب خانہ میں موجود رہتی ہیں۔

صاحب تصنیف نے میرے والد ماجد کے لوح مزار کے اشعار کی نسبت لکھا ہی کہ بعض شعر پڑھنے میں نہیں آئے۔ یہہ شکایت عرصہ ہوا کہ مٹ گئی: لوح مزار کے شعر جو اُس وقت جناب مصنف سے پڑھے نہ گئے یہاں نقل کئے جاتے ہیں تا کہ کتاب ”واقعات“ جب دوبارہ چھپے تو شکایت کی ضرورت نہ رہے۔

(بقیہ) باوزیر

لوحِ مزار سیّد ابو المنصورؒ

سنہ ۱۳۲۰ ہجری

کلام الامام امام الکلام

بر مزارم نہ چراغے نہ گلے می باید ÷ اے عزیزاں فقط الحمد و قلے می باید

کردہ ام خدمت اسلام بہ دور آخر ÷ با من امداد ز ختم الرسلے می باید

ادب شہر خموشاں ست مزاج ارواح ÷ اندریں خانہ نہ شورے نہ غلے می باید

ہر کہ در دعوت اسلام تگ و دو دارد ÷ بر صراطش نہ دواب و نہ پلے می باید

مست زیک نظر لطف خدایم منصور[1]

در بہشتم نہ کبابے نہ گلے می باید ÷

کامل العصر من خیار النّاس ÷ ناصر الدّین صاحب لافضال

ہاتفِ غیب عام رحلتہٖ ÷ یا امام المناظرہ - قد قال

۱۳۲۰

فُرطِ خوشی میں حوروں سے رضوان نے کہا

جنّت میں آج آئے امام المناظرہ

۱۳۲۰

---

[1] یہ شعر والد ماجد کے ہیں جو وفات سے پہلے ایک کتاب کے حاشیہ پر آپ کے ہاتھ کے لکھے ہوئے ملے

باکار و بے کار

ع باکارم و بے کارم چوں مد بحساب اندر

باکار اور بے کار کا تعلق ہر انسان سے ہے چاہے وہ کسی ہیئت و کیش میں ہو۔ مگر ہمارا مقصد مضمون ہذا میں اُس باکار و بے کار سے ہے جس کو ملازمت سے سروکار ہو ہم کسی اور پیشہ و طرزِ زندگانی کو اس مضمون سے مربوط نہ کریں گے۔ اور ملازمت کے فرقہ میں بھی ہم کو تخصیص اُس ملازمت سے ہے جو شاہِ وقت کی ہے ؛

شاہ وقت کے ملازم یا تو خود وطن شاہ کے رہنے بسنے والے ہیں یا ملکِ مفتوحہ کے ہندوستان میں یا تو اہل ولایت ملازم ہیں یا اہل ہند۔ قدرتی طور پر اور شایان سلطنت سے بھی حکمراں قوم کو جمیع دیگر اقوام پر تفوق و فضیلت ہے۔ پس جو ملازم غیر قوم کے ہیں وہ ہمیشہ دست نگر قوم حکمراں کے رہتے ہیں۔ لیکن بوئے تحکّم بالیقیں تلخ ہوتی ہے جس سے حلق تک کڑوا ہو جاتا ہے اور غیر قوم کو چار و ناچار اُس کا متحمل ہونا پڑتا ہے ؛

تھوڑی دیر کو ہم تحکّم کی بو باس کو نکالے ڈالتے ہیں جو حکمراں قوم کا حصہ ہے تو محض انسانی اخلاق کی پابندی باقی رہجاتی ہے جو حکمراں قوم اور دیگر اقوام کے درمیان راہ و رسم پیدا کرتی ہے۔ اور جس سے ہم تشخص کو بھی بالقصد دور پھینکتے ہیں۔ کیوں کہ تشخص ایک ایسا اخلاق نکوہیدہ ہے جس سے گو کوئی نقصان نہ پہونچے مگر اہلِ تشخص ترچھی نگاہوں سے ضرور دیکھے جاتے ہیں اور لوگ اُن سے مونسانہ تعلقات پیدا کرتے ہوئے احتراز کرتے ہیں اور اسی بنا پر اہلِ تشخص اس ہمدردی کے مستحق نہیں ہو سکتے جو بلا تشخصیت جتلائے ان کو ہاتھوں ہاتھ مِل سکتی تھی ؛

اگر کوئی ملازم سرکاری (شاہی) باحسن وجوہ اپنے خدمات مفروضہ کو ادا کر چکا ہے

تو وہ اس پر ناز کرتا ہے کہ ہم سے خدمت کا انجام ہوا اور حق نمک ادا ہوا۔ یہہ ملازم بعد سبکدوشی خدمات کے شاہ وقت سے اجرِ خدمت بھی پاتا ہے یعنی پنشن پاتا ہے اور شکر گزاری کے ساتھ شاہ وقت کی دعاگوئی میں بقیۃ العمر زندگانی بسر کرتا ہے ؛ میں اس محل پر شاہ وقت کے سلوک پر نظر ڈالتا ہوں کہ شاہ وقت جب اپنے پنشنر پر نظر ڈالتا ہے تو بالیقین اپنی مسرت کا اظہار کرتا ہے اور قدر دانی کرتا ہے کہ ہمارے ملازم نے ہماری خدمت باحسن وجوہ انجام کو پہونچائی اور حد سے زیادہ مسرت اس کو جب ہوتی ہے جب وہ حکمران قوم کے ماسوا غیر قوموں میں اپنے خدمت گزاروں کو پینشنر دیکھتا ہے۔ ادھر تو پنشنر کا یہ قول ہوتا ہے کہ ہم آپ کی روٹیوں کے پالے ہوئے ہیں ادھر شاہِ وقت ربّ العزت کے سر بسجود ہوتا ہے کہ غیر قوموں کے لوگ ہمارے پروردہ ہیں ؛

امر حق تو یہہ ہے کہ پنشن پاکر اہلِ حکومت کے زمرہ میں شمار ہونا ایک فعل عبث ہے ع مفلس عورم مرا بازمرہ دیوان چہ کار۔ لیکن اہل دیوان کو اگر ان میں انسانیت آتی ہے تو پنشن یافتوں کو اپنے زمرہ کے بہترین اور افضل ترین انسانوں میں سمجھنا چاہئے اور ان کی عزت و توقیر ان کے مناسب حال کرنا چاہئے۔ اس موقع پر یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ دریا کے پار اترنے والے جب کشتی پر سوار ہو جاتے ہیں تو سوائے پار ہو جانے کے ہرگز کوئی دوسری فکر ان کے دامن گیر نہیں ہوتی۔ ایک مذاق کی بات پرلطف الاسہگیں اور عبرت انگیز یہہ ہے کہ جب بیچ دھار میں کشتی پہونچتی ہے تو ناخدائے کشتی موت کے فرشتہ کی یاد دلاتا ہے اور کشتی والوں سے کہتا ہے کہ یہہ خیرات کا وقت ہے خدا جانے کشتی کدھر کا پلٹا کھائے۔ اُس وقت اور بھی اہل کشتی کو پار لگ جانے کا خیال ایسا دامن گیر ہو جاتا ہے کہ خدا یاد آنے لگتا ہے۔ اس میں دو پہلو نکلتے ہیں ناخدا تو تشخص میں بھرا ہوتا ہے اور اُس کو اپنی جیب بھرنا مدِ نظر ہوتی ہے مگر اُس کی فقرہ بازی کشتی نشینوں کے دل پر واقعی اثر ڈالتی ہے اور وہ تحفظ جان کی غرض سے کچھ نہ کچھ خیرات ضرور کرتے ہیں ع عدو شود سبب نیک گر خدا خواہد

ی چلا

اسی حیلہ سے کشتی نشین لوگ کارِ خیر میں تو داخل نذر ہو جاتے ہیں۔ الغرض جو کشتی والے ہنوز دریا میں ڈگ مگ ہوتے جا رہے ہیں وہ نگاہ اٹھا کر اُس پار کے لوگوں کو جو اُن سے پہلے پار اُتر چکے ہیں بڑے رشک کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں اور خدا تعالےٰ سے یہہ دعا مانگتے جاتے ہیں کہ الٰہی ہم کو بھی تو اسی طرح سے پار لگا دے۔ ان کی نگاہ میں دراصل زندگی اُنہیں کی ہے جو پار لگ گئے اور خود اپنی یعنی کشتی والوں کی زندگی معرضِ خطر میں ہے ؂

کیسے خوش قسمت وہ لوگ ہیں جو صلۂ خدمت میں پنشن پاکر شکر گزاریِ شاہِ وقت اور خداوند ربّ العزّت میں مصروف ہیں اور کیسے لایق زرین النسان وہ اہلِ حکومت ہیں جو پنشن یافتوں کو عزّت و توقیر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں ؂ ابھی حال کا ذکر ہے کہ جناب صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر محکمۂ نمک (جو انگلش مین ہیں) بذات خود خان بہادر میر ناصر علی صاحب کے مکان پر (بمقام دہلی محلّہ فراشخانہ) تشریف لے گئے۔ کیونکہ جناب صاحب بہادر اور خان بہادر ہنگام ملازمت میں عرصہ ہوا ایک علاقہ میں ساتھ رہے تھے اور اب خان بہادر کے پنشن پانے پر انکے افسرِ وقت نے یہہ عزّت افزائی فرمائی جو قابلِ ہزار ہا آفرین کے ہے۔ ایسے مرزدول والے حاکم بالخصوص غیر قوم اور حکمراں قوم کے جب یہہ قدر دانی فرماویں تو اہلِ ہند کہاں تک اُن کی فرماں برداری کا دل سے دم نہ بھریں۔ اور اب پنشن والے تو بجز دعاگوئی کے کچھ نہیں چاہتے اور ان کا حال بالکل اس کے مصداق ہے کہ ع

با کارم و بے کارم چوں مد بحساب اندر ؂

راقم مرزا عرفان علی بیگ۔ آئی ایس او۔ از آگرہ

صلائے عام۔ پنشن کا انتظام گورنمنٹ انگریزی کی نعمتہائے عظمیٰ میں سے ہے کہ انسان جب ملازمت میں بوڑھا ہو جائے تو ضعیفی میں کوئی سہارا نہیں رہتا

جاری کی

فارسی کے اس شعر کی تمثیل کہ ؎

قدیمانِ خود را بیافزاے قدر ❊ کہ ہرگز ز پرورده آید نہ غدر

سرکار انگریزی میں نظر آرہی ہے کہ اتنا بڑا سلسلہ نمکخوار دعاگویوں اور جاں نثاروں کا ہر وقت جاری ہے ❊ واقعی پنشن خوار جس قدر اپنی سرکار کی ترقیٔ دولت و اقبال کے لئے جان و دل سے خیرخواہی کریں تھوڑی ہے ❊

یہاں یہہ کہنا بھی ضروری ہے کہ پنشن کا اتنا وسیع اور فیاضانہ انتظام کسی پہلی سلطنت میں نہ تھا۔ بخ کے طور پر چند شخصی و ذاتی ملازموں کے ساتھ ملازمت کے بعد خفیف سلوک ہوجاتا تھا۔ لیکن اس اہتمام اور قواعد و ضوابط کے ساتھ پنشن کے حقوق کی پابندی نہ تھی جو سرکار انگریزی میں ہے۔ یہہ سلوک اپنے نمک خواروں کے ساتھ بارگاہ ایزدی میں بے اثر نہیں رہ سکتا ❊

میں نے دیکھا کہ فوجی پنشن خواروں کا ایسا انتظام ہے کہ ان کی سرکار میں رسائی معقول ہے سول پنشن خواروں کی طرف سے کوئی کوشش ایسی نہیں سُنی گئی جس سے ان کی دلی خیرخواہیوں کا اظہار سرکار تک پہونچ سکے۔ سول ملازمت کے پنشن خوار خیرخواہی اور نمک حلالی میں کسی سے کم نہیں : ان کی ایک سوسائیٹی باضابطہ ہونی مناسب ہے کہ سرکاری کاموں میں جن کا تعلق سرکار و رعایا سے ہو ان کی خدمتیں دونوں کے لئے مفید ہیں ❊ ہر ضلع کے پنشن خوار ایسی ایک سوسائیٹی قایم کریں اور تبادلۂ خیالات کے لئے آپسمیں ایک جگہ ملا کریں ❊ دلی میں خان بہادر جناب بہاؤالدین صاحب ریٹایرڈ ڈپٹی کلکٹر جو صوبۂ متحدہ سے پنشن لیکر آئے ہیں اس طرح کی سوسائیٹی کے خیال میں تھے۔ اور پنشن یافتہ اصحاب بھی اس رائے سے متفق ہیں ❊ اس سوسائیٹی کا ماٹو یعنی نقطۂ خیال سرکار اور پنشن خواروں کے درمیان وہی شعر ہونا چاہئے جو میں عرض کرچکا کہ ؎

قدیمانِ خود را بیافزاے قدر ❊ کہ ہرگز ز پرورده آید نہ غدر

حضرت اورنگ زیب عالمگیر بادشاہ نے یہہ شعر اپنے خط میں بیٹے کے نام کسی قدیم ملازم کی سفارش میں بطور ہدایت۔

× CIVIL PENSIONERS ×

سِول پنشنخواروں کیلئے ایک سوسائیٹی کی ضرورت

جیساکہ صفحہ   میں جناب مرزا عرفان علی بیگ صاحب آئی۔ ایس۔ او کے مضمون "باکار و بے کار" کے نیچے صلائے عام کی طرف سے عرض کیا گیا سول پنشن خواروں کے لیئے تبادلۂ خیالات کے لیئے ایک سوسائیٹی کی ضرورت ہے جس میں سوشیل[1] - اِنٹیلیکچوئیل[2] لٹریری[3] - دل و دماغ کے خیالات اور معاملاتِ خاص و عام پر نظر ڈالی جائے + پنشن یافتہ اصحاب کی رائے زیادہ اعتبار کے لایق اس لیئے ہے کہ ان کو زمانہ کا تجربہ زیادہ ہو چکا ہے۔ دُنیا کے نشیب و فراز سے زیادہ واقف ہیں؛ یہہ جو کچھ کہیں گے سرکار اور رعایا یعنی گورنمنٹ اور پبلک دونوں کے لیئے مفید ثابت ہوگا +

اسوقت اگر کوئی مقام اور مکان مستقل طور پر ممکن نہ ہو تو سرِدست دہلی میں دفتر صلائے عام حاضر ہے اور اگر بالفعل سوسائیٹی کے شرکا کا ایک جا جمع ہونا دشوار ہو تو سوسائیٹی کے متعلق جس قدر تحریریں اور خط کتابت ہو نیازمند کے نام اس پتہ سے ہو سکتی ہے:- دہلی - فراشخانہ: مکان میر ناصر علی خاں بہادر -

اس کے سوا اور جو مقام تجویز ہو اور جو رائے قایم ہو اُس کی تعمیل میں دریغ نہیں:

میری یہہ التماس اسوقت ان اصحاب سے ہے:-

۱- خان بہادر جناب بہاؤالدین خاں صاحب ڈپٹی کلکٹر پنشنر -
۲- جناب مولوی بشیرالدین احمد صاحب تعلقہ دار پنشنر ریاستِ حیدرآباد (دکن)

(1) Social. (2) Intellectual. (3) Literary.

محمد خان بہادر

۳۔ خان بہادر پیرزادہ جناب محمد حسین صاحب خان بہادر سشن جج پنشنر۔

۴۔ خان صاحب جناب مرزا محمد علی خان صاحب پنشنر جوڈیشل ممبر ریاست ٹونک۔

۵۔ کرنیل زیڈ احمد صاحب بہادر پنشنر۔

۶۔ جناب خضر صاحب تحصیلدار پنشنر۔

۷۔ جناب پنڈت امرناتھ صاحب تحصیلدار پنشنر ۸۔ خان صاحب ڈاکٹر خواجہ شریف حسن صاحب

اِن اسمار مبارک میں مقدم و موخر کا لحاظ نہیں کیا گیا۔ یہہ صرف مثال کے طور پر لکھے گئے ہیں: نام بہت باقی ہیں۔ سوسائیٹی میں شرکت کے لئے صرف دو شرطیں ہیں۔ اوّل تو سوسائیٹی میں شریک ہونے کا ارادہ دوسرے جو صاحب شریک ہونا چاہیں (سرکار انگریزی کے پنشن خوار ہوں یا ریاست کے) ملازمت میں سوپیریر سروس سے پنشن لی ہو۔ سوسائیٹی کو عقاید مذہبی سے تعلق نہیں۔ اس کے آفس ہولڈر سوسائیٹی کے ممبروں کی کثرت رائے پر مقرر ہوں گے۔ اور ممبروں کی تعداد مقرر نہیں۔

یہہ چند سوسائیٹی کے اصول کا محض بہ غرض اطّلاع ہے۔ اس میں ابھی زیادہ تفصیل کی ضرورت ہے: جو صاحب چاہیں اپنی رائے سے مطّلع فرمائیں۔

متروک الفاظ کا استعمال

جس زمانہ میں جس چیز کا چلن ہوتا ہے وہی عام طور پر مرغوب طبع ہوتی ہے۔ ایک وہ بھی زمانہ تھا کہ جب غباروں کے ذریعہ سے لوگ ہوا میں اُڑتے تھے۔ یہہ غبارے ایک انوکھی اور نرالی چیز خیال کئے جاتے تھے۔ دُنیا تعجّب خیز نگاہوں سے دیکھتی اور اُن کی دید سے سیر نہ ہوتی تھی مگر علمائے طبیعات کی آنکھیں کسی اور شے کی متلاشی تھیں۔ آخر کار ہوائی جہاز کا ظہور ہوا۔ اس کے

ہوتے ہوئے بھلا کوئی غباروں کی خاک قدر کرتا نتیجہ یہ ہوا کہ غبارے دنیا سے ایسے اڑے کہ بالکل ناپید ہوگئے۔ بجنسہ ہمارے متروک الفاظ کا بھی انہیں غباروں کا سا حشر ہوا۔ ایک وہ بھی وقت تھا کہ جب الفاظ متروکہ یعنی ٹک۔ کسو۔ کبھو۔ لیک۔ کہیو وغیرہ۔ وغیرہ (یا ایسی بندشیں جو اب نہیں باندھی جاتی ہیں) ہماری زبان میں مستعمل تھے اور فصیح سمجھے جاتے تھے۔ آج وہ ہماری نظروں سے اس لئے گر گئے ہیں کہ ہم نے اُن سے دامن کشی ہو کر دوسری رابیں اختیار کر لیں ؎ سے رنگ تماشائے جہاں صورت خورشید ہ جو صبح کو دیکھا وہ نظر شام نہ آیا۔ (سودا) مگر یہ بھولے بھالے سادے سادے الفاظ جس حسن خوبی سے ہمارے شعرائے نگینوں کی طرح اپنے شعروں میں جڑے ہیں اس کی داد دل سے نکلتی ہے۔ میں یہاں میر۔ سودا۔ میر درد۔ مع کچھ اور شعراء کے چند خاص خاص اشعار جن میں الفاظ متروکہ استعمال کئے گئے ہیں لکھتا ہوں ؛

(ٹک) سودا ؎ فصل گل جاتی ہے سودا دیکھ لے نرگس کو ٹک ؛ باغ میں مہمان کوئی دن ہے بہار چمن۔ میر ملا ہے خاک میں کس کس طرح کا عالم یاں ؛ نکل کے شہر سے ٹک سیر کر مزاروں کی۔

میر درد۔ ساقی مرے بھی دل کی طرف ٹک نگاہ کر ؛ لب تشنہ تیری بزم میں یہ جام رہ گیا ؛

سودا۔ ٹک دیکھ صنم خانۂ عشق آن کے اے شیخ ؛ جوں شمع حرم رنگ جھلکتا ہے بتاں کا ؛

میر۔ کیا رکھا کرتے ہو آئینہ سے خلوت ہر دم ؛ ٹک کبھو بیٹھو کسو طالب دیدار کے پاس ؛

میر درد[1]۔ ہستی نے ٹک جگا دیا تھا ؛ پھر کھلتے ہی آنکھ سو گئے ہم ؛

سودا۔ اے غنچہ آنکھ کھول کے ٹک تو چمن کو دیکھ ؛ جمعیت دلی پہ ترے پھول ہنس چلے ؛

میر۔ ٹک گور غریباں کی کر سیر کہ دنیا میں ؛ ان ظلم رسیدوں پر کیا کیا نہ ہوا ہوگا ؛

میر درد۔ تو اپنے ہاتھوں آپ ہی پڑتا ہے تفرقہ میں ؛ اے امتیاز ناداں ٹک امتیاز کرنا ؛

میر۔ ٹک میر جگر سوختہ کی جلد خبر لے ؛ کیا یار بھروسہ ہے چراغ سحری کا ؛

میر۔ سرہانے میر کے آہستہ بولو ؛ ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے ؛

[1] میر درد نے اسی مطلب کو دوسرے لفظوں میں خوب ادا کیا ہے۔ گو کہ اس شعر کو مضمون سے کچھ تعلق نہیں مگر لکھتا ہوں ؎ خواب عدم سے چونکے تھے ہم تیرے واسطے ؛ آخر کو جاگ جاگ کے ناچار سو گئے۔ بشیر

دیکھا آپنے۔ ان اشعار میں "ٹک" نے تو جان ڈال دی ہے۔ اب "ٹک" نہیں بولتے اور "ذرا" کہتے ہیں۔ مولانا صفی لکھنوی یوں فرماتے ہیں ؎ غزل اس نے چھیڑی مجھے ساز دینا ؞ "ذرا" عمر رفتہ کو آواز دینا۔ ایک اور شعر ہے ؎ "ذرا" دیکھو تو بیرحمی مرے ترک ستمگر کی ؞ جواب خط میں بھیجی کاٹ کر گردن کبوتر کی ؞

(کسو) میر۔ کسو پہاڑ میں جوں کوہکن سر اب ماریں ؞ خیال ہمکو بھی ہے بخت آزمائی کا ؞

میر درد۔ گر نے نہ دویں خلق کی نظروں سے دل کو ہم ؞ کوئی اگر کسو کے سنبھالے سنبھل سکے ؞

میر۔ مگر دیوانہ تھا گل بھی کسو کا ؞ کہ پیراہن بھی سو جاگہ رفو تھا ؞

میر درد۔ مرا غنچۂ دل ہے وہ دل گرفتہ ؞ کہ جس کو کسو نے کبھو وا نہ دیکھا ؞

میر درد۔ جوں صبح چاک سینہ مرا اے رفوگراں ؞ یاں تو کسو کے ہاتھ بھی ہرگز رفو نہ ہو ؞

جس طرح میر اور درد نے اپنی موتیوں کی لڑیوں میں "کسو" کو پرو دیا ہے اسی طرح آتش۔ صفی اور خود سودا علیہ الرحمۃ۔ کسی (اب بجائے "کسو" کے "کسی" مستعمل ہے) کو اپنی سلک گوہراں میں اس طرح منسلک کرتے ہیں ؎ آتش۔ "کسی" نے مول نہ پوچھا دل شکستہ کا ؞ کوئی خرید کے ٹوٹا پیالہ کیا کرتا

صفی۔ مرے سر پہ ہے دامن گل کا سایہ ؞ "کسی" کو نہ چھاں اس کی ہمراز دینا ؞

سودا۔ "کسی" کے مرگ پر سودا نہ کیجیے چشم تر ہرگز ؞ بہت سا رویئے اُن کو جو اس جینے پہ مرتے ہیں۔

(کبھو) میر۔ ہزار جاں سے قربان بے پری کے ہیں ؞ خیال بھی "کبھو" گر را نہ پرفشانی کا ؞

سودا۔ مجلس سے مجھکو اُٹھتے جلیسوں کے سامنے ؞ عزت کبھو نہ دی یہ کہ پوچھے کدھر چلا ؞

میر درد۔ کیا مجکو داغوں سے سرو چراغاں ؞ کبھو تو نے اگر تماشہ نہ دیکھا ؞

میر۔ جہاں پُر ہے فسانہ سے ہمارے ؞ دماغ عشق ہم کو بھی کبھو تھا ؞

سودا۔ جہاں آباد تو کب اس ستم کے قابل تھا ؞ مگر کبھو کسی عاشق کا یہ نگر بھی تھا ؞

میر درد۔ یا رب یہ دل ہے یا کوئی مہماں سرائے ہے ؞ غم رہ گیا کبھو کبھو آرام رہ گیا ؞

میر۔ وہ موسم گل ہم کو تہ بال ہی گزرے ؞ مقدور نہ دیکھا کبھو بے بال و پری کا ؞

اب "ہم کبھو" کو چھوڑ کر "کبھی" کے عاشق بن بیٹھے ہیں۔ مومن خاں مرحوم خدا بخشے خوب کہتے تھے۔ فرماتے ہیں ؎ منتِ حضرتِ عیسےٰ نہ اٹھائیں گے کبھی ؛ زندگی کے لئے شرمندۂ احساں ہوں گے ؛
صفی لکھنوی یوں گوہر بار ہوتے ہیں۔ پڑھ جانا فاتحہ احباب نے کبھی آکر ؛ مگر مزار ہمارا صفی مزار نہ تھا ؛

(تئیں)۔ میر۔ دل کے تئیں آتشِ ہجراں سے بچایا نہ گیا ؛ گھر جلا سامنے پر ہم سے بجھایا نہ گیا ؛
میر درد۔ ماتم کدۂ جہاں میں جوا بر ؛ اپنے تئیں آپ رو گئے ہم +
میر۔ پہونچا جو آپ کو تو میں پہونچا خدا کے تئیں ؛ معلوم اب ہوا کہ بہت میں بھی دور تھا +
میر درد۔ غافل خدا کی یاد پہ مت بھولیو زنہار ؛ اپنے تئیں بھلا دے اگر تو بھلا سکے +
میر۔ تم نے جو اپنے دل سے بھلایا ہمیں تو کیا ؛ اپنے تئیں تو دل سے ہمارے بھلایئے ؛

تئیں کو بھی اب ہم نے دودھ کی مکھی کی طرح نکال کر پھینک دیا اور اس مفہوم کو اب ہم دوسرے طریقوں سے ادا کرنے لگے۔ آتش فرماتے ہیں ؎ طبل و علم ہی پاس ہے اپنے نہ ملک و مال ؛ ہم سے خلاف ہو کے کریگا زمانہ کیا۔ صفی کہتے ہیں ؎ ہوں نہ یارب دیکھنا دشمن کو بھی وہ دن نصیب ؛ جو فراق یار میں ہم نیم جاں دیکھا کئے +

(لیک[1]) میر۔ ہر قدم پر تھی اُس کی منزل "لیک" ؛ سر سے سودائے جستجو نہ گیا +
مومن۔ گو کہ ہم صفحۂ ہستی پہ تھے ایک حرفِ غلط ؛ "لیک" اُٹھے بھی تو ایک نقش بٹھا کے اُٹھے +
میر۔ بوئے گل اور رنگِ گل دونوں ہیں دلکش اے نسیم ؛ لیک بقدر یک نگاہ دیکھئے تو وفا نہیں ؛

(کہیو[2])۔ سودا۔ کہیو صبا سلام ہمارا بہار سے ؛ ہم تو چمن کو چھوڑ کے سوئے قفس چلے ؛
غالب۔ نہ کہیو طعن سے تم پھر کہ ہم ستمگر ہیں ؛ مجھے تو خو ہے کہ جو کچھ کہو بجا کہئے +

(رکھیو[3]) سودا۔ سمجھ[4] کے رکھیو قدم خارِ دشت پر مجنوں ؛ کہ اس نواح میں سودا برہنہ پا بھی ہے
غالب۔ رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی سے معاف ؛ آج کچھ درد مرے دل میں سوا اُٹھتا ہے +

---

[1] "لیکن" بولتے ہیں ؛ [2] "کہنا" آجکل بولتے ہیں ؛ [3] "رکھنا" مستعمل ہے ؛

[4] میر نے بھی خوب کہا ہے ؎ گزار شہر وفا میں سمجھ کے کر مجنوں ؛ کہ اس دیار میں میر شکستہ پا بھی ہے ؛ بشیر

اگلے وقتوں والے بھی کیا قیامت کے انداز اختیار کرتے تھے۔ بات معمولی ہوتی مگر اس پیرایہ میں بیان کرتے کہ سننے والا پھڑک اٹھے۔ میا مجبور (ایک قدیم شاعر تھے) کا ایک شعر ہے۔ ذرا سادگی اور اندازِ بیان ملاحظہ ہو ؎ ملایم ہوگئیں وپیر برہ کی ساعتیں کڑیاں ؛ پھر کٹنے لگیں آن بن نہ کٹتیں جب بنا گھڑیاں۔ میر صاحب کا ایک شعر ہے۔ اس کی بندشِ الفاظ غور فرمایئے گا۔ (باوجودیکہ وہ الفاظ اب متروک ہیں مگر اس خوش اسلوبی سے بٹھلائے گئے ہیں کہ داد طلب ہیں) ہائے کس مزے سے مطلب کو ادا کیا ہے ؎ دور بہت بھاگو ہو ہم سے سیکھے طریق غزالوں کا ؛ وحشت کرنا شیوہ ہے کچھ اچھی آنکھوں والوں کا۔ میں چند اشعار اور لکھتا ہوں جس میں مختلف متروک الفاظ استعمال کئے گئے ہیں ؎ نالہ۔ فریاد۔ آہ اور زاری ؛ آپ سے ہو سکا سو کر دیکھا ؛ سودا۔ زباں ہے شکر میں قاصر شکستہ پائی کے ؛ کہ جن نے دل سے مٹایا خلش رہائی کا ؛ غالب۔ خاکسار۔ اس کی تو آنکھوں سے کہے مت لگیو ؛ مجکو ان خانہ خرابوں ہی نے بیمار کیا ؛ میر درد۔ جنھوں کے دل میں جگہہ کی ہے نقشِ عبرت نے ؛ سدا نظر میں وہ لوحِ مزار رکھتے ہیں ؎ میر۔ پی دو اینٹ کی جُدی مسجد ؛ کسی ویرانہ میں بنائے گا ؛ میر۔ منہہ تکا ہی کرے ہے جس تس کا ؛ حیرتی ہے یہ آئینہ کس کا ؛ میر۔ دل وہ نگر نہیں کہ پھر آباد ہو سکے ؛ پچھتاؤگے سنو ہو یہ بستی اجاڑ کر ؛ میر۔ گل و آئینہ کیا۔ خورشید و مہ کیا ؛ جدہر دیکھا تدھر تیرا ہی رو تھا ؛

اب یہہ میٹھی میٹھی باتیں۔ سیدھے سادے الفاظ۔ دلکش انداز اور نرالی بندشوں کے سننے کے لئے کان ترس جاتے ہیں۔ اور میر کا یہ قول یاد آتا ہے ؎ باتیں ہماری یاد رہیں پھر باتیں ایسی نہ سنئے گا ؛ پڑھتے کسو کو سنئے گا تو دیر تلک سر دھنئے گا۔

مرزا محمد بشیر (ریاست۔ دتیا)

صلائے عام ۔ اس مضمون میں اساتذہ کے شعر بہت اچھے اچھے چھانٹے ہیں۔ مضمون نگار نے اشعار کے انتخاب میں بڑی قابلیت دکھائی ہے: رہا یہہ مسئلہ کہ ان کے ترک کرنے سے زبان کو فائدہ ہوا یا نہیں ہوا دوسری بات ہے ؛ جب یہ مسلمہ ہے کہ اردو میں الفاظ کی کمی ہے یہاں تک کہ اکثر الفاظ غیر زبان کے بہ لاچاری اس میں لانے پڑتے ہیں تو خود اس کے الفاظ کیوں ترک کئے جائیں؟ دوسرے جس لفظ سے کثرت استعمال کی وجہہ سے جو اثر ہوتا ہے وہ نئے لفظ میں پیدا نہیں ہوتا ؛ متاخرین نے جن الفاظ کو ترک کیا کوئی معقول دلیل ترک

تھادی کلام میں لائے۔ ترک کرنے سے وہ اثر نہ رہا۔ اس لئے متاخرین کے کلام میں مضمون کی خوبی کے عوض صرف زبان کی خوبی کی تعریف رہ گئی ؛ میری رائے ناقص میں متروکات سے زبان کو بہت

فائدہ نہیں ہوا ؛ مانگے تانگے کے سامان سے گھر کا اپنا پرانا سامان کام میں لانا بہتر ہے۔ بقول شیخ سعدیؒ ؎

کہن خرقہ خویش پیراستن + بہ از جامۂ عاریت خواستن

خدماتِ مرد وزن

یہ تو اظہر من الشمس ہے کہ خلقت مرد وزن کی خالقِ مطلق نے کسی نہ کسی غرض سے فرمائی ہے۔

عام طور پر تو دونوں ملکر خدا کی عبادت کے لئے پیدا ہوئے ہیں گو ایک شاعر نے جوہر لفاظی یوں چمکائے ہیں کہ ؎ دردِ دل کیواسطے پیدا کیا انسان کو ؛ ورنہ طاعت کے لئے کچھ کم نہ تھے کرّوبیاں ۔

یہ تو شاعر کا محض محدود خیال اور حُسن کلامی ہے ورنہ جو کچھ عالم ظہور میں ہے وہ سب پرستار احکم الحاکمین ہے جیسا کہ سعدی علیہ الرحمتہ نے صاف صاف صدق دل سے اظہار فرما دیا ہے کہ

؎ - پرستار امرش ہمہ چیز و کس ؛ بنی آدم و مُرغ و مور و مگس

اور پھر بھی حق عبادت وعبودیت تو کسی سے بھی پورا نہیں ہوتا اور حضرت انسان کیسے ہی عقل کے پتلے کیوں نہ ہوں اگر غافل ہیں تو حق عبودیت سے اور ایسے غافل کہ خراٹے بھر کر سوتے ہیں اور بالکل بے فکر۔ حافظ رح کا مقولہ ہے ؎ مگو دیگر کہ حافظ نکتہ‌دان است ؛ کہ ما دیدیم محکم غافلے بود۔ یہ حافظ کی ذاتی حالت ہے اور اسی پر غلبۂ قیاس ہے بلکہ یقین ہے۔

(نکتہ داں)

العرض خالقِ مطلق کی خدمت واطاعت کے واسطے یہی تو مرد وزن کو طاقت۔ ہمت و ہمدردی ایسی درکار ہے کہ ایک کا ایک معین رہے ورنہ بے لبسی میں کچھ بھی نہیں ہوسکتا اور پیدا ہوانا اور ناپید ہونا انسان کا دونوں برابر ہیں۔ عورت تو مرد ہی کی پسلی سے پیدا ہوئی ہے اور اس کی پیدایش حضرت آدم کی تسکین ودل بستگی تھی ورنہ اکیلے کہاں مارے پھرتے اور جب دونوں سے ملکر جوڑا ہوا تو ان کے رہنے بسنے کے واسطے گھر کی ضرورت پیش آئی۔ لیکن اس موقع پر ہمارا مقصود اس گھر سے ہرگز نہیں ہے جس کو تخصیص تعمیر سے ہے۔ بلکہ گھر ہم اُسی جگہ کو کہتے ہیں جہاں یہ انسانی جوڑا بسیرا لے۔ چاہے وہ گھر جواہرات سے مرصع ہو۔ چاہے سنگین ہو۔ چاہے خشتی ہو۔ چاہے جھونپڑا ہو اور چاہے محض درخت کا سایہ ہو یا جہاں یہ جوڑا بیٹھ جائے وہی گھر ہے۔

اُم سلمہ

گھر کے ساتھ اندر اور باہر کے الفاظ بھی پیچھا نہیں چھوڑتے اور اس کے سمجھانے کی ضرورت نہیں جو گھر میں ہے وہ گھر کے اندر ہے اور جو گھر میں نہیں ہے وہ گھر کے باہر ہے بس اسی اصول پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جب مرد و عورت ساتھ ہیں تو گھر میں ہیں اور ان میں اگر تفرقہ ہے تو کوئی اندر ہے اور کوئی باہر ہے یا دونوں باہر ہیں۔ اور وہ گھر گھر نہیں ہے۔

اب ہم گھر کے ساتھ ساتھ مرد و عورت کے خدمات کو بیان کریں گے خواہ اندرونی خدمات ہوں خواہ بیرونی یا دونوں۔ جب انسانی جوڑا مکمّل ہے تو یہ سب صورتیں باہمی خدمات کی محتاج بالیقین ہیں ورنہ مرد کو مرد کہنا اور عورت کو عورت کہنا محض صورت آشنائی کے لحاظ سے ہوگا کیوں کہ کوئی کسی کے کام نہ آوے گا۔ اور اس میں شک نہیں کہ دونوں مرد و زن کی یک جہتی پوری پوری گھر کی سلطنت ہے۔ اور یہ وہ سلطنت نہیں جس کو بادشاہ حکمرانی سے چلاتے ہیں اور چھوڑ چھاڑ کر چلے جاتے ہیں۔ یہ وہ سلطنت ہے کہ دم کے ساتھ ساتھ ہے۔ اور اپنی سلطنت ہے ورنہ ؎

شکوہ سلطنت و حکم کے ثباتے داشت ٭ ز تخت جم سخنے ماندہ است و افسر کے

کس کی سلطنت رہی ہے اور کس کی رہ جاوے گی ہا۔

قبل ازیں کہ ہم خدمات کا ذکر کریں ناظرین نزتمکین سے خاص طور پر یہ التجا رکھتے ہیں کہ گو میرا قلم کیسا ہی محرف چلے اور میرا نسیان چاہے جس درجہ تک بڑھ جاوے وہ براہ مہربانی اس امر کو تمام تر یاد رکھیں اور ایک لمحہ بھی فراموش نہ فرماویں کہ عورت کو مرد کی تسکینِ خاطر کے واسطے اُس بدیع السماوات والارض نے پیدا فرمایا ہے اور چونکہ عورت پسلی سے نکلی ہے لہذا اُس کا سیدھا ہونا بڑی ٹیڑھی کھیر ہے ظاہر ہے کہ پسلی ایسی ٹیڑھی ہے کہ سیدھا ہونا ناممکن ہے مگر ٹوٹ جانا آسان تر ہے پس ہم اگر تمثیلاً یہ عرض کردیں تو بیجا نہ ہوگا بلکہ خالی از لطف نہ ہوگا کہ عورت شیشہ آلات کی پارسل بھی ہے اور ٹیڑھی بھی ہے۔ جب ایسی نازک شے خدا نے ہم کو بخشی ہے تو اس کا سنبھالے رہنا ہمارا فرض ہے ورنہ تسکین خاطر ناپید ہے۔ سنبھالے رہنے سے میری مراد یہ ہے کہ سیدھا کرنے میں توڑتے نہیں اور پارسل اُٹھانے میں پھوڑتے نہیں۔ جب اس ٹوٹ پھوٹ سے محفوظ

ہوگی تو اس خدمت کے واسطے جو ہمہ تن تسکین ہے عورت مرد کے واسطے بہشت کی حور ہوگی۔ اور وہ حور ہوگی جو گویا مقصوراتٌ فی الخیام میں سے نکل کر ابھی آئی ہو؛

عام طور پر سب جانتے ہیں کہ مرد کو عوام سے واسطہ پڑتا رہتا ہے مگر عورت کو تخصیص خاص الخاص سے ہے اور اس تخصیص کو اپنی مصلحت سے خالق اکبر نے مرد و عورت دونوں کے ہاتھ میں دے دیا ہے اور اسی بنا پر مرد و عورت عقد کے پابند ہیں اگر یہ عقد نہ ہو تو ساری تسکین رائیگاں اور ساری خدمات عبث ہیں۔ بقولے ٹائیں ٹائیں فش۔ نہ مرد عورت کا میت اور نہ عورت مرد کی میت خدمات ہمدردی مُطلق ندارد اور میدان پٹ پڑے ہے گویا دنیا میں آئے ہی نہ تھے پس نکاح آمد چو لاحول و ولا٭ تاکہ دیوث نفگند اندر بلا[1]۔ لیکن یہ بھی واضح رہے کہ عورت کو اندرون خانہ تخصیص ہے اور بیرون خانہ بھی اسکی خدمات کارآمد ہیں۔ اور مرد کو اندرون خانہ اور بیرون خانہ دونوں جگہ تخصیص ہے یعنی وہ معاملات خانہ کا بھی ذمہ وار ہے اور معاملات بیرون خانہ سے بھی اس کو سروکار ہے۔

مرد کا کام جو اندرون خانہ سے مُتعلق ہے وہ تین شعبے رکھتا ہے۔ اوّل گھر کا آباد رکھنا۔ دوّم ضروریات خانہ داری کا مُہیا کرتے رہنا۔ سوّم حفاظت کرتے رہنا۔ کہنے میں تو یہ تینوں خدمات بڑی آسان ہیں مگر فی الحقیقت ایسی مُشکل ہیں کہ تمام عمران ہی خدمات کے کرنے میں ختم ہو جاتی ہے اور پھر بھی کچھ نہ کچھ کسر باقی رہتی چلی جاتی ہے۔ میں تو اُن مَردوں کو فرشتہ صفت کہنے میں ہرگز دریغ نہ کروں گا جو ان ہر سہ خدمات کو پورے پورے طور پر انجام دیکر اپنی عاقبت کا راستہ لیتے ہیں۔ وہ بہشت میں بس چین کرین گے۔

لیکن ان خدمات میں سے ایک بھی خدمت اس وقت تک انجام کو نہیں پہونچ سکتی جب تک کہ عورت کی مدد نہ ہو اور جب تک (مجھے یاد آگیا) عورت مرد کی تسکین بخش نہ ہو۔ ہم یہ پہلے عرض کر آئے ہیں کہ مرد و عورت کے واسطے گھر سلطنت ہے مگر سلطنت بغیر حکومت کے ایک دم بھی نہیں چل سکتی پس گھر کی حکومت کے واسطے ایک حکمراں کی ضرورت لازم ہے اور

[1] مولانا روم دفتر پنجم۔

یہ منصب جو بادشاہی ہے سوائے عورت کے مرد کو نصیب نہیں ہو سکتا پس گھر کی سلطنت عورت کی بادشاہت ہے اور اب یہ ماننا پڑے گا کہ سوائے مرد کے کوئی دوسرا فرد اُس کی حُکم برداری نہیں کر سکتا کیونکہ مرد کے سوا کسی میں یہہ لیاقت جو اہم ترین خدمت ہے ہرگز نہیں ہو سکتی اور وہ یہ حُکم برداری کیوں کرے گا۔ کیا غلام بنے گا؟ نہیں نہیں بلکہ وہ موعودہ تسکین جو مرد کو آفریدگار نے بخشی ہے بغیر ان خدمات کے انجام دہی کے مرد کو میسّر آجانا ناممکن اور بعید از عقل ہے ۔ اس سلطنت کے رشک کرنے والے تھوڑے اور حسد کرنے والے زیادہ ہوتے ہیں کیونکہ ہر شخص اپنا عروج چاہتا ہے۔ پس مرد کی نازک ترین اور اہم ترین خدمت یہ ہے کہ امن قایم رکھے ورنہ وہی ٹوٹ پھوٹ جس کا ہم ذکر کر آئے ہیں رخنہ پرداز یاں کرائیگی اور اُس طرح سے وہ سلطنت ہاتھ سے جاتی رہے گی جس کا عین مقصود تسکین ہے۔ مرد کو تمام خدمات سے خواہ وہ اندرونی ہوں یا بیرونی اپنے گھر کی حفاظت لازم ہے۔ مرد کے بیرونی تعلقات کا ذکر ہم طوالت کی نظر سے چھوڑتے ہیں۔ اور وہ بہت زیادہ ہیں۔ اُن کا حصر ان اوراق میں نہیں ہو سکتا۔

عورت کی خاص خدمت کا ذکر تو آ ہی چکا کہ مرد کی تسکین ہے اور یہ خدمت ایسی خدمت ہے جس کا دار و مدار مرد عورت کی باہمی زندگانی پر ہے اور اس کی تخصیص قدرت نے عورت ہی کو بخشی ہے اور یہ ایسی تخصیص ہے کہ اگر مرد کو نصیب نہ ہو تو وہ محض بے کار رہے اور صرف بے کار ہی نہیں بلکہ اُس کی زندگی وبال ہے۔ عورت گھر میں ایسی ہے جیسے کہ دائرہ میں مرکز یعنی جتنے خطوط محیط سے کھینچے جاویں گے اُن کا خاتمہ مرکز پر ہو گا۔ پس ہر مرض کی دوا اور ہر رنج کی شفا اگر دنیا کے پردہ پر ہے تو وہی ایک مرکز ہے جس سے تسکین حاصل ہوتی ہی اور جو گھر کی عورت ہے میں اُس محل پر گھر کی عورت کہتا ہوں جس سے مقصود وہی عورت ہے جس سے عہد و پیمان عقد میں ہو چکا ہے اور جو آئندہ زوجہ کے نام سے خطاب کی جاوے گی۔ اُس عورت سے اپنا مقصد ہرگز نہیں جو فطرتی قانون کی توڑنے والی اور قدرتی جوڑے کی پھوٹنے والی ہو جس نے خلوص کی کبھی ہَوا نہ پائی ہو اور جو محبت کا راستہ کبھی نہ چلی ہو اور جس نے ہمدردی کی

راہ و رسم سے کبھی واقفیت تک پیدا نہ کی ہو اور جو یہ بھی نہ سمجھتی ہو کہ اُس میں تسکین دینے کی قابلیت موجود ہے۔ مگر جس کو وہ کبھی کام میں نہیں لاتی۔

امر حق تو یہہ ہے کہ مرد کا کوئی کام کیسا ہی کیوں نہ ہو بغیر تسکین پائے انجام کو نہیں پہونچ سکتا۔ پس ہر امر میں عورت کی امداد شامل ہے چاہے وہ بالعمل ہو چاہے بالقوہ۔ عورت کی محبت اور عورت کا خلوص مقتضی اسی کے ہیں کہ وہ مرد کے تمام کاموں میں معین ہو۔ مرد کو امن قائم رکھنے میں پوری مدد پہونچاوے اور اپنی امداد اور حُسن خدمات سے مرد کو پورا آرام پہونچاوے۔ مرد اگر غم زدہ ہے تو اس کے زخموں پر مرہم رکھے۔ یہہ تو ایک معمولی بات ہے جس کو رات دن ہر اہلِ زمانہ دیکھتا ہے کہ جب کبھی مرد بیرونی خدمات سے پریشان اور متردد ہوتا ہے تو گھر میں پہونچکر اسے اطمینان ہو جاتا ہے عورت کی صورت دیکھتے ہی تسکین ہو جاتی ہے۔ مرد اگر درد سر لیکر گھر میں گھستا ہے تو عورت اُس پر صندل لگاتی ہے اور اس کا درد سر کھوتی ہے۔ بہر حال ہر درد و دُکھ میں عورت کی صورت دیکھکر تسکین پیدا ہو جاتی ہے۔ اور ان سب باتوں پر اگر عورت میں اخلاق حسنہ بھی موجود ہیں تو سونے میں سُہاگہ ہے۔ سب سے بڑی خوبی عورت کی یہی ہے کہ وہ اپنے حُسنِ خدمات سے مرد کو مطمئن رکھے اور مرد اس کی خدمات سے ایسا رضامند ہو کہ بقول حافظ ؎

درمسجد و میخانہ خیالت اگر آید ❊ محراب کمانخانہ ابروئے تو سازم
پروانۂ راحت بدہ اے شمع کہ امشب ❊ از آتشِ دل پیشِ تو چوں شمع گدازم

اللہ میاں کے گھر میں بھی گھر کی عورت کا خیال دامن گیر رہتا ہے۔

اگر ان سب خدمات کے ساتھ حُسن کی دولت بھی عورت میں خدا داد ہے تو کیسا ہی ٹوٹا پھوٹا جھونپڑا ہی کیوں نہ ہو مرد کے واسطے پوری بہشت ہے اور وہ ہر وقت یہی راگ گا تا رہے گا کہ ؎ از چشمِ زخمِ دہر مبادت گزند ازانکہ ❊ دل دلبری بغایت خوبی رسیدہ

راقم مرزا ... علی بیگ - بی - اے - ایس - او - آگرہ -

صلائے ...
کے
مضامین کا مجموعہ

صلائے عام کے ...

کو دیکھکر جو مضمون" ارباب ...

کا مجموعہ کتابی صورت میں شایع ہونا چاہیے۔ میرے ...

فرماتے ہیں ؎

حقیقت اپنے خط میں یار کو تحریر کرتے ہیں ...

"آج × × × × × ×

شہاب مالیر کوٹلوی کی اس تحر...

مجھے مسرت ہوئی"۔ × × ×

"یہہ خیال میں خود ایک زمانے ...

رہ گیا کہ آپ کو لکھوں۔ آپ کا طرز ان...

تتبع سے بے نیاز ہے اور اس حقیقت سے انکار نہیں ... رنگ ...

کے ساتھ ہی ختم ہو جاتا ہے (خدا آپ کی عمر میں برکت دے!)" ×

کے ہوئے دماغ

ں ہے“ × ×

× × ×

وصل … رح نہایت اختصار

ہے کہ صاحب تحریر صلائے عام

ری خوشی کی وجہہ یہہ ہے کہ زیادہ

عرصے سے صلائے عام کے اکثر

ں صاحب طالب رئیس دہلی

ب کی تاکید تھی۔ بلکہ صلائے عام

نے جمع کر لئے۔ یوپی کے سشتہ

عام کے مضمون منتخب ہوئے

زیادہ … لگے ہیں کیوں کہ میری

ری عمر کا اعت … ب زندگی کا بھرو

ئی چارہ نہیں رہتا جس طرح کہ اس

ا آپ … ے“! دنیا میں چراغ سحری اور آفتاب

ری میں داخل نہیں۔ … جناب حسن دہلوی سے

یوں خدا کی خدائی برحق ہے ؎ پر حسن کی ہیں تو آس نہیں

صلائے عام
کے
مضامین کا مجموعہ

صلائے عام کے پچھلے پرچہ میں جناب شہاب مالیرکوٹلوی کی تحریک کو دیکھکر جو مضمون "ارباب لسان" میں پیش ہوئی تھی کہ صلائے عام کے مضامین کا مجموعہ کتابی صورت میں شایع ہونا چاہیئے۔ میرے کرم فرماؤں میں سے ایک صاحب ارقام فرماتے ہیں ؎

حقیقت اپنے خط میں یار کو تحریر کرتے ہیں: تمہارا امتحاں اے کاتب تقدیر کرتے ہیں

× × × × × × "آج جولائی کا صلائے عام ملا۔ اور مہر محمد خاں صاحب شہاب مالیرکوٹلوی کی اس تحریک سے کہ آپ کے مضامین کا مجموعہ شایع ہونا چاہیئے مجھے مسرت ہوئی" × × × × × × × × × × × ×

"یہہ خیال میں خود ایک زمانہ سے اپنے دماغ میں رکھتا تھا اور بارہا ارادہ کرکے رہ گیا کہ آپ کو لکھوں۔ آپ کا طرز انشا جس خصوصیت کا حامل ہے وہ یقیناً تقلید و تتبع سے بے نیاز ہے اور اِس حقیقت سے انکار نہیں ہوسکتا کہ اس رنگ کو آپ کے ساتھ ہی ختم ہوجانا ہے (خدا آپ کی عمر میں برکت دے!)" × × × × × ×

"صلائے عام کا مجھے انتظار رہتا ہے۔ صرف اس لئے کہ میرے تھکے ہوئے دماغ کو اگر حقیقی معنی میں کوئی راحت نصیب ہوتی ہے تو آپ ہی کے مضامین سے" × ×

× × × × × × × × × × × × × × ×

صلائے عام۔ اِس خط کا خلاصہ شبِ وصل کی کوتہی کی طرح نہایت اختصار کے ساتھ یہاں درج کیا گیا ہے۔ لیکن بڑی خوشی اس بات کی ہے کہ صاحب تحریر صلائے عام کے مضامین کے انتخاب اور ترتیب کا ذمہ لیتے ہیں۔ میری خوشی کی وجہ یہہ ہے کہ زیادہ عُمر ہو جانے سے یہہ کام میرے بس کا نہیں تھا۔ یہہ تحریک عرصے سے **صلائے عام** کے اکثر قدر دانوں کے ذہن میں تھی۔ جناب نواب احمد سعید خاں صاحب **طالب** رئیس دہلی۔ جناب مہدی حسن صاحب مرحوم۔ اور اور دیگر اصحاب کی تاکید تھی۔ بلکہ صلائے عام کے چند مضامین جا بجا سے جس کو جو پسند ہوئے لوگوں نے جمع کر لئے۔ یو پی کے سررشتۂ تعلیم کے نصاب میں وہاں کے فائینل ریڈر میں **صلائے عام** کے مضمون منتخب ہوئے اسی طرح بمبئی کے اردو کورس میں۔ مگر اب زیادہ تقاضے ہونے لگے ہیں کیوں کہ میری عُمر زیادہ ہو گئی ہے اور پچھلی رات کیطرح میری عمر کا اعتبار نہیں رہا۔ جب زندگی کا بھروسہ کم رہے تو خدا سے دُعا کرنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں رہتا جس طرح کہ اِس خط میں لکھا ہے کہ "خدا آپ کی عمر میں برکت دے"! دُنیا میں چراغ سحری اور آفتاب لبِ بام کا اعتبار عقلمندی میں داخل نہیں۔ بقول جناب حسن دہلوی ؎

یوں خدا کی خدائی برحق ہے ⁂ پر حسن کی ہمیں تو آس نہیں

نظام المشائخ

اگلے وقتوں کی سرائے کی بھٹیاریاں چلتے وقت مسافر سے زیادہ تقاضہ کرتی تھیں کہ کہیں بغیر کرایہ دیئے چلا نہ جائے۔ صبح کی نماز سے پہلے ادھر تو پہلی جھکار ٹٹو جو میسر ہوا سرائے کے دروازہ پر کھڑا ہے اُدھر بھٹیاری جان کو آرہی ہے کہ میں نکلنے نہ دوں گی میرا کرایہ چاہیئے: آتے وقت تو مسافر سے یہہ نرمی کہ جو جی چاہے دیدیجئے گا اور چلتے وقت سخت تقاضہ کہ مسافر کو سرائے سے نکلنا مشکل ہو جاتا ہے؛ مجھسے بھی اخیر عمر میں تقاضہ ہو رہا ہے کہ جب تک صلای عام کے مضامین کا مجموعہ شایع نہ ہو جائے حضرت سرائے فانی سے نکلنے نہ پائیں؛ قسمت میں یہہ تشہیر اور لکھی ہے۔ یہہ بھی سہی سہ

الم اخفائے اُلفت میں جو گزرے وہ تو ظاہر ہیں
دلا رازِ محبت فاش ہو جانے پہ کیا گزری؟

"تحفہ" اِس نام کا ایک رسالہ حیدرآباد (دکن) سے جاری ہو رہا ہے جس کی نسبت لکھا ہے کہ "انجمنِ اربابِ اردو کا ماہوار علمی رسالہ" ہے۔ یہہ رسالہ واقعی علمی ہے؛ ثبوت میں مَیں پرچہ نمبر ۱۲ جلد اول کا ذکر کرتا ہوں کہ اس میں طبقاتِ ناصری اور المقری التلمسانی والے دونوں مضمون علمی معلومات کے اچھے نمونے ہیں؛ لیکن سب سے زیادہ داد کے قابل وہ مضمون ہے جو انتخابِ کلامِ میر کے مقدمہ[۱] کے متعلق لکھا گیا؛ یہہ بحث نہایت سخن گسترانہ از روے تحقیق شاعری لکھی گئی جو شعر و سخن کی گفتگو میں بہت بکار آمد ہے؛

رسالہ "تحفہ" گو انجمنِ اربابِ اُردو کا رسالہ مشہور ہے مگر معلوم ہوا کہ جناب میر منور علی خاں صاحب بہادر عالی رفاعی اس پرچہ کے روحِ رواں ہیں اور زبان اردو کے بڑے محقق اور قدرداں ہیں؛

---

[۱] یہ مقدمہ اڈیٹر رسالہ "اردو" اورنگ آباد (دکن) کا انتخاب کلام میر کے متعلق شایع ہوا تھا؛

صلائے عام (بطرزِ تبصرۂ مجمل)

رسالۂ "نگار" اچھے رسالوں میں جناب نیاز فتحپوری کا رسالہ نگار مجھے بہت پسند ہے۔ پسند ہونے کی بڑی وجہ یہہ ہے کہ حضرت نیاز خود بڑے پایہ کے لکھنے والوں میں ہیں اور حُسنِ اتفاق سے ان کو مضموں نگار بہت اچھے اچھے مِل گئے ہیں۔ اگست سنہ رواں کے رسالہ میں جناب وصی احمد صاحب بلگرامی کا مضمون لاجواب تھا جس کی سرخی "ملکِ خطا کے شہزادے" نہایت پاکیزہ ہے۔ اس کا طرزِ بیان بہت دلچسپ اور الیگری Allegory نہایت ہی دل کش ہے۔ اس وضع کے مضامین اُردو لٹریچر کے لئے ناز کا سبب ہیں۔

گو حضرت نیاز صلائے عام میں غزلوں کو پسند نہیں کرتے مگر خود نگار میں اچھے اچھے کلام شایع کرتے ہیں۔ اچھے کلام سے جب طبیعت خوش ہو تو اُس کی داد نہ دینی ظلم ہے۔ اسی پرچہ میں یہہ شعر کس غضب کے ہیں:-

جناب فراق گورکھپوری سے اب دل کی مجھسے ہوں گی نہ تیمارداریاں ۔ کمبخت دُکھ رہا ہی اگر تو دُکھا کرے ۔

" " " یوں تو ہوں غم گیں سدا رویا ہی کرتا ہوں مگر ۔ تم نہ جب تک دل دُکھاؤ لُطف کیا پیدا کا ۔

" " " یہی حیا ہے یہی جان ہے محبت کی ۔ جو نیچی نظروں سے کہتے ہیں "ہم تمہارے ہیں" ۔

(نیچی نظروں سے حیا ثابت ہے اور محبت اس فقرہ سے کہ "ہم تمہارے ہیں"۔ ایک ہی مصرع میں دو

خوبیاں جمع ہوگئیں ؎) انگڑائی کے مضمون بہتوں نے باندھے ہیں۔ میں سمجھا تھا کہ اب اس میں گنجائش نہیں: پھر بھی کمال کیا ؎

اُبھر کر کچھ چلا اُوپر کو عالم ؎ کوئی انگڑائیاں لینا اُٹھا کیا؟

جناب نکری بھوپالی کا یہ شعر کتنا صاف ہے ؎ نگاہیں جس طرف اُٹھیں گرا دیں بجلیاں تو نے ؎ نہ دیکھا ناتواں تو نے نہ دیکھا نیم جاں تو نے ؎ پچھلا مصرع میں نے پچاس دفعہ پڑھا۔ کتنا پاکیزہ ہے؎ اسی طرح جناب شوکت بلگرامی نے فارسی کے مشکل قافیہ میں چار شعر بہت پاکیزہ نکالے۔ خاصکر یہ شعر ؎ مجنوں کی بیاباں گردی فرہاد کی پامردی ؎ سُنتے ہیں مگر دل سا دیکھا نہیں وارستہ؎ جناب ہادی مچھلی شہری کی غزل کے دو چار شعر بہت صاف ہیں ؎ برقِ نگہِ یار خدا جانے ہوئی کیا ؎ ہم تو دلِ سوزاں کے بجھانے میں لگے تھے ؎ اللہ رے تیرِ نگہ ناز کی سُرعت ؎ سو زخم ہمیں دل کے بچانے میں لگے تھے۔ (مضمون بہت ہی شاعرانہ ہے صرف لفظ "سرعت" ذرا بیگانہ ہے؎)

جناب آثر کے اثرستان کے یہ شعر بے مثل ہیں:۔

؎ چشمِ مخمور سے بتا دل کو ؎ تو نے توڑا کہ آپ سے ٹوٹا ؎ ؎ لے لیا دل مُڑ کے نہ دیکھا اِدھر جاؤ تمہارا ہی بھلا ہوگیا ؎ ؎ یہ کیفیت کیسا ہے آنکھوں میں آج اے ساقی ؎ کہ میرے ہاتھ سے ساغر ہی چھوٹ گیا ہوتا ؎ ؎ رات کو ہُوک ایسی دل میں اُٹھی ؎ اک گرہ رہ گئی جہاں دل تھا ؎

صلائے عام۔ گو بقول حضرت نیاز صلائے عام میں شعر و شاعری بہت موزوں نہیں کیونکہ صلائے عام کو نثر سے زیادہ تعلق ہے مگر ہماری زبان کی شاعری اس بلا کی ہے کہ سُنے بغیر رہا نہیں جاتا اور سُنا تو چُپ رہنا مشکل ہے ؎

اے لیلےٰ اگر قیس کی مشتاق نہیں تو ÷ کیوں آنکھہ تری پردۂ محمل سے لگی ہے

واقف تھا وہ کھلنے سے نہ پھولوں کے چمن میں

گلچیں کو خبر شورِ عنادل سے لگی ہے ÷

"پیمانہ" | آگرہ کا رسالہ پیمانہ نامی زیادہ تکلف کا ہوچلا ہے۔ مگر اس وقت مجھے تکلف سے غرض نہیں: یہہ کہنا ہے کہ اس کے مضامین اب زیادہ بکار آمد ہوتے ہیں÷ چنانچہ "جرعات" سے یہہ عبارت تمثیلاً نقل کیجاتی ہے:-

"ملک میں بعض حریفانِ ادارت اور حریفان ادب نے اُردو رسائل کی طرف سے تعلیم یافتہ طبقہ کو کافی سے زیادہ بیدل اور بدگمان بنانے کی کوشش کی ہے۔ اور یہ ایک ایسا گناہ ہے جو کبھی دامن عفو کو نہیں چھو سکتا۔ یوپی میں ایک خاص طبقہ ہے جو ادبی رسائل کی نوازش میں ہمیشہ پیش از پیش رہتا ہے۔ مگر بعض رسائل کے اجرار و احتجاب نے (جن کے بدنام کوش تذکرہ سے میں عمداً گریز کرتا ہوں) وہ جوشِ نوازش اُن کے دل سے قطعی نکال دیا ہے اور اب نئی صدی کی ہستیوں کو اعتبار نہیں کہ کوئی رسالہ چھ مہینے بھی زندہ رہ سکتا ہے۔ "ستارہ" نکلا اور غروب ہو گیا۔ عندلیب چہکا اور بے معنی بولی بول کر غائب۔ مولانا یاس عظیم آبادی نے تو غضب ہی کر دیا "صحیفہ" کا ایک نمبر شایع کیا اور اُس طبقے سے جس میں اُن کی وقعت و عزت کافی تھی کافی روپیہ حاصل کر کے خاموش جا بیٹھے۔ ہمیں ان لوگوں کی بدعملی پر کوئی اعتراض نہیں جو نہ ملک میں روشناس ہیں نہ ہنوز اُن کی طرف سے کوئی اعتبار قایم ہوا ہے اور نہ باعتبارِ فن ملک میں ان کی قدر ہے۔ وہ تو لڑکوں کی طرح کھیلتے ہیں۔ مٹی کا تعزیہ بنایا اور بگاڑ ڈالا۔ ریت کا بنگلہ چھایا اور ڈھا دیا۔ اُن کے کسی کام کو پائدار اور اُن کے کسی مشغلے کو قابلِ اعتبار سمجھ لینا ظنیات کی بہت بڑی غلطی ہے۔ لیکن افسوس آتا ہے اُن مقدسان ملک پر جو ملک میں ایک حد تک وقار و اعتبار قائم کرنے کے بعد ایک کام کرتے ہیں اور اُسے نباہ نہیں سکتے۔ ہم نہایت صاف الفاظ میں کہتے ہیں کہ ایک رسالہ جاری کر کے اُسے جاری رکھنا مسخر لعد

مذاق نہیں ہے۔ اسی طرح کسی رسالہ سے منفعت کی توقع بھی تحصیل حاصل ہے اس لئے تمام ملک کو صرف اسی طرف متوجہ نہ ہو جانا چاہئے۔ بدقسمتی سے آج کل اتنے رسالے اور اخبار ہندوستان میں شائع ہو رہے ہیں کہ لوگوں کو اچھے اور بُرے کی تمیز باقی نہیں رہی۔ اور ضرورت سے زیادہ سمجھے جانے لگے۔ اجرا رسائل جرائد کا جو مقصد ہونا چاہئے اس افراط و تفریط میں وہ بھی فنا ہو رہا ہے۔ اگر تمام ہندوستان سے صرف چار رسالے شائع ہوں اس نوع کے کہ ہم اُنہیں دوسرے ممالک کے ترقی یافتہ رسائل کے مقابلہ میں رکھ سکیں اور جو حقیقت میں ادب و قوم۔ مُلک اور زبان کی خدمت کر سکیں تو سینکڑوں رسائل سے زیادہ مفید و کارآمد ہو سکتے ہیں۔ ان حوادث و ظرائف کو دیکھتے ہوئے ہندوستان کو یہ روِیہ اختیار کر لینا چاہئے کہ جب تک کوئی رسالہ اپنی اشاعت کی بارہ منزلیں طے نہ کر لے اُس کی نوازش سے مصلحتاً محترز رہے۔ آخر ان فریب کاریوں سے بچنے کی اور کیا تدبیر ہو سکتی ہے؟ بہرکیف بعض ہم مذاق کی بے حمیتی نے اس راستہ کو بہت خطرناک بنا دیا ہے × × × × × × ×

× × × × × × × × × × × × × × ×

میں انہیں ڈاکٹر سر تیج بہادر بالقابہ سے ملا جو پیمانہ کے معزز حامیئں میں سے ہیں تو انہوں نے فرمایا کہ: "ہندوستان کے اخبار و رسائل اپنے فرسودہ دشنام انگیز اور کذب آمیز لٹریچر سے قابلِ سرزنش ہو گئے ہیں نہ رسائل و اخبارات کی کوئی وقعت ہے نہ ان کے ایڈیٹروں کی کوئی عزت۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ:۔ "یورپ میں کسی بادشاہ سے مل لینا آسان ہے مگر لندن ٹائمس" (London Times) کے اڈیٹر سے ملاقات کر لینا بہت دشوار ہے"! یہ ہے وقعت و عظمتِ ادارت۔ سب ہندوستان نے بڑی ذلت کے ساتھ ٹھکرا دیا ہے اور جسکے استرداد کی بھی کوئی فکر نہیں کیا آپ ہندوستان کسی ایک اڈیٹر کو بھی لندن ٹائمس (London Times) کے اڈیٹر کے مقابلہ میں پیش کر سکتے ہیں؟ یا کسی اردو رسالے کی اشاعت کا موازنہ یورپ کے کسی رسالے سے کیا جا سکتا ہے؟ اس کی وجہ کیا ہے؟ وہی افراط و تفریط تجاوز و کثرت۔ اور فطرتِ بے حمیتی۔ اگر ہندوستانی سے یہ باتیں کسی طرح دور ہو سکتی ہیں تو مشرق بھی مغرب کی طرح آج نازش بہ کنار ہو سکتا ہے۔ مـ

صلائے عام۔ اکثر رسالوں کا حشر واقعی قابلِ افسوس ہے کہ طفلانِ اشک

کی طرح انہیں جوانی کے لالے رہتے ہیں ع

مقام گریہ ہے طفلانِ اشک کا احوال کہ ان میں سے کوئی ہوتے جواں نہیں دیکھا

عمرِ طفلِ اشک دیکھو کس قدر کوتاہ ہے

بس ادھر دامن میں آیا اور ادھر جاتا رہا

"الناظر کا انعامی مضمون اور مشرق"

"کے عنوان سے ہمارے محترم و مکرم دوست سید ناصر علی صاحب نے چند سطریں صلائے عام دہلی میں لکھی ہیں اور خواہش ظاہر کی ہے کہ اربعۂ عناصر کے سوا باقی عناصر کا تذکرہ کیا جائے اور صلائے عام کے صفحات اس کے لئے کھلے ہوئے ہیں۔ ہماری رائے اس بحث میں یہ ہے کہ عناصر ادب اردو کا احصاء و استقراء بہت دشوار ہے۔ یہ کام بڑی فرصت اور سینہ کاوی کا ہے۔ کیوں کہ آج کل جن کے ہاتھوں میں قلم ہے اکثر ان میں کے اپنے معبودوں کے سوا دوسروں کے پیغمبروں کی طرف نظر ڈالنا بھی گناہ سمجھتے ہیں۔ ۲۰ برس کے اندر کئی بار اس پر گفتگو ہو چکی ہے۔ بہتر ہو کہ پہلے ایک فہرست ہندو مسلم انشاپردازوں کی بنائی جائے اور پھر سرسری نظر ہر ایک کے حالات پر ڈالی جائے۔

فہرست شائع ہو جانے سے یہ ہوگا کہ ہر شخص کسی نہ کسی انشاپرداز کا نام ضرور بتلا دے گا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ اس وقت ہر شخص انشاپرداز ہے [illegible] تذکرہ تمام عا[illegible]

تہذیب الاخلاق [illegible]

[illegible]

[illegible] نصف صدی کے اندر [illegible]

[illegible] تمام تمہید کا ست یہ کیونکر کر سکتا تھا

انتخاب جدید بھی

شبلی غریب تو آخری زمانے کی ٹوٹی ہوئی زنجیر کی ایک کڑی تھے۔ انکا ذکر ہی کیا ؎

نازہے گل کو نزاکت کا چمن میں ایذوق
اس نے دیکھے ہی نہیں نازو نزاکت والے

صلائے عام - یہہ عبارت اخبار مشرق سے اس غرض سے نقل کیجاتی ہے کہ جناب حکیم برہم صاحب کی رائے سے **صلائے عام** کو بالکل اتفاق ہے کہ "پہلے ایک فہرست اُردو انشا پردازوں کی بنائی جائے اور پھر سرسری نظر ہر ایک کے حالات پر ڈالی جائے"۔

اس رائے میں صرف اس قدر ترمیم اور کردی جائے کہ سرسری نظر سے نہیں بلکہ اچھی طرح غور و تامل کے بعد جس کے جی میں آئے لکھے۔ گفتگو صرف نثر زبان اُردو کے متعلق ہو۔ کسی طرح کی مذہبی یا سیاسی بحث نہ ہو۔ نہ خاص یا عام عقاید میں مباحثہ و مجادلہ سے سروکار ہو۔ اس گفتگو میں شعرو شاعری سے تعلق نہیں۔ شعراء زبان اُردو کے کمال میں کسی کو کلام نہیں: ان کا احسان زبان اُردو پر شروع سے ہے اور قیامت تک رہیگا۔

نثر میں کمال کا ثبوت اس طرح ممکن ہے کہ جو صاحب جس کی نثر پسند کریں ایک دو مضمون منتخب کرکے مضمون کی خوبیاں دکھائیں۔ یا اب جو نثر میں اچھے لکھنے والے ہیں کسی مقررہ مضمون پر لکھکر مقابلہ کریں۔ اس تدبیر سے گو سارے ذی کمال یک زبان ہوکر اتفاق نہ کریں مگر مضامین ہیچ بہت اچھا مسالہ اُردو لٹریچر میں جمع ہو جائیگا۔ جو بات لکھی جائے کسی کی شکایت میں نہ ہو۔ صرف انشاپردازی کی خوبیوں سے واسطہ رہے۔ مجھے نثر اردو سے ایک عرصہ سے محبت ہے۔ اس کی خدمت گزاری میں ایک عمر گزر گئی: اور گو بڑھاپے سے دل و دماغ میں بہت ضعف آگیا ہے لیکن اپنی زبان کی خدمت... میں کسی طرح دریغ نہیں ؎ کھا چکا ہے دل مرا چرکا نگاہِ یار کا + مجھ سے بڑھکے ہے شبہہ کون س تلوار کا ؛

ذی النون

ذوی العقول

آج کل ہم دہلی آئے ہوئے ہیں ہمارے کرم فرما ہمارے پڑوسی ہمارے مکرمی مولوی ابوالمنصور سید منصور علی خاں صاحب امام فن مناظرہ بالقابہ کے ؎

مری زباں پہ الٰہی یہ کس کا نام آیا ٭ کہ یاد صحبت دیرینہ رفتگاں بخشید

خلف اکبر اُردو زبان کے بادشاہ اُردو کو زندہ کرنے والے بلکہ آئندہ کو اُس کی پرورش نگہداشت کے ذمہ وار کون۔ مولوی خان بہادر سید ناصر علی خاں صاحب بہادر سے ملکر دل خوش کرنا تو اُن کے اخلاق سے کوئی بڑی بات نہیں اُن کی صحبت نے اُن اصحاب واکابر اشخاص صاحب علم واہل کمال کی یاد اور صحبت کو تازہ کر دیا جو عنقریب دیکھتے دیکھتے یکے بعد دیگرے ہم سے اور دنیا سے مفارقت کر گئے کہ جن کی بازیافت حسرت زدہ ہے اور امکان ناکامی کا یقین دلاتی ہے نہ وہ صحبتیں رہیں نہ وہ چرچے علمی رہے نہ وہ وفا شعار رہے۔ جو ہیں وہ بھی ہم جیسے خاطر افسردہ اور ناشکیب ؎

مجھے تو رات کو ساقی کی یہ ادا بھائی ٭ کہ پہلے پینے سے مے خاک پر چھڑکوائی
جو میں نے پوچھا تو کہنے لگا کہ سودائی ٭ تو یار قیب نشینی و بادہ پیمائی ٭
بیاد واد محبان بادہ پیما را ٭

خصوص مولانا موصوف کا رسالہ **صلائے عام** دیکھنے سے زیادہ امید ہو گئی کہ اِس اُجڑے زمانہ میں جس نے چشم کمال کو خیرہ اور آفتاب علم وہنر کو تیرہ کر دیا تھا اپنی معلومات ذاتی سے منور کر دیں گے اور جس قدر مضامین ماہران فن و علم پرور اصحاب باتمکین کے **صلائے عام** میں دیکھنے میں آئے اُن کی داد دینا تو ہمارے حوصلہ سے باہر ہے بہرحال اگر یہی چرچہ آئندہ رہا تو اُمید ہے کہ دہلی کا نام علم دوست ہنر پروروں سے پھر زندہ ہو جاویگا اللہ تعالٰی توفیق رفیق کرے اور ہیچ خیالات کو ترقی بخشے۔ چوں کہ اس تمام تمہید کا شکریہ کیونکر کر سکتا تھا

بمنابی کہ جی

لہٰذا یہی سوجھی کہ اپنے ناچیز خیال کو بھی صلائے عام میں جگہہ دوں تاکہ عام ہوجاوے مگر جہاں تک دیکھا گیا تو عرصۂ صلائے عام مضامین رنگا رنگ سے اور جدت ہائے نیرنگ سے اس قدر تنگ ہے کہ رہوار افکار پالنگ۔ اب لکھوں تو کیا لکھوں۔ چونکہ تذکرۂ علوم اُردو کی تجدید نظم و نثر کی تقدیر سے صلائے عام مالا مال ہے اور یہ سارا سرمایہ بدولت علم کے ہے مگر باوصف اس کے انسان کو لقب اور خطاب بھی دیا گیا تو ذوی العقول کا اور اس تخصیص اور شرف عقلی سے بچارے حیوان کو ایسا دور پھینکا اور محروم رکھا کہ اُس کو شعور وادراک کا کوئی حصہ نہ ملا۔ اگرچہ یہ مقولہ اور لقب ابتدا سے مسلمہ چلا آتا ہے مگر بادی النظر میں جہاں تک غور کیا جاتا ہے تو ملکۂ عقلی و قوائے ادراک سے حیوان بالکل بے بہرہ و بے نصیب نہیں ہے قریب قریب زندہ (ذی روح) کے واسطے جو ضرورتیں و مایحتاج لازمی ہیں حیوان بھی مانند انسان اُن کی تکمیل و اجرا میں محتاج و عاری نہیں ہے مثلاً

خورونوش

چیونٹی بارش سے پہلے کہ بارش میں اُس کو نقل و حرکت دشوار ہے ذخیرا جناس غلہ اپنے مسکن میں فراہم کرتی ہے اور اس تمیز اور ترتیب سے ہر ایک اجناس کو جُدا جُدا مرتب کرتی ہے گویا کمپوزر اُنہیں کا شاگرد ہے۔ دیگر انتظام بھی مبنی علی العقل حسب ذیل قابل غور ہیں
۱۔ اگر کوئی چیونٹی پر محلہ مسافت بعیدہ میں کسی وجہہ سے چلی جاوے تو وہاں کی چیونٹیاں اور دریائی قبیلہ والیاں اُس کی رہبر ہوکر اُس کو اُس کے مسکن تک پہونچا دیتی ہیں۔ ۲۔ مخبر کا یہ کام ہے کہ صرف اشیار خوردنی کی تلاش رکھے اور جہاں پاوے خبر کردے۔ ۳۔ اس اشیار کے لانے والے باربردار جُدا ہیں اور لطف یہ ہے کہ مخبر کے ہمراہ یا بغیر اُس کے اُنہیں قدموں مخبر کے موقعہ پر پہونچ جاتے ہیں ۴۔ اُن باربرداران کے محافظ قوی الجسہ بھی ہمراہ ہوتے ہیں کہ دوسری قوم کی چیونٹیاں کچھ دست اندازی کریں تو وہ مار ڈالتے ہیں۔ مگر چاہئے کہ وہ بھی اجناس و اشیار کے لے جانے میں مدد دیں ہرگز نہیں۔ ۵۔ گھر بنانے کے لئے گروہ خاص ہے کہ ایک ایک سنگ ریزہ نکالنا اور

باہر ڈالنا۔ ۶۔ ایک گروہ ہے کہ صرف مُردوں کو لانا اور مکان کے گوشے میں جمع کرنا کہ پائمالی سے محفوظ رہیں۔ ۷۔ اپنے انڈوں کو بخوف گزند مکانی دوسرے موقعہ پہلے جانا۔ خصوص موسم بارش میں مقام خشک میں ۸۔ ہر موسم میں اُس کے نفع و نقصان کے محل تجویز کرنا وغیرہ۔

شہد کی مکھی

اپنے خورونوش کو پھولوں کے جوف میں سے قطرات شیریں لانا اور فراہم کرنا۔
۲۔ اُن پھولوں کا رس یا شیرہ لانا جو بدبو تلخ مضر صحت نہ ہو۔ ۳۔ گھر کے خانہ شش جہت اس عقلمندی سے بناتی ہے کہ انسان سے بھی ایسے شش گوشہ ضلع آلہ پرکار سے بھی نہ بن سکے جو بچوں کی پرورش کے واسطے ہوتے ہیں۔ خود صرف تہ برتہ اُس لکڑی مخزنِ شہد پہ اجماع رکھتی ہیں جس سے گرمی سردی بارش سے شہد کو گزند نہ پہونچے۔ ان میں ایک رانی یا بادشاہ ہوتی ہے اُس کو یعسوب کہتے ہیں وہ دن کو وقت نصف النہار سب کو لیکر اُڑتا ہے اور دھوپ دہوا لیتا ہے تاکہ وہ اجماعی صورت متعفن ہو کر شہد کے خواص عمدہ کو خراب نکردے جس کی صفت قرآن مجید میں شفاءٌ للناس وارد ہے۔ ۴۔ قبل از وقت ایک جگہ سے دوسرے محل میں جاکر گھر بنانا بلحاظ موسم۔ ۵۔ دشمن کا مقابلہ کرنا وغیرہ۔

دوست و دشمن کی شناخت

ہر جانور کا بچہ خواہ پرند یا چرند جس نے کبھی بلّی اور بھیڑیہ کو نہ دیکھا نہ ماں باپ نے بتایا ہو جب سامنے آدیکا اُس سے بھاگنا۔ ۲۔ شیر وغیرہ درندہ صبعی خواص کے حیوان اپنے ہم محلہ انسانوں کو کبھی نقصان نہیں پہونچاتے۔ جانتے ہیں کہ ہمارے دشمن نہیں ہیں ہاں شکاری لوگوں کو دشمن جان کر مقابلہ کرتے ہیں اور ہلاک۔ ۳۔ کبوتر، گھوڑا، کتا وغیرہ اپنے مالک کی آواز پر تعمیل حکم کی کرتا ہے اور پہچانتا ہے۔

چمگادڑ (شب پرہ)

اس کو احساس عقلی اس قدر ہے کہ دن کو تہ خانوں و گوشہ ہائے تاریک میں گزارہ کرتی ہے کیسا ہی ابر غلیظ ہو کر چڑیاں وغیرہ بہ گمان غروب آفتاب اپنے مسکنوں میں اپنے آشیانوں میں رات جان کر چلی جاتی ہیں مگر چمگادڑ کہ اس کے مسکن میں کچھ دن باقی ہونے پر بھی اس قدر اندھیرا ہو جاتا ہے کہ گویا کچھ حصہ شب کا گزر گیا مگر اس کو خدا جانے کیا اندازہ غروب آفتاب کا ہے کہ اسی وقت اپنے مسکن سے باہر آوے گی جب کہ بالکل آفتاب غروب ہو گیا ہو انسان بھی وقت غروب بنا بر نماز مغرب بواسطہ گھڑی گھنٹہ معلوم کر سکتا ہے کہ آفتاب غروب ہوا مگر وہ حیوان اپنے احساس عقلی سے ٹھیک وقت اس تاریکی شدید میں معلوم کر لیتی ہے۔

اتفاق

ہر جنس کا حیوان اپنے آپس میں اتفاق رکھتے ہیں۔ کوّا اگر ایک کوّا مارا جاوے تو گروہ کوّوں کا تعزیت کو براہ ہمدردی جمع ہو جاتا ہے۔ کتا۔ کتے باہم غذا پر لڑتے جھگڑتے دیکھو گے مگر جب دشمن سامنے آیا اور سب کچھ چھوڑ کر اس کے مقابلہ میں یک جہت ہو جاتے ہیں۔ مکھیاں شہد کی خصوص صحرائی زیادہ دشمن کو پہچانتی ہیں اور بہت پیچھا کرتی ہیں۔ گلۂ میش مشہور ہے کہ بھیڑ چال یعنی اگر ایک بھیڑ کوئیں میں گر جاوے تو ہمراہی سب بھیڑیں اس کا ساتھ دیں گی وغیرہ۔

تناسل و توالد

ہر حیوان کا جوڑا ہوتا ہے اور گھر بنانا اور بچوں کی پرورش کے سامان مہیا کرنا۔ بیا تو وہ گھر بناتا ہے کہ دوسرے جانوروں کو رشک اور انسان کو حیرت ہے۔ پودنا بہت چھوٹا پرند ہے اس کی عقلمندی گھر بنانے میں قابل داد ہے۔ پتّوں کو باہم سیتا ہے کہ ریشہ نباتی یا دودہ کسی درخت کا جو بالکل سوت و تاگہ کی شکل بناتا ہے اور اس سے ان پتّوں کو محض چونچ سے ایک دوسرے کو سیتا ہے چند حیوان ایسے ہیں کہ سلسلۂ تناسل و تولید مطلق نہیں رکھتے بلکہ کیڑے اپنے گھر میں بند کر کے ایک

مدتِ خاص میں اپنی صورت میں پرند کر لیتی ہیں ہر شخص کو معلوم ہے کہ ہر گھر میں ایک زرد رنگ کا جانور پردار کے برابر مٹی لاکر دیوار وں میں نلی دار خانہ بناتا ہے اور بعد تکمیل اُن میں کیڑا (بینگ نما) لاکر رکھتا ہے اور بند کر دیتا ہے اسی طرح چند خانے بنا کر اور کیڑے رکھکر بالکل مٹی سے بند کر کے چلا جاتا ہے۔ وہ کیڑے ایک زمانہ خود بخود پر پرزہ لاکر اُڑنے لگتے ہیں جو اُس کے جنس ہوتے ہیں ان میں نہ مادہ ہے نہ نر۔ مچھلی جس قدر دُنیا میں بمقابلہ خشکی پانی کی کثرت ہے اسی مقدار میں پانی کے رہنے والے حیوان بھی زیادہ ہیں چونکہ اُن کے اعمال ہمارے تجربہ سے باہر ہیں لہذا اُن کی معیشت میں کوئی رائے نہیں دی جاسکتی۔ البتہ اُن کے نوع و جنس لاتعد ولاتحصیٰ ہے۔ جن کاموں کا مدار عقل پر ہے اُس میں کامل ہوں گے۔ رہا:-

نطق

جو خاصہ انسانی ہے یعنی تلفظ و تکلم اس میں تو حیوان بھی شامل ہے کہ بولتا بھی ہے اُس کا ہم جنس ایک دوسرے کی بولی کو سمجھتا ہے بلکہ ایک صورت میں تو انسان پر ترجیح رکھتا ہے کہ انسان اُس کی بولی نہ سمجھے اور حیوان اُس کی بولی کو اور الفاظ کو خوب سمجھتا ہے مثلاً کُتا کہ اُس سے کہو کہ آؤ یا جاؤ۔ تو صرف تلفظ سُن کر آتا جاتا ہے۔ طوطا۔ مینا۔ انسان کی بولیاں تکرار کے ساتھ سُنکر خود ادا کرتے ہیں گو اُس کا مفہوم نہ جانیں۔ کبوتر بازوں نے جہاں کہا کہ آؤ وہ فوراً مکان پر اُتر آتے ہیں۔ بلکہ بندر والے کے اشارہ پر بندر کام کرتا ہے اور انسان اور حیوان کی بولی باہم نجانا تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ انسان انسان کی بولی سمجھنے اور بولنے میں ایک دوسرے سے مانند حیوان کے ہے جن صاحبوں نے اقوام بھیل بھٹائی و دیگر وحشی پہاڑی و جنگلی انسان دیکھے ہوں گے وہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ انسان بنی آدم ضرور ہیں مگر معاشرت اور تمدن کو دیکھو کہ نہ ان میں حیا ہے نہ محبت ہے نہ معیشت ہے کہ لباس سے بے بہرہ خورد و نوش میں مانند حیوان پیٹ پالتے ہیں نہ گھر بنانا آتا ہے نہ سایہ کی پرواہ ہے۔ دھوپ و بارش سے بچنے کے لئے کوئی سامان آسایش مہیا کرنا ان کی قدرت سے باہر ہے۔ اخلاق اور ہمدردی کا تو ذکر کیا ہے۔ عوام کالانعام پس فرمایئے کہ اُن پر بھی اطلاق ذوی العقول عاید ہوسکتا ہے

ہرگز نہیں۔ پس ان جملہ مراتب ہر دو نوع پر جب غور کیا جاتا ہے تو یہی نتیجہ مرتب ہوتا ہے کہ بلحاظ عقل کے نوعی تشخص خاص نہیں ہے اگر انسان کو اشرف المخلوقات کہا جاوے تو بیشک بواسطہ تحصیل علم شرف و اعلیٰ ہے لہذا ضرور ہوا کہ بجائے ذوی العقول کے انسان کو ذوی العلوم کا خطاب دیا جاتا تو ہر گونہ زیب دیتا ایک علم ہی وہ بے بہا دولت لازوال ہے کہ آدم علیہ السلام سے لیکر اس وقت تک اور آئندہ انسان مُردوں کا نام زندہ ہے اور زندہ رہے گا گویا علم کیا ہے کہ ایک حیاتِ ابدی ہے کہ جو کام انسان میں عقلی بمقابلہ حیوان بے حد و لاتعد ہیں وہ سب بواسطہ علم کے ہیں۔ مثل مشہور ہے کہ یکمن علم را دہ من عقل باید۔ یہاں بھی علم کو عقل پر ترجیح ہوئی کہ تحدد و تعدد پر فضیلت رکھتا ہے کہ کُل جز کا اور مرکب مفرد کا محتاج ہے گو عوام اس کے معکوس معنی لیتے ہیں اگر کوئی شمہ تعلیم کا حیوان کو بھی نصیب ہو گیا ہے تو وہ بھی اپنے ابنائے جنس میں قدر و قیمت میں افضل ہو گیا ہے۔ جیسے طوطا۔ مینا۔ بندر اور سگ متعلّم کا مارا ہوا شکار تو شارع نے حلال کر دیا۔ وقس علی غیرہ۔ اگرچہ ہمارا یہ خیال مجرّد اجتہادی ایک قدیمہ مسئلہ مسئلہ میں وقعت نہیں رکھتا تاہم خیال ہی تو ہے اور ترغیب علم جس کی اس وقت اپنی قوم میں زیادہ ضرورت ہے کہ (بے علم نتوان خدا را شناخت) باقی آئندہ

(محررہ۔ خادم العلماء محمد نواب علی خان دہلوی)

”کوکب ہند“

گو صلائے عام کو عقائد مذہبی سے کسی طرح کی بحث منظور نہیں مگر اکثر رسالے جو دفتر میں آجاتے ہیں اُن کو دیکھنا ضرور ہوتا ہے اور دیکھنے کے بعد اگر کوئی بات **صلائے عام** میں لکھنے کے لایق ہو تو اُس کے لکھنے کو جی چاہتا ہے۔ مدیران رسالہ ”کوکب ہند“ کی عنایت سے اس رسالے کے چند پرچے میرے پاس آچکے ہیں۔ ۷ اگست سنہ رواں کے پرچہ میں دو ایک باتیں مسلمانوں کے کام کی ہیں ”حقوقِ نسواں اور پنجاب کے مُسلمان“ ضروری مسئلہ ہے کہ مسلمان ہو کر شریعتِ اسلام سے انکار جائز نہیں۔ انکار تو انکار مسلمانوں میں شرع کے خلاف عمل درآمد افسوس کا مقام ہے۔ **قرآن** مجید کے ترجمہ کرنیکا مسئلہ بھی غور طلب ہے۔ اسی طرح خُطبہ کس زبان میں ہونا چاہئے؟ لاتنابزوا بالالقاب سے اسلام کی تعلیم خلاق ثابت ہے۔ اخلاق میں ایک دوسرے کو نیکی سے یاد کرنا مناسب ہے۔

از افادات مہدی

× × × × × × × × × × × × × × × ×

"میں آپ میں یونانیوں کی سی لطافت خیال پاتا ہوں۔ آپ کی چشم سخن جہاں "جنس لطیف" اور اُس کے متعلقات کی طرف اشارے کرتی ہے۔ وہ نزاکت خیال کی آخری حد ہے۔ تیرہویں صدی میں بہتیرے نشتر ہیں جو آج تک دل میں چبھ رہے ہیں۔ ابھی ابھی ایک فقرہ نظر سے گذرا۔

"یہ پان اُن کے سنے ہے"

بے اختیار جی بھر آیا۔ اگلے پچھلے قصے ذہن لظر ہو گئے۔ یہ پوچھئے تو بتا نہیں سکتا۔ لیکن کچھ تو ہے جو دل پر چوٹ لگی۔ رکھ رکھاؤ آنا تو ہو۔ ایک چھوٹا سا فقرہ اور عطر زندگی!"

× ×

"اس قسم کے بہتیرے نکتے ہیں۔ مگر و کھائے کون ہُزار و نجیتے جی مرگئے۔ آپ باتوں باتوں بالوں میں ٹالنا چاہتے ہیں۔ کیا اچھا ہوتا اگر آپ "بیسویں صدی کا مناظرہ" لکھتے "اخوان الصفا" کے رنگ میں ایک خیالی مجمع الفصحا رد لٹریری اکیڈیمی) ترتیب دیجئے پورا دائرہ ہو۔ ارکین بحث یعنی اخلاقی۔ مذہبی۔ افادی۔ اقتصادی اور فلسفی وغیرہ مختلف الموضوع عناصر اگر جمع ہو گئے اور ان سبھوں میں آپس میں دماغی ٹکر ہوئی تو لطف آجائے گا۔ کچھ نہ ہی خیام کے فلسفہ پر ریویو کرڈالئے اور جو چتے پتے کی کہہ گیا ہے نا آشنایان حقیقت کو سمجھا دیجئے۔ بیچارہ یورپ کے ہاتھوں جی رہا ہے۔ ایشیا میں بے طرح اُس کی مٹی خراب ہے۔ نقد لوگ اُسے ہاتھ بھی نہیں لگاتے۔ نہ جاننا بھی ایک مزے کی بات ہو۔ اس قسم کی سرد مہریاں لٹریچر پر ایک بدنما داغ ہیں۔"

× × × × × × × × × × × ×

"آجکل سرمایہ دار وہی سمجھا جاتا ہے جو پچھلوں کی جمع کردہ مواد میں تصرف بیجا یا بجا کر سکے۔ آپ میں مادۂ اختراعی کی کمی نہیں۔ مواد موجود ہے یورپ سے لیجئے اور خیالات کو پھیلا کر سمیٹئے۔ اور لکھئے۔ غزالی اور ابن رشد کا محاکمہ[1] بہت دلچسپ تھا۔"

"لیکن ضرورت تھی کہ زیادہ پھیلاؤ ہوتا اور لگے لپٹے مسائل میں سے کچھ نہ رہ جاتا۔ مختصر یہ کہ

[1] یہ محاکمہ صلائے عام کے پچھلے دور میں شائع ہوا تھا۔

(ب)

جب پیا: پر آپ لکھ رہے ہیں میرے توقعات اُس سے کہیں بڑھے ہوئے ہیں۔ اور یہ امر آپ کی عظمت کے ثبوت میں ہے۔ نری باتوں سے خواہ وہ کتنی ہی پیاری ہوں اگر بار بار دہرایئے تو جی اُکتا جاتا ہے۔ متعدد ادھورے مضامین کی جگہ ایک آدھ لکھئے لیکن ذرا دل لگا کر۔ کم سے کم ایک مضمون خالص فلسفیانہ رنگ میں ہو۔ جسے جامعیت اور رکھ رکھاؤ کی حیثیت سے آپ اختراع فائقہ (ماسٹر پیس) کہہ سکیں۔

نئے گروہ سے کچھ امید نہ کیجئے۔ ان کے ہاں اس وقت تک صحیح علمی مذاق کا پتہ نہیں۔ نہ پڑھنا لکھنا ضروریات زندگی میں داخل ہے۔ قومی لٹریچر سے بیگانگی جیسا اس سے پہلے کسی موقع پر لکھ چکا ہوں۔ ایک طرح کی نمود سمجھی جاتی ہے اور سچ یہ ہے کہ انگریزی شاید کچھ آتی بھی ہو اُردو تو خیر سے قطعاً نہیں آتی انگریزی کی غیر ضروری آمیزش نے روزمرہ کا جس طرح خون کر رکھا ہے آپ دیکھ رہے ہیں اس پر ستم ظریفی یہ ہے کہ کسی کو احساس نہیں۔ مغربی تمدن اور شائستگی کے دلدادہ جہاں یورپ کی تقلید پر مٹے ہوئے ہیں۔ ایک خاص مسئلہ میں اجتہاد سے نہیں چوکتے یعنی تکلفات زندگی کے اسراف کے ساتھ بھی قومی لٹریچر پر کچھ صرف کرنا جرم ہی نہیں بلکہ ایسا گناہ ہے جس کی بازپرس ہو کر رہے گی ایسے افراد کہاں تک آپ کے توقعات پورے کر سکیں گے؟"

× × × × × × × × × × × × × × × × × ×

× × × × × × × × × × × × × × × × × × × ×

(ماخوذ از افادات مہدی)

OPINIONS

Regarding "SALA-I-AM," Delhi.

... of ... the SALA-I-AM, Delhi ... by the Pioneer, ... its issue of the 3rd November 19[illegible]

The Sala-i-Am published at Delhi keeps up high character as a periodical which seeks to promote the cultivation of Urdu literature.

Khan Bahadur Mir Nasir Ali, with whom loyalty and learning go hand in hand is filling the leisure hours of his retirement by devoting himself to the editing and publishing of this Magazine. His style is marked by refinement and culture, and his readers should increase in number as the merit of his work becomes disclosed. The Sala-i-Am is particularly well printed and European students of Urdu should find it quite worth reading."

Extract from a letter from Colonel D. C. PHILLOTT, Secretary Board of Examiners, Calcutta, dated 20th January 19[illegible]

"I have obtained the opinion of some of the board on the Sala-i-Am." We think it is the best Urdu Magazine we have yet seen both in appearance and contents. I shall have great pleasure in recommending it to candidates for the high Proficiency and Degree of Honour. In fact, I have been doing so."

From Lieutenant Colonel D. C. PHILLOTT, M. A., Ph. D., F. A. S. B. late Secretary, Board of Examiners Calcutta,

The printing, paper, and contents of the Sala-i-Am make it the best Urdu Magazine for European students of Urdu.

Cambridge }
1923 }

D. C. PHILLOT, (Lieut. Colonel)
Late Secretary Board of examiners Calcutta.

Extract from a letter from R. P. Dewhurst Esquire, I. C. S. Session Judge, dated 1[illegible]th 1911

"I take this opportunity of saying that I entertain a very high opinion of your Magazine. I will not say that I read every word of every number but I can say with truth that I read eagerly all the articles proceeding from your own pen beginning to end,"

o o o

ADVERTISEMENTS.

X PUBLISHED ANNUALLY X

THE

LONDON DIRECTORY

With Provincial & Foreign Sections and Trade Headings in five LANGUAGES

enables traders to communicate direct with

MANUFACTURERS & DEALERS

London and in the Provincial Towns and Industrial Centres of the United Kingdom and Ireland. The Continent of Europe, Africa America, Asia, Australasia etc

The names, addresses and other details are classified under more than 5,000 trade headings, including

EXPORT MERCHANTS

with detailed particulars of the Goods shipped and the Colonial and Foreign Markets supplied;

STEAMSHIP LINES

arranged under the Ports to which they sail, and indicating the approximate sailings.

One-inch BUSINESS CARDS of Firms desiring to extend their connections, or Trade Cards of dealers

SEEKING AGENCIES

can be printed at a cost of 5. shillings for each trade heading under which they are inserted. Larger advertisements at ... per page.

The directory is invaluable to every one interested in overseas commerce, and a copy will be sent by parcel post for 40 shillings nett cash with order.

THE LONDON DIRECTORY CO. LTD.,
25 Abchurch Lane, London E C 4,
ENGLAND

X X

BUSINESS ESTABLISHED IN 1814.

اِطلاع (بخدمت معاونین)

اس پرچہ کے پہونچنے کے بعد جن صاحبوں کے ذمہ **صلائے عام** کی سالانہ قیمت باقی ہے از راہ کرم ستمبر سنہ رواں کے ختم ہونے سے پہلے بذریعہ منی آرڈر عنایت فرمائیں۔ ورنہ اس کے بعد ستمبر کے پرچہ کا انتظار نہ کریں: گلزار نسیم میں بکاؤلی نے تاج الملوک کو خط کے آخر میں لکھا کہ

پھر خط کی نہ امیدواری ✽ القط ہے قلم کی دوستداری

یہ بھی اطلاع دینی ضرور ہے کہ **صلائے عام** میں اس مہینہ سے اشتہارات کے چھاپنے اور اشاعت کا انتظام ہوگیا ہے۔ **شرح اشتہارات** ہم کو لکھ کر دریافت کر لیجئے ✽ اُردو انگریزی۔ ہندی میں اشتہارات چھپ سکتے اور شائع ہو سکتے ہیں ✽ امور دریافت طلب کے لئے ڈاکخانہ کے جوابی کارڈ کافی ہیں ✽

صلائے عام میں مضامین نثر کی زیادہ ضرورت ہے۔ نظم اگر داد طلب ہو تو داد دینے میں دریغ نہیں لیکن جسطرح شعر میں مضمون کی یا زبان کی خوبی نہ ہو یعنی جب تک کوئی ایسی بات نہ ہو جو دوسرے کلام میں کسی سے بن نہ پڑی ہو شعر بے کار ہے۔ اسی طرح نثر میں جب تک غایت درجہ کی پاکیزہ بیانی و معلومات کا حصہ نہ لیا جا سکے **صلائے عام** کے لئے مضمون نگاری کی تکلیف کا میں احسانمند نہیں ہو سکتا۔

خدا کا شکر ہے سوکھی زبان سے کانٹے ✽ مزاج پوچھ رہے ہیں برہنہ پائی کا۔

اُنگلیاں نجد میں کانٹوں کی اُٹھینگی اے قیس
ڈر گیا آبلہ پائی سے تو رسوا ہوگا ✽

مہتمم کی طرف سے

اطلاع

صلائے عام کی قیمت پیشگی چھ روپیہ سالانہ ہے۔ قیمت بذریعہ منی ارڈر عنایت فرمائی جائے: مضمون نگار بھی صلائے عام کی قیمت سے بری نہیں۔ نہ یہ ضرور ہے کہ ہر مضمون خواہ مخواہ شایع کیا جائے ✦ جامع اوراق کو مضمون میں کمی بیشی کا اختیار ہے۔ جو مضمون شایع نہ ہوسکیں اُن کے واپس کرنے کا ذمہ نہیں ✦

صلائے عام میں ہر طرح کے مضامین نظم و نثر شایع ہوتے ہیں: زیادہ تر نثر کہ اس وقت نثر کی زیادہ ضرورت ہے: اور نثر بھی ایسی جس میں زبان کی خوبی و فصاحت کے ساتھ مضمون کی پاکیزگی و نازکخیالی ضرور ہو یعنی بلسان ع) عروس جمیل و لباس حریر۔ شرط ہے کہ مضمون پاکیزہ اور ادائے بیان لاجواب چاہئے ✦

اکثر اصحاب نمونہ کا پرچہ مانگتے ہیں۔ اوّل تو ایک پرچہ سے صلائے عام کی ساری خوبیوں کا حال معلوم ہونا مشکل ہے دوسرے صلائے عام اتنے عرصہ سے جاری ہے کہ اہلِ علم میں شاذ ہی کوئی ایسا ہوگا جو اِس سے واقف نہ ہو: پھر بھی اگر کسی کو نمونہ یا سال سے کم کی خریداری منظور ہو تو ایک روپیہ فی پرچہ کے حساب سے قیمت لی جائے گی ✦

صلائے عام کا پتہ اس قدر کافی ہے کہ:

دہلی۔ فراشخانہ: مکان میر ناصر علی خاں بہادر

حسب الارشاد میر ناصر علی خاں بہادر مطبع ناصری واقع فراشخانہ دہلی میں باہتمام میر احمد چھپا اور شایع ہوا ✦

Printed and Published by Mir Nāsir Ali Khān Bahādur (Editor) at the Nāsri Press, Farrāsh-Khāna, Delhi.

Regd. No. L. 1162 SALAAM, Delhi.

A high class Monthly Magazine devoted to the cause of Urdu literature, the preservation of the old Indian, especially Mohammadan culture and refinement, and the assimilation of the best features of the new civilization

جلد ۱۳ نمبر ۹

فہرست مضامین

بابت ماہ ستمبر ۱۹۲۵ء مطابق ربیع الاول ۱۳۴۴ ہجری

پیرایۂ آغاز

اب کی دفعہ مضمونِ پریشان میں نے عمداً چھوڑ دیا کہ اجیرن ہو گیا تھا۔ اس کے عوض بدل کر اطمینان کی باتیں (صفحہ ۹) پر لکھی ہیں: اس سے پہلے مضمون بعنوان دونوں وقت ملتے (صفحہ ۵) پر لکھا گیا ۔ ان مضمونوں میں کوئی بڑی خوبی نہیں صرف نیا راگ ہے ؎

اسبابِ پریشانیِ گل خندۂ گل ہے ۔ غنچہ کا کبھی چاک گریباں نہیں دیکھا

مرزا جہانگیر کی گرفتاری (صفحہ ۱۶) پر تاریخی مضمون ہے جو اخیر سلاطینِ مغلیہ کے حالات پر روشنی ڈالتا ہے کہ مرزا جہانگیر کی گرفتاری کس طرح عمل میں آئی اور مرزا جہانگیر کی بد وضعی کا کیا نتیجہ ہوا؟

اُردو رسالوں کی ڈائرکٹری (صفحہ ۲۲ پر) کا حق رسالے نکالنے والوں اور پڑھنے والوں دونوں پر ہے کہ ان مظلوموں کی یادگار کچھ تو ہونی چاہئیے جنھوں نے ہماری زبان پر احسان کیا اور کر رہے ہیں۔ یہہ احسان قطعی خالصاً للّٰہ ہے ۔

جناب مرزا عرفان علی بیگ صاحب آئی۔ ایس۔ او کا مضمون انشا غلط املا غلط (صفحہ ۲۵) انشا پردازوں۔ مضمون نگاروں۔ کاتبوں اور اکثر مالکانِ تحریر کے کام کا ہے ۔

نغمۂ عندلیب (صفحہ ۲۰ پر) ایک ہندو بزرگ ساکن دہلی (شاہجہاں آباد) کی تصنیف ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ بزرگانِ ہنود کو زبانِ اردو میں کیسا کمال تھا کہ مرزا رجب علی بیگ سرور لکھنوی کے طرز پر یہہ افسانہ لکھدیا ۔ میرا عقیدہ ہے کہ اُردو کے موجد صاحبانِ اہلِ ہنود تھے ۔

نادر شاہ۔ بعد ہنگامۂ قتلِ عام دہلی (صفحہ ۳۲ پر) تاریخی مضمون ہے جو فارسی تاریخ سے بہ بیانِ واقع سے لیا گیا۔ اس کا مصنف قریب قریب اُس زمانہ کا ہمعصر ہے اور دلّی میں

نادر شاہ کی آمد کے وقت موجود تھا۔ دلّی کے قتلِ عام کا حال تو بہت مفصل اکثر تاریخوں میں موجود ہے۔ اس ہنگامہ کے بعد نادر شاہ نے جو کام کئے اُن کا ذکر مجملاً اس مضمون میں ہے: مضمون میں اُن باتوں کا ذکر کیا گیا جن کا لگاؤ کم و بیش یہاں سے ہے ؛

نیا پُرانا کفن (صفحہ ۴۵ پر) بکار آمد مضمون ہے جس کی طرف توجہ کرنے سے بہت بے کار خرچ سے بچنے کی نہایت معقول صورت نکل سکتی ہے ؛

پچھلے پرچہ کی تحریک کی نسبت جو دربارۂ ضرورت انجمن پنشن خواران محکمۂ سول پیش ہوئی اس کے جواب میں جو تحریریں آئیں اُن کا خُلاصہ یہہ ہے کہ:-

"ایسی انجمن کی ضرورت تو عرصہ سے محسوس ہو رہی ہے مگر چونکہ اندر پنجاب اب تک کوئی سلسلہ جُنبانی نہیں ہوئی تھی سب صاحبان خاموش تھے اب چونکہ یہہ تحریک پیش ہوئی ہے کسی کو اس سے انکار نہیں" × × × × × × ×

اشتہارات کا انتظام جیسا کہ چاہئے قرار واقعی اچھا کیا گیا ہے۔ انگریزی- اُردو فارسی- ہندی میں ہر طرح کے اشتہار چھپ کر صلائے عام میں شایع ہوا کریں گے ؛ شرحِ اُجرت اشتہارات اخیر صفحہ ۵۲ میں ملاحظہ ہو ؛

جن اصحاب نے صلائے عام کی سالانہ قیمت بیباق نہیں کی ہے اُن کے نام اس مہینہ سے رسالہ بھیجنا ملتوی کر دیا گیا ہے۔ اور جب تک قیمت نہ آئے گی رسالہ بھیجنا بند رہیگا ؛ اس میں پڑھنے والوں کے لئے یہہ دِقّت ضرور ہوگی کہ اُن کی سالانہ جلد نامکمل رہ جائے گی اور پھر وہ پرچے ہاتھ آئیں یا نہ آئیں ؛ اس لئے مناسب ہے کہ جس قدر جلد ہو سکے صلائے عام کی قیمت سالانہ بذریعہ منی آرڈر بھیجدی جائے تاکہ صلائے عام برابر پہونچتا رہے ؛

دونوں وقت ملتے

صبح وشام کے مضمون ہمارے شعرا نے غضب غضب کے باندھے ہیں۔ جناب انیس وجناب دبیر نے مرثیوں میں ان کا سماں دکھانے میں قلم توڑ دیئے۔ اسی طرح اصغر علی خاں نسیم دہلوی نے الف لیلے کی ڈھائی سو راتوں میں صبح وشام ایک سے ایک بڑھ کر دکھائی۔ بغرض ہمارے ہاں کی صبح وشام کے مضمون بڑے معرکے کے سمجھنے چاہئیں۔ ان کا لطف بھی ہندوستان ہی میں ہے کہ صبح کو جب مطلع صاف ہو آسمان کے نیلے رنگ میں آفتاب کی کرنیں یار کے تیر مژگاں سے زیادہ نگاہ میں کھبتی ہیں۔ اسی طرح شام کو آفتاب کا غروب ہونا کسی حسین کے پانی میں غوطہ لگانے سے زیادہ دل کش معلوم ہوتا ہے۔

مگر ان دونوں وقتوں سے زیادہ "دونوں وقت" کا ملنا بلا کا ہے کہ جب کم سن حسین لڑکیاں بال کھولے کانوں میں پھول پہنے شام کو کوٹھے پر چڑھیں اور گھر کی بڑی بوڑھیاں یہ کہہ کہ منع کریں کہ "دونوں وقت ملتے ہیں اس وقت بال کھلے پھول پہنے چھت پر نہ جاؤ۔ دونوں وقت ملتے پریاں ہوا کھانے نکلتی ہیں اچھی شکل والی بچیوں پر پریوں کا سایہ ہو جانے کا ڈر ہے"۔

رات دن کے وقتوں میں "دونوں وقت" کا ملنا عجیب پاکیزہ دل کش وقت ہے کہ صبح وشام اندھیرے اور اُجالے دونوں کی کیفیت اور پھر دونوں سے علیحدہ۔ اس پر اپنا

فاضل لطف

خاص لطف جدا جو کسی وقت میں میسر نہیں ؛

دونوں وقت تو صبح کو بھی ملتے ہیں مگر شام کو دونوں وقتوں کا ملنا عجیب لطف کا وقت ہے۔ صبح کی تشبیہہ تو اس طرح سمجھئے کہ گویا آسمان کی پرانی نیلی چادر میں جسمیں تاروں کے بے گنتی چھید ہیں آگ لگ رہی ہے۔ سورج کی کرنیں آگ کی چنگاریوں سے بہت مشابہ ہیں کہ

در سینۂ صبح آتش افتاد ؛ خاکسترِ شام رفت برباد

دوسرے۔ صبح کو کسی کی آنکھ کھلے نہ کھلے خاصکر کم عمر بچوں کی آنکھ بہت سویرے نہیں کھلتی۔ انکو کون جگاتا پھرے؟ اس لئے صبح کا ذکر میں چھوڑتا ہوں ؛ شام کو البتہ کم عمر بچیوں کو دونوں وقت ملتے اور بدا کر سر کھلے کانوں میں پھول پہنے کوٹھے پر چڑھنے کی سوجھتی ہے کہ اس وقت ان کو گھر کے کاموں سے فرصت ملی: "اماں جان اب تو کچھ کام نہیں۔ ہم ذرا کوٹھے پر ہوائیں" پاس پڑوس کی لڑکیاں ادھر اُدھر سے چھت پر آ گئیں: اب اماں تو نیچے رہ گئیں: لڑکیوں کا یہہ حال ہے: کسی کا سر کھلا ہے کسی کی اوڑھنی کندھے پر جا رہی ہے۔ کسی کا آنچل زمین میں لٹک رہا ہے۔ کسی کے بال ہوا میں بکھر رہے ہیں۔ کسی کے بال کچھ گندھے کچھ کھلے ہیں۔ کوئی کچھ کہہ رہی ہے کوئی کچھ: یہہ وقت پھر نصیب نہیں۔ جہاں ذرا اور اندھیرا ہوا پھر یہہ لطف کہاں!

آپ کہیں گے کہ کم سن حسینوں کے لئے تو دونوں وقت کا ملنا غنیمت سہی۔ تجھے جو گور میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہے کیا سوجھی کہ اس وقت یہہ راگ لے بیٹھا ؛ اس کے جواب میں عرض ہے کہ :-

میرے لئے کیا! ہر شخص کے لئے جس کی زندگی خاتمہ کے قریب پہونچ گئی ہو اور قید

حیات سے چھٹنے کا وقت دکھائی دیتا ہو یہہ چھٹ پٹے کا وقت بہت غنیمت ہے۔ بقول حضرت شیخ سعدیؒ ع مگر این پنج روزہ دریابی ؛

اِس وقت آفتاب اُفقِ آسمان پر کنارے کے قریب پہونچ رہا ہے۔ اُفقِ آسمان کے اُس طرف گو ظاہرا اندھیرے کا اندیشہ ہے مگر اندھیرا تو اُفقِ آسمان سے اس طرف کو ہونے والا ہے کہ سورج ادھر سے ڈوبتا دکھائی دیتا ہے؛ اُفق کے دوسری طرف تو روشنی زیادہ ہونی چاہیئے کہ جو چیز اِس طرف روشنی کا سبب تھی یعنی آفتاب اس کا رُخ دوسری طرف کو ہو رہا ہے اور ہماری طرف سے اب اِس کا مُنہہ موڑنے کا وقت ہے؛ اسی طرح رُوح جو جسمِ خاکی کی رونق کا باعث تھی جدھر رُخ کریگی رونق ہو جائے گی ؛

اِس حساب سے عُمر کا اخیر وقت گویا زندگی و موت کی سرحدوں کا سین ہے جو بتاتا ہے کہ دیارِ فنا پیچھے رہا جاتا ہے اور مُلکِ بقا آگے ہے۔ زندگی کا علاقہ تھوڑا سا رہ گیا ہے اور مُلکِ عدم سامنے ہے: یہاں سے وہاں کا ڈانڈا ملا ہوا ہے ؛

اس میں شک نہیں کہ دونوں وقت ملنے کا زمانہ بہت تھوڑا ہوتا ہے لیکن کوئی دلکش وقت کتنا ہی عزیز کیوں نہ ہو دیرپا نہیں ہوسکتا۔ بلکہ اس کے عزیز ہونے کی وجہہ ہی یہی ہے کہ دیرپا نہیں ہے ؛ شبِ وصل کے اختصار کا حال شاعروں سے پوچھئے اور مہمان عزیز کی رخصت کا حال میں نے دیکھا ہے کہ ریل سیٹی دے رہی ہے۔ مشکل سے بغل گیر ہونا نصیب ہوا۔ کھڑکی سے خدا حافظ کہا۔ خط جلدی بھیجنا۔ بھول نہ جانا؛ اتنے میں گاڑی اسٹیشن سے باہر نکل گئی: جانے کیا کیا جی میں تھا جی ہی میں رہ گیا ؛

شام کا وقت ہے۔ تھوڑا سا دن باقی ہے: کچہری والے کچہریوں سے گھر کو آ رہے ہیں۔ کام کرنے والے کام کرتے کرتے تھک کر بیٹھے ہیں۔ میں کتابیں دیکھتے دیکھتے تھک گیا۔ پڑھتے پڑھتے دل گھبرا گیا: چاہتا ہے کہ کسی ہم خیال سے ملئے جس کا خود بھی جی چاہتا ہو کہ مجھ سے ملے۔ دو گھڑی جی بہلایئے۔ بقول جناب سوز لکھنوی ؎

جی میں آئی کہ کہیں ہو جئے چل کر مے نوش: لیکن ایسے سے کہ ہو غارتِ دیں آفتِ ہوش

جاڑوں کے دن چھوٹے آ رہے ہیں۔ دن کو بڑھانے کی ترکیب یہی ہے کہ دونوں وقت ملتے دوست آشناؤں سے باتیں کیجئے:

میرے دوست آشناؤں میں مجھے سب سے زیادہ عزیز صلائے عام کے پڑھنے والے ہیں۔ آؤ ان سے ملیں: صلائے عام میں مضمونِ پریشان لکھتے لکھتے جی گھبرا گیا۔ آج اس مختصر وقت میں اطمینان کی باتیں کریں:

× × × × × × × × × × × × × × × ×

صلائے عام پہونچا۔ شکریہ: اس کے دوسرے جنم کے سب پرچے جواب تک لوگوں کی نظروں سے گزرے میں نے بھی دیکھے آنکھوں سے لگائے۔ مجھ ہیچمدان کے لئے یہ کہنا زیب نہیں دیتا کہ میں نے بھی پڑھے۔ کیونکہ اُستاد مرحوم کا مصرعہ ہے ع چھوٹے سے منہہ کو بڑی بات سزاوار نہ تھی۔ اور اسکا بھی ڈر لگا تھا کہ ع صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے۔ اب کے صلائے عام دل پذیر جامہ زیب تن کئے نکلا۔ دیکھتے ہی آتش مرحوم کا یہ شعر زبان پر آگیا ؎ جامہ زیبی ترے اندام کے اوپر ہوئی ختم: تم کو پہنا کے جو انداز قبا کا دیکھا: اب رہا مضامین کیسے تھے؟ اُس کا جواب یہ ہے ع جب تم ہی نمک پاش ہو تب کیوں نہ مزا ہو: آپ کی یہ رائے کہ "متروکات سے زبان کو کوئی بہت بڑا فائدہ نہیں پہونچا" بہت درست ہے۔ واقعی اُردو کے ترقیخواہوں کو اس بحث کیطرف توجہ کرنی چاہئے: ××

اطمینان

اطمینان کی باتیں

زندگی آرام سے کاٹنے کا ذریعہ اطمینان باطن ہے۔ اس اطمینان کا نام عقیدہ ہے: عقیدہ کے لئے تحقیق و فلسفہ کی ضرورت نہیں ؛ معمولی سمجھ سے کام نکل جاتا ہے ؛ مثلاً ایسی باتوں سے :۔ "کہئے کیسی گزرتی ہے"؟ اگر اس کا جواب آپ نے یہہ دیا کہ "ابھی تک تو اچھی گزر رہی ہے۔ آگے دیکھئے کیا ہوتا ہے"؟ یہہ بات اطمینان کے خلاف ہے ؛

خدا تو وہی ہے جس کے فضل و کرم سے اب تک گزر گئی۔ آگے کی حالت میں شبہہ کرنا خلاف عقل ہے کہ خدا جانے کیا ہوگا؟ ہمیں پورا یقین رکھنا چاہئے کہ وہی ہوگا جو ہمارے لئے اچھا ہے۔

عالم اسباب میں کسی چیز کی خصلت میں فرق نہیں آسکتا: پانی ہمیشہ نیچے کو دوڑتا ہے شعلہ کا سر ہمیشہ اونچا رہتا ہے۔ ہوا جس طرف رخ کرے چل نکلتی ہے ؛ پتھر جہاں پڑا ہے پڑا رہتا ہے: کوئی وجہہ نہیں کہ صناع عالم اسباب کا مزاج ہر وقت بدلتا رہے۔ وہ ہمارے لئے جو کچھ مناسب ہے خود بخود کر رہا ہے ؛ یہہ شبہہ کرنا کہ خدا جانے وہ اب کیا کریگا۔ ہماری سمجھ کی غلطی ہے جس سے اطمینان میں رخنہ پڑ جاتا ہے ؛

زندگی اگر مصیبت میں کٹی ہے تو یہہ سمجھنا کہ آئندہ بھی یہی اندیشہ ہے تو یقیناً غایت درجہ کی کج فہمی ہے۔ خدا کی طرف سے کوئی مصیبت ایسی نہیں آسکتی جس کی برداشت کرنے کی قوت پہلے سے نہ آجائے ؎ چوں نسخہ جزو کل نوشتند ؛ یک درد بہ صد دوا نوشتند ؛

اگر آپ غور سے دیکھیں دُنیا میں مصائب سے زیادہ رحمت کے اسباب ہیں۔ محض زندگی ہی کیسی کیوں نہ ہو۔ مرنے سے بہتر ہے۔ بہار کے دن کتنے ہی چھوٹے ہوں اندھیری راتوں سے اچھے۔ عورتوں کے سیاہ بال اگر خوبانِ فرنگ کی طرح صرف کانوں کی لوتک پہونچیں بڑھاپے کے سپید بالوں سے زیادہ دلکش سمجھئے گو سپید بال درازی میں ایڑیوں تک چلے جائیں ۔

انسان کسی حالت میں کیوں نہ ہو مایوسی کو پاس نہ آنے دے۔ بیماری کیسی ہی کیوں نہ ہو یہ نہ سمجھئے کہ جاں بر ہونا مشکل ہے۔ لحاف کو ایڑی کی طرف سے اوڑھتے ہیں اور ٹوپی کا اجھانج باہر رکھتے ہیں۔ مصیبت کو بُلانا نہ چاہئے اگر آجائے تو یقین رکھئے کہ جائے گی ضرور۔

ذلیل و محبت بُری چیزیں نہیں ہیں مگر بھولا پن نعمت ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ گھر میں جب بڑے میاں گھر والوں سے کسی بات پر روٹھ جاتے ہیں اور روٹھنے کے ثبوت میں گھر میں کھانا کھانے نہیں جاتے تو گھر میں سے کوئی معصوم بچہ پان یا چار کی پیالی لیکر آتا ہے کہ آپا نے بھیجی ہے۔ اس وقت آپ سے انکار نہیں کیا جاتا۔ یہ اثر اس بچے کے بھولے پن کا ہے۔ کیٹو (یونان کے ایک بڑے بہادر فلاسفر) نے کسی جنگ میں اپنے رقیب سے شکست پاکر خودکشی کا ارادہ کیا۔ گھر والوں نے تلوار چھپا دی کہ کیٹو نے اپنا گلا کاٹنے کا ارادہ کر رکھا تھا۔ کیٹو کو بہت غصہ آیا کہ گھر والے بھی میرے دشمن ہوگئے۔ جب کیٹو نے بہت ضد کی تو گھر والوں نے تلوار اس کے کم عمر ننھے بچے کے ہاتھ بھیجی کہ معصوم بچے کے ہاتھ سے بھیجنے میں کیٹو کو ترس آجائے گا۔ دُنیا بھر کی چالاکی سے بھولے پن میں زیادہ اثر سمجھئے۔ بوڑھے کی تکلیف سے زیادہ بچے کی تکلیف کا خیال ہوتا ہے۔

یہہ اثر اس بات کا ہے کہ بچہ بھولا ہوتا ہے - دُنیا کے نشیب و فراز سے بے خبر ہے ؛

جو بات سمجھ میں نہ آئے اُس کا اثر سمجھی ہوئی بات سے زیادہ ہوتا ہے - شعرا نے کھلے ہوئے پھولوں کی تعریف اتنی نہیں کی جتنی کلیوں کی کی ہے جو کچھ کھلی کچھ بند ہوں - حسن بے پردہ سے حجاب والے حسن کے دیکھنے کو زیادہ جی چاہتا ہے - مقبرہ نمایوں کی بھول بھلیوں کے دیکھنے کا شوق بہ نسبت کھلے سیدھے راستوں کے زیادہ ہوتا ہے - جب آپ ٹہلنے کو نکلیں تو کھلے دست میدان کا راستہ چھوڑ کر اکثر ٹیڑھی بیڑھی پگ ڈنڈیوں سے نکل جانے کو جی چاہتا ہے ؛ حکیم جی نسخے فارسی میں لکھتے ہیں کہ " شب درآب تر داشتہ علی الصباح یک تولہ نبات آمیختہ بنوشند " حالانکہ فارسی کا رواج اب نہیں ہے - لیکن عوام میں چونکہ فارسی کا رواج نہیں رہا ہے یہی امر دوا جی زیادہ اثر کا سبب سمجھی جاتی ہے - کیونکہ جو بات سمجھ میں آ جائے اُس کا اثر کم ہو جاتا ہے : تعویذ و وظیفوں کے ساتھ تاکید ہوتی ہے کہ دوسرا نہ جانے ؛

کارخانۂ عالم جو ہماری سمجھ میں نہیں آتا یہی ہماری حیرت کا سبب ہے - بلکہ واقفکاری سے لاعلمی میں زیادہ آرام ہے : ہمارے دوست آشناؤں عزیزوں رشتہ داروں کی چالیں اور دھوکے کی باتیں جب تک ہم سے چھپی رہتی ہیں ہمیں رنج نہیں ہوتا حسینوں کی بیوفائیوں سے جب تک ہم واقف نہ ہوں رقیبوں پر غصہ نہیں آتا ؛

اس سے ظاہر ہے کہ جو باتیں مصلحتِ ایزدی سے ہم سے پوشیدہ ہیں اُنہیں کرید کرید کے نکالنے میں کچھ ایسا بہت آرام نہیں - بلکہ اُن کا پوشیدہ ہی رہنا ہمارے آرام کا سبب ہے : ہماری خیر اسی میں ہو کہ ہمیں کل کی خبر نہیں - یہہ کل " فردائے قیامت کی ہو یا وعدۂ یار کی سے

کیا قہر ہے جو اُس نے کیا رازداں مجھے
گویا زبان دے کے کیا بے زباں مجھے

اُردو رسالوں کی ڈائرکٹری

صلائے عام نکالنے کی وجہہ سے مجھے اکثر رسالوں کے دیکھنے کا موقع ملتا ہے۔ رسالے نکالنے والوں کی ہمت و محنت و زیرباری کو دیکھکر کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اس وقت ان سے بڑھکر اور کسی کا احسان اُردو زبان پر ہے اور تمام مہذب قوموں اور ملکوں کا مسلمہ ہے کہ اپنی زبان کی ترقی میں کوشش کرنا ہی سچی خیرخواہی ہے ✣

زبان اُردو کے چاہنے والوں میں گو تمام ہندوستان شامل ہے مگر دلی. لکھنؤ اور آگرہ و لاہور ٹکسالی شہروں میں ہیں۔ پنجاب میں اُردو کا رواج زیادہ ہے کہ لاہور و امرتسر سے سب سے زیادہ رسالے نکلتے ہیں؛ ریاستوں میں حیدرآباد (دکن) کی شہرت زیادہ ہے اور واقعی حیدرآباد کے اُردو رسالے از روئے مضامین اور خوبی اہتمام بہت پاکیزہ نکل رہے ہیں۔ خاصکر تحفہ و تاج ✣ رسالہ اُردو کے مضامین ولایت کے سہ ماہی و شش ماہی میگزینوں کی تقلید میں نکلتے ہیں مگر ابھی ولایت کے مضمون نگاروں کے مرتبہ کو نہیں پہونچے ✣ آگرہ کے رسالوں میں شمع بہت پاکیزہ رسالہ ہے۔ یہہ اگر جاری رہا تو آگرہ کی عزت کا سبب ہوگا: خاصکر ایسے مضامین سے جیسا کہ بیادگار جناب شوق قدوائی (جولائی ۱۹۲۵ء کے رسالہ میں) لکھا گیا ✣

دلی کے رسالوں میں الصالح نماز روزہ کی تاکید میں نکلتا ہے۔ دین و دنیا

(جیسا کہ اُس کا

(جیساکہ اس کا نام ہے) دینی و دنیوی دونوں پہلو لئے ہوئے ہے درویش میں جیساکہ اُسکے نام کا مقتضا ہے فقیرانہ و تصوّف کے خیالات و مضامین زیادہ ہوتے ہیں ؛ **شعلہ** اب دیکھنے میں نہیں آتا۔ **زبان** کے پُرانے پرچے کہیں کہیں مل جاتے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ اُردو زبان کے لئے مفید پرچہ تھا؛ مگر عرصہ ہوا کہ بند ہو گیا ؛ **مخزن** بھی کچھ دنوں دلّی سے نکلا۔ مگر دلّی کی آب و ہوا رسالوں کے لئے بہت راس نہیں آتی ؛ **تمدّن** و **عصمت** زور سے نکلے اور بہت مقبول ہوئے : خاص کر **عصمت** تعلیم نسواں کے لئے کام کا ہے ؛ ایک رسالہ دلّی سے **حکومت** نام کا نکلا جس میں اکثر مشہور لوگوں کے مضامین ہوتے تھے۔ مثلاً مولانا راشد الخیری دہلوی۔ مولوی عبدالحلیم **شرر** لکھنوی۔ منشی محمد دین صاحب **فوق** وغیرہ ؛ مجھے دلّی کے تمام رسالوں کا حال معلوم نہیں۔ ابھی اور بھی ضرور ہونگے جو میری نظر سے نہیں گزرے : لیکن ہیں مجھسے یہہ عرض کئے بغیر رہا نہیں جاتا کہ دلّی گو زبانِ اُردو کا گہوارہ اور مرکز سمجھی جاتی ہے مگر اُردو رسالوں کے لئے راس نہیں آتی۔ خاصکر زبان کی ترقی کے لحاظ سے : کوئی خاص کوشش اس بات کی نہیں ہو رہی ہے کہ اپنی زبان میں نازکخیالی و پاکیزہ بیانی کے اسباب پیدا ہوں اور ہمکو ملک میں شایع ہوں تاکہ اور ملک والوں کی خاصکر یورپ کی زبانوں و خیال سے برابری کر سکیں ؛ پھر بھی جو کچھ رسالے نکالنے والے باوجود ناقدری اُردو کی ترقّی میں محنت و کوشش کر رہے ہیں بہت غنیمت ہے ؛ ان کی محنت اور زبان کی خیرخواہی کا حق ہے کہ ہم ان کی طرف سے غافل نہ ہوں۔ ان کی تفصیل و تاریخ ہماری زبان کی لٹریچر کے لئے نہایت دلچسپ ہوگی ؛ ان کا حال جس قدر قلمبند ہوتا رہے آئندہ بہت بکار آمد ہوگا ؛

اس لئے میرا ارادہ ہے کہ جہاں تک ہو سکے اُردو رسالوں کا تذکرہ تفصیل وار
ڈائرکٹری کے طور پر لکھا جائے جس میں ہر شہر کے اُردو رسالوں کے نام معہ تفصیل
اس طرح لکھے جائیں:۔ شہر کا نام۔ رسالہ کا نام۔ رسالہ نکالنے والے کا نام۔
رسالہ کے مقاصد۔ جاری ہے یا بند۔ بند ہے تو کب سے؟ جاری ہے تو ملنے کا پتہ۔
غرض ایسی ہی بکار آمد اطلاعیں۔ معہ کیفیت و حالات جس قدر معلوم ہو سکیں پایہ تفصیل تک پہنچا
چاہئے۔ اس لئے ہر شہر میں جو صاحب اس کام کی طرف متوجہ ہو سکیں اس کا مسالہ
کم و بیش جس قدر ممکن ہو سکے مجھے اس پتہ سے بھیجدیں:۔

دہلی۔ فراشخانہ: مکان میر ناصر علی خاں بہادر: دفتر صلائے عام

مزید عنایت تو یہہ ہو اگر ایک ایک پرچہ ہر رسالہ کا جو دستیاب ہو سکے بذریعہ
بک پوسٹ مجھے بھیجدیا جائے۔ اُن کی خدمت میں ایک جلد ڈائرکٹری کی نذر کی جائیگی:

محض خبروں کے روزانہ اور ہفتہ وار اخبار اس تجویز سے علیحدہ ہیں:

آفتاب نامی رسالہ بہ سرپرستی ہز ہائی نس سری مہاراج مہارانا بہادر
فرماں فرمائے ریاست جہالاوار دام اقبالہم و بہ اہتمام افسرالشعرا آغا شاعر قزلباش دہلوی
ریاست جہالراپاٹن سے نکلا۔ اس میں مضامین بہت اچھے ہوتے ہیں خاص کر جناب آغا
صاحب کا کلام اس کی شہرت کا باعث سمجھا جاتا ہے: مگر اس میں بھی خریداروں کی کمی
کی شکایت دیکھی کہ آفتاب کے لئے تازہ خریدار پیدا کرنا چاہئے: یہہ رسم تو اکثر رسالوں
اور اخباروں میں عام ہو رہی ہے۔ مگر تعجب اس بات کا ہے کہ جن رسالوں کو رئیسوں کی

سرپرستی کا فخر حاصل ہے وہ بھی اس شکایت سے مستثنیٰ نہیں ؛ میری دانست میں
ان اپیلوں سے چنداں فائدہ نہیں کہ دو دو چار چار خریدار بڑھ جانے سے سارا خرچ نکل
نہیں سکتا۔ دوسرے ؛ اکثر نازک طبیعتیں دوسروں کا احسان گوارا کرنے سے خود اپنے
پاس سے خرچ کرنا زیادہ پسند کرتی ہیں ؛

ریاست حیدرآباد سے بھی چند اچھے رسالے نکلے اور نکل رہے ہیں۔ مثلاً
دبدبۂ آصفی۔ دکن ریویو۔ ترقی۔ و لسان الملک وغیرہ ؛ مجھے معلوم نہیں کہ ریاست سے
ان کی سرپرستی کا کیا حال رہا اور کیا حال ہے ؛

میں دیکھتا ہوں کہ پنجاب میں لاہور و امرتسر سے ہر طرح کے رسالے اور اخبار زیادہ نکلتے ہیں
رسالۂ **تحریک** لاہور اپنی وضع خاص کا رسالہ ہے جس کے ذریعہ سے شاعری۔ ناول نویسی۔ ڈراما
نویسی وغیرہ کی تعلیم دیجاتی ہے ؛ انگریزی میں مشہور ہے کہ شاعر ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتا ہے
محنت کرنے سے شاعر نہیں ہو سکتا ؛ اس کے برخلاف رسالہ **تحریک** میں شاعر بنانے
کا دعوےٰ ہے ؛ امرتسر سے سہیلی نامی رسالہ اعلےٰ درجہ کی مستند تعلیم یافتہ ہندوستانی بیگمات
کے اہتمام سے نکلتا ہے۔ اس رسالہ کی مہتمم لیڈیاں از روے ڈگری اس اعلےٰ مرتبہ کی ہیں
جنکی برابری میں کیا بہت کم اڈیٹر کر سکیں گے ؛

بہرحال میں بہت خوش ہوں کہ ہماری زبان میں ہر وضع و طرز کے رسالوں کی کمی نہیں۔ ان کی
تعداد اتنی ہے کہ ان کے لئے ہر سال ایک ڈائرکٹری کا اہتمام کیا جائے۔ کہ جو رسالے بند ہو جائیں اُنکی یادگار
رہے اور جو جاری ہوتے رہیں اُنکا حال لوگوں کو معلوم ہوتا ہے ؛ یہہ مضمون محض خاکہ کے طور پر...

لکھا گیا ہے جناب ... [illegible] ... معلوم ہوتا ...

مرزا جہانگیر کی گرفتاری

منشی مہتاب رائے دہلوی جو اکبر شاہ ثانی کے میر منشی تھے مرزا جہانگیر کی گرفتاری کا حال اس طرح لکھتے ہیں کہ—

اہلِ قلعہ[1] کی سازش سے مرزا جہانگیر اور ناظم قلعہ میں ناچاقی پیدا ہو گئی۔ ناظم قلعہ صاحبانِ عالیشان کی طرف سے مقرر تھا۔ لوگوں نے مرزا جہانگیر کو بہکایا کہ حکام انگریزی کے ہاتھ میں قلعہ کا انتظام نہ ہونا چاہئے۔ ناظم قلعہ روزمرہ بادشاہ کی خدمت میں قلعہ کی خیریت بولنے اور تسلیمات عرض کرنے کو حاضر ہوتے تھے۔ اسی دستور کے موافق ایک دن ایسا ہوا کہ دیوان خاص کے نزدیک مرشد زادہ (یعنی مرزا جہانگیر) نے شریر لوگوں کے ورغلانے سے ناظم قلعہ پر بندوق چلائی۔ گولی ان کے کان کے پاس سے نکلتی ہوئی چپراسی[2] کے جا لگی۔ چپراسی مارا گیا۔ مرشد زادہ کی اس حرکتِ نامطبوع نزدیک اہلِ خرد از عقل دور و خلاف آئینِ راستی و شعور سے تمام قلعہ میں شور مچ گیا۔ ناظم قلعہ نے اپنے قیام گاہ پر واپس جا کر قلعہ کے دروازوں کے بند کرنے کا حکم دیدیا۔ "شاہزادہ عالی گہر" یعنی مرزا جہانگیر نے اس حکم کی مزاحمت کی اور ملازمان سرکاری کو جو اس حکم کی تعمیل کے لئے بھیجے گئے تھے از روئے نا عاقبت اندیشی روکا۔ صاحب ناظم نے جب کوئی چارہ نہ دیکھا چند ضرب توپ قلعہ کے دروازوں پر لگا دیں۔ قلعہ پر گولہ باری شروع ہو گئی۔ یہاں تک کہ دیوان خاص بادشاہی تک نوبت پہنچی۔ بادشاہ بحالت پریشانی محلِ خاص سے نکل کر اس دروازے

لہ قلعہ معلیٰ۔ یعنی دلی کے لال قلعے کے متوسلین ؛ ۲ے۔ چپراسی کو فارسی میں "[illegible]" لکھا ہے [illegible] اصطلاح انگریزی [illegible]
گو ہیڈ۔ ۳ے۔ [illegible] منشی مہتاب [illegible]

جو جمنا کی طرف ہے اور مدت سے بند تھا مرزا جہانگیر کو سوار کرایا۔ تخت رواں پر سوار ہو کر باہر سے سیشن صاحب[۵] بہادر نے جب بادشاہ کو تسلیم کیا تو ۔ ت ۔ در شاہی کے پاس پہونچے ۔ جناب قلعہ یعنی بادشاہ نے صاحب بہادر سے فرمایا کہ اس بیہودہ لڑکے مرزا جہانگیر کی طرف سے بزرگی کی یاوہ گوئی و بیہودہ کاری ہے جس کو نیک و بد کی تمیز نہیں اس قدر ہنگامہ کی نوبت آئی۔ جب مناسب ہے کہ لڑکے کی حرکت ناشائستہ سے در گزر کریں ۔۔ ارہ راہ و رسم اتحاد قائم کی جائے اور جو کچھ ہوا اس کو بھول جانا چاہیئے ۔ صاحب نے نہایت اخلاق و شرافت سے جواب دیا کہ فدوی[۶] نے جو غلام خانہ زاد سرکار ہے شریر لوگوں کی محض عبرت کے لئے ایسا کیا۔ اگر مرشد زادہ مرزا جہانگیر چند روز آوارہ لوگوں کی صحبت سے علیحدہ رکھے جائیں تو مناسب ہے۔ کمترین مرشد زادہ کی اصلاح و شائستگی میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ ہونے دیگا۔ صاحب عالم[۷] کو فدوی اپنے ساتھ لئے جاتا ہے ۔ ہر چند بادشاہ نے چاہا کہ صاحب بہادر مرزا جہانگیر کو نہ لے جائیں مگر صاحب ممدوح نے نہ مانا۔ مرزا جہانگیر کو بادشاہ کی نظر کے سامنے اپنے ساتھ لے گئے ۔ قلعہ کا انتظام جیسا مناسب ہوا "صاحبان صاحب عزّم[۸]" کے اختیار میں آگیا ۔ اس مضمون کو صاحب تحریر یعنی میر منشی نے نظم میں اس طرح لکھا ہے کہ :-

خدائے یکہ دستش زبردست ہست ۔ بجز او دیگرے حکمرانی کراست ۔ یکے را دہد تاج و تخت و کلاہ ۔ دگر را بخاک اندر آرد ز ماہ

یکے را بہ گردن کشی سر کند ۔ دگر را بنانے گدا گر کند ۔ یکے را ہ اقبال بخت ظفر ۔ یکے را کند خوار بے پا و سر

چنیں است مرسوم دیرینہ کہن ۔ سخن در میانہ نباید زدن[۹]

---

۵ اُس وقت رزیڈنٹ دہلی تھے ۔ ۶ سرکار ۔۔۔ کے ۔۔۔ یعنی ۔۔۔ کا سلطنت مغلیہ کے آخر تک رہا ۔ ۷ شاہزادے صاحب عالم کے لقب سے مخاطب کئے جاتے تھے ۔ ۸ ۔۔۔ ۹ ۔۔۔ کی زبان کس طرح کم تھی

روانہ شدن مرزا جہانگیر بسمتِ الہ آباد حسب الطلب صاحبانِ کونسل[1]

مرزا جہانگیر کو قلعہ سے لیجانے کے بعد محلات میں ماتم ہونے لگا۔ بیگمات نے بادشاہ سے بہت واویلا مچائی: بادشاہ نے کئی بار صاحب ریذیڈنٹ بہادر کو لکھا مگر کچھ اثر نہ ہوا۔ حکام کی طرف سے ایک نہ ایک حیلہ سے یہہ درخواست ٹلتی رہی۔ آخر کار یہہ کہا گیا کہ جناب ممتاز محل بیگم صاحبہ یعنی والدۂ ماجدہ مرزا جہانگیر بادشاہ سے الگ ہو کر کسی اور جگہہ رہا کریں اور مرزا جہانگیر عہدہ ولیعہدی سے خارج ہو کر اپنی والدہ کے پاس رہیں مگر ضبط و انتظام ملازمان سرکار انگریزی کا رہیگا۔ اگر یہہ منظور نہیں ہے تو چونکہ آوازۂ شجاعت و نیکنامی مرزا جہانگیر آویزۂ گوش سامعان ہو رہا ہے۔ کارپردازان و مختاران انتظام کلکتہ کو شاہزادہ کے دیکھنے کا بہت شوق ہے۔ شاہزادہ کے دیکھنے کے لئے بہت منتظر ہیں اس لئے شاہزادہ کو اُس طرف روانہ کیا گیا۔ جلد مور ہا ہے۔ وہاں سے واپس تشریف لانے پر کوئی امر مانع نہ ہوگا اور یہہ نیک نامی ریذیڈنٹ بہادر بادشاہ کو لکھتے ہیں "تا دوست خواہد یافت و در بادہ بندگی و خیر سگالی خواہد شتافت"۔

بادشاہ نے بہت چاہا کہ اس آگ کو تدبیر کے پانی سے کسی طرح بجھائیں مگر کارگر نہ ہوئی۔ آخر کار شعبان کی دسویں تاریخ ۱۲۲۴ھ ہجری کو مرزا جہانگیر کو چند خواجہ سرا دیگر ملازموں اور خدمتگاروں کے ساتھ ہاتھی پر سوار کر کے جمنا کے کنارہ پہونچا دیا اور

[1] کونسل یعنی کونسل۔

کشتی پر سوار کر دیا ٭ جب کشتی دور نکل گئی دیکھنے والے روتے ہوئے واپس آ گئے کہ بمصداق قول فارسی ع ہر کہ رفت از کینہ خود رفت یاراں را چہ شد - وہاں سے پلٹ کر لوگ اپنے اپنے دھندوں میں لگ گئے ٭ منشی وہاب رب جی نے مرزا جہانگیر کی روانگی کی تاریخ اس طرح لکھی ہے :-

چو انگریز زیں خطۂ دل پسند ٭ جہاں گیر را برد بیروں ز بند ٭ بیامد ز شورش از نہاد ہمہ
سپہ شد جہاں خاصہ بر بادشہ ٭ نہ چندیکہ شد صرف اصلاحِ کار ٭ بجز تیرہ روزی نیاورد بار
باتمام تاریخ آں روز بد ٭ چنیں گفت تاریخ داں خرد ٭ کہ دل شد ز سعی و سر از التفات
زبوں گردشہ زادہ پیل مات

(۱۲۲۴ ہجری بہ تعمیہ نقصان دل یعنی علیت و سر التفات یعنی الف و مادۂ تاریخ تمام شد)

صدائے عام - یہہ مضمون فارسی سے اُردو میں لیا گیا ہے جو اُسی وقت کا لکھا ہوا ہے : اس سے اُسی وقت کے ایک تاریخی ہنگامہ کا حال معلوم ہوتا ہے کہ ایسے نازک معاملہ کو سرکار انگریزی نے کس خوبصورتی سے طے کر دیا ٭

---

۱ - مادۂ تاریخ نہایت پاکیزہ ہے - خاصکر "پیل مات" کی رعایت کہ مرزا جہاں گیر قلعہ سے دریائے جمنا تک ہاتھی پر سوار کرکے بھیجے گئے تھے ٭

نغمۂ عندلیب

یہہ افسانہ اُردو میں منشی گوبند سنگہ صاحب شاہجہاں آبادی نے (اب دہلوی کہنے کا دستور ہے) غدر سے پہلے لکھا تھا۔ نغمۂ عندلیب تاریخی نام ہے جس سے ۱۲۶۱ ہجری نکلتے ہیں۔ منشی صاحب کا تخلص عندلیب تھا۔ تخلص کی رعایت سے افسانہ کا نام نغمۂ عندلیب رکھا۔ میں اس افسانہ کا ذکر اس لئے کرتا ہوں کہ اس کا مصنف ایک ہندو بزرگ ہے جس نے اُردو میں کمال پیدا کیا۔ حضرت شیخ سعدی کیطرح اس افسانہ میں جتنے شعر لکھے اپنے لکھے کہ بقول مصنف "اور صاحبوں کے اشعار سے اپنی نثر کو زینت نہیں دی۔ اپنی ہی گدڑی اوروں کی قبا سے کمخوابی سے بہتر سمجھی۔ کہن خرقہ خویش پیراستن ٭ بہ از جامۂ عاریت خواستن ٭

مجھے دکھانا منظور ہے کہ تراسی برس پہلے اُردو زبان کا کیا رنگ تھا۔ اور اب جو آپ ہندو اس کے مخالف ہیں اس میں انہیں بزرگوں کا کمال پیدا کیا ہوا ہے ٭

اساتذہ نے سب سے پہلے اُردو میں مقفٰے عبارت کی طرف توجہ کی۔ اس کا سبب یہہ ہے کہ اُردو میں جب شاعری کمال کو پہونچی جسکا مدار قافیہ و ردیف پر ہے تو نثر میں نظم سے قریب تر مقفٰے عبارت ہی کا خیال ہوا۔ اُس وقت کمال کا معیار یہی سمجھا گیا ٭ اسی خیال سے مرزا رجب علی بیگ سرور کا رنگ جو فسانۂ عجائب میں ہے سب سے زیادہ مقبول ہوا ٭

نغمۂ عندلیب کا طرز فسانۂ عجائب سے ملتا ہوا ہے۔ بلکہ اگر نغمۂ عندلیب فسانۂ عجائب

سے پہلے کی تصنیف ہے تو گویا سرور لکھنوی نے عندلیب شاہجہاں آبادی کی تقلید کی ٭

عندلیب کے افسانے سے چند مقام نمونہ کے طور پر یہاں لکھنے کو جی چاہتا ہے:-

(۱) آغازِ داستان ۔ مرزبوم روم میں ایک بادشاہ فلک فر عدل گستر تھا ٭ اُس کا شیوۂ داد رسی زمیں سے آسمان تک مشتہر تھا ٭ برق خس کو جلا نہ سکتی تھی ٭ بدلی مہر و قمر کو چھپا نہ سکتی تھی ٭ آسمان کو گردش کج یاد نہ تھی ٭ رعد کے لب پر بھی فریاد نہ تھی ٭ ہزاروں ولایتیں اور جزیرے اُس کے تابع فرمان اور زیر نگیں تھے ٭ اور ہر مُلک کے بادشاہ خراج گزار سر بزمیں ٭ تمام شہر میں دن عید رات شب برات رہتی تھی ٭ ندی شادی و خوش دلی کی ہر کوچہ میں بہتی تھی ٭

نظم

گرم بازار انبساط کا تھا ٭ جو تھا سرخوشِ مے نشاط کا تھا ٭ رنج کا نام بھی نہ تھا لب پر
سایہ فضلِ خدا کا تھا سب پر ٭ شاہ شاداں تھا مُلک آباداں ٭ جوشِ عشرت زمیں سے تا بہ زماں

(۲) شاہزادی کی تعریف ۔ ایک دن شاہزادی با ہزاراں کرشمہ ناز : مانند طاؤسِ طناز ٭ مصاحبانِ دمساز کو ساتھ لیکر خراماں خراماں بامِ محل سرا پر آئی ٭ سامنے پائیں باغ تھا ۔ نرگس نے اُس کے گُل رخسار پہ ٹکٹکی باندھی ٭ سرو حیران کھڑا رہ گیا ٭ لالہ نے داغ کھایا ٭ غنچہ نے شرما کے گریبان میں مُنہہ چھپایا ٭ اُس کی زلفِ مشکیں کی بو سے سُنبل مست ہو کر جھومنے لگا ٭ ہر گُل بلبل بن گیا ٭ اُس کے غنچہ لب کے تصور میں ایک دوسرے کا مُنہہ چومنے لگا ٭ نسیم اُس شاخ یاسمیں پر قربان ہوئی ٭ شبنم دُرِ دنداں کی آبداری دیکھکر آٹھ آٹھ آنسو روئی ٭ ایک طرف گلچیں اور باغباں آپس میں کہہ رہے تھے ٭ شعر

بو باس اُسکے رُخ کی جو گُل میں نہ پایئے ٭ پھولوں کو کیوں نہ توڑیئے پُرزے اُڑایئے ٭

اور ایک طرف قُمری و بُلبل میں یہ چرچے تھے ٭ شعر

قد سرو سے ہے رُخ گُلِ خنداں سے خوب تر ٭

(۳) شاہزادی کو غش آنا - یکایک شاہزادی کی نظر شاہزادہ پر پڑ گئی ؛ چہرہ بدل گیا شکل بگڑ گئی ؛ کلیجے کے پرزے اُڑے ؛ ناوکِ مژگانِ یار دل میں گڑے ؛ مُنہہ پر اُداسی آئی ؛ طاقت گئی بے حواسی آئی ؛ پھول سا بدن شرم سے پسینا پسینا ہو گیا ؛ جان پر آ بنی دشوار جینا ہو گیا ؛ مطلق سُدھ نہ رہی ؛ غش کھا کر گر پڑی ؛ خواصوں اور سہیلیوں نے گھبرا کر وہیں اُٹھا لیا ؛ کوئی سورۂ جن تلاوت کرنے لگی کسی نے بازو پر رومال باندھا ؛ ایک بولی اے میرے اللہ یہ کیا ہو گیا ؛ دوسری نے کہا دیوانی پری کا سایہ ہو گیا ؛ ایک طرف سے آتو جی تسبیح لئے ہونٹھ ہلاتی آئیں ؛ ایۃ الکرسی پڑھ پڑھ کر دعائیں دم کیں ؛ اور ایک طرف سے خواصیں پنڈول اور صندل سُنگھانے لائیں ؛ خوب روئیں پیٹیں چلائیں ؛ بادشاہ بیگم (شہزادی کی ماں) کو خبر پہنچی سر پیٹتی آئی ؛ بلائیں لیں تلوے سہلائے بہتیرا بلبلائی ؛ کہ بیٹی پیاری اماں واری کچھ بولو ؛ آنکھیں کھولو ؛ ہے ہے لوگو میں کیا کروں ؛ اس دردِ ناگہانی کا کیا چارا کروں ؛ لیکن شاہزادی نے ہرگز آنکھ نہ کھولی ؛ کچھ نہ بولی ؛ تب چہرے پر گلاب چھڑکا گیا ؛ مُنہہ کیوڑے سے دھویا گیا ؛ آنکھیں کُھلیں پر نقشہ نقشِ تصویر ہی کا رہا ؛

ایسے ایسے ہزار سین رزم و بزم کے جناب عندلیب نے اس افسانہ میں نہایت فصاحت سے لکھے ہیں جن کا حجم خفی قلم کے ۱۲۰ صفحوں میں آیا - ان سب کا پورا ذکر کرنا گویا ایک اور کتاب لکھنا ہے پھر بھی خاتمہ سے تھوڑی سی عبارت نقل کئے بغیر رہا نہیں جاتا ؛

افسانہ کا خاتمہ

پلا ساقیا جامِ عشرت فزا ؛ کہ زہرآبِ غم پیجے کب تک بھلا ؛ بہت داستانیں الم کی لکھیں حکایات پُر دردِ غم کی لکھیں ؛ اب آگے نہیں تاب کیجے رقم ؛ کہ اشکِ قلم سے ہے قرطاس نم

ذرا سن لو شادی کی یہ داستاں ؞ بہت سن چکے رنج و غم کا بیان ؞ ہوا بعد مدت کے فضل خدا
کہ ہوتے ہیں بچھڑے ہوئے ایک جا ؞ چمن زار سے دن خزاں کے گئے ؞ وہ ایام بد گلستاں کے گئے
مراحل مصیبت کے طے ہو گئے ؞ وہ فتنے جو بیدار تھے سو گئے ؞ گیا گزرا غم سب بکھیڑا چکا
کہانی کا بھی خاتمہ ہو چکا ؞

نغمۂ عروسی و دامادی کے پردہ کشا اور ترانۂ شادی و مبارکبادی کے نغمہ سرا کلک رنگیں نوائے یوں سر آہنگ داؤدی سے سناتے ہیں ؞ یہہ نغمۂ باربدی گاتے ہیں ؞ کہ اُدھر بادشاہ ظفر پناہ کا سفر میمنت اثر سے پھر آنا ؞ اِدھر عندلیب نوید شادی کا چہچہانا ساری مملکت میں دھوم پڑگئی ؞ خلقت رنگ کھیلنے لگی ؞ وہ گلال اڑا ؞ کہ دامن آسمان گلگوں ہوگیا ؞ لوگوں نے شفق کہدیا ؞ ایسا زرد آب تھا کہ ساری کائنات زعفرانی ہوگئی ؞ یاروں نے دھوپ نام رکھ لیا ؞ یہہ خوشی تھی کہ عشاق غم زدہ کے لب پر بھی ہنسی تھی ؞ مسکراہٹ تھی ؞ امیر فقیر جس کے گھر میں جو لڑکا پیدا ہوا ؞ ہنستا پیدا ہوا ؞ غنچوں کی گرفتگی جاتی رہی ؞ باد صبا بیکار ہوگئی ؞ اپنی بے آبروئی سے سخت شرماتی رہی ؞ مطبخ سرکاری سے یہہ فیض جاری ہوا ؞ کہ زمین خانۂ زنبور بھی چمن ہوگئی ؞ بوباس سے باغ میں جو گل تھے پھول کی شکل دہن ہوگئی ؞ سلاطین ہفت اقلیم آئے ؞ تو لئے فلک نے شادیانے گائے ؞ رات کو وہ شمعیں روشن ہوئیں ؞ کہ آئنہ آسمان اُس کے عکس سے پر کواکب ہوگیا ؞ شکر گزاری فرض تھی ؞ نہ فلک پر تا قیامت سجود واجب ہوگیا ؞ خیمہ ہائے زریں سے خورشید اقتباس نور کرتا رہا ؞ فرش زرنگار کی گرد رضوان غازہ روئے غلمان و افشان جبین حور کرتا رہا ؞ نجومیوں نے ستاروں کی طرح در دولت پر ہجوم کیا ؞ جو بہین اقتران مشتری و قمر برج حمل میں

معلوم کیا ؛ حضرت کو خبر دی اُسی وقت ساعتِ سعید ٹھیرا کے ؛ شاہزادے کو شہانا جوڑا پہنایا ؛ ہر فرد بشر کو خلعتِ زرّیں سے یکّا نور کا بنایا ؛ محل میں بھی ہر ایک . نڈی خلعت سُرخ جواہر نگار سے ممتاز ہوگئی ؛ دودھ پیتی لڑکی تک اُس عطا سے سرفراز ہوگئی ؛ سفید پوشی کا حکم نہ تھا ؛ اسی لئے پوشاک کے عکس سے الماس لعل موتی یاقوت بن رہے تھے ؛ سفیدئی چشم بھی مے گُستی سے مبدّل بہ سُرخی ہوگئی تھی ؛ صاف دو جام بادہ آتش فام چہروں پر دھرے تھے ؛ القصّہ صبح روز مسعود کو سواری وطن کو چلی ؛ بیچ میں نوشا عماری مغرق میں مثل خورشید جلوہ گر ؛ گرد سلاطین عالم بہ ہزار کرّ و فرّ ؛ ہم رکاب شاہ فوج چمک دمک سے پس و پیش ؛ نوکِ سنان سے آفتاب کے سینے میں ہزاروں نیش اس پر بھی چتر سا سر پر بلا گرداں ہوتا ہوا؛ آسمان ناچتا ہوا ؛ قربان ہوتا ہوا ؛ تختِ رواں پر پریزاداں رقاص اصول سے گاتی ہوئی ؛ نوبت خانے نویدِ تہنیت ساکنانِ خاک بان سبحان افلاک کو سناتے ہوئے ؛ یہہ عالم بھی دیکھنے کے لایق تھا ؛ حضرت باری کو بھی گویا پیدایش زمین و آسمان سے اسی تماشے کی غرض تھی؛ اسی دن کا شایق تھا ؛

یہہ افسانہ (نغمۂ عندلیب) خود مُصنّف نے ۱۸۲۵ء میں چھپوایا . اور اُس وقت کے اہلِ سخن کو بہت پسند آیا ؛ میں بہت خوش ہوا کہ منشی جی کا طرزِ بیان اساتذۂ زبان اُردو سے کسی طرح کم نہیں . اہلِ ہنود میں اُردو کے ایسے ذی کمال ہندو مسلمانوں میں اتّحاد کا باعث تھے ؛ سارے افسانہ سے کہیں یہہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ اس کا مُصنّف مسلمان نہیں : جسطرح حضرت غوث گوالیاری کی پدماوت سے جو نظم بھاکھا میں ہے کسی کو یقین نہیں ہو سکتا کہ مسلمان ہندی بھاکھا میں اسقدر کمال رکھتے تھے ؛ اس وقت سب سے زیادہ

انشا غلط املا غلط

میری ہمت کو تو دیکھئے کہ باوجود اس اقبال کر لینے کے کہ میں خود غلط ہوں اپنے مضمون کے لکھنے کی جرات کرتا ہوں جس کی پیشانی انشا غلط املا غلط ہے مگر جس کے ابتدا میں خود غلط لگا دینے سے مصرع کا صدر مقام پاتا ہوں ٭ خیر یہ تو لطیفہ ہو چکا اب حقیقت حال عرض کرتا ہوں آج کل اردو زبان کے اخبار اور رسالوں کی بھرمار ہوتی چلی جاتی ہے مگر اس کا لحاظ و پاس کسی کو نہیں کہ انشا کدھر جاتا ہے اور املا کدھر جاتا ہے۔

یہ واضح رہے کہ مطبوعات کے واسطے اہل قلم چار نفوس ہیں اور اگر میں غلطی نہیں کرتا ہوں تو اپنے اپنے محل پر چاروں صحت مطبوعات کے ذمہ وار ہیں ان چاروں میں سے اول صاحب مضمون ہیں۔ دوم کاتب۔ سوم اڈیٹر (ترتیب مضامین و نگران طبع) چہارم مالک مطبع ہیں۔

صاحب مضمون کی ذمہ واری اظہار مطالب۔ لطف سخن۔ خوبی بیان اور انشا پردازی پر ختم ہو جاتی ہے۔ اگر وہ اہل قلم بھی ہیں تو صحت لفظی بھی اُن کے پلے پڑتی ہے۔ میں نے اس موقع اہل قلم ہونے کی تخصیص کے ساتھ صحت لفظی کی ذمہ داری بھی اُن پر رکھی ہے۔ ورنہ نثار اور ناظم دونوں رسلے کے ذمہ داری سے بری ہیں۔ اور ان کو رسم الخط سے کوئی بھی سروکار نہیں بالخصوص ناظم کو کچھ بھی تعلق باقی نہیں رہتا۔ کیونکہ اُس کی ذمہ داری اوزان بحور کے پورا کر دینے سے ختم ہو جاتی ہے مثلاً اس شعر کو ؎

عصۂ ہجر بس مرا وعدہ آمدن مدہ ٭ بر سر آن فزوں مکن محنت انتظار ہم

اگر کوئی ناخواندہ اسی شعر کو اس طرح پڑھ جاوے ؎

گسۂ حجر بص مرا وادۂ آمدن مدہ ٭ بر سرا ان فجوں مکن مہنت انتجار ہم

تو نظم میں ہرگز کوئی فرق نہ آویگا کیونکہ ناظم تو بحر رجز[۱] مطوی مجنوں کا وزن دیکھے گا مگر صحت املا سے

[۱] مفتعلن مفاعلن مفتعلن مفاعلن ٭

اس کو سہو و کار نہو گا۔ پس وزن و تقطیع میں ناخواندہ زبان بھی غلطی سے پاک ہے۔ اور تلفظ اس کا وہ ہے جو جہلا کا ہو سکتا ہے۔

کاتب کی ذمہ داری وہ نہیں ہے جو اہل مضمون کی ہے مگر لکھے کی ذمہ داری سے وہ بری نہیں ہے۔ اس کو بالیقین اس قدر زبان و صحت لفظی پر عبور ہونا لازم ہے کہ اس کی قلم سے غلط لفظ نہ نکل جاوے اور نہ بد املا ہو مثلاً شعر مذکور الصدر میں گُر حجر لبس کو غصہ ہجر بس لکھنے کا ذمہ دار ہے ورنہ خطا کار ہے۔ کاتب محض نقل نویس نہیں ہے جو نقل راجہ ۱۲۱ل کہہ کر بس کرے۔

اڈیٹر صاحب کی ذمہ داری ربط عبارت اور صحت لفظی دونوں کی ہے۔ ان کو یا تو جرأت ہی نہ کرنا چاہئے کہ بے ربط اور غلط عبارت و الفاظ کو طبع میں جگہ دیں یا صاحب مضمون سے تصحیح کرانا لازم ہے۔ اڈیٹر صاحب کی لیاقت بالیقین مضمون فہمی و سخندانی کی پورے طور پر ہونا چاہئے ورنہ اڈیٹری اختیار کرنے سے پرہیز کرنا لازم ہے۔

مالک مطبع کی ذمہ داری تو بہت ہی اہم ہے اور ذمہ داری کے لفظ سے ہمارا مقصد اُس ذمہ داری سے ہرگز نہیں ہے جس کا پابند اس کو قانون مطابع نے کر دیا ہے پس ہم مالک کے لفظ کی صراحت اولاً کر دینا مناسب جانتے ہیں۔ مالکِ مطبع کا کام دو حال سے خالی نہیں ہو سکتا یا تو اس کا مقصود محض سوداگری ہے یا اشاعتِ علمی بھی ہے۔ یعنی تجارت یا اشاعتِ علمی۔ جس مالک کا مقصود محض سوداگری ہے اس کے واسطے لیاقت علمی ضروری نہیں ہے۔ ایک ناخواندہ (جاہل) بھی صاحب مطبع ہو سکتا ہے مگر طبع کی ذمہ داریوں سے وہ کسی طرح سے بری نہیں ہو سکتا یعنی اگر اس کے مطبع سے غلطی طبع میں ہوگئی تو غلطی کے الزام سے وہ کسی طرح سے بری نہیں ہو سکتا اور غلطی سے جو بدنامی ہوگی وہ اُسی کے سر رہے گی۔ مالکِ مطبع کی ذمہ داری تمام اُن ذمہ داریوں کا مجموعہ ہے جو صاحبِ مضمون۔ کاتب اور اڈیٹر کی ہیں۔

آج کل یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ کہیں کہیں صاحب مضمون۔ اڈیٹر۔ اور کاتب کے خدمات کو ایک شخص واحد ہی انجام دیتا ہے اور اس سے ظاہر ہے کہ وہ کس قلیل مقدار معاش کا شخص ہے۔

اب ان تمام مراتب کو چھوڑ کر جن کا ذکر ہم کر چکے ہم اپنے اصلی مقصد کو بیان کرتے ہیں جس کا تعلق خاص طور پر ان آئے دن کے رسالوں و اخبارات سے ہے جو جا بجا سے جاری ہوتے ہیں۔ مجھے بہت کچھ رسالوں اور اخباروں کے مطالعہ سے واسطہ پڑا ہے اور پڑتا رہتا ہے۔ میں سب کی نسبت تو عرض نہیں کر سکتا مگر اکثر کی نسبت عرض کرتا ہوں کہ ان کا شایع ہونا بیکار ہے اور بعض تو نقصان دہ بھی ہیں میرا خیال اگر غلطی پر نہیں ہے تو رسالوں سے تو اشاعت علمی اور معلومات ہے اور اخبارات سے حالات دنیا سے روزمرہ آگاہی ہے اور یہہ دونوں امور فیض رسانی میں داخل ہیں کیونکہ علمی معلومات سے جہالت رفع ہوتی ہے اور واقعات دنیا کے اخبار سے ہوشمندی بڑھتی ہے۔

لیکن کیسا کچھ افسوس کرنے کا یہ موقع ہے کہ دام دو رسالے اور اخبار خریدو اور بجائے معلومات و ہوشمندی کے بیوقوف بنو۔

رسالے اُردو میں جاری ہوتے ہیں مگر اردو زبان سے پاک ہوتے ہیں۔ علمی مضامین اگر کسی میں درج بھی ہوئے تو یا ناتمام چھوٹے یا خام رہے۔

اخبار اُردو کے بے محاورہ اور غیر مانوس الفاظ سے بھرے لاطائل کلام سے کالموں کے کالم بھرے نظر آتے ہیں۔ اگر سنی سنائی خبریں بھی ان میں ہیں تو وہ کسی کو نافع نہیں۔

رسالے ہوں یا اخبار ان کا انشا اور املا دونوں بہت سے موقعوں پر غلطیوں سے بھرے ہوئے ہوتے ہیں اور بجائے نفع کے مطالعہ کرنے والوں کو نقصان پہونچاتے ہیں حتیٰ کہ ان کی بدلیاقتی میں اضافہ کرتے ہیں۔

مالکان رسالہ و اخبار نے اب یہہ طریقہ جبریہ وصول قیمت کا اختیار کر لیا ہے کہ پہلا پرچہ روانہ کر کے مکتوب الیہ سے یوں دام وصول کرتے ہیں کہ اگر آپنے پرچہ پہونچنے پر اپنی نامنظوری سے مطلع نہ کیا تو دوسرا وی پی بھیجا جاوے گا اور سمجھ لیا جاویگا کہ آپ منظوری خرید کی دے چکے ان سب مراتب پر نظر کرنے سے میں تو یہ نتیجہ نکالتا ہوں کہ معاش کی تنگی نے ایسے

مالکوں کو

مالکوں کو ایسے رسالے اور اخبار نکالنے پر مجبور کر دیا ہے جو ردّی ہیں ؛

میں نے پہلے عرض کر دیا ہے کہ سارے رسالے اور سارے اخبار ایسے بے کار نہیں ہیں چنانچہ مستثنات میں میں تخصیص کے ساتھ **صلائے عام** دہلی کو نظیر میں پیش کرتا ہوں جو فی الواقع ذیفر سانی کر رہا ہے۔ زبان اردو اس سے زندہ ہے۔ علمی مباحثے اور معلومات کا لکھنا خاص اسی کا حصّہ ہے۔ اچھے اچھے لایق ترین سخنوروں کے کلام اس میں درج ہوتے ہیں۔ اس کے مضمون نگار سب بالیاقت اہل زبان اور اخلاق مجسّم ہیں۔ اور ایسے بہتر ین انشا ان میں جن سے غلطیوں کی اصلاح ہوتی ہے۔ اس کی اشاعت کا مقصد نفع ریز ہرگز نہیں اور امر حق یہ ہے کہ اس کے مولف و جامع مضامین جناب خان بہادر میر ناصر علی صاحب گورنمنٹ پینشنر ہیں جو فصیح البیانی اور سخن سنجی میں اپنا نظیر نہیں رکھتے اور اپنی زبان کے ایسے دلدادہ ہیں کہ تمام اپنی کمائی اسی کے صرف میں لگائی۔ وی پی کے ذریعہ سے صلائے عام کا چندہ وصول کرنا ناجائز قرار دیدیا ع آفریں باد بریں ہمّتِ مردانہ تو۔ جس کے جی میں آوے دیکھ لے کہ صلائے عام کس قدر نفیس خوش قطع خوش خط اور نقش و نگار سے آراستہ ہے اور ہر لوح اس کا لامعِ نور بنا ہوا ہے۔ میں نے مدّتوں اس پر نگاہ رکھی کہ کوئی غلطی عبارت کی لفظ کی یا املے کی پکڑوں مگر میں نے آج تک نہیں پکڑ پائی۔ حالانکہ کاتب کی غلطی کا ایسے ضخیم پرچہ میں جو ساٹھ پینسٹھ صفحات کا حجم رکھتا ہو ہونا تعجب انگیز ہرگز نہیں ہو سکتا اور اس پر خوبی انتظام طبع کی یہ ہے کہ وقتِ معینہ سے ایک دن کی بھی دیر خریداروں میں پہونچنے کی نہیں ہوتی۔ × × × × × × × × × ×

(مرزا عرفان علی بیگ۔ آئی ایس او۔ از آگرہ)

مثنوی اسرارِ ہستی

(مصنفہ سید ضامن حسین صاحب گویا - جہاں آبادی)

اُردو زبان کی تمام مثنویاں زیادہ تر حُسن و عشق کے فسانوں سے لبریز ہیں میری نظر سے اُردو زبان میں اب تک کوئی ایسی مثنوی نہیں گزری جس میں مُصنّف نے فلسفہ و تصوف کے نازک اور دقیق مسائل کو شاعرانہ انداز میں بیان کیا ہو - جناب گویا صاحب اِس لحاظ سے تحسین و تہنیت کے مستحق ہیں کہ وہ ایسے خیالاتِ عالیہ کے نظم کرنے میں کامیاب ہوئے - اور جب اُردو زبان کی ایک مکمل تاریخ مرتب ہوگی تو گویا صاحب کا نام شعرائے اُردو کی فہرست میں نہایت ممتاز حروف میں لکھا جائے گا - اِس مثنوی میں مصنف نے وحدانیت - وحدت وجود سوفسطائیت - مادیت - ثنویت اور تثلیث پر اپنے خیالات کا اظہار کرکے تبصرہ کیا ہے - بعد ازاں "وجدانی باتیں" اور "حقیقت خدا شناسی" پر اپنے زریں خیالات لباسِ نظم سے مزین کرکے پیش کئے ہیں اور آخر میں "عروسِ وحدت" اور "تبسم" کے عنوان سے دو نظمیں درج ہیں - اِس مثنوی کی بحر چھوٹی اور رواں ہے - انداز بیان دل کش اور زبان شُستہ ہے -

جناب مولانا عبدالماجد صاحب بی - اے مُصنّف فلسفۂ جذبات - نے اپنے مخصوص اور فاضلانہ اندازِ بیان میں اِس مثنوی کے متعلق جن بیش بہا خیالات کا اظہار کیا ہے - میں وہی الفاظ یہاں نقل کئے دیتا ہوں :-

"اسرار الٰہیات و معرفت کی تشریح کے لئے نظم کا قالب عموماً نثر سے بہتر و موزوں تر سمجھا گیا ہے - ہندوستان کی قدیم ترین کتاب وید مقدس - اشلوکوں میں ہے - کرشن جی

کی گیتا کلام منظوم ہے ۔ حضرت مسیح کی انجیل اگرچہ نثر میں ہے ۔ لیکن طرز ادا و پیرایۂ بیان بالکل شاعرانہ ہے ۔ زبور کے راگ مشہور ہیں ۔ مسلمان صوفیہ میں اکثر نے اسرارِ معرفت کو جامۂ نظم ہی پہنا کر پیش کیا ہے ۔ سنائی ۔ عطّار ۔ مولانائے روم ۔ عراقی ۔ مغربی ۔ امیر خسرو ۔ جامی ۔ اسلامی تصوف کے عناصرِ اعظم ہیں اور یہہ سب حقائقِ معارف کو زبانِ شعر ہی میں ادا کرتے ہیں ۔ اُردو کی ابتدائی زندگی صوفیانہ و عارفانہ نظموں ہی سے شروع ہوئی ۔ تاہم یہہ اُس کی بدقسمتی تھی کہ اب تک کسی عارفِ کامل کی مستقل سرپرستی اُسے حاصل نہیں ہوئی ۔ خال خال مثالیں ملتی ہیں ۔ لیکن جب تک کوئی رومی ۔ کوئی سنائی ۔ کوئی عطّار اُردو میں بھی نہ پیدا ہو سکے گا ۔ اُردو کا افلاس اس حیثیت سے فارسی کے مقابلہ میں سقیم رہیگا ۔ پیشِ نظر مثنوی اُردو کے اِس افلاس کے کم کرنے کے مقصد سے لکھی گئی ہے ۔ اور اُس حد تک پوری کامیاب رہی ہے جہاں تک کوئی ایک کتاب یہہ مقصد پورا کر سکتی ہے "۔

ناظرین صلائے عام کی دلچسپی کے لئے اس مثنوی کے کچھ اشعار یہاں پیش کئے جاتے ہیں ۔ گویا صاحب بصائر کے عنوان کے تحت میں لکھتے ہیں : ۔

چمن میں ہے کیا بہار دیکھو ۔ چمن ہے کیا لالہ زار دیکھو ؛ نکلتی ہے دل سے خود بخود واہ ؛ زبان کہتی ہے اللہ ۔ اللہ
وہ خوشنوا ہیں طیور گویا ؛ وہ پیارا پیارا ہے اُنکا نغمہ ؛ کہ محو ہو جائے سُننے والا ؛ رہے نہ کچھ ہوش تن بدن کا
یہ پھول پتے ۔ مہکنے والے ؛ یہ بیل بوٹے طرح طرح کے ؛ کھلائے کس نے اُگائے کس نے ؛ دکھائے کس نے سنگھائے کس نے
یہ چھوٹی چڑیاں چہکنے والی ؛ وہ ننھی کلیاں مہکنے والی ؛ چہک رہی ہیں مہک رہی ہیں ؛ پھدک رہی ہیں چٹک رہی ہیں
تمام دنیا ۔ جہان کیا ہے ؟ ؛ زمین کیا آسمان کیا ہے ؟ ؛ مکین کیا ہے مکان کیا ہے ؟ ؛ یہ جسم کیا شے ہے جان کیا ہے ؟
ظہور ہے کس کی قدر توں کا ؟ ؛ یہ نور ہے کس کی قدر توں کا ؟ ؛ یہ روشنی خود ہی کہہ رہی ہے ؛ کہ "شمع بزم جہاں کوئی ہے" ؛

ضخامت ۸۴ صفحے اور تقطیع چھوٹی ہے ۔ یہہ مثنوی چار آنے میں سید ضامن حسین صاحب گویا ۔ محلہ احمد زئی سے مل سکتی ہے ۔

(ڈاکٹر محمد عبد الغفور بسمل بریلوی)

[illegible]

مختصر تنقید صلائے عام (ماہ اگست ۱۹۲۵ء)

× × × × × × × × × × × × ×

یہہ تو آپ پر روشن ہوگیا کہ تنقیدی مضامین لکھنے سے میں پریشان ہوگیا اور میں نے پناہ مانگی۔ مگر کیا کروں بے صبری نہیں مانتی۔ آپ کا یہہ فقرہ زیر پیشانی "مرنے کے بعد کیا گزرتی ہے" پڑھ کر میں تو قابو سے باہر ہوگیا کہ "دار فانی کا تماشہ تو کچھ دیکھنے بھی آیا دار البقا کا حال تو آج تک سننے میں بھی نہ آیا" یہہ حقیقت حال ہے اور بڑی پیاری زبان میں کہا گیا ہے"۔ × × × × × ×

"صلائے عام ماہ اگست بہت ضخیم یکم ستمبر کو کل پہونچ گیا۔ پنشن خواروں میں اور فرماں برداروں میں میں بھی اپنے آپ کو سمجھتا ہوں۔ اگر سوسائیٹی قائم ہوگئی تو بشرط زندگی میں بھی کبھی دہلی کی دہلیز پر جا کھڑا ہوں گا" × × × × × × × × × ×

اپکا نیازمند خاص عرفان علی

(مرزا عرفان علی بیگ آئی۔ایس۔او۔ از آگرہ)

صلائے عام۔ تنقید پر لوگوں کی خفگی سے آپ ڈریں نہیں۔ پھول کانٹوں سے نہیں ڈرتے نہ شمع پتنگوں سے: بلکہ ایسے سامان پھولوں اور شمع کی آبرو کا باعث ہیں۔ بقول حضرت جنوںؔ سہ انگلیاں نجد میں کانٹوں کی اُٹھینگی اے قیس ۔ ڈر گیا آبلہ پائی سے تو رسوا ہوگا ۔ ع ناچنے ہی کو جو نکلے تو کہاں کا گھونگھٹ؟ اکھاڑے میں لنگر لنگوٹا چاہئے نہ کہ جبہ و عمامہ ۔ اگلے وقت کے اکھاڑوں میں جب کشتی والے پہلوان لڑنت کے لئے میدان میں آتے تو دیکھنے والوں سے پکار کر آواز دیدیتے کہ دیکھنے والوں میں کوئی عورت کتنی ہی حسین کیوں نہ ہو نظر اُٹھا کر نہ دیکھے سہ نظر لگے نہ کہیں اُن کے دست و بازو کو ۔ یہہ لوگ کیوں مرے زخم جگر کو دیکھتے ہیں ۔

نادر شاہ۔ بعد ہنگامۂ قتل عام دہلی

نادر شاہ کا بڑا ہنگامہ دہلی کا قتلِ عام تھا۔ اس کا حال تاریخوں میں بہت مفصّل آچکا ہے۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ بھی ذکر کرنے کے قابل ہے۔ قتل کے ہنگامے کے رفع ہونے کے چند روز بعد نادر شاہ نے اپنے بیٹے نصر اللہ مرزا کی شادی خاندانِ تیموریہ میں چاہی۔ محمد شاہ بادشاہ کی اُس وقت کوئی لڑکی نہ تھی۔ سلطان ایزد بخش کی بیٹی سے شادی کا پیغام بھیجا گیا۔ سلطان ایزد بخش کا سلسلہ شاہجہاں بادشاہ تک اس طرح پہونچتا تھا کہ سلطان ایزد بخش ابن سلطان داور بخش ابن سلطان مراد بخش ابن شاہجہاں بادشاہ۔ یہہ لڑکی نجیب الطرفین تھی۔

شادی میں دستور ہے کہ دولہہ کی طرف سے لڑکی والوں کے نام رقعہ پیام شادی کا بھیجا جاتا ہے۔ رقعہ میں دولہا کے خاندان کے باپ دادا پردادا کے نام لکھے جاتے ہیں جس سے دولہا کا حسب نسب معلوم ہو جائے۔ اور رقعہ کے آخر میں لکھا جاتا ہے "ہرجا کہ خواہند دریافت نمایند"۔ اس دستور کے موافق ضرور ہوا کہ نادر شاہ کی طرف سے لڑکی والوں کے ہاں رقعہ بھیجا جائے۔ نادر خاندان کی طرف سے گمنام تھا۔ اس کے خاندان میں فلاں ابن فلاں کا پتہ کہاں؟ منشی سے کہا کہ پدرم شمشیر ابن شمشیر واو ابن شمشیر سات پشت تک لکھدے۔ اسی طرح نادر شاہ جب اپنی تاریخ لکھوانے بیٹھا۔ مورخ نے عرض کیا کہ تاریخ

سے خاندان کا ذکر بھی شروع میں ضرور ہے۔ نادر نے جواب دیا کہ میری تاریخ کا آغاز "امیر تیمور" یہ خاندان کی لڑکی سے نادر شاہ کے بیٹے سے جو بچہ پیدا ہوا اُس کا نام تیمور مرزا رکھا گیا ؛

شہر دہلی کے ضبط و نسق کے بعد نادر نے عظیم اللہ خاں اور سربلند خاں کو حکم دیا کہ شہر والوں کے پاس قتل و غارت کے بعد جو مال و دولت باقی ہو وہ نصف خزانۂ نادر شاہی میں داخل کیا جائے ؛ مورخ لکھتا ہے کہ چونکہ کسی کی دولت و مال کا حساب سوائے خدا کے دوسرے کو معلوم ہونا مشکل ہے۔ اس کی تحقیق میں شہر والوں پر بڑے بڑے ظلم ہوئے نادر کے خوف سے نصف کیا تمام شہر دولت سے خالی ہو گیا ؛

نواب شیر جنگ کو حکم ہوا کہ نواب برہان الملک صوبہ اودہ کا خزانہ داخل خزانۂ نادر شاہی کیا جائے۔ اس پر نواب ابوالمنصور خاں نے اس سے پہلے اودہ سے ایک کرور اسی لاکھ روپیہ اور بیس لاکھ روپیہ جو دلی میں موجود تھا جملہ دو کرور روپیہ نادر شاہ کے خزانچی کے حوالہ کر دیا ؛ اس کے علاوہ جو امرا رشاہی اور رعایا قتل عام میں مارے گئے اُن کی دولت و اسباب سب ضبط ہوا ؛ فوج کے خرچ کے لئے حکم ہوا کہ سپاہیوں کی تنخواہ چھہ مہینے کی چڑھ رہی ہے۔ چھہ مہینے کی اور پیشگی اور چھہ مہینے کی بطور انعام کُل اٹھارہ مہینے کی تنخواہ کا روپیہ شہر سے وصول کر کے لشکر والوں کو تقسیم کیا جائے ؛ یہہ سب وصول کر کے اُس دولت و جواہرات و ظروف طلائی و نقرئی۔ خاصکر شاہجہاں بادشاہ کا تخت طاؤس معہ کوہ نور و شعلۂ طور کے جو تخت طاؤس کے میر فرش تھے۔ اور اور بادشاہوں کے مرصع تخت و صندلیاں اور

ہاتی گھوڑوں معہ ساز و سامان کا شمار و حساب نا پوچھئے جو خدا تعالے جل شانہ کے
سوا وہ سرا نہیں جانتا۔ حساب کے مشکل ہونے کا ثبوت یہہ ہے کہ محمد شاہ بادشاہ کے
جواہر خانہ کا حساب محمد شاہ کے منشیوں اور نادرشاہ کے محاسبوں نے تیس سال برابر
لکھا اور ختم نہ ہوا۔ اغلب ہے کہ اسی کروڑ سے زیادہ تھا۔

منجملہ اُن باتوں کے جو نادرشاہ نے قیام دہلی کے زمانہ میں جاری کیں یہہ ہے کہ معز الملک
کو حکم دیا کہ ایران کے رائج الوقت سکّوں کو جو عباسی و محمدی و ہزار دیناری و اشرفی قزلباشی کے
نام سے مشہور تھے موقوف کرکے چاندی کا سکّہ دہلی کے روپے اور شکل کے موافق جاری کیا جائے۔ سکّہ
پر یہہ شعر کندہ کیا جائے: **شعر**

ہست سلطاں بر سلاطینِ جہاں ؛ شاہ شاہان نادرِ صاحبقراں ہاور مہدی ذو
میرمنشی کو جو دُرّہ نادرہ کا مُصنّف ہے حکم ہوا کہ تمام مُلک میں اعلان کیا جائے کہ جملہ کاغذات
سرکاری۔ فرمانوں۔ سندوں۔ عہد ناموں۔ مُہروں۔ دستاویزوں پر نادرشاہ کا نام
لکھا جائے۔ اور شاہی مُہر پر یہہ شعر کندہ ہو

نگینِ دولت و دیں رفتہ بود از ہر جا ؛ بنام نادرِ ایراں قرار داد خدا

مُلک کی تقسیم اس طرح ہوئی کہ دریا اٹک کے اُس طرف جس قدر مُلک ہیں یعنی
پشاور و کابل و غزنین و ڈیرہ جات و خیر آباد وغیرہ معہ پنجاب کے چار محال کے محاصل کے
کہ یہہ محاصل قدیم سے کابل کے مصارف کے لئے مقرر تھے نادرشاہ کے تصرف میں داخل
ہوں اور باقی محمد شاہ بادشاہ کے قبضہ میں رہے ؛

سلطنت کے کاروبار کے بعد نادر اکثر ہندوستان کی ارباب نشاط کے رقص و سرود سے دل بہلایا کرتا تھا۔ کیونکہ محمد شاہ کے پاس اس کے سوا کوئی مشغلہ نادر کے سامنے پیش کرنے کو نہ تھا: چنانچہ نوربائی نامی طوائف نے ایک دفعہ نادر شاہ کے سامنے یہہ شعر گائے ؂

دل ربایانہ دگر برسر ناز آمدہ ٭ از دل من چہ بجا ماند کہ باز آمدہ

مے بدہ ئے لبستاں دست بزن پا بکوب

درخرابات بزانہ بہر نماز آمدہ ٭٭

نادر بہت خوش ہوا اور حکم دیا کہ چار ہزار روپیہ نور بائی کو انعام دیا جائے۔ اور ساتھ ہی یہہ حکم کہ نور بائی کابل ساتھ چلے ٭ یہہ سُنکر نور بائی کا بُرا حال ہوا جان پربن گئی ٭ قریب المرگ سمجھ کر چھوڑ دی گئی ٭

ایک دن دھوپ میں سیر و شکار کے بعد نادر کے سر میں درد ہو گیا۔ قلعہ میں آکر حکیموں کو علاج کے لئے حکم دیا گیا: مگر شرط ٹھہری کہ دوا نہ لگائی جائے نہ پلائی جائے ٭ طبیبوں میں مُصنّفِ تحفۃ المومنین بلائے گئے جو بہت مشہور تھے۔ نادر کی اس شرط سے کہ دوا نہ پیوں گا نہ لگاؤنگا اور درد سر جاتا رہے۔ حکیم جی کو بہت فکر ہوا۔ مگر یہہ بات ذہن میں آئی کہ دھوپ میں شکار میں پھرتے پھرتے تمازتِ آفتاب سے سر میں درد ہو گیا ہوگا ٭ نادر کو مُثمن بُرج کے جھروکے میں جو جمنا کی طرف ہے بٹھادیا۔ چاروں طرف خس کی ٹٹیاں لگادی گئیں گلاب کیوڑے کے قرابے کھول دئے گئے۔ ٹٹیاں گلاب سے چھڑکی گئیں ٭ جمنا کے کنارے

قلعہ کے نیچے فالیز کے کھیت تھے۔ سو ڈیڑھ سو تربوز فالیز سے منگوانے کا حکم دیا گیا۔ یہہ تربوز کاٹ کر زمین برج کے اندر پھیلا کر رکھدیئے گئے۔ ترائی کی ہوا اور تربوزوں کی خنکی سے نادر شاہ کو چھینک آئی۔ الحمد للہ کہہ کر دیکھا کہ سر کے درد کو افاقہ ہوگیا۔ حکیم جی سے بہت خوش ہوا اور حکم دیا کہ ان کو کابل ساتھ لے چلو۔ حکیم جی بہت گھبرائے کہ الٰہی یہہ کیا آفت آئی۔ مگر نادر نہ مانا کہ بے دوا لگائے یا پلائے جو علاج کر سکے ایسا آدمی کہاں میسر ہے۔ غرض ان کو ساتھ لے چلا۔ ہندوستان کی سرحد پہ پہاڑوں میں چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں دیکھ کر حکیم جی جھاڑیوں سے لپٹ کر زار قطار رونے لگے۔ نادر نے رونے کا سبب پوچھا تو کہا یہہ وطن کی یادگار ہیں ان سے مل کر جی بھر آیا۔ دیکھئے خدا ان سے کب ملائے۔ نادر نے کہا۔ کابل چلو تو سہی۔ حکیم جی نے جواب دیا کہ حکم حاکم مرگِ مفاجات۔ حکم سے لاچار ہوں مگر بے دل نوکر سے اندیشہ مناسب ہے۔ کابل پہونچکر حکیم جی بار بار اپنی بیدلی کا ذکر زبان پر لاتے رہے۔ اس پہ نادر شاہ نے کہا کہ تم بار بار نوکر بے دل سے اندیشہ کہتے رہتے ہو۔ بے دل نوکر کیا کر سکتا ہے؟ حکیم جی نے جواب دیا کہ شربت کے ایک پیالے سے ہلاک کر سکتا ہے۔ اس پر گفتگو زیادہ بڑھی۔ حکیم جی نے کہا کہ حضور اس کا امتحان کرلیں۔ دایم الحبس اور گردن زدنی قیدیوں میں سے چند قیدی بلائے گئے۔ اُس زمانہ کے قیدیوں کو آج کل کے قیدخانوں کا سا آرام اور غذا کہاں نصیب تھی دو دو چار چار دن کے بھوکے سو بھی شہر میں بھیک مانگ کر سوکھے ٹکڑوں سے پیٹ بھرنے والے حاضر آئے۔ حکیم جی نے عرض کیا کہ ان کو ایک دو دن بھوکا رکھ کر روغنِ بادام اور مشک زعفران میں پکایا ہوا پلاؤ و متنجن و مزعفر جس قدر کھا سکیں کھلایا جائے۔ قیدی

گئی دن کے بھوکے تھے بے تحاشہ کھانے لگے۔ کھاتے کھاتے مُرغن غذا کی وجہہ سے پیاس زیادہ لگی : پانی منع کر دیا گیا کہ ایک بوند پانی کی نہ دیجائے ؛ جب پیاس کے مارے بُرا حال ہوا حکیم جی نے شربت پلانے کا حکم دیا۔ پیاس میں شربت بہت پی گئے ؛ چانولوں کے اوپر شربت زہر ہے۔ ایک ایک کنی چانول کی معدہ میں ہیرے کی کنی بن گئی جس سے جاں بر نہ ہو سکے ؛ نادر ڈر گیا کہ جو شخص شربت کے پیالے سے ہلاک کر سکے اُس کا رکھنا مناسب نہیں۔ حکیم جی کو ہندوستان رخصت کر دیا +

حکیم جی کا ذکر تو ضمناً جملہ معترضہ کی طرح آگیا ؛ ۱۱۵۲ہجری ماہ صفر کو محمد شاہ بادشاہ کے جلوس کے اکیسویں سال نادر شاہ نے دلّی کے قلعۂ معلّے سے کوچ کر کے شالہ مار باغ[^1] میں پہلا مقام کیا۔ حاجی فولاد خاں کوتوال شہر کو نادر شاہ نے تاکید کی کہ میرے لشکر کا کوئی آدمی اگر شہر میں رہ جائے تو اُس کے کان اور ناک کاٹ کر میرے پاس روانہ کر دینا۔ کوتوال نے گو اِس حکم کی تعمیل میں بہت کوشش کی مگر پھر بھی بہت مُغل چھپے رہ گئے : سبب یہہ کہ ہندوستان کا خاص کر دہلی جیسے پائے تخت کا آرام و عیش کابل و قندہار بلکہ تمام وسط ایشیا میں کہاں میسر تھا

معلوم ہوا کہ لاہور کا راستہ بہت ویران ہو گیا ہے۔ اِس وجہ سے سیالکوٹ کی راستہ سے سفر کا ارادہ کیا گیا ؛ اس میں کم بختی یہہ ہوئی کہ راہ میں گرمی بہت پڑی۔ اِس موسم میں آفتاب بُرج جوزا میں تھا مُغلوں کو اس قدر گرمی کی تاب نہ تھی۔ گرمی کے مارے بُرا حال ہوا۔ بہتیرے مر گئے ؛ اس گرمی میں دریائے چناب کا پانی نہایت سرد معلوم ہوا مغلوں کو کہاں وہ گرمی کہاں یہہ سرد پانی۔ دریا میں کمر تک پانی میں کھڑے کھڑے زندگی اجیرن

[^1]: سه دلی کے گرد نواح میں اب اس نام کا پتہ نہیں ؛

ہوگئی: سفر بیچ و پیچ صورتِ سقر ہوگیا۔ دریا کے اندر پانی میں اس لئے کھڑا رہنا پڑتا تھا کہ لشکر دریائے چناب کا پل باندھنے پر تعینات کئے گئے: نادر کے لشکر میں سب بے دل اور جان سے عاری نظر آنے اور بھاگنے کو تیار ہوگئے: نادر شاہ نے ابوالحسن بیگ "رکاب باشی"[1] کو حکم دیا کہ لشکر میں جس کے پاس بیش قیمت جواہر ہوں ضبط کر کے جواہر خانۂ سرکاری میں جمع کئے جائیں۔ چنانچہ بعض نے خود جن کے پاس بوگراں بہا جواہر تھے داخل خزانۂ شاہی کر دئے اس پر اُن کو نادر شاہ کی طرف سے انعام و خلعت عطا ہوئے مگر بعض نے زمین میں دفن کر دئے کہ وہیں پڑے رہ گئے اور بعض نے رنج و غصہ میں دریائے چناب میں پھینک دئے: رکاب باشی کو یہ بھی حکم ہوا کہ اسیرانِ اہل ہند میں سے جو لشکر کے ساتھ ہیں جس کا جی چاہے اُس کو اجازت دیدی جائے کہ اپنے اپنے وطن کو رخصت ہوجائیں: نواب ذکریا خاں اس کام پر تعینات ہوئے تھے۔

دریائے چناب سے پار اُترنے کے بعد نادر شاہ نے کشمیر کا ارادہ کیا اور کشمیر کا راستہ اور حالاتِ مُلک دریافت کئے گئے تو معلوم ہوا کہ فی الحقیقت کشمیر کا ملک ٹھنڈا ہے اور راہ میں چارہ پانی کی بھی بہت کمی نہیں لیکن راہ دشوار اور خوراک (رسد وغیرہ) کی تکلیف ہے: یہ سُنکر کشمیر کا حکم منسوخ کیا گیا اور نواب ذکریا خاں کو لاہور کی طرف رخصت کر دیا: نادر شاہ شدت کی بارش میں متواتر کوچ کرتا ہوا دریائے جہلم پر پہونچا۔ اتفاق سے باربرداری کا وہ اُونٹ جس پر تمام سونے کے برتن لدے ہوئے تھے پُل پر سے بھاگا اور دریا میں ڈوب گیا۔ تمام سامان غرق ہوگیا: اس پر ایک دل لگی کی بات سُنئے کہ جس وقت محمد شاہ بادشاہ فرشتہ صفت[2]

[1] یہ عہدہ "رکاب باشی" کا سفر میں بڑے اعتبار کا تھا کہ سفر کے متعلق تمام انتظام اسی کے سپرد تھا۔ (?) حکمرانی تھی:
[2] مصنفِ تاریخ محمد شاہ کو "بادشاہ فرشتہ صفت" لکھتا ہے کہ واقعی نادر شاہ جیسے ظالم کے معاملہ میں محمد شاہ فرشتہ تھا:

کے توپ خانہ کے افسر جو نادرشاہ کے لشکر کے ساتھ نادرشاہ کو پہونچانے آئے تھے نادرشاہ سے رخصت ہونے کو آئے تو نادرشاہ نے اُن سے کہا کہ اُس اونٹ کا بار جو ڈوب گیا ہے تم کو رخصتانہ کے طور پر انعام میں دیا گیا۔ ان بیچاروں نے بہت سعی و محنت کرنے کے بعد ایک تانبے کا آفتابہ اور لگن دریا میں سے نکالا۔ باقی کچھ نہ ملا ٭

"سلطان دشمنِ جانِ انسان و حیوان"[1] (یعنی نادر) باوجود کثرتِ بارش کے جلد در جلد حسن ابدال وغیرہ سے گزرتا ہوا اُن ندی نالوں کے کنارے پر پہونچا جو سرحد پٹھانوں یوسف زئی وغیرہ کی جائے سکونت ہیں ٭ یہہ پہاڑی لوگ قدیم الایام سے کسی سلطنت کے تابع و فرماں بردار ہو کر نہیں رہے۔ ان کو ہمیشہ سے اس بات کا غرور رہا کہ ہم نے آج تک کسی بادشاہ کی تابعداری نہیں کی ٭ واقعی ان کے رہنے کے مقامات نہایت دشوار گزار پہاڑوں اور ندی نالوں میں گھرے ہوئے ہیں جہاں غیر کی رسائی بہت مشکل ہے ٭ یہہ سرحدی پٹھان نادر کے آنے کی خبر سنکر عرصہ سے لڑنے کو تیار بیٹھے تھے۔ ضد سے تمام کشتیاں جلا دی تھیں اور راستے بند کر رکھے تھے ٭

نادر نے ان پٹھانوں کی تنبیہہ اور تسخیر کے لیئے فوج روانہ کی اور حکم کیا کہ چوں کہ کشتیوں کا پتہ نہیں ہے لشکر ہاتھیوں اور گھوڑوں پر پانی سے اُترے۔ چنانچہ ایسا ہوا۔ بہت تکلیفوں اور خوں ریزیوں کے بعد پٹھانوں کو زیر کیا اور قرار پایا کہ پٹھانوں میں سے تین ہزار جوان مستعد اور چند اور تحائف اُس ملک کے نادرشاہ کی خدمت میں بھیجے جائیں۔ اس قلیل شرط پر نادرشاہ نے اُن پٹھانوں سے اس لئے صلح کر لی کہ آگے کو کابل کے راستے برف سے بند ہو جاتے اور کابل پہونچنا ناممکن ہو جاتا ٭ یہہ صلح بھی گویا سرحدی پٹھانوں کی جیت رہی کہ نادر زیادہ نہ ٹھہر

[1] اس لقب کا صحیح اطلاق نادرشاہ پر بہت مناسب ہے ٭

اس مضمون کا ماخذ زیادہ تر بیان واقع نامی تاریخ ہے جس کا مُصنّف نادر کے حملہ کے وقت دلی میں موجود تھا۔ یہہ تاریخ اس نے سفرنامے کے طور پر لکھی ہے۔ لکھتا ہے:۔

کہن افسانہ ہا شنیدہ او لے ✤ سخن از ہرچہ گوید دیدہ او لے ✤ کہن شد قصۂ فرہاد و شیریں
چو علیش رفتہ و تقویم پارین بگو ✤ من از دیدۂ خویش گویم سخن ✤ نہ از گفتۂ داستانِ کہن گو
چرا عاقل رہ نادیدہ پوید ✤ قلندر ہرچہ گوید دیدہ گوید

اس مضمون میں مَیں کہیں نادرشاہ اور کہیں صرف نادر لکھ گیا ہوں۔ اس سے کوئی خاص غرض نہیں: جلدی میں جو یاد آیا لکھ دیا یا اُس کی حرکتوں سے جس طرح دل پہ اثر ہوا اُسی کے موافق قلم سے نکل گیا۔ (صلائے عام) ✤

دادِ صلائے عام

× × × × × × × × × × × × × × × ×

"رسالہ صلائے عام ہمیشہ سے اُردو زبان کی اصلاح و صفائی میں سرگرم رہتا چلا آ رہا ہے۔ جن کو مذاق صحیح ہے اور جو سلیس عام فہم اُردو کے دلدادہ ہیں ان کی نظروں میں صلائے عام ایسی دنیا میں ہے جہاں سکندر پیدا ہی نہیں ہوا اور آج تک آئینہ بنا ہی نہیں۔ گویا اور مخلوق میں اس کا ہم نوا اور ہمسر تو کیا پیدا ہوتا۔ بلکہ اس کی صورت کے سامنے کبھی آئینہ بھی نہیں آیا جو کم از کم ہم شکل ہی پیدا ہو جائے اور یکتائی کا دعوے

باعث کرنے کا سبب بن سکے ؟"

"صلائے عام کے مضامین عموماً صفائی زبان کے بہترین نمونے ہوتے ہیں اور خصوصاً آپ کی تحریر تو فصاحت کی جان ہوا کرتی ہے - آپ کے مضامین کا مجموعہ شائع ہونے کی تحریک واجبی ہے" × × × × × × × × × ×

× × × × × × × × × × × × × ×

{ خاکسار، عالی رفاعی - (خلفِ اکبر حضرت نواب مظفر جنگ بہادر - سابق وزیر امور مذہبی دولت آصفیہ)

صلائے عام - صاحبِ رسالہ تحفہ (حیدرآباد - دکن) کی اس تحریر سے میری دو غرضیں ہیں - ایک تو اُن لوگوں کا جواب جو کہتے ہیں کہ صلائے عام کی زبان مشکل ہے - جس طرح غالب کی اُردو شاعری پر الزام لگایا جاتا تھا + دوسرے یکتائی کے لئے آئینہ کی مثل بے مثل ہے - نثر میں یہہ بات میں نے نہیں دیکھی ؛ صلائے عام کے مضامین میں اس بات کی احتیاط کی جاتی ہے کہ زبان کی خوبیوں کے ساتھ مضمون بھی پاکیزہ و لاجواب پیدا کیا جائے - جس طرح جناب داغ کی زبان لاجواب سمجھی جاتی ہے اور حضرت امیر مینائی مضمون کی پاکیزگی و متانت میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے - دونوں خوبیاں یک جا بہت کم دیکھنے میں آتی ہیں ؛

× × × × × × × × × × × × × × ×

"رسالہ (صلائے عام) کی ترتیب - مضامین کی متانت - خصوصاً آپ کی نثر کی کیا تعریف ہو : کاش ایسی اُردو لکھنے والے اتنے کمیاب نہ ہوں - بعض رسائل پڑھ کر تو حیرت ہوتی ہے کہ خداوندا یہہ اُردو ہے یا کوئی اور زبان ؛"

× × × × × × × × × × × × × × ×

غزل - جناب مائل دہلوی

رخِ تاباں کو تکے نرگسِ شہلا دیکھے ÷ بے نقاب اُسکو جو دیکھے بھی تو کیا دیکھے ÷ زخم دیکھے تو تری تیغِ ادا کا دیکھے
داغ دیکھے تو مری داغِ تمنا دیکھے ÷ دین دیکھے نہ خدائی میں نہ دُنیا دیکھے ÷ وہ ہے کچھ اور جسے دیدۂ بینا دیکھے
اُس سے کس بات کا پردہ ہے تجھے اے واعظ ÷ میکدہ میں جو ترا رہن مصلےٰ دیکھے ÷ تیرے بیمار کو دیکھا نہیں اچھا کرتے
ہمنے دُنیا میں بہت رشکِ مسیحا دیکھے ÷ پھر تو وہ ظلم کرے وہ کہ الٰہی توبہ ÷ دل میں عاشق کے اگر خوف خدا کا دیکھے
وہ تو سایہ سے مرے دور رہا کرتا ہے ÷ دل میں آئے تو مرے دل کی تمنا دیکھے ÷ اے صبا اُس سے مرا شوق بیاں کر دینا
خوبرویوں میں جسے اچھے سے اچھا دیکھے ÷ کفر و اسلام کے جھگڑوں سے جو بچکر نکلے ÷ آنکھ اُٹھا کر سوئے کعبہ نہ کلیسا دیکھے
بدگماں کیوں نہوں بلبل سے کہ ہر شام و سحر ÷ تجھے گلگشت چمن میں تنِ تنہا دیکھے ÷ یہہ تو مانا کہ ہو رسوائے زمانہ لیکن
خواب دیکھے تو کوئی خوابِ زلیخا دیکھے ÷ کل ہی تو مائلِ میخوار نے رحلت کی ہے ÷ آج تربت پہ چڑھے شیشۂ صہبا دیکھے

"تحفۂ خوشتر"

اس نام کا گلدستہ جو گورکھپور سے نکلتا ہے جناب وسیم کی وجہ سے گلُ چین کا جواب ہو رہا ہے۔ آج کل کے شعراء کی غزلوں کی اصلاح میں جناب وسیم نے کمال کیا ہے۔ جون ۱۹۲۵ء کے تحفہ میں لسان الملک حضرت ریاض کی غزل پر جناب وسیم نے نہایت سخن گسترانہ رائے دی ہے کہ "معترض" کا مصرع اچھا ہے ع میں لباس غیر میں تھا مجکو کیا پہچانتے ÷ باقی حضرت ریاض کی غزل کا کیا کہنا! میں دیکھتا ہوں کہ جناب وسیم کے شاگردوں میں بہت اچھے اچھے شعر کہنے والے ہیں۔ اور زیادہ خوشی اس بات کی ہے کہ گورکھپور میں ذی مرتبہ اہلِ ہنود بھی اُردو شاعری کی طرف متوجہ ہیں: جناب جگر۔ جناب قمر۔ جناب بدر۔ جناب خوشتر کی غزلیں پاکیزہ ہوتی ہیں ÷

انجمن پنشن خواران (سول)

خدا کا شکر ہے کہ پنشن خواروں کی انجمن کی بنیاد ۵ ار ستمبر ۱۹۲۵ء کو قائم ہوگئی۔ اس کے افتتاحی اجلاس میں خان صاحب جناب مرزا **محمد علیخان** صاحب رئیس دہلی نے نہایت پاکیزہ بات کہی کہ یہ انجمن ایسے لوگوں کی ہے جس میں ایک ایک بزرگ زمانہ کے ہر طرح کے حالات اپنی آنکھ سے دیکھ چکا ہے۔ جسے دنیا کے نشیب و فراز کا تجربہ ہو چکا ہے ۔ ملازمت جسے ایک بڑے امتحان و جوابدہی کا زمانہ کہنا چاہیئے ان لوگوں پر گذر چکا ہے تب کہیں اس مرتبہ کو پہنچے ہیں جسے **پنشن یافتہ** کہتے ہیں۔ ایک عمر کی مشق اطاعت سے وفاداری و خیر خواہی انکا شعار ہوگیا ہے ۔ ایسے لوگوں کی انجمن کا کیا کہنا ؎

یادگارِ زمانہ ہیں یہ لوگ ✤ سن رکھو تم فسانہ ہیں یہ لوگ

یہ بات ہر جگہ میسر نہیں۔ ایسی صحبتیں کہاں نصیب ہیں! آجکل کی طرزِ معاشرت اور اوضاعِ زمانہ میں لطفِ صحبت کے لالے پڑ رہے تھے۔ خدا نے چاہا تو اس انجمن سے یہ شکایت مٹ جائیگی ✤

انجمن کو صرف ۲ اغراض سے کام رہے گا۔ کسی طرح کے سیاسی بحث و مباحثہ اور کسی کے عقائد مذہبی سے واسطہ نہیں: از روئے لطفِ صحبت مجھے اپنی کہنی اور آپکی سُننی منظور ہے۔ آپ جو کچھ فرمائیں میں سنوں۔ اور جو میں

Social, Intellectual and Literary

عرض کریں آپ سن لیں تاکہ معلومات علمی و سائنس۔ تحقیق و تاریخ۔ انشا و ادب میں ترقی ہو۔

اس انجمن میں بڑی شرط اتحاد باہمی کی ہے کہ بقول عرفی ؎

وقتیکہ نہادیم دریں دیر قدم را ✤ گفتیم صلاح است عرب را و عجم را

شیر شاہ کے اقبال کی وجہ مورخوں نے یہ لکھی ہے کہ:۔
جب اس نے دیکھا کہ ہندوستان میں پٹھان صرف آپس کے نفاق سے بگڑ رہے ہیں، اسکے ذہن میں آیا کہ اگر یہ عیب نہ رہے تو ان سے بڑا کام نکل سکتا ہے۔ حکم دیا کہ پٹھان کی ذات نہ پوچھی جائے کہ فلاں "زئی" ہے یا نہیں ہے۔ پٹھان کے لئے یہ بس ہے کہ پٹھان ہے زیادہ پوچھا پاچھی کی ضرورت نہیں۔ پٹھانوں کی قوم ایک کر لی۔

یہ انجمن بھی کسی خاص ذات یا قوم کی پابند نہیں۔ یہ بس ہے کہ آپ پنشن خوار ہیں۔ آ بیئے تشریف لایئے۔ یہ شرط اس خیال سے ہے کہ سرکاری یا ریاست کی ملازمت میں آپ نے اپنی خیر خواہی اور وفاداری کے صلہ میں پنشن حاصل کی ہے۔ یہ تمغائے وقار کافی ہے۔

فارسی میں مثل مشہور ہے کہ "حکیم و حاکم و حمام کہنہ باید"۔ امتحان وفاشعاری میں پنشن یافتہ گویا "پاس شدہ" ہیں۔ ان کی نیک نیتی و خلوص عقیدت میں کسے کلام ہوسکتا ہے۔ ان کی تجربہ کاری مسلمہ ہے۔

نیا پرانا کفن

چاک دامن کے ہیں ٹکڑے ہیں گریبانوں کے ❊ سئے جاتے ہیں کفن آپ کے دیوانوں کے

صلائے عام کو از روے ارادہ دینیات و عقائد مذہبی میں بحث و مباحثہ سے ہمیشہ احتراز رہا اور رہیگا۔ لیکن بعض امور ایسے ہیں جن کا تعلق عام سے ہو انکی نسبت از روے مصلحت لکھنے کو جی چاہتا ہے مرنے کے بعد جو سلوک مرنے والے کے ساتھ کیا جاتا ہے اور ہوتا ہے وہ کفن دفن کا مسئلہ ہے کہ مردہ بدست زندہ زندہ سے مراد سوسائٹی ہے کے متعلق آگرہ اخبار[1] میں ایک مضمون زیر عنوان بالا بہت بکار آمد دیکھنے میں آیا۔ جو مرزا **عرفان علی بیگ** صاحب ای۔ ایس۔ او۔ نے نہایت انصاف اور تحقیق سے لکھا ہے۔ مرزا صاحب نے یہ بحث سوشیلی (از روے رسم و رواج سوسائٹی) بڑے کام کی چھیڑی ہے ❊

مردہ کے کفن میں جو تکلف کیا جاتا ہے اُسکے دو سبب ہوتے ہیں۔ ایک تو عزیز و اقارب میں ناموری کہ برا بھلا جیسا میسر کفن دینے میں ذرا ذلت کا اندیشہ ہے۔ دوسرے کفن کا کپڑا سپید ہونا ضروری سمجھا گیا ہے۔ کہ کفن کا پاک ہونا شرعی حکم ہے۔ سپید اور نئے کپڑے

[1] مطبوعہ ۲ ستمبر ۱۹۲۵ء

واسطہ نہ اُس سے۔ از روئے شریعت جن باتوں کا حکم ہے تعمیل کرنی چاہیئے جس سے عاقبت بخیر ہو۔ باقی اللہ اللہ خیر صلاح۔ اللہ بس باقی ہوس ۔*

ایک فلک زدہ وارستہ مزاج کا شعر ہے جو شدت دیوانگی میں اُس اجل رسیدہ کی زبان سے نکل گیا۔ ؎

پھینک دو چاہو جہاں قبر میں اب دھرنا کیا * وہ جنازہ بھی نہ دیکھیں تو مرا مرنا کیا ؟

یہاں میں ایک اور بات عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔ کہ مرنے والے کے جنازہ اُٹھانے اور جنازے میں شریک ہونے میں تامل کرنا یا متعرض ہونا عزیز و اقارب کی دل شکنی کا باعث ہوتا ہے۔ مروت و آدمیت کے خلاف ہے۔ جیسا کہ حافظ رحمہ اللہ کے جنازہ کے ساتھ ہوا کہ دیوانِ حافظ میں فال دیکھی گئی۔ اور فال میں نکلا کہ ؎

قدم دریغ مدار از جنازۂ حافظ * کہ گرچہ غرق گناہ است میرود بہ بہشت

تعجب ہے کہ جس شخص کے جنازہ کی نماز سے احتراز ہو اُسی کے کلام سے سند لی گئی۔ اِسی طرح فردوسی کے نمازِ جنازہ کا قصہ۔ کہ نماز میں اس لئے تامل کیا گیا تھا۔ کہ ایران کے قدیم بادشاہوں کی جو اسلام سے پہلے گذرے ہیں شاہنامہ میں تعریف کی۔ یہ کیسی حماقت کا اعتراض تھا۔ اسلام کے پہلے تو آفتاب بھی ہے۔ پھر اُسکی روشنی کیوں ناجائز نہیں؟ آسمان بہت پہلے کا ہے۔ پھر اُس کے نیچے رہنا کیوں ناجائز نہیں؟ اور زمین جس میں بُرے بھلے دفن ہیں اِس میں دفن ہونا کیوں جائز ہے؟ بہر حال مرنے والوں سے درشت مزاجی انسانیت کے خلاف ہے *

سول پنشنرز ایسوسی ایشن

ع پیشِ حکیم مرو بیشِ تجربہ کار برو۔

اے دل تو دمے صحبتِ دانا بنشیں۔ با ساقی صفا ٭ یا با صنمِ لطیف و رعنا بنشیں۔ با شرم و حیا دیں ہر دو ترا اگر میسر نہ شوند۔ از طالعِ خویش ٭ اوقات مکن ضایع و تنہا بنشیں۔ در یاد خدا

ماہِ اگست کے صلائے عام میں جناب مرزا عرفان علی بیگ صاحب رئیسِ آگرہ نے ایک نادر مضمون "با کارو بے کار" بہت خوب۔ با موقع اور حسبِ حال لکھا ہے۔ رباعی

خوش رہتے ہیں دُکھ میں کامرانوں کی طرح ٭ ہیں ضعف سے زلتے پہلوانوں کی طرح
دل اُن کے ہیں خلاف اُن کے جو کرتے ہیں تیر ٭ ہنس بول کے پیری کو جوانوں کی طرح
(حالی)

اس مضمون نے خوابِ غفلت سے سب کو چونکا دیا۔ سوتے ہوؤں کو جھنجھوڑ دیا۔ رباعی

پیری اسبابِ زیست ٹوٹ چکی ٭ اک آس جوانی کی جو تھی ٹوٹ چکی
کہتے ہیں زبانِ حال سے موئے سفید ٭ اب رات کہاں رہی کرن پھوٹ چکی

جناب خان بہادر میر ناصر علی صاحب کے لئے اس مضمون نے "سرود بہ مستاں یاد دہانیدن" کا کام دیا وہ خود قدیم پنشن خوار۔ بیدار مغز اور اپنی دُھن کے پکے ہیں۔ دل پر چڑھنا شرط ہے۔ جو بات دل میں سما گئی اُسے کرکے چھوڑتے ہیں۔ تعجب ہے کہ اس قدر جلد اُنہوں نے سول پنشنرز ایسوسی ایشن کی داغ بیل ڈال دی۔ دیکھتا کیا ہوں کہ ۵ ار ستمبر کو لال کوئیں کی قدیم شفاخانے کی عمارت میں دھڑلے سے پہلی میٹنگ بھی بہ صدارت جناب خان صاحب نواب مرزا محمد علی خاں صاحب رئیس شہر دہلی سابق جیوڈیشل ممبر ریاستِ ٹونک منعقد ہوگئی۔ شک نہیں کہ ع ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند پہلی میٹنگ میں خان بہادر مولوی بہاءالدین صاحب ڈپٹی کلکٹر۔ پنڈت امرناتھ صاحب تحصیل دار اور کوئی درجن بھر

ہندو مسلمان شریک تھے خاکسار ہیچمدان بھی پائین مجلس میں بیٹھا تھا۔ اغراض و مقاصد اس سوسائٹی کے یہ کہے جاتے ہیں کہ پنشن خوار جیسا ان کے نام سے ظاہر ہے گورنمنٹ کے سچے خیرخواہ وبہی خواہ ہیں اور کیوں نہ ہوں انسان جس کا کھاتا ہے اسی کا گاتا ہے۔ اس سوسائٹی کو پولیٹیکل اور مذہبی امور سے کسی قسم کا تعلق نہ ہوگا۔ ایک ... مرنجاں جھنجھٹ ہوگا سہ لنگک زیر و لنگک بالا نے غم دزد نے غم کالا ... کہ پنشن خوار عموماً معمر و سن رسیدہ زمانہ دیدہ گرم و سرد چشیدہ ہوتے ہیں بالضرور تجربہ کار ہوتے ہیں ان کے باہمی میل جول اور یگانگت کے تعلقات مستحکم ہونے سے مفید و بہتر نتائج پیدا ہوں گے۔ تبادلۂ خیالات کے ماسوا دوسروں کے لئے ان کا وجود باوجود بس مغتنمات سے ہوگا۔ آپس میں ربط و اتحاد بڑھے گا۔ پنشن کا وہی مستحق قرار پاتا ہے جس نے اپنی عمر کا بہترین حصہ گورنمنٹ پر نثار کر دیا ہو ؎

منّت منہ کہ خدمتِ سلطاں ہمی کنم ؛ منّت ازو شناس کہ بخدمت بداشتت

پچیس تیس برس کے مسلسل اور لگاتار گراں بار مشغلے کے انہماک اور ذمہ داری کے بعد ایک دم سے شترِ بے مہار کی طرح کام سے سبکدوش ہو جانا انسان کی زندگی میں ایک بڑا نازک زمانہ ہے۔ جس کی تمام عمر کام کرنے میں گزری ہو اُس کے لئے آخرِ عمر میں کچھ نہ کچھ مشغلہ نہایت ضرور ہے۔ کیوں کہ کام کرنا اور ایکٹیو لیف اس کے لئے شرطِ زندگی اور طبیعتِ ثانیہ ہو جاتی ہے۔ بے کاری سَو بیماریوں کی ایک بیماری ہے۔ ربگی

ہے جان کے ساتھ کام انساں کے لئے ؛ بنتی نہیں زندگی میں بے کام کئے
جیتے ہو تو کچھ کیجئے زندوں کی طرح ؛ مُردوں کی طرح جئے تو کیا خاک جئے (حالیؔ)

اکاؤنٹنٹ جنرل کے دفتر کے اعداد و شمار اس کا کافی اور بدیہی ثبوت ہیں کہ معمولی لوگوں سے بالمناسبت پنشن خواروں کے اعمار کا اوسط بہت گھٹا ہوا ہے اور بے کاری کی وجہ سے جلد مر جاتے ہیں یہ میں نے مانا کہ پنشن خوار زیادہ کہنہ سال اور عمر رسیدہ ہوتے ہیں اور جوانوں کی بہ نسبت اُن کا جلد مر جانا کچھ تعجب کی بات نہیں ہے مگر امرِ واقعی یہ ہے کہ خالی ہاتھ بیٹھے رہنا۔ اُن کی زندگی کا کوئی مقصد نہ ہونا اُن کو عمرِ طبعی سے کچھ پہلے یعنی قبل از وقت مار ڈالتا ہے۔ جو گھوڑا ساری عمر گاڑی میں جُتا رہے اگر اُسے اب ایک دم تھان پر باندھ دیں اور کام نہ لیں تو وہ انواع و اقسام کے امراض پیدا کرے گا۔ بُرے موتر سے نکالے گا اور آخر کا

کوئی موت مرجائے گا۔ بجنسہ یہی حال پنشن خواروں کا ہے ؎

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو ۔ اک گونہ بیخودی مجھے ہر آن چاہئے

میرے والد ماجد (مولوی نذیر احمد صاحب) نے پورے تیس برس پنشن لی یعنی ایک لاکھ آٹھ ہزار روپیہ کی بھاری رقم بڑی حسن خدمت کا صلہ گھر بیٹھے پایا۔ موت کسی کو نہیں چھوڑتی انہیں بھی چھوڑا مگر چونکہ ان کو کتب بینی تصنیف تالیف کا بڑا بھاری مشغلہ تھا اور اس میں وہ مرتے دم تک ایسے گتھے رہتے تھے کہ سچ پوچھئے تو انہیں مرنے کی بھی مہلت نہ تھی اور یہی وجہ تھی کہ معمولی عمر سے زیادہ عمر پائی۔

اس سوسائٹی سے اگر ہمیں اور کچھ فائدہ پہونچنے کی امید نہ بھی ہو تو سردست یہ فائدہ کیا کم ہے کہ وقت اچھا کٹے گا جسے انگریزی میں Killing time (وقت کو مار ڈالنا یعنی کاٹنا) کہتے ہیں اور Dull life (کاہلانہ زندگی) سے نجات ملے گی اور ہم میں از سر نو چستی آجائے گی۔ ہمارے تجربوں سے ہمارے ہم جنس مفید معلومات حاصل کریں گے۔ ہم میں جو کور کسر ہے وہ بھی نکل جائے گی۔ ع بسیار سفر باید تا پختہ شود خامے ۔ دنیا میں کسی کام کی پہلے پہل ٹھیک چول نہیں بیٹھتی مگر آگے چل کر جوں جوں اس کی عمر بڑھتی جاتی ہے اس کی بنیاد مستحکم ہوتی جاتی ہے ہاں مداومت اور استقلال شرط ہے اس سوسائٹی میں بڑی بڑی نامی گرامی اور قابل اور ذی کمال اصحاب شریک ہیں اور آئندہ شریک ہوں گے۔ اس کی روح رواں خان بہادر ہیں۔ ع ہر دمے کہ بعشق زندہ غنیمت است ۔ خدا ان کی عمر میں ہماری خاطر سے برکت دے۔ وہ اپنے لئے اتنے مفید کارآمد نہیں جتنے ہمارے لئے ہیں۔ ہمارے لئے ایسے پختہ کار کی بہت ضرورت ہے عمر میں برکت کی ضرورت ہے ہمت میں برکت کی ضرورت نہیں۔ ہمت مرداں مدد خدا۔ جوانوں سے اب بھی وہ کہیں بڑھ کر کام کرتے ہیں۔ کتابوں کا مطالعہ کرتے ہیں۔ لکھنے میں ان کا قلم نہیں رکتا بولنے میں ان کی زبان میری طرح لکنت نہیں ہے۔ مستعدی ان کی گھٹی میں پڑی ہے۔ چلنے پھرنے میں بھی وہ میری طرح خانہ نشین نہیں ہو گیا ہیں۔ خان بہادر شمس العلما میرزادہ محمد حسین صاحب ایم اے پرانی طرز و روش اور نئی روشنی دونوں کی معجون مرکب معتدل ہیں۔ میں نہیں سمجھتا کہ کس بلا کے آدمی ہیں۔ دلی جیسے غدار شہر کی میونسپلٹی کے وائس پریزیڈنٹ ہیں۔ اینگلو عربک کالج کے سرگرم ممبر ہیں۔ مساجد جامع و فتح پوری کے ممبر اور اسی طرح اور بہت سے قومی کاموں میں پیش پیش ہیں۔ میرا خیال اور عقیدہ یہ ہے کہ دلی میں کوئی سوسائٹی کامل نہیں سمجھی جا سکتی جب تک میرزادہ صاحب کا اس میں وجود نہ ہو۔ بڑے پایہ کے مصنف بڑے مرتبہ کے شاعر ہیں۔ غرض سب کچھ ہیں کسی بات

کی ان میں کمی نہیں۔ میں آج تک نہیں سمجھ سکا کہ ان بزرگوں کو اتنا وقت کہاں سے ملتا ہے۔ سوتے کب ہیں آرام کب کرتے ہیں۔ خان بہادر مولوی مظفر احمد صاحب فضی بہار ان کا شریک ہونا برکت کے سوا ہمارے لئے نہ صرف مفید ہی بلکہ باعث فخر ہے کہ آپ بسا بزرگ اور مشفق قوی علم و صاحب تصانیف کثیرہ اور فارسی کے شاعر بے بدل ہیں (بشرطیکہ ہر جلسہ میں تشریف لائیں) خانصاحب نواب مرزا محمد علی صاحب کو ناظرین صلائے عام خوب جانتے ہیں ان کی تحریر یا لکھو اس لگانے کے قابل ہے جس مضمون کو لکھیں گے خواہ وہ معمولی ہی کیوں نہ ہو ایسا رنگ دیں گے کہ لوگ لوٹ لوٹ کر پڑھیں گے اور ایسے محظوظ ہوں گے کہ زبان کا چٹخارا نہ بھولیں گے۔ زبان کھولتے ہیں تو گویا منہ سے پھول جھڑتے ہیں۔ ان کی باتوں میں لطف آتا ہے اور نصیحت تجربہ کھاتے میں ان کی تقریر دل آویز ایسی سلجھی ہوئی اور لچھے دار ہوتی ہے کہ جی چاہتا ہے کہ بس سنا کیجئے۔ کبھی ہنساتے ہیں تو کبھی رلا دیتے ہیں۔ غرض تحریر و تقریر دونوں پر حاوی ہیں۔ خان بہادر مولوی بہار الدین صاحب زیادہ کیا لکھوں بے بہادر ہیں۔ دردِ بھرا دل رکھتے ہیں غیر متعصب ہیں۔ دامے درمے قدمے کا رخیر میں سب سے آگے موجود۔ انہوں نے اپنی زندگی کو دوسروں کے لئے وقف کر دیا ہے۔ پنڈت امرناتھ صاحب شاعر بے بدل طوطی شکر مقال صحبت یافتہ خلیق اور ملنسار ہیں۔ خانصاحب ڈاکٹر شریف حسین صاحب جو اس کے سکریٹری ہوگے اسم باسمی ہیں شرافت کے آثار اُن کے چہرہ سے اور طرز عمل سے ہویدا ہیں۔ میں نہیں سمجھتا کہ ان سے بہتر اس کام کے لئے اور کوئی شخص مل سکتا ہے۔ روحانی اور جسمانی دونوں فیض ان سے حاصل ہوتے ہیں۔ کوئی کام ان کا حکمت سے خالی نہیں۔ وہ قدم بڑھ کے ملتے ہیں حد درجہ کے متواضع خلیق اور منکسر المزاج ہیں۔ سب کی تعریف کچھ نہ کچھ اپنے خیال کے موافق عرض کر چکا مگر اپنی نسبت کچھ نہ کہا۔ ع بیٹھا ہوا اگرچہ لوگوں کے درمیاں ہوں ٭ پر یہ خبر نہیں ہے میں کون ہوں کہاں ہوں ٭ دوسرا کوئی کہے یا نہ کہے ع کس نشنود یا نشود من گفتگوئے می کنم میں بہ مصداق اپنے منہ میاں مٹھو اپنا تعارف خود کراتا ہوں۔ مجھ سے بہتر مجھے اور کون جان سکتا ہے۔ رباعی۔ جوشِ خم بادہ جام خالی میں ہوا ٭ پھر ولولہ پیدا دلِ حالی میں ہوا ٭ تسلیم نے دی کچھ اس طرح دادِ سخن ٭ مجھ کو بھی شک اپنی بے کمالی میں ہوا ٭ لو اور سنئے مجھے اس سوسائٹی کا خزانچی مقرر کیا ہے یعنی مارِ گنج تصور کیا ہے۔ ع قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند شاید اس خیال سے کہ ع ورار زمی کشد۔ گو مجھے زر مجتمعہ سے بجز دردسر ایک مزمہرہ نہ ملے گا مگر نقدہ گرفتہ دل خوش کرنے کو کافی ہے۔ ع دل کے خوش کرنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ رفتہ رفتہ یہ انجمن بہت ترقی کرے گی اس کی باگ بڑے بڑے زمانہ دیدہ اور آزمودہ کار اصحاب کے دست قدرت میں ہے۔ اگر بڑے بڑے شہروں جیسے آگرہ۔ لکھنؤ وغیرہ میں اس کی طرح ڈالی جائے تو نہ صرف مناسب ہے بلکہ ضرورت ہے ٭ خداوند کریم جناب میر ناصر علی صاحب قبلہ کا ناصر و مددگار رہے یہ سارا اس بڈھے کے دم کا ظہور ہے۔ ع ہمت بلند دار کہ پیش خدا و خلق ٭ باشد بقدرِ ہمت تو اعتبار تو۔ وہ ہمارے لئے ایک نعمت غیر مترقبہ ہیں کہنے کو بڈھے ہیں مگر ستر بہترے نہیں خاصے ساٹھے پاٹھے ہیں۔ رباعی۔ ہندو سے لڑیں نہ گبر سے بیر کریں ٭ سر سے کھیلیں اور ستر کے عوض خیر کریں ٭

Copy of a letter from the Private Secretary to His Honour the Lieutenant Governor of the United Provinces, Dated 11th April 1913.

GOVERNMENT HOUSE, LUCKNOW.

Sir,

I am desired to acknowledge your letter of the 9th forwarding a copy of your Paper (Salar-i-Am) for His Honour the Lieutenant Governor's perusal; and to say that His Honour has put it aside to study and enjoy at leisure.

Presentation of Mir Nasir Ali Khan Bahadur of Delhi to His Most Gracious Imperial Majesty King Emperor

Extract from a letter from J. P. THOMPSON Esqr., I. C. S.
Dated 13th December 1911.

Dear Mir Sahib,

"I enclose your invitation card for the Garden Party this afternoon, which had just reached me, from the Private Secretary to His Honour" "Sir Louis Dane hopes to have an opportunity of presenting you to His Imperial Majesty."

Extract from a letter from Sir RICHARD DANE K. C. I. E. (Brother of His Honour the Lieutenant Governor of Punjab Dated 25th Feb. 1912.

Dear Mir Nasir Ali

"My brother has told me that you had the great honour of being introduced to His Imperial Majesty the King Emperor."

I am,
Yours Sincerly,

Extract from a letter from Major (Now Lt.-Colonel) J. C. C. ANGELO, Deputy Commissioner, Dated 18th December 1911.

My Dear Mir Sahib,

I am very glad you were presented to His Imperial Majesty—it was a fitting ending to the Durbar.

Yours Sincerly,

Extract from a letter from the Honourable W. MERK, Esq I. L. D., I. C. S., Late Chief Commissioner, N. W Frontier Province, dated 6th August 1911

"I thought it (Sala i am) a Periodical that might be encouraged with advantage, for instance to be placed in the waiting rooms for native gentlemen calling on Deputy Commissioners.

Extract from a letter from A. L. GORDON WALKER, Esq., I. C. S., Punjab Commission, dated 11th October 1911,

I quite agree with Mr Merk that the (Sala-i-Am) ought to be in the Waiting Rooms of all Deputy Commissioners. Curiously enough I have used it for the purpose myself and always find that the Indian gentlemen who read it are delighted with it

---

Extract from a letter from the Deputy Commissioner of Gujranwala Punjab, Dated 4th September 1912.

"I shall be glad to recommend your Paper (Sala-i-Am) to the District Board."

"I like your Paper personally. It is always written in chaste and pure, and if I may say so, in classical style"

(NOTE—The officer is now the Commissioner and Political Agent Ambala Division, Punjab)

L. WHITE KING Esqr L. L. D, C. S. I, F. R. S, Indian Civil Service, retired, writes as follows

"I am delighted with the style of your magazine and am looking forward to the next number.

Dated 5th October 1908

Extract from a letter from L WHITE, Esqr, L L D, C S I, Indian Civil Service, Retired"

"I was glad to get the last number of the (Sala-i-Am) which I thought excellent. My friend Coloneal Story takes great interest in it.'

(NOTE—The gentlemen has since been knighted, Sir Lucas King)

صلائے عام دھلی

ہندوستان کے اہل علم کے لئے فخر کا مقام ہے کہ گورنمنٹ عالیہ ہند نے اردو ہندی - فارسی عربی میں امتحان و انعام مقرر فرمائے تاکہ حکام و افسران انگریزی مشرقی زبانوں میں کمال و لیاقت پیدا کریں اور صلائے عام کیلئے سب سے زیادہ فخر کی جگہ ہے کہ اردو زبان کے اعلے امتحان میں یہ رسالہ بھی مقبول ہوا -

گورنمنٹ عالیہ ہند کے سرکاری حکم کا انتخاب انگریزی میں جستقدر کہ صلائے عام کے متعلق ہے گزٹ آف انڈیا مطبوعہ ۶ جون سنہ ۱۹۱۴ ع سے ذیل میں نقل کیا جاتا ہے اسکی نسبت زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں کہ یہ انتخاب صلائے عام کی قدر شناسی کیلئے بس ہے -

دلا یہ مکتب الفت ہے دیکھ چپ رہنا * بڑا گناہ ہے یہاں الف سے بے کہنا -

---

Extract from the GAZETTE OF INDIA June 6, 1914 EXAMINATIONS

XVI.—The following are the Text Books prescribed for the PROFICIENCY EXAMINATION —

* * * *

URDU.

* * * * *

In addition to the Grammer and Magazine recommended for the proficiency examination —

* * *

Magazine,

SALA-I-AM.

* * * *

Appendix B. List of authorised Text Books

The following is a list of Text Books prescribed for the various examination together with places where they may be obtained.

* * *

URDU

SALA-I-AM .... **Delhi.**

* * *

(Sd.) J. C. PORTER,

Secretary to the Govt. of India.

(See the pages 1091 part 1 of the Gazette of India June 6, 1914.)

Sir Rabindra Nath Tagor, author of GITANJALI writes:—

* * * * "I have no doubt that it (Sala-i-Am) is doing a good service in promoting the cultivation of Urdu Literature,"

* * * * * * * *

OPINIONS

Regarding "SALA-I-AM," Delhi.

The following Critique on the "SALA-I-AM, Delhi was Published by the Pioneer, in its issue of the 3rd November 1909

—oOo—

The Sala-i-Am published at Delhi keeps up high character as a periodical which seeks to promote the cultivation of Urdu literature.

Khan Bahadur Mir Nasir Ali, with whom loyalty and learning go hand in hand is filling the leisure hours of his retirement by devoting himself to the editing and publishing of this Magazine. His style is marked by refinement and culture, and his readers should increase in number as the merit of his work become disclosed. The Sala-i-Am is particularly well printed and European students of Urdu should find it quite worth reading.

Extract from a letter from Colonel D. C. PHILLOT Secretary Board of Examiners Calcutta, dated 20th January 191

"I have obtained the opinion of some of the board on the Sala-i-Am" We think it is the best Urdu Magazine we have yet seen both in appearance and contents. I shall have great pleasure in recommending it to candidates for the high Proficiency and Degree of Honour. In fact, I have been doing so."

From Lieutenant Colonel D. C. PHILLOTT, M. A. Ph. D, F. A. S. B, late Secretary Board of Examiners, Calcutta.

The printing, paper, and contents of the Sala-i-Am make it the best Urdu Magazine for European students of Urdu.

D. C. PHILLOT, (Lieut. Colonel)
Late Secretary Board of examiners Calcutta.

Cambridge
1923.

Extract from a letter from R. P. Dewhurst Esquire, I. C. S. Session Judge, dated 11th 1911

"I take this opportunity of saying that I entertain a very high opinion of your Magazine. I will not say that I read every word of every number but I can say with truth that I read eagerly all the articles proceeding from your own pen beginning to end," o o o

اشتہار

صلائے عام میں اشتہارات چھپوانے کی اجرت بشرح ذیل ہے۔ اشتہار خواہ اردو میں ہو یا فارسی میں ہوں۔ انگریزی میں ہو یا ناگری میں:۔

زبان اردو یا فارسی میں۔ ایک صفحہ ایک سال کے واسطے للعہ۔ چھ ماہ کے واسطے عــه تین کیواسطے ہے

" " نصف صفحہ " " " " " " " "

" " چوتھائی صفحہ یا اس سے کم " " " " " " "

" ایک صفحہ ایک دفعہ کیواسطے ہے۔ نصف صفحہ ایک دفعہ عار۔ چوتھائی صفحہ ایکدفعہ ایکروپیہ

اجرت ہر حالت میں پیشگی آنی ضرور ہے۔ غیر مہذب اور خلاف شرافت اشتہار چھاپنے سے انکار ہے

ناگری میں چھپوانا ہو تو اردو سے ڈیوڑھی اجرت ہے

انگریزی میں چھپوانا ہو تو اردو سے دگنی اجرت ہے

دس نئی کتابیں

لطائف عجیبیہ۔ جس میں صدہا عمدہ عمدہ پھڑکا دینے والے مگر مہذب لطیفے ہیں۔ تین حصے۔

حکایات لطیفہ۔ جس میں صدہا عمدہ عمدہ دلکش۔ پرلطف نصیحت آمیز دل خوش کن مختصر کہانیاں ہیں۔ تین حصے۔ قیمت فی حصہ ایک ایک روپیہ محصول ڈاک ۵ر۔ تینوں حصوں کے سٹ کے خریدار کو فی سٹ ۲ر اور کم۔ جلد منگائیے۔ **دیوان بشیر** جس میں (۲۲) بہترین نظمیں اور مصنف کا فوٹو بھی ہے۔ قیمت عہ۔ محصول ۵ر۔ **انشائے بشیر**۔ عورتوں کے لئے سب سے بہتر انشاء۔ وافر معلومات کا ذخیرہ ہے۔ عہ محصول ۵ر

تاریخ دہلی۔ قدیم زمانے سے اب تک کی مکمل تاریخ جس میں ساری مشہور عمارتوں کے ۲۰۹ قلمی نقشے اور فوٹو ہیں۔ تین حصے ۵۶۶ صفحے قیمت للعہ محصول عہ۔ **تاریخ بیجاپور**۔ دکن کی مکمل اور مستند تاریخ جس میں ساٹھ فوٹو ہیں۔ تین حصے ۱۲۸۷ صفحے۔ قیمت للعہ محصول عہ۔ ہماری کتابوں کی مکمل فہرست جلد مفت طلب کیجئے۔

ملنے کا پتہ

بشیر الدین احمد تعلقہ دار کھاری باولی۔ دہلی

مہتمم کی طرف سے:

اطّلاع

صلائے عام کی قیمت پیشگی چھہ روپیہ سالانہ ہے - قیمت بذریعہ منی آرڈر عنایت فرمائی جائے ؛ مضمون نگار بھی صلائے عام کی قیمت سے بری نہیں - نہ یہہ ضرور ہے کہ ہر مضمون خواہ مخواہ شائع کیا جائے ؛ جامع اوراق کو مضمون میں کمی بیشی کا اختیار ہے - جو مضمون شائع نہ ہوسکیں اُن کے واپس کرنے کا ذمہ نہیں ؛

صلائے عام میں ہر طرح کے مضامین نظم و نثر شائع ہوتے ہیں - زیادہ تر نثر کی اس وقت نثر کی زیادہ ضرورت ہے ؛ اور نثر بھی ایسی جس میں زبان کی خوبی و فصاحت کے ساتھ مضمون کی پاکیزگی و نازکخیالی ضرور ہو یعنی بلسان عروس جمیل و لباس حریر - شرط ہے کہ مضمون پاکیزہ اور ادائے بیان لاجواب چاہیے ؛

اکثر اصحاب نمونہ کا پرچہ مانگتے ہیں - اول تو ایک پرچہ سے صلائے عام کی ساری خوبیوں کا حال معلوم ہونا مشکل ہے دوسرے صلائے عام اتنے عرصہ سے جاری ہے کہ اہل علم میں شاذ ہی کوئی ایسا ہوگا جو اس سے واقف نہ ہو ؛ پھر بھی اگر کسی کو نمونہ یا سال سے کم کی خریداری منظور ہو تو ایک روپیہ فی پرچہ کے حساب سے قیمت لی جائے گی ؛

صلائے عام کا پتہ اس قدر کافی ہے کہ:

دہلی - فراشخانہ : مکان میر ناصر علی خاں بہادر -

حسب الحکم استاد میر ناصر علیخاں بہادر مطبع ناصری واقع فراشخانہ دہلی میں باہتمام میر احمد دہلوی چھپا اور شائع ہوا ؛

Printed and Published by Mir Nasir Ali Khan Bahadur (Editor) at the Nasri Press, Farrash-Khana, Delhi.

Oct 25

صلائے عام



A high class Monthly Magazine devoted to the cause of Urdu literature
the preservation of the old Indian especially Mohammadan
culture and refinement, and the assimilation
of the best features of the new
civilization

Mustansir Press, Delhi

فہرستِ مضامین

جلد ۱۳ نمبر ۱۰

بابت ماہ اکتوبر ۱۹۲۵ء مطابق ربیع الثانی ۱۳۴۴ ہجری

پیرایۂ آغاز

جناب نوح ناروی کا شعر ہے ؎

جوش کھا کر خون کا دل کی رگوں میں دوڑنا ۔ کچھ دنوں پہلے سے ہوجاتا ہے اعلانِ بہار

یہہ شعر پیرایۂ آغاز کے مطلب کا ہے کہ پہلے سے مضامین کا حال معلوم ہوجاتا ہے جس طرح فصلِ بہار سے جنون کا زور۔ آنکھوں کے سُرخ ڈوروں سے نشہ کی کیفیت۔ نیچی نگاہ سے شرم و حیا۔ چاند کے گھٹنے بڑھنے سے جزر و مد کا حال معلوم ہوجاتا ہے اسی طرح پیرایۂ آغاز میں مضامین کا چربہ اُتر آتا ہے ۔ ؎

ادراکِ حالِ ما ز نگہ می تواں نمود ۔ نسخہ ز حالِ خویش بہ سیما نوشتہ ایم

پیرایۂ آغاز گویا نوشہ کے چہرہ پر سہرا ہے جس سے دُولہا برات میں پہچانا جاتا ہے۔ یا طبیب کے ہاتھ میں بیمار کی نبض جس سے دل کی حرکت کا پتہ چلتا ہے۔ یا بقول حضرتِ مومن شوخیٔ نقشِ پا سے مشابہ ہے کہ محوِ خرام کی وضعِ رفتار پہچانی جاتی ہے ع کہے دیتی ہے شوخی نقشِ پا کی ۔ ؎

کہ گزشت است ازیں بادیہ وحشی اینک ۔ نبضِ رہ می تپد و سینۂ صحرا گرم است

پچھلے پرچہ میں مضمونِ پریشان عمداً چھوڑ دیا گیا تھا۔ مگر جن لوگوں کو اُس

طرز کی عادت ہوگئی تھی اُن کے تقاضے سے تنگ آکر ایک مضمون سُرخی بغیر لکھا گیا ہے۔ پڑھنے والے جو نام چاہیں رکھ لیں۔ میں نے اس کا عنوان بغیر سُرخی کا مضمون لکھہ دیا ہے (صفحہ ۶) اس طرز کے مضامین سے میری غرض یہہ ہے کہ آپکی زباں کی طاقت دکھائی جائے کہ ہماری زبان کسی طرح کسی بات میں عاری نہیں ہے۔ نئے نئے خیال اس میں اس طرح آسکتے ہیں جس طرح دل میں نگاہِ یار کام کر جاتی ہے ✦

متروک الفاظ (صفحہ) کی بحث ہماری زبان کے لئے بہت ضروری ہے۔ جناب نواب جعفر علی خاں صاحب اثرؔ نے اس کے متعلق بہت پاکیزہ مضمون لکھا ہے۔ نظم میں تو شعراء کے لئے متروک و غیر متروک الفاظ کی پابندی چنداں مشکل نہیں کہ شعر کے دو مصرعوں میں جن میں گنتی کے چند لفظ ہوتے ہیں اور "مضمون واحد"[1] کا معاملہ ہوتا ہے احتیاط ہو سکتی ہے۔ برخلاف اس کے نثر میں زیادہ الفاظ اور مختلف مضمون بے گنتی ہوتے ہیں اس احتیاط کی پابندی دقت سے خالی نہیں۔ نظم و نثر میں امتیاز ہی یہی ہے کہ شعر میں ایک ہی فرسودہ مضمون یعنی حُسن و عشق کے سوا اور مضامین کی ضرورت نہیں۔ اس کے لئے چند سانچے میں ڈھلے ہوئے لفظ کافی ہیں: برخلاف اس کے نثر میں حُسن و عشق کے سوا اور بہت مضمون لکھنے کی ضرورت ہوتی ہے بغیر کثرتِ الفاظ ہر طرح کا مضمون موقع و محل کے موافق کس طرح ادا کیا جاے؟

شمرو بیگم والا مضمون (صفحہ) گو مورخانہ ہے مگر تحقیق کے مرتبہ کو نہیں پہونچا

[1] اگلے خطوط نویس جب کاتب کے سوا غیروں کیطرف سے وہی مطلب ادا کرنا چاہتے تھے تو لکھدیتے کہ "مضمون واحد" سمجھ لیا ✦

مضمون نگار

مضمون نگار نے اس نامور عورت کے متعلق اُن مُصنفوں کا حوالہ نہیں دیا جو پہلے لکھہ چکے ہیں: مگر چونکہ اس عورت کا تعلق دلّی سے بہت رہا تھا اس لئے یہہ مضمون بکار آمد ہوسکتا ہے ؛

ناول والا مضمون (صفحہ) مرزا عرفان علی بیگ صاحب آئی ایس او کا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ناولوں کی کثرت سے تہذیب و شائستگی کو فائدہ نہیں ہوا۔ خاصکر لڑکیوں اور عورتوں کے لئے بہت مُضر ہے ؛

پچھلے صلائے عام کی تنقید اور داد دونوں اچھی ہیں۔ داد شاعرانہ ہے اور تنقید از روئے انصاف ؛

مضمون بمقابلہٗ زبان (صفحہ) محض شعر و سخن کے متعلق ہے کہ شعر میں زیادہ ضرورت مضمون کی ہے ؛

پتھر کی چھپائی میں کتابت کی غلطیوں کی شکایت بیکار ہے اور عذر بدتر از گناہ ہے کبھی تو مجھے خود اپنے مضمون کا مطلب سمجھنے میں شُبہہ ہو جاتا ہے: لیکن مضمون نگاروں کو مجھسے زیادہ شکایت ہے کہ اُن کے مضامین بہت غلطیاں رہ جاتی ہیں۔ اس کا بڑا سبب یہہ ہے کہ مضامین دیر میں پہونچتے ہیں اور جلدی جلدی دوبارہ دیکھنے کی نوبت نہیں آسکتی۔ صاحبِ مضمون اپنے مضمون جسقدر جلد مہینہ کے آغاز میں بھیجدیا کریں تو غلطیوں میں کمی زیادتی کا اندیشہ کم رہے ؛

برائے سرخی کا مضمون

بے سُرخی کا مضمون

یہہ عنوان اس غرض سے تجویز کیا گیا کہ پچھلے پرچے میں مضمون پریشان کی جگہہ اطمینان کی باتیں لکھی گئیں۔ مگر جن کو "مضمون پریشان" کی عادت ہوگئی تھی اُنہوں نے اُسی طرز کا تقاضہ کیا: لاچار ہوکر اب کی دفعہ میں نے کوئی خاص عنوان لکھنا چھوڑ دیا۔ آپ کو اختیار ہے کہ اس مضمون کا نام آپ جو چاہیں رکھ لیں: جس طرح افسانہ ہائے محبت میں قیس و لیلےٰ کی محبت کا طرز اور تھا کہ قیس کو جنگل کی ہوا راس آگئی۔ اور شیریں و فرہاد کا اور کہ فرہاد کو کوہ کنی کی سوجھی۔ نل دمن کی وضع اور کہ قمار بازی سے شروع ہوئی اور رانجھے ہیر کی اور۔ مگر سب کا مقصود ایک ہی تھا۔ اسی طرح ادائے بیان کسی کی کچھ کیوں نہ ہو غرض اس سے ہے کہ آپ کی زبان و خیال کا اندازہ دکھایا جائے ؎

ہماں عشق است بر خود بستہ چندیں داستاں عہد
کسے بر معنئ یک حرف صد دفتر نمی سازد

اس مضمون کی وضع میں سموئے ہو پانی کی سی رکھنا چاہتا ہوں کہ نہ بہت گرم ہو نہ بہت سرد۔ یعنی گو زلفِ بتاں کی طرح یہہ عالم اسباب جامع پریشانی ہے مگر زلفِ یار کی پریشانی کسی نے عیب میں نہ سمجھی بلکہ اسبابِ حُسن میں داخل ہے کہ موئے پریشان وارستہ مزاجوں کی طرح پابندی سے مستغنی ہوتے ہیں؛

یہہ دُنیا اگر بہت ہی دل کش ہے تو کیا دل کشی اسی کو کہتے ہیں کہ یہاں سے نکلنے کے بعد کسی نے آج تک ادھر مُنہہ پھیر کر نہیں دیکھا۔ بقول ابو طالب کلیم ؎

وضع زمانہ قابلِ دیدن دوبارہ نیست ✤ رُو ہیں نہ کرد ہر کہ ازیں خاکداں گزشت

دنیا میں آکر کوئی حرکت ہم نے ایسی نہیں کی جس کا سامان عالمِ اسباب میں پہلے سے مُہیّا نہ ہو۔ نہ اس قصد سے کی کہ میاں کو خفا کرنا منظور تھا: ہم نے جو مزے اُڑائے عامیانہ قول کے موافق "میاں کی جوتیوں" کا صدقہ ہے۔ اس پر از روے شرمندگی جو ہم خواستگار عفوِ ایزدی ہیں تو کیا ہماری شرمندگی بھی قصور میں داخل ہے؟ ؎

نہ کردہ جرم مرا عفو کن بہ لُطفِ عمیم ✤ کہ خوش نما ست خطائے نہ کردہ بخشیدن

انسان کے لئے نیکی سے زیادہ کوئی نعمت نہیں۔ یعنی تقوےٰ و پرہیزگاری و پارسائی کا کیا کہنا! مگر تقوے کو مکر کے ساتھ اور پرہیزگاری و پارسائی کو خواہشاتِ نفس سے ملانا گناہ سے بدتر ہے کہ نہ رندی کا لطف آیا نہ پارسائی کا ؎

کلیدِ درِ دوزخ است آں نماز ✤ کہ در چشمِ مردم گزاری دراز

اس کی بدیہی تمثیل یہہ ہے کہ زہد و تقوے کے ساتھ سماع و غنا۔ حسین گانے والیوں کو چھوڑ کر مُغنّیانِ امرد کی آواز پر وجد۔ شراب کی جگہہ بادۂ عرفان کی ایجاد۔ جس سے نہ شراب کا نشہ ہوا نہ عرفان کا مرتبہ حاصل ہوا: بلکہ معصیت کو نیکی کے پردہ میں.... (خاکم بہ دہن) گناہ بے لذّت کر دیا۔ گویا بھلا۔ کی زبان کا: لُقمۂ طعامِ لذیذ بھی بے مزہ معلوم ہوا: اب گناہ گار۔ توبہ کریں تو کس منہہ سے؟ ان کو تو درِ توبہ کُھلا دیکھکر شرم آتی ہو گی ؎

منفعل

؎ تا منفعل ز رحمتِ بیجا نہ سازدش * ہر دم عترافِ گناہ نہ بودہ را * معصیت کو جب نیکی کا لباس پہنا دیا تو گویا ؎ میں لباسِ غیر میں تھا مجھکو کیا پہچانتے * آتے جاتے شب میں مجھکو پاسباں دیکھا کئے *

تم دُنیا میں ترکِ دُنیا کے لئے نہیں آتے ہیں۔ اگر دُنیا کا ترک کرنا مقصود تھا تو ہم کو یہاں بھیجنا کیا ضرور تھا؟ ؎

کیسۂ بر وعدہ ہائے بخت نتواں دوختن * خفتہ گر در خواب حرفے گفت ازاں آگاہ نیست

حضرت موسےٰؑ جانتے تھے جیسا کہ تمام دُنیا جانتی ہے کہ خُدا کو کسی نے نہیں دیکھا۔ ایمان بالغیب کے معنی یہی ہیں کہ بغیر دیکھے یقین کرلینا۔ پھر بھی خدا کو دیکھنے کی ہوس کی۔ اس کا جواب حضرتؑ کو لن ترانی کے سوا اور کیا ملتا؟ ؎

اک عاشقوں کی بات تھی اس کو بھی کھو دیا * موسےٰؑ ملا جواب ارنی کے سوال کا

حضرتؑ کو دیدارِ الٰہی کی ہوس ہی نہ کرنی چاہئے تھی *

عُرفیؔ نے اس معاملہ میں خوب کہا ؎

بہ طُورِ ما نہ گنجد منعِ دیدار * ولے ایں راز با موسےٰ نگوئید

عرفی کا ایک اور شعر بھی صبر و ثبات کے متعلق سُننے کے قابل ہے کہ ؎

من از یں درد گرانبار چہ لذت یابم * کہ باندازۂ آں صبر و ثباتم دادند

(جب مصیبت میں صبر و ثبات کی قوت ہو جائے تو وہ مصیبت ہی نہیں۔ اور نعمائے الٰہی میں یہ مسئلہ ہے کہ مصیبت کے ساتھ ہی مصیبت کے برداشت کرنے کی طاقت

[illegible]

تی پیدا ہو جاتی ہے تو اب صحبت کا لطف باقی رہا) اسی مضمون کو ابو طالب کلیم نے بھی خوب کہا ہے ؎

صبر گوارا کند مرعیبِ ترا خوش مست ⁂ ساعتے نکتہ نہ آب گل آلودہ را

(پانی اگر گرد آلود ہے تو ذرا ٹھہر جانے دے کہ مٹی نیچے بیٹھ جائیگی اور ستھرا پانی رہ جائیگا)

ہمارے ہاں کی شاعری برخلاف اور زبانوں کی شاعری کے فلاسفی وتصوف کا نچوڑ ہے۔ بہت عرصہ نہیں ہوا کہ صلائے عام میں یہہ مشغلہ رہا کہ گیتا انجلی کی سی نازکخیالیاں دکھائی گئیں۔ بڑی خوبی ان میں یہہ ہے کہ ایک چند الفاظ کے مختصر مصرع میں وہ بات دکھائی جائے جس میں ردیف وقافیہ ووزن کی ہزار پابندیوں کے ساتھ ہی نئے نئے مضمون باندھے جائیں جن کی شرح کے لیئے دفتر کے دفتر درکار ہوں۔ اور وہ چند لفظ بھی اس طرح نگینہ کی طرح جمائے جائیں جو اپنی جگہ سے ہل نہ سکیں نہ ان کی جگہ دوسرا لفظ آ سکے ⁂ لطفِ صحبت کی تعریف اس سے زیادہ بیان کرنی مشکل ہے ؎

مقصود صحبت است ز گل۔ ورنہ بوئے گل ⁂ انصاف اگر بود ز صبا می تواں شنید ⁂

(پھول سے غرض لطفِ صحبت ہے کہ دیکھکر جی خوش کر لیا۔ ورنہ پھول کی خوشبو تو ہوا سے بھی معلوم ہو سکتی ہے ⁂)

عرفی نے اس شعر میں کس قدر فصاحت کس خوبی واختصار کے ساتھ ختم کردی ؎

فریاد کہ غمہائے تو در سینۂ تنگم ⁂ اندک بود لایق و بسیار نہ گنجد

کلیم کا شعر ہے ؎ دل آگاہ می باید وگرنہ ⁂ گدائے کحضرتے نام نہ نیست ......

مضمون بمقابلۂ زبان

شاعری میں دو خوبیوں کی ضرورت ہے۔ مضمون اور زبان کی: اگر دونوں باتیں موجود ہوں تو غایتِ کمال ہے۔ مگر یہہ کمال ہر شخص کے بس کا نہیں: بعض کو مضمون خوب سوجھتا ہے اور بعض زبان کا زیادہ خیال رکھتے ہیں: زبان میں اس قدر دقت نہیں ہوتی جس قدر مضمون کی تلاش میں دماغ سوزی کی ضرورت ہے۔ زبان پر تو جو شخص جس ملک کا رہنے والا ہے کم و بیش قدرت رکھتا ہے۔ مضمون کے لئے دل و دماغ کی لیاقت درکار ہے: یہی وجہہ ہے کہ شعر کے ساتھ "فکر" کا اطلاق لاحق ہوتا ہے۔ زبان کا فائدہ محدود ہے کہ اسی زبان کے لوگوں کو اسکا لطف آتا ہے جہاں وہ زبان رائج ہے۔ مگر مضمون ترجمہ ہوکر غیر زبانوں تک پہونچ سکتا ہے: بلکہ پند و نصائح کے مضمون کا اثر تو جس زبان میں جی چاہے دیکھ لیجیئے بے کار نہیں جاتا:

آپ زبان کا تو ضرور خیال رکھیں مگر مضمون کو مقدم سمجھیں۔ پہلے کوئی بات ذہن میں آئے پھر دیکھنا چاہئے کہ کس طرح ادا کیجائے: اصل چیز مضمون ہے اور زبان لباس و زیور سے مشابہ ہے کہ اچھی شکل ہو تو لباس و زیور زیادہ زیب دیتا ہے ؎

جب مے تھی تو کچھ حسن بھی تھا جلوہ گری کا ❊ شیشہ تو اب اترا ہوا جامہ ہے پری کا

لیکن عوام میں زیادہ قدر زبان کی ہے کہ زبان ہر شخص کی سمجھ میں جلد آجاتی ہے اور مضمون کی

باریکیاں سمجھ لینا ہر کس و ناکس کے بس کا نہیں۔ جو شعرا زبان کی طرف زیادہ متوجہ ہوتے ہیں جلدی مشہور ہو جاتے ہیں: مضمون پیدا کرنے والوں کی قدر دیر میں ہوتی ہے۔ وہ بھی خاص لوگوں میں:؛ محض زبان کے شاعر بہت ہیں، مضمون کے بہت نہیں ہیں ؎

یوسف کو کیا سمجھ کے خریدار لے گیا ؛ جو حسن تھا وہ صدقہ بازار لے گیا

متاخرین میں جن دو کمال شعرا نے مضمون کی طرف زیادہ توجہ کی اُن میں نو جوان ذریعہ جناب اسیر لکھنوی اور جناب امیر مینائی اور جناب ماہر ہیں۔ اس اسکول کے گو اور لوگ بھی مقلد ہیں مگر اس وقت میرا ارادہ جناب مولوی مہدی حسین صاحب ماہر کے کلام کی نسبت کچھ عرض کرنے کا ہے کہ آپ کے کلام میں سرے سے اخیر تک مضمون ہی کا زیادہ ثبوت ملتا ہے۔ کلام نہایت پختہ مگر زبان سے زیادہ مضمون سے پُر ہے۔ خود فرماتے ہیں ؎

شاگردیٔ اسیر سے مضموں کی قید ہے ؛ ماہر و گرنہ رنگ بھی اپنی زباں میں ہے

تمثیلاً چند شعر جابجا سے یہاں لکھنے کو جی چاہتا ہے:۔ ؎

شاخ ناقہ۔ قیس بلبل۔ نجد ہے صحنِ چمن ؛ غنچے میں نکہت کہ لیلےٰ گوشۂ محمل میں ہے

(لیلےٰ و ناقہ لیلےٰ کا مضمون اکثر شاعروں نے باندھا ہے مگر اس طرح شاید ہی کسی نے باندھا ہو) ؎

دن بہ دن قربت بڑھی موسیٰ کلیم اللہ ہوئے ؛ بن پڑیں باتیں زباں میں جب کہ لکنت رہ گئی

(لکنت پہ تو حضرتؑ کو کلیم اللہ کا مرتبہ ملا۔ لکنت نہ ہوتی تو خدا جانے کیا کیا اور مرتبے ملتے۔ خاص کر سحبانِ وائل جیسے فصیح کے جس کی نسبت مشہور ہے کہ اس کی ماں کے مرنے

میں تین چار سو آدمی تعزیت کو آئے سحبان نے ہر شخص کا شکریہ علیحدہ علیحدہ الفاظ میں ادا کیا۔ گویا ایک مضمون سیکڑوں طرح ادا کیا) ؎

دانش پایا جب کہ راز عسرتِ اربابِ فقر ✤ پردہ رکھ لینے کو دنیا میں قناعت رہ گئی

(یہہ بالکل نیا مضمون ہے) ؎

باغِ عالم سے عمل دورِ خزاں کا نہ اٹھا ✤ موسمِ گل میں بھی کانٹے نہ چمن سے نکلے

(دنیا میں آرام و راحت کے ساتھ بھی رنج و مصیبت کا کھٹکا لگا رہتا ہے)

دیکھیے کس زور کا مضمون ہے ؎

مجھ سا بھی نالہ کش کوئی دارِ محن میں ہے ✤ دل منہہ کو آگیا ہے زباں لب دہن میں ہے

؎ پیش رو راہ عدم میں ہیں جوانوں سے مسن ✤ یاں ضعیفی جسے کہتے ہیں توانائی ہے +

(بوڑھوں کی تیز رفتاری اچھی ثابت کی - اسی طرح یہہ شعر کہ ؎ سب چل بسیں گی دل سے بڑھاپے میں حسرتیں ✤ نکلے گا قافلہ بھی سرا سے سحر تو ہو) ؎

جہاں سے حسرتِ زلف و عذار لیکے چلے ✤ مزار میں بھی یہ لیل و نہار لے کے چلے

(اس لیل و نہار کا کیا کہنا!)

؎ ہم بڑھ کے آبرو ہو تو خیر اس قدر تو ہو ✤ دریا سی شے گھٹے تو بہ قدرِ گہر تو ہو

(یہہ گھٹنا بڑھنا بہت معقول ہے)

؎ میں اک فشارِ قبر کا شکوہ کروں تو کیا ✤ دنیا میں کس کے خون کی پیاسی زمیں نہیں

؎ ترس کھا ہمصفیروں پر سبھی جو ساتھ آئے ہیں ✤ میں جس ٹہنی پہ ہوں گلچیں چھپا لے اس کو دامن میں

(رزی ترد یکھ)

(یہ بھی ... کا مضمون ہے)

سے یہاں میں رنگ یا ... گذر رہا ہے ہو ... ہو گیا وہ ... ہو نہیں

(اسی طرز سے ملتا ہوا مضمون مرزا نوشہ (اسد اللہ خاں غالب) کا بھی ہے سے چپک

رہا ہے بدن پہ ہو سے پیراہن ...)

سے کتنی شب فراق آئی ہے خبر نہیں ؛ بگڑی ہوئی گھڑی ہے ... کی قمر نہیں

معدومی دہن کی تو خیر ایک بات تھی ؛ کس پہ کھڑے ہیں ہاتھ رکھے گر کمر نہیں

کی اس نے بھی نہ آکے عیادت مری کبھی ؛ کیا نیند کو بھی میرے مرض کی خبر نہیں ؛

سے داغ دل نزع میں گلُو میرے ضیا دیتے ہیں ؛ نیند کے وقت تو شمعوں کو بجھا دیتے ہیں

(اسی مضمون کا ایک شعر یہ بھی ہے سے پیری میں کیوں فلک نے دیئے مجھکو داغ دل ؛

گھر میں چراغ دن کو کسی کے جلا نہیں)

نشاں انہیں کے نظر آ رہے ہیں جوہر پر ؛ تڑپ کے جان رگوں نے جو دی تھی خنجر پر

ہو دل تو اور بھی ہو حُسن قدِ دلبر پر ؛ کہ فاختہ بھی ہے طُرّہ سرِ صنوبر پر

غش آئے کیوں نہ انہیں کم سنی سے ذبح کے بعد ؛ مرے ہوؤں کا لہو دوڑتا ہے خنجر پر

بہار آتی ہوئی راہ میں رُکی ہے کہیں ؛ کہ رہ گئی ہیں رگیں خون اُگل کے بستر پر

وہ بن کے آئینہ آیا ہے سامنے سب کے

جو پانی پڑ گیا تھا تُربتِ سکندر پر

جناب ماہر کے چند شعر میں اس غرض سے سُنا رہا ہوں کہ نئی زبان کو

دو چار دفعہ دُہرانے سے آپ کی لٹریچر میں بہت ترقی نہیں ہو سکتی۔ نئے نئے مضمون پیدا کیجیے: خواہ نظم میں ہوں یا نثر میں *

آخیر میں حضرت ماہر کا ایک شعر اور سُن لیجیے ؎

نظم اشعار میں بھی حُسن بیاں ہے ماہر
جس کو کہتے ہیں زباں ہم وہ زباں رکھتے ہیں

کلام الملوک ملوک الکلام

اعلیٰ حضرت بندگانِ عالی متعالی مدظلہ العالی حضور پُر نور نواب میر عثمان علی خان بہادر بادشاہِ دکن خلد اللہ ملکہٗ کا تازہ کلام صلائے عام کے ناظرین کے لیے بھیجتا ہوں۔

شہِ ملکِ رسالت صاحبِ تاج و سریر آمد * ضیا بار و جہاں افروز۔ چوں مہرِ منیر آمد
امین و خازنِ رحمت معین و شافعِ اُمت * وزیر و راز دار و نائبِ ربِ قدیر آمد
رسولِ ہاشمی۔ خیر الوریٰ صلِّ علیٰ آمد * کریمؐ صادقؐ نورؐ نذیرؐ و البشیر آمد
چہ خوش چشمے کہ مازاغ البصر نازل بشانِ او * ز قلبِ پُر صفا وز دیدہ حق بیں بصیر آمد
نہ ماند تا حجابے جلوۂ روئے حقیقت را * پئے کشفِ رموزِ غیب عالم و خبیر آمد
بنامِ آں شہِ لولاک صد جان و دلم قرباں * کہ عثمان از طفیلش بر مسلماناں امیر آمد

گزرانیدہ خاکسار رشید الدین احمد دہلوی
تعلقہ دار نمک خوار سرکار ممدوح الشان۔

متروک الفاظ

سی زبان میں وہ الفاظ متروک کیوں ہو جاتے ہیں جو ایک وقت میں رائج تھے اور فصیح سمجھے جاتے تھے؟ یہ امر بخوبی ذہن نشین نہیں ہو سکتا جب تک اُس زبان کی تاریخ کا مطالعہ نہ کیا جائے اور اُس کے مختلف مدارجِ ترقی پیشِ نظر نہ رہیں۔ جب تک یہ معلوم نہ ہو کہ زبان کا آغاز کس طرح ہوا اور کس زمانہ میں کن اثرات کی تابع رہی۔ اِس مختصر مضمون میں اِن مباحث کی گنجائش نہیں۔ اس کا موضوع صرف اس قدر ہے کہ آیا جو الفاظ متروکات کے تحت میں آگئے وہ اس قابل ہیں یا نہیں اور اُن کو ترک کرنے سے زبان کو نقصان پہونچا یا اُن کی خانہ پُری دوسرے الفاظ سے ہو گئی؟

اسی ضمن میں یہ عرض کر دینا بھی ضروری ہے کہ ہر ملک اور قوم کی ادبی زبان اُس زبان سے جو عام طور پر بولی جاتی ہے مختلف ہوتی ہے۔ اور ان میں بھی مردوں اور عورتوں کی طرزِ گفتگو میں فرق ہوتا ہے۔ ہم لوگوں میں (جن سے میری مراد وہ اشخاص ہیں جو اُردو بولتے ہیں) مستورات کو باہر نکلنے کا اتفاق نہیں ہوتا۔ لہذا اُن کی زبان میں بہت کم تغیرات ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ وہ اب بھی "آتیاں ہیں" "جاتیاں ہیں" اور اسی قسم کے جملے جو ہمارے نزدیک متروک ہیں بلا تکلف استعمال کرتی ہیں۔ مجھے سخت حیرت ہوئی جب ایک دن اپنی بیوی کو لفظ نکتوڑا استعمال کرتے سُنا۔ ایک خادمہ سے جس کی کئی پشتیں میرے ہی خاندان میں گزر چکی ہیں کسی بات پر ناراض ہو کر کہا "تمہارے ہر وقت کے نکتوڑے کون اُٹھائے"۔ میں نے کہا تم تو ڈیڑھ سو برس اُدھر کی زبان بولتی ہو۔ یہ لفظ میں نے سوداؔ کے علاوہ نہ تو کسی کے کلام میں دیکھا نہ

نہ کسی کو بولتے سُنا! اُنہوں نے کہا یہ تو ہماری بول چال ہے۔ حق یہ ہے کہ تمام پہلوؤں پر غور کرتے ہوئے لفظ "نکتوڑا" سے مفہوم جس خوبی سے ادا ہوا "غمزہ بیجا" یا اس قبیل کے دوسرے الفاظ سے ممکن نہیں۔ مگر انشا پردازی میں وزن و متانت کی ضرورت ہے۔ عورتوں کی زبان جس میں لوچ نرمی اور نزاکت ہوتی ہے انہیں کو زیب دیتی ہے۔ اس کے سوا اگر ہم آپ لکھیں تو زنانہ پن کا الزام دیا جائے۔

زبان بھی اور اشیائے عالم کی طرح چند قوانین کی تابع ہے اور اُنہیں کے زیرِ عمل ترقی کرتی ہے۔ اور امور کو نظر انداز کرکے صرف ایک کی طرف اشارہ کرتا ہوں۔ ماہرین علم اللسان کا قول ہے کہ ہر زندہ زبان میں تیس برس کے بعد انقلاب ہوتا ہے۔ بہت سے الفاظ اور محاورے جو پہلے رائج تھے ٹکسال باہر سمجھے جاتے ہیں۔ اُن کی جگہ دوسرے الفاظ اور محاورے داخل ہوتے ہیں۔ متعدد نئی اصطلاحیں حسب ضرورت ایجاد ہوتی یا دوسری زبانوں سے اپنی اصلی حالت میں یا تغیر و تبدل کے بعد مستعار لی جاتی ہیں۔

متروکات پر غور کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ ان میں سے تمام تر نہیں تو بیشتر ایسے ہیں جن میں امتداد زمانہ یا جدید و پُر تکلف (بعض حضرات پُر تصنع کہیں گے) طرزِ معاشرت سے ثقالت پیدا ہوگئی ہے یا متانت سے گر گئے ہیں۔ ان متروکات میں بہت کم ایسے ہیں جن کا مرادف اختراع نہ کیا گیا ہو۔ اکثر انہیں متروک الفاظ کی کثرِ یونت سے مرادف لفظ وضع ہو گیا ہے جو اپنے پیشرو سے تلفظ و لہجہ میں سہل و شیریں تر ہے۔ مثلاً "سوں" اور "سیتی" کی جگہ "سے"، "کوں" کی جگہ "کو"، "ایدھر" اور "اودھر" کی جگہ "اِدھر" اور "اُدھر"، "کسو" اور "کبھو" کی جگہ "کسی" اور "کبھی"۔ جو حضرات "کسو" اور "کبھو" کے حامی ہیں میرا اُن سے سوال ہے کہ "کوئی" اور "کہیں" کے خلاف صدائے احتجاج کیوں نہیں بلند کرتے اور اُن کی جگہ "کوؤ" اور "کہوں" استعمال کرنے کا مشورہ کیوں نہیں دیتے۔ اگر "کسو" اور "کبھو" فصیح و درست ہیں تو "کبھو" اور "کہوں" کیوں غیر فصیح و غلط ہیں؟

متروکات کی تاریخ کا مطالعہ کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اُن کی اصلاح کا راستہ ہمیشہ پیچیدگی سے سادگی یا ثقالت و عمومیت سے ستھرائی۔ نفاست کی طرف ہے۔ یہہ ماننا پڑے گا کہ بعض جایہ سادگی کا خون ہوکر تصنع پیدا ہو گیا ہے مگر یہہ ہماری موجودہ تہذیب کا فیض ہے اور جب تک اس میں انقلاب نہو گا الفاظ کی یہی حالت رہے گی ؛

میں نے متروکات کی فہرست پر نظر ڈالی۔ ٹک۔ سو۔ اور پہ (بمعنی لیکن) کے سوا ایک بھی ایسا نہیں جس کا بدل موجود نہو۔ "سو" متروکات کی فہرست میں ضرور ہے مگر اس کا استعمال کبھی ترک نہیں ہوا۔ دَور حاضر کا شاید ہی کوئی شاعر ہو جس نے استعمال نہ کیا ہو۔ مجھے اتنی فرصت نہیں کہ اور حضرات کے کلام سے مثالیں ڈھونڈوں۔ اپنا ایک شعر درج کیے دیتا ہوں جو اثرستاں میں موجود ہے ؎

باقی تھا ایک ہوش سو وہ دے گیا جواب ؛ اب کوئی پردہ میرے ترے درمیاں نہیں

یہی حال "پہ" کا ہے۔ برابر استعمال کیا جاتا ہے — غزل میں کم اور اصناف شاعری میں کثرت کے ساتھ۔ "ٹک" ثقیل ہے اس کا احیا ممکن نہیں۔

اصل یہہ ہے کہ زبان و انداز بیان بدل گئے۔ یہی متروک الفاظ قدما کی زبان کا جوہر تھے اور اُنہیں کے کلام میں بھلے معلوم ہوتے ہیں۔ موجودہ طرز انشا میں اُن کی گنجائش نہیں۔ ہم اُنکا استعمال کریں تو انمل بے جوڑ معلوم ہوں گے۔ اور کوئی مزا نہ دیں گے۔ میرے نزدیک متروک الفاظ کو اُن کے حال پر چھوڑ دینا چاہیے۔ شاعر اگر اپنے خیالات کو اپنی زبان میں بغیر "ٹک" "پہ" "منے" (میں) "مت" ادا نہیں کر سکتا تو یہہ اُس کے عجز کی دلیل ہے نہ کہ زبان کی خامی۔ سائنس کی اصطلاحات کو چھوڑ کر اظہار جذبات و خیالات کے لیے جس قدر وسعت اُردو میں ہے شاید ہی کسی زبان میں ہو کیونکہ کوئی زبان اتنی زبانوں سے مرکب نہیں۔ سنسکرت۔ ہندی۔ فارسی۔ عربی۔ ترکی۔ انگریزی۔ پرتگالی۔ اور نہ معلوم کتنی زبانوں کے الفاظ اس میں داخل ہیں اور ان کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا جاتا ہے مگر افسوس کہ ہم میں تحقیق و تدقیق کا مادّہ نہیں رہا۔ اثر (نواب جعفر علی خاں بہادر ڈپٹی کلکٹر مصنف اثرستاں)

منقول

ناول

ناول معمولاً محض فرضی ہوتے ہیں اور وہ صورتوں سے خالی نہیں ہوتے۔ یا تو بداخلاق کی باتوں سے بھرے ہوتے ہیں یا خوش اخلاقی بیان کرتے ہیں۔ مگر عورتوں کے ذکر سے خالی نہیں ہوتے۔ یہ تو اس مضمون میں پورے طور پر ثابت کر دینا مشکل ہے کہ عورت کے بغیر مرد کب بچایا جا سکتا ہے لیکن ہمارا مقصود صرف اتنا ہی ہے کہ ناول پڑھنے سے کیا اثر پیدا ہوتا ہے اور اس کا پڑھنا کہاں تک جائز ہو سکتا ہے۔

قبل ازیں کہ اصل مقصد پر لکھنا شروع کریں ہم پہلے یہ کہدیں کہ خدا پرستی کی زندگانی جن ابنائے جنس نے اختیار فرمائی ہے انہوں نے دنیا کو خیرباد کہدی ہے اور محض خواہشات سے گریز کرنے میں عورت سے اگر نفرت نہیں تو علیحدگی بالیقین اختیار کی ہے۔ مگر یہ فعل استثنائی محض شخصی اور بالذات ہے اس کو تعمیم نہیں ہے اور جہانتک عقل کا زور چلتا ہے ہم اگر دنیا سے علیحدگی کے معنی سمجھیں تو اس سے یہ ہرگز نتیجہ نہیں نکلتا کہ عورت کو ساتھ لیکر بھی دنیا نہیں چھوٹ سکتی کیونکہ عورت خود بھی تو خدا پرست ہو، وہ کب خدا پرستی سے علیحدہ ہے بس اگر مرد و عورت کا جوڑا مصروف بندگی ہے تو یقیناً وہ دنیا میں رہ کر بھی دنیا پرست نہیں ہے اور یہ لازم کب ہے کہ مرد عورت سے متنفر ہو کر اور عورت مرد سے متنفر ہو کر خدا پرستی کریں گو بذاتِ واحد ہر شخص اپنے نفس کا تزکیہ کر سکتا ہے چنانچہ ہزارہا مثلیں اہل اللہ کی موجود ہیں جنہوں نے بذات خاص ولایت کا رتبہ حاصل کر لیا۔ تاہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ وہ دیگر شے کے کیا کام آئے اگر ایک پیراک اپنی ہنرمندی اور تیز دستی سے اپنے رفقا کو اس کنارہ پر چھوڑ کر گنگا کے پار جا لگا تو خود ہی تو پار لگ گیا مگر اوس کے بس قدر رفیق تھے وہ منہ دیکھتے رہ گئے اسی طرح سے خدا پرستی میں اگر ایک بزرگ خدا کا

ہو رہا تو ہم کو کیا۔ ہاں یہ تو نہ درست کہ ہمارے واسطے ایک مثال قائم کر گیا۔ مگر ذات و حدت کے کرشمے ذات واحد ہی کے ساتھ ہیں اور کچھ تعجب کی بات نہیں ہیں چنانچہ حضرت رابعہ بصری نے بھی عبادت خدا کی مصروفی سے ولایت کا درجہ حاصل کیا۔ اب ہم صرف استدر اور عرض کرلیں کہ دنیا کے چھوڑنے سے ہرگز یہ مقصد نہیں ہے کہ عورت مرد کو اور مرد عورت کو چھوڑ دے۔ دنیا کے معنی مولانا روم نے بہت آسان لفظوں میں بیان فرمادے ہیں اور حق بھی یہی ہے کہ ؎

چیست دنیا از خدا غافل شدن ۔۔ نے قماش و نقرہ و فرزند و زن

اس قدر تمہید کے بعد ہم عرض کریں گے کہ ناولوں میں کیا دی۔ مکاری۔ فریب و دغابازی قمار بازی۔ عیاشی۔ دغل فصل وغیرہ جب تک عورت کے مرد کے ساتھ اور مرد کے عورت کے ساتھ بیان نہوں تب تک ناول خوان کو حظ نہیں پیدا ہوتا اور یہ حظ محض بے سود ہوتا ہے۔ اگر بعض دلوں میں کوئی اثر والتا بھی ہے تو بد اعمالی کا۔ نیک اعمالی کی صورت تو شاذ ونادر ہی کسی لوح دل پر عکس افگن ہوتی ہوگی۔ معمولاً اُن لوگوں کے اخلاق بالذات نہ تو پختہ ہوتے ہیں نہ حمیدہ ہوتے ہیں جو ناول پڑھتے ہیں بالعموم جہلا ہوتے ہیں جنکو محض لکھنے پڑھنے کا ہنر آتا ہے مگر علم اخلاق سے بالکل کورے ہوتے ہیں یا خام ہوتے ہیں اور ان صورتوں میں ناول اپنا وہ اثر پیدا کردیتا ہے جو بد ہے۔ مجھکو تو آج تک کوئی صاحب ایسے نہیں ملے جنہوں نے اپنی نیک اعمالی کا حوالہ کسی ناول کے اثر سے کیا ہو یا وہ ناول پڑھ کر نیک ہوگئے ہوں اور یہہ تو میں تعمیمی الفاظ میں کہہ گیا۔ نہیں نہیں۔ ایسے بھی کوئی صاحب نہیں ملے جنہوں نے کسی خاص خُلقِ حَسن کو ناول سے حاصل کرلیا ہو یا تھیٹر کے تماشے سے کوئی حُسن خُلق اُن میں پیدا ہوگیا ہو۔ اور گو بداعمالی اور اخلاقِ رذیلہ کسی شخص نے ناول پڑھ کر یا تماشے دیکھکر حاصل نہ کئے ہوں مگر دنیا کا نظارہ تو ضرور ہی آنکھوں تلے آگیا ہوگا اور دُنیا تو سراسر زور ہے پس جب تک خود بھی زور میں مستند نہولے دُنیا حاصل نہیں ہو سکتی لیکن فن رذالت انسان کو جلد تر حاصل ہوجاتا ہے اور رفتہ رفتہ انسان اس کا خوگر ہوجاتا ہے۔ اب خلاصہ اس تمام تقریر کا یہ ہے کہ معمولاً ناول کا پڑھنا نازیبا ہے۔ فقط

راقم مرزا عردن علی بیگ۔ آئی۔ ایس۔ او۔ از آگرہ

سمرو بیگم

ہندوستان کی تاریخ میں عورتوں کے کارنامے اظہر من الشمس ہیں۔ اور ملک کے ہر حصہ میں ان کے نام کی بڑی تعظیم ہوتی ہے۔ سلطانہ رضیہ کی بہادری سے کون واقف نہیں؟ نورجہاں بیگم کی قابلیت کو کون نہیں جانتا؟ شہزادی نادرہ بیگم کی دردناک داستان کس نے نہیں سنی؟ علاوہ ان بلند مرتبہ بیگمات کے بہت سی عورتیں ایسی بھی گذری ہیں جنھوں نے اپنی معمولی زندگی میں ایسے کام کئے جن کو سن کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔

اس آخر الذکر طبقہ میں سے ہم ایک عورت کا ذکر کرتے ہیں۔ جو ایک غریب گھرانے میں پیدا ہوئی۔ تعلیم وتربیت سے بے بہرہ رہی۔ مگر خداداد قابلیت نے اونڈی سے ریاست کا حاکم بنایا اور دنیا نے دیکھا کہ عورت کس خوش اسلوبی سے مشکل سے مشکل کام انجام دے سکتی ہے۔

اٹھارویں صدی عیسوی کا زمانہ ہندوستان میں بڑی بدامنی کا گزرا ہے۔ سلطنت مغلیہ زوال پر تھی۔ مختلف صوبوں کے حاکم خودمختاری کا اعلان کر چکے تھے۔ انگریز بنگال اور فرانسیس کرناٹک میں اپنی اپنی حکومت قائم کرنے کے لئے آپس میں برسر پیکار تھے۔ اس پُرآشوب زمانہ میں سنہ ۵۰ء کے قریب عرب کے ایک غریب گھر میں ایک لڑکی پیدا ہوئی جس کا ابتدائی زمانہ اس قدر عسرت میں بسر ہوا کہ اُس کے نام کا بھی پتہ نہیں چلتا۔ اسکا باپ لطیف علی خاں ہندوستان آیا اور میرٹھ کے قریب قصبہ کوتانہ میں سکونت اختیار کی۔ یہہ نہیں معلوم کہ وہ ہندوستان کیوں آیا تھا اور یہاں اسکا ذریعہ معاش کیا تھا۔ ابھی اس لڑکی کی عمر چھہ برس کی تھی کہ باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا جو کچھ سرمایہ تھا بڑی بیوی اور اس کے لڑکے کے ہاتھ لگا اور انہوں نے اس چھوٹی لڑکی اور اس کی ماں کو نکال باہر کیا۔ اس سنگدل

سوتیلی ماں اور بھائی کو کیا خبر تھی کہ ان کا یہ ظلم اس لڑکی کے حق میں کس قدر مفید ہو گا اور آخر کار وہ کس درجہ پر پہنچیگی

دس برس تک یہ بیوہ اور اس کی لڑکی در بدر مارے مارے پھرے۔ آخر مجبور ہو کر ماں نے اپنی لڑکی کو ایک شخص بنام جنرل سمرو یعنی ہارٹ (General SumreeReinhardt) کے ہاتھ فروخت کیا جو تاریخ میں ظلم اور سنگدلی میں اپنا جواب نہیں رکھتا۔

سمرو جرمنی کا باشندہ تھا۔ ۱۷۵۰ء میں ہندوستان آیا۔ کچھ عرصہ دکن میں ملازمت کرنے کے بعد جنرل لا (Low) کی فوج میں شامل ہوا جو اس وقت چندا نگر میں مقیم تھی۔ ۱۷۵۷ء میں جب کلائیو (Clive) نے اس شہر پر قبضہ کیا تو اُن چند لوگوں میں جو بچ کر نکل گئے تھے سمرو بھی تھا۔ سمرو انگریزوں سے بچتا ہوا پٹنہ پہنچا۔ اور نواب اودھ کے ہاں نوکر ہوا۔ اسی زمانہ میں کلائیو اور نواب میں جنگ ہوئی۔ پٹنہ میں کچھ انگریز مقیم تھے جن کو نواب نے قید کر لیا۔ مونگھیر کی لڑائی کے بعد نواب کے پاؤں اُکھڑ گئے اور اس نے بدلہ لینے کی غرض سے اپنی فوج کو حکم دیا کہ ان بے کس قیدیوں کو قتل کر دے۔ کہا جاتا ہے کہ فوج نے اس وحشیانہ حکم کی تعمیل سے انکار کر دیا۔ آخر نواب نے سمرو کو بلایا اور یہ کام اس کے سپرد کیا۔ چنانچہ سمرو نے بیکس مظلوموں کا خاتمہ کیا۔ کلائیو ان کا تعاقب کر رہا تھا اس لئے سمرو کو یہاں سے بھی بھاگنا پڑا۔ دہلی پہنچ کر اس نے اپنی طرح کے خانہ بدوش سپاہیوں کی ایک جماعت اکٹھی کی اور اس فوج سے ہر اُس شخص کی مدد کرنے کو تیار تھا جو سب سے زیادہ قیمت دے۔

اُس زمانہ میں جب سمرو راجہ بھرت پور کی طرف سے دہلی کا محاصرہ کر رہا تھا یہ عربی لڑکی اس کے ہاتھ فروخت ہوئی۔ قیاس کہتا ہے کہ دہلی کی گلیوں کی دہ سالہ آوارہ گردی نے اس لڑکی کو دنیا کے ہر پہلو سے واقف کر دیا ہوگا۔ اور چونکہ اس کی طبیعت قدرتی طور پر شوخ واقع ہوئی تھی اس کو سمرو کی خونخواری سے بالکل نفرت نہیں ہوئی۔ اُس نے اس موقعہ کی اہمیت کو خوب سمجھا اور نہ صرف اپنے خونریز آقا کو اس قدر گرویدہ کر لیا کہ وہ تھوڑے سے عرصہ میں اپنی زرخرید لونڈی کا تابعدار ہو گیا۔ بلکہ اُس بدمعاش گروہ کو بھی رام کر لیا۔

اب وہ سمرو بیگم کہلانے لگی۔ اپنے آقا کی ہر لڑائی میں ساتھ رہتی اور ہر حملہ میں اس کی مدد کرتی۔ جس موقعہ پر بڑے بڑے سورما کانپ اُٹھتے یہ نہایت بے پروائی سے پیش قدمی کرتی۔ رفتہ رفتہ

نہم سلیزی

بیگم نے اتنی عزت پیدا کرلی کہ یہ بے سری فوج اس کا ہر حکم ماننے کو تیار رہتی۔ شاہ عالم بھی بیگم سے اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے سمرو کے دستہ کو شاہی محل اور دارالسلطنت کی حفاظت کے لئے مقرر کیا اور اس کے معاوضے میں میرٹھ کے قریب ایک جاگیر عطا کی جس کی آمدنی تقریباً چھ لاکھ روپیہ سالانہ تھی۔ اسی حلقہ میں سردھنہ کے قصبہ میں سمرو نے اپنا ہیڈ کوارٹر مقرر کیا۔ اور اپنے دستہ کو ازسرِنو ترتیب دیکر باقاعدہ فوج بنایا۔ جاگیر کا انتظام بیگم کے ہاتھ میں تھا کیوں کہ کچھ دنوں بعد سمرو کو شہنشاہ نے صوبہ آگرہ کا گورنر کرکے بھیج دیا تھا۔

یہ وقت بیگم کے لئے بہت نازک تھا مگر اس نے اس خوش اسلوبی سے جاگیر کا انتظام کیا کہ تھوڑے سے عرصے میں آمدنی دُگنی ہو گئی۔ سختی کے موقعہ پر البتہ وہ ظلم بھی کرتی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے دو باغی لونڈیوں کو زندہ دفن کروایا تھا۔ تاہم سردھنے میں مُقیم ہونے کے بعد اُس نے اس قدر بیدار مغزی اور ہوشیاری سے حکومت کی کہ ایک ایسی عورت کے لئے جس کا ابتدائی زمانہ آوارہ گردی میں گزرا ہو تعجب خیز ہے۔ سمرو اس کا اِتنا زیرِ اثر تھا کہ بُڑھاپے میں اُس نے اپنے ظلموں سے توبہ کرلی اور مذہب کا سختی سے پابند ہوگیا۔ اکبر کے وقت میں جو عیسائیوں کا گرجا آگرہ میں بنا تھا۔ سمرو نے ازسرِنو بنایا اور پادریوں کے وظیفے مقرر کئے۔

۱۷۷۸ء میں سمرو نے انتقال کیا۔ اور آگرہ کے گرجا میں دفن ہوا۔ گو زندگی کے آخری دنوں میں وہ برائے نام جاگیر اور فوج کا مالک رہ گیا تھا مگر اُس کی موت سے بیگم پر سخت مُصیبت آپڑی۔ صرف
۸ گیارہ برس کا عرصہ گزرا تھا کہ یہ بحیثیت ایک لونڈی کے خریدی گئی تھی۔ اب اس کا اقتدار لوگوں کی آنکھوں میں کھٹکتا تھا۔ مگر اُس نے تمام سازشوں کا بڑی دلیری اور ثابت قدمی سے مقابلہ کیا۔ اور دشمنوں کو نیچا دکھایا۔

سردھنہ بریگیڈ کی درخواست پر شہنشاہ دہلی نے بیگم کو سمرو کا جانشین مقرر کیا۔ اس چھوٹی سی جاگیر کے چاروں طرف لڑائیاں ہو رہی تھیں۔ مگر سب سے زیادہ خطرناک سمرو کا بیٹا تھا جو مغل دربار میں باپ کی جانشینی کے لئے سازش کر رہا تھا۔ مگر جس استقلال اور جوانمردی سے بیگم نے ان طاقتوں کا مقابلہ کیا قابلِ تعریف ہے۔ اپنی قوت کو زیادہ مستحکم بنانے کے لئے بیگم نے عیسوی مذہب اختیار کیا اور جوآنا Joanna

نام پایا۔ سمرو کے بیٹے کو بھی جو ظفریاب خاں کہلاتا تھا عیسائی ہونے پر مجبور کیا۔

۱۸۰۰ء میں بیگم کو ایک عظیم الشان خطرے کا سامنا کرنا پڑا۔ فوج کے یورپین افسروں میں تین شخص ایسے تھے جو بیگم کو اپنے قبضے میں لانے کے لئے انتہائی کوشش کر رہے تھے۔ ان میں سے پہلا شخص آیرلینڈ کا باشندہ تھا جس کا نام جارج ٹامس (George Thomas) تھا۔ دوسرا شخص فرانس کا رہنے والا نام لیواسولٹ (Levassoult) تھا۔ اور تیسرے کا نام لیگوائس (Leigeois) تھا۔ ٹامس بڑا بہادر سپاہی تھا اور سردھنہ بریگیڈ پر سب سے زیادہ اثر رکھتا تھا۔ اگر بیگم اسکو اپنا خاوند بناتی تو یقیناً ہندوستان کی تاریخ میں بڑا انقلاب ہوتا۔ مگر بیگم نے فرانسیسی کو اُس پر ترجیح دی۔ ٹامس نے بیزار ہو کر علیحدگی اختیار کر لی کیوں کہ فرانسیسی کی ماتحتی اُس کے لئے ہتک تھی اس لئے وہ الٰہ آباد چلا گیا اور پھر کسی راجہ کے ہاں ملازم ہو گیا۔ لیگوائس نے ٹامس کی طرح اپنے رنج او غصہ کا اظہار نہیں کیا۔ ظاہر وہ بیگم کا خیرخواہ رہا مگر فوج میں بغاوت کا بیج بو دیا اور بیگم کے سوتیلے بیٹے سے خفیہ سازشں شروع کر دی۔

بیگم نے شادی تو کر لی مگر کسی مصلحت سے پوشیدہ رہی۔ سب سے بڑی غلطی اس نے یہہ کی کہ لیواسولٹ کو فوج کا کمانڈر بنا دیا جس سے اس کا دماغ ساتویں آسمان پر چڑہ گیا۔ اُس کی بد دماغی اور نخوت سے تمام افسر بگڑ بیٹھے اور لیگوائس نے موقعہ غنیمت سمجھ کر ظفریاب خاں کو بیگم کے خلاف اکھڑا کیا۔ بیگم کو اپنے عشق میں دین و دُنیا کی خبر نہ تھی۔ جب اُس کی آنکھیں کھلیں تو وقت ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ مجبوراً اُس نے انگریزوں سے درخواست کی کہ وہ اُس کو یہاں سے نکل بھاگنے میں مدد دیں مگر یہہ خط پکڑا گیا اور مخالفین کی خوب بن آئی۔

اسی اثنا میں موقعہ پا کر بیگم اور لیواسولٹ بھاگ نکلے اور غالباً دہلی پہونچ بھی جاتے مگر خزانے سے لدی ہوئی بیل گاڑیاں زیادہ تیز نہ چل سکیں۔ دشمنوں نے آن گھیرا۔ بیگم کی پالکی کے گرد لڑائی شروع ہوگئی۔ لیواسولٹ جو آگے آگے گھوڑے پر جا رہا تھا بیگم کی مدد کے لئے لوٹا مگر کسی نے یہہ کہہ دیا کہ بیگم نے موت کو گرفتاری پر ترجیح دی اور خودکشی کر لی۔ یہہ وحشت ناک خبر سن کر اُس سے

نہ رہا گیا اور اُس نے سر میں گولی مار کر جان دی۔

باغیوں نے بیگم کو جو لڑائی میں زخمی ہو گئی تھی پکڑ لیا اور سردھنے واپس لے گئے۔ وہ لوگ جو اس کی شکل سے کانپتے تھے آج اس کا مذاق اُڑا رہے تھے۔ ظفریاب خاں اور لیگوائس نے اُس کی توہین کرنے میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا۔ ان کی اتنی جرأت تو نہ ہوئی کہ بیگم کو قتل کر دیں مگر زخم اس قدر کاری لگے تھے کہ دشمنوں نے انہی کو موت کے لئے کافی سمجھ کر اس کو پریڈ کے میدان میں ایک توپ سے باندھ دیا۔ تین دن تک بغیر کھانا پانی کے یہ اسی طرح بندھی رہی۔ آفرین ہے اس کی ہمت اور استقلال پر کہ بھوک پیاس کی مصیبت۔ زخموں کی تکلیف اور دوپہر کی چلچلاتی ہوئی دھوپ کو بغیر کسی حرفِ شکایت کے برداشت کیا۔ باغی اپنی کامیابی کے نشہ میں اس قدر چور تھے کہ انہوں نے بیگم کے وفاداروں کو کسی شمار میں نہ لیا۔ ایک ملازمہ نے رات کے وقت بیگم کو تھوڑا سا پانی پہونچایا۔ اور ایک فرانسیسی افسر نے ٹامس کو خط لکھا اور بیگم کی مُصیبت بیان کرتے ہوئے اُس کی امداد چاہی۔ حُسنِ اتفاق سے ٹامس ان دنوں دہلی کے اطراف میں لڑ رہا تھا۔ گو اُس کی ناراضگی بیگم سے ایک حد تک درست تھی تاہم اُس نے اپنے سابقہ محسن کی مدد سے انکار نہ کیا۔

سردھنے کی تمام فوج بے سری تھی۔ ظفریاب خاں اور لیگوائس جشن منا رہے تھے۔ چند انگریز افسر اس طوفانِ بے تمیزی سے الگ ہو کر ٹامس سے جا ملے۔ ٹامس نے اپنی ساری فوج جمع کی اور سردھنے کو بآسانی لے لیا۔ بیگم کو حفاظت میں چھوڑ کر ٹامس نے باغی سپاہیوں کو لالچ اور دھمکی سے بیگم کا خیر خواہ ہونے پر آمادہ کیا۔ اُس نے وعدہ کیا کہ بقیہ تنخواہیں جو لیگوائس نے جان بوجھ کر فساد برپا کرنے کی غرض سے روک لی تھیں فوراً تقسیم کی جائیں گی۔ چنانچہ ٹامس نے اپنی جیب سے ایک معقول رقم اس طرح تقسیم کی۔ اس کے بعد اُس نے اس بغاوت کے سرغنوں ظفریاب خاں اور لیگوائس کو پکڑ کر دہلی روانہ کیا اور مہاراجہ سیندھیا نے جو دہلی پر قابض تھا ایک گرانقدر نذرانہ لیکر پھر بیگم کو سردھنے کا مالک تسلیم کیا۔ یہ تمام کام انجام دیکر ٹامس پھر اپنی لڑائیاں لڑنے چلا گیا۔

بیگم جس قدر بھی ٹامس کی مشکور ہوتی کم تھا۔ مگر ہم کو یہ لکھتے ہوئے افسوس ہوتا ہے کہ جب ٹامس بیگم

زوال آیا اور وہ مصیبت میں گرفتار ہوا تو بیگم نے اس کی ایک نہ سُنی اور مدد کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ یہ بات بھی ایک حد تک مشکوک ہے کہ اُس نے ٹامس کا وہ روپیہ جو اُس نے سپاہیوں میں تقسیم کیا تھا واپس دیا۔ البتہ اس کے مرنے کے بعد بیگم نے اُس کی بیوہ کی (جو بیگم کے محلات میں سے تھی) اچھی امداد کی اور اُس کے بچوّں کو تعلیم دلوائی۔ مگر ٹامس سے جیسا برتاؤ اُس نے کیا یہ اُس کی زندگی کی بساط پر بڑا بدنما دھبہ ہے۔

اب مشکلات کا خاتمہ ہوا۔ بیگم کی عمر اِس وقت چالیس سال کی تھی۔ اُس نے فوج کی اصلاح کی۔ بدمعاشوں کے بدلے شریف افسر مقرر کئے۔ اور جاگیر کا انتظام بڑی بیدار مغزی سے کیا۔ چاروں طرف لڑائیاں ہو رہی تھیں مگر بیگم سب سے الگ رہی۔ آخر جب انگریزوں اور مرہٹوں میں لڑائی ہوئی تو بیگم مرہٹوں کی مدد کرنے پر مجبور ہوئی۔ سندھیا کی فوج کے ساتھ سردھنہ بیگم بھی دکن روانہ ہوگئی 1
مگر اسائی کی لڑائی کے موقعہ پر اُس نے کوئی حصہ نہ لیا بلکہ اپنی جاگیر کو واپس روانہ ہوگئی اور ۲۰۰ میل کی مسافت طے کرنے کے بعد صحیح و سالم اپنے ٹھکانے پر آ پہنچی۔ انگریزوں کی ہر جگہ فتح دیکھ کر بیگم نے اُن سے اس شرط پر صلح نامہ کیا کہ تا حیات یہ جاگیر کی مالک رہے اور اُس کے بعد انگریز اُس پر قابض ہو جائیں۔

اب بیگم کی عمر ۵۰ سے متجاوز تھی۔ انگریز اس کی تعظیم کرتے تھے۔ اور اُس کا درجہ راجہ مہاراجوں کے برابر تھا۔ بیگم نے تقریباً ۹۰ سال کی عمر پائی۔ بقیہ عمر میں اُس نے اپنے مذہب کو فروغ دیا۔ سردھنہ میں عالیشان گرجا بنوایا۔ پادریوں کے وظیفے مقرر کئے۔ مدرسے قائم کئے اور بڑی رقمیں خیرات میں دیں۔ اور پچاس ہزار روپیہ ایں آرچ بشپ کنٹربری کو دیا۔

اس کا طرزِ حکومت دوسری ریاستوں کے لئے نمونہ تھا۔ رعیت خوشحال اور خزانہ معمور۔ ویسرائے اور کمانڈر ان چیف اس کے مہماں ہوا کرتے تھے اور جس فیاض دلی سے یہ اُن کا خیر مقدم کرتی اُس کی مثال نہیں۔ اپنے دشمنوں سے بیگم نے کسی قسم کا بدلہ نہیں لیا۔ سمرو کے بیٹے کو اس نے اس شرط پر معاف کیا کہ وہ پھر عیسائی مذہب اختیار کرے۔ اس نے اس کی شادی بھی اپنی فوج

کے افسر کی لڑکی کے ساتھ کردی ؛

محمد احمد۔ بی۔ اے
(نبیرۂ شمس العلما مولوی نذیر احمد صاحب)

صلائے عام۔ یہہ مضمون مؤرخانہ ہے اور کام کا ہے۔ شمرو کی بیگم کا تعلق اُس کے اقبال کے زمانہ میں دلّی سے بہت رہا۔ شمرو کی بیگم کو شاہ عالم کیطرف سے "ہمشیرہ عزیزہ" لکھا جاتا تھا۔ یورپ کے نامور سیاح دربار شاہی میں شمرو کی بیگم کے توسطّ سے پیش ہوتے تھے: قلعہ معلّے سے چاندنی چوک کی طرف کو آتے ہوئے شمرو کی بیگم کا باغ اور عالیشان کوٹھی تھی جس میں اب دہلی لندن بنک ہے ؛ دلّی کے قریب بیگم کے بہت گاؤں جہارسہ وغیرہ گوڑگانوں کے علاقہ میں تھے ؛ دلّی کے مصوّروں میں شمرو کی بیگم کی قلمی تصویریں بہت لاجواب دیکھنے میں آئیں جو فن مصوری کے اعلےٰ درجہ کے نمونے سمجھے جاتے ہیں۔ یہہ تصویریں میں نے فائن آرٹس (فنونِ لطیفہ) کے نایاب نمونوں میں جمع کیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ اس عورت کے باوجود یورپین سے اس قدر گہرے تعلّقات کے ہندوستان کی بیگمات خاصکر بیگماتِ اہلِ اسلام کے لباس و وضع میں فرق نہ آیا۔ اکثر تصویروں میں بیش قیمت دوپٹّہ یا کشمیر کا شال سر پر ہے اور پیچوان نہایت تکلّف کا سامنے رکھا ہے ؛

سلاطینِ مُغلیہ کے بادشاہوں اور شاہزادیوں اور بڑے مرتبہ کی بیگمات کے مرقّعوں کی طرح شمرو کی بیگم کے مرقعے کمالِ فنِ مصوّری کے نمونے ہیں۔ بقول لسان المُلک حضرت ریاؔض خیرابادی ؎

گُل مُرقّع میں ترے چاک گریبانوں کے
وضع معشوق کی انداز ہیں دیوانوں کے

تنقید صلائے عام ستمبر ۱۹۲۵ء

یہ تو گئی گزری بات ہوئی کہ صلائے عام اگست کا شل اگست کے چاپ گیا اب دیکھنے کے قابل ماہ ستمبر کا پرچہ ہے جس کے شعاع نور سے اگستؔ[1] چھپ گیا۔ سچ جانئے کہ یہ رسالہ اعلیٰ ترین مضامین کا مجموعہ ہے۔ میں تو تنقید کرنے سے پورا دل برداشتہ ہوگیا تھا مگر ستمبر کے پرچہ کو پڑھکر بس نہیں ہے کہ قلم کو روک لوں ؛ بالخصوص جب کہ خود بدولت خان بہادر صاحب یوں ارشاد فرماویں کہ "تنقید پر لوگوں کی خفگی سے آپ نہ ڈریں"۔

دونوں وقت ملتے۔ یہ عجب پرتکلّف مضمون ہے میں تو گستاخانہ یہ کہنے پر تیار ہوں کہ ع پیرے کہ دم زعشق زند بس غنیمت است۔ ہمارے خاں بہادر صاحب نے کم سن حسینوں کا اماں جان کی اجازت سے کوٹھے پر چڑھنا اور بال کھولے ہوا کھانا عجب قیامت خیز مضمون لکھا ہے اور تماشہ یہہ کہ آپ بُوڑھے بنے چلے جاتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ "تجھے جو گور میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہے کیا سوجھی کہ اس وقت یہ راگ لے بیٹھا" اور آگے چل کر فرماتے ہیں کہ "یہ جھٹ پٹے کا وقت بہت غنیمت ہے"۔

یہہ لیل و نہار دکھانا اور ٹھیٹھ فصاحت کے ساتھ اردو میں ادا کر دینا خاص خان بہادر ہی کا حصہ ہے۔ یہ مضمون بڑا پیارا ہے کیونکہ پیاری پیاری باتوں سے بھرا ہے۔

اطمینان کی باتیں۔ عجب دلچسپ ہیں اور کیسا سچا مضمون ہے کہ "زندگی اگر مصیبت میں کٹی ہے تو یہ سمجھنا کہ آئندہ بھی یہی اندیشہ ہے یقیناً غایت درجہ کی کج فہمی ہے" "کیونکہ کوئی مصیبت ایسی نہیں آسکتی جس کے برداشت کرنے کی قوت پہلے سے خدا کی طرف سے نہ آجائے" یہ بالکل پکّا عقیدہ ہے اور یہی اطمینان بخشتا ہے۔

[1] یہ تارا بہت ہی نور افشاں ہے۔

اُردو رسالوں کی ڈائرکٹری۔ ہرچند کہ یہ مضمون محض خاکہ کے طور پر لکھا گیا ہے مگر مجھے فی الواقع اس سے اتفاق نہیں اور یہ ڈائرکٹری میرے خیال میں کوئی کارآمد لٹریچر نہیں ہوسکے گی ؛

مرزا جہانگیر کی گرفتاری۔ اس میں منشی مہتاب رائے دہلوی نے تاریخ گرفتاری کے لکھنے میں بہت بڑی صنعت وسعی کے ساتھ تخرجہ عین الف کا فرمایا ہے جب تو یہ مصرعہ تاریخی کہہ پایا ہے کہ "زبوں گردشہ زادہ را بیل مات" اس تخرجہ میں میرے تخلص عارف کا الف اوّل غائب ہوتا ہے ؛

نادر شاہ بعد ہنگامہ قتلِ عام دہلی۔ اس مضمون سے نادر شاہ کے حسب نسب۔ لوٹ مار۔ سرود۔ خوش گواری۔ سیر و شکار۔ اسیران ہند کے ساتھ بے رحمی اور زبردستی کی چل پکار برستی ہے۔ مصنفِ بیان واقع کی نظم کے انتخاب میں بالیقیں خان بہادر صاحب کی نگاہ چوک گئی شاید کوئی اور نظم بھی اس وقت پیشِ نظر تھی ورنہ ذیل کے دو شعروں سے معلوم ہوجاویگا کہ وہ مختلف بحور کے ہیں۔

بحرِ ہزج مسدس مقصور۔ کہن شد قصۂ فرہاد و شیریں ؛ چو عیشِ رفتہ و تقویم پاریں [1]

بحر متقارب مثمن مقصور۔ من از دیدۂ خویش گویم سخن ؛ نہ از گفتۂ داستانِ کہن [2]

اس نظم کو تصنیف و تالیف کا واسطہ جناب خان بہادر سے ہرگز نہیں ہے [3]

کھرا ہوتا ہے یہ مضمونِ تنقید ؛ جو اہلِ فن ہیں وہ اس کو سمجھ جائیں
اگرچہ لکھتا ہوں تنقید لیکن ؛ میں ڈرتا ہوں خفا مجھسے نہ ہو جائیں

سول پنشنرز ایسوسی ایشن۔ تمام رسالہ کی روح رواں تو یہ مضمون ہے

---

[1] وزن۔ مفاعیلن۔ مفاعیلن مفاعیل۔ [2] وزن۔ فعولن فعولن فعولن فعول۔

[3] یہ شعر مصنفِ بیانِ واقع کے ہیں اور مختلف بحروں کے ہیں الگ ہی جگہ غلطی سے لکھے گئے ان میں جدائی کردینی مناسب تھی۔ یہ غلطی کتابت میں

مجھے تو پورا یقین ہے کہ اپنے مطالب کا پا کر جناب مولوی بشیر الدین احمد صاحب رئیس دہلی نے خاص توجہ اس کے لکھنے میں فرمائی ہے۔ بہت بڑا کار آمد مضمون ہے۔ ہر پنشن خوار اس ایسوسی ایشن کے قائم ہونے سے بالیقین خوش ہوگا۔ میں بھی اس کا دلدادہ ہوں کیونکہ نمک خواروں کے زمرہ میں میں بھی ہوں اور سرکار دولت مدار سے بڑی معقول پنشن پاتا ہوں۔ مجھے اُمید ہے کہ جناب خاں صاحب ڈاکٹر شریف حسین صاحب سکرٹری ایسوسی ایشن مجھے قواعد ایسوسی ایشن کے جلد تر لطف فرماویں گے۔ میں بے حد ممنون ہوں گا۔ خدا سے دُعا ہے کہ یہ ایسوسی ایشن مُستقل طور پر قائم رہے۔ دہلی میں اس کی اصل اور تمام ہندوستان میں اس کی شاخیں پھیلیں ÷ فقط

راقم مرزا عرفان علی بیگ آئی ایس او از آگرہ۔

× × × × × × × × × × × × × × × ×

× × × × فی الواقع ماہ ستمبر کا صلائے عام بے مثل ہے۔ آپ نے "اطمینان کی باتیں" واقعی نایاب لکھی ہیں اچھا جی لگایا ہے۔ خدا کرے اس کو پڑھ کر سب مُطمئن ہو جائیں÷ اجی حضور اطمینان ہی دنیا میں بڑی چیز ہے اور مضمونِ پریشان پر پردہ ڈالتا ہے۔ مگر ہر ایک کو یہ نصیب کہاں ؟ ساری دُنیا پریشانی کی مبتلا ہے ÷ یہ مضمون اعلےٰ درجہ کا ہے۔ کیا ہم اُمید کریں کہ آپ پھر بھی ایسی اطمینان کی باتیں کریں گے اور سارے جگت کی پریشاں خیالی کو رفع فرماویں گے÷ آپ کے سوال کے جواب میں میں یہ عرض کر سکتا ہوں کہ پریشاں خیالی سے اطمینان کی قدر ہوتی ہے پس اُس مضمون کا سلسلہ بھی موقوف نہ ہونا چاہئے اُس میں اگر اطمینان کی نہیں تو کام کی باتیں کثرت سے ہوتی ہیں۔ ہاں یہ خیال البتہ ہو تو بہتر ہے کہ پریشاں مضموں کو اطمینان کے پرچہ میں جگہ نہ دیجائے÷

اس دفعہ حضرت مولوی بشیر الدین احمد صاحب نے جی لگا کر مضمون لکھا ہے اور وہ بالیقین بیش بہا ہے۔ پنشن خواروں کو تو ہر طرح سے انکا ممنونِ احسان ہونا لازم ہے ÷ × × × × × × × × × × × × × × ×

عرفان علی

دہلی مکالمہ

دادِ صلائے عام

ایسے ستم کئے کہ مرا قلب ہل گیا * اور اس طرح کہ سینے کا ہر داغ چھل گیا

صبح و شام کی میر انیس اور مرزا دبیر مومن نے ایک سے ایک بڑھ کر سینہ زیاں دکھلائی ہیں۔ مگر آپ بھی تو اُن دونوں بزرگوں سے پیچھے نہیں رہے: دو قدم آگے ہی نظر آتے ہیں اور وہ بھی نثر میں: کیوں کہ نثر میں نظم کا سا زور اور خوبیاں دکھلانا آپ کا اور صرف آپ ہی کا حصہ ہے۔ دوسرے کہ یہ بات میسر نہیں: اور اس سے آگے بڑھکر" دونوں وقت ملتے پر تو آپ کا قلمِ جادو رقم تیز چھری بن گیا ہے جو تھم تھم کر ذبح کر رہا ہے ؎

نہ لیجئے وبال اپنے سر پر کسی کا * بھلا فائدہ دل دُکھا کر کسی کا

ہائے کیا جادو بھری تحریر ہے:-

"دونوں وقت کا ملنا بلا کا ہوتا ہے" ؎

سہانے وقت ہیں اے دل دمِ طلوع و غروب
سماں دکھاتی ہے قدرت کا فریبی دھوپ

"جب کم سن حسین لڑکیاں بال کھولے کانوں میں پھول پہنے سرِ شام کوٹھے پر چڑھیں اور گھر کی بڑی بوڑھیاں یہ کہہ کر منع کریں کہ دونوں وقت ملتے ہیں اس وقت بال کھلے پھول پہنے چھت پر نہ جاؤ۔ دونوں وقت ملتے پر یاں ہوا کھانے نکلتی ہیں اچھی شکل والی بچیوں پر پریوں کا سایہ ہو جانے کا ڈر ہے" ؎

کم سن ہو زلف بکھری ہے رُخ پر اُتار دو ہار * ملتے ہیں دونو وقت نہ بیٹھو پہن کے پھول *

معلوم نہیں کہ ان فقروں میں کیا سحرِ حلال ہے جس نے پہروں بے خود و مدہوش رکھا ؎

دزام رحمٰ

ذرا سے دُھنئے دے مجھکو کفِ افسوس ملنے دی ۔ گلے پر چلتی ہیں رہ رہ کے چھریاں اُن کو چلنے دے
تڑپنے لوٹنے جلنے کی حسرت تو نکلنے دی ۔ مزے لے لیکے جلتا ہوں مجھے تو یوں ہی جلنے دے

ارے پپیہا باورے آدھی رین مت کوک
دھیرے دھیرے سلگتی تو کیوں دینی پھوک

نہیں غم گر فنا کر دے کوئی سرتا بپا مجھ کو ۔ کہ جو یار میں ہے خود مری ہستی بلا مجھ کو
گر آنکھیں ہیں پیاری جان وہ اسے بھی ہوا مجھ کو ۔ انہیں سے اک نظر دیدار کا ہے آسرا مجھ کو

کاگا سب تن کھائیو چن چن کھیو ماس
دو نیناں مت کھائیو پیا ملن کی آس

پھر آپ تحریر فرماتے ہیں کہ:-
"ہر شخص کے لئے جس کی زندگی خاتمہ کے قریب پہونچ گئی ہو اور قیدِ حیات سے چھٹنے کا وقت دکھائی دیتا ہو یہہ چھٹ پٹے کا وقت بہت غنیمت ہے"

ان نازک باتوں کے اب سمجھنے ہی کے لالے ہیں ۔

نقشہ دکھا کے روز عروج و زوال کا ۔ گردوں سبق پڑھاتا ہے دُنیا کے حال کا

یہہ نازک خیالیاں آپ ہی کے دم تک ہیں خدا آپ کو مدتوں زندہ رکھے اور مُلک اسی طرح آپ سے فیضیاب ہوتا رہے ۔

اطمیناں کی باتیں - کی سرخی سے عجیب دلکش مضمون لکھا گیا ہے جو پند و نصائح سے بھرا ہوا ہے اور جس کا ایک ایک فقرہ انمول ہے - اس مرتبہ صلائے عام مضامین کا گنجینہ ہے ع اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ

ناصر صلائے عام کے نذرانے کے لئے
لایے تو بھیدوں میں کلیجہ نکال کے

(نواب) شمشیر بہادر برتر - از ریاست انجگڑھ -

جناب غالب کا کلام

جناب مرزا نوشہ (اسد اللہ خاں غالب) کے کلام کی شرحیں ان کی زندگی میں بہت کم دیکھنے میں آئیں۔ بہت کم کیا بلکہ جہاں تک مجھے یاد ہے کسی نے اس طرف توجہ بھی نہیں کی: ان کے بعد شرحوں کا طومار بندھ گیا اور مجھسے فرمایش ہوتی ہے کہ ریویو لکھو۔ اول تو جو کلام شرح کا محتاج ہو یا جو کلام کسی کی سمجھ سے باہر ہو اس کی شرح کی تکلیف گوارا کرنی کیا ضرور ہے؟ اور پھر شرحوں میں اس قدر اختلاف ہے کہ جس کی سمجھ میں جو کچھ آگیا لکھ دیا یہاں تک کہ اختلاف کی وجہہ سے شرح اصل مضمون شعر سے بھی زیادہ الجھن کا سبب ہو گئی۔ اگر غالب کی زندگی میں شرح لکھی جاتی تو ان سے جاکر دریافت کر لیتے کہ آپ کا کیا مطلب ہے؟ اب یہہ ممکن نہیں۔

اتفاق سے آج کل آگرہ اخبار میں جناب نفیس کا ایک خمسہ جناب غالب کی غزل پر میری نظر سے گزرا۔ وہ میں یہاں اس خیال سے نقل کرتا ہوں کہ غالب کے اشعار سمجھنے کے لئے مختلف شرحوں کی بہ نسبت اس وضع کی تضمین زیادہ بکار آمد ہے کہ خمسہ کے پہلے تین مصرعے تو گویا غالب کے شعر کی بہت اچھی شرح ہو گئے۔ تضمین کے مصرعے تو غالب کے کلام کو نہیں پہونچتے مگر غالب کے شعر کا مطلب اچھی طرح نکل آتا ہے۔ خمسہ یہہ ہے:

کوئی بات اپنی کھوکے مفت رسوائے جہاں کیوں ہو ٭ عدو ضبط محبت کا نصیب دشمناں کیوں ہو
کسی پہلو سے لوگوں پر عیاں راز نہاں کیوں ہو ٭ کسی کو دے کے دل کوئی نوا سنج فغاں کیوں ہو
نہ ہو جب دل ہی سینہ میں تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو

نہو جب تو ہی تو در سے ترے مجکو تعلق کیا ٭ نہ کہنا اب کبھی مجھسے یہیں سر پھوڑ کر مرجا
جہاں میں پتھروں کا قحط یا اینٹوں کا ہے توڑا ٭ وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھیرا
تو پھر اے سنگدل تیرا ہی سنگ آستاں کیوں ہو

کہیں وہ بات کیوں سنکر جسے وہ اپنا منہ موڑیں ٭ ہنسیں دشمن پھپولے اپنے دل کے مدعی پھوڑیں
گریں کیوں پانوں پر کیوں ہاتھ اُن کے سامنے جوڑیں ٭ وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں چھوڑیں
سبک سر بن کے کیوں پوچھیں کہ ہم سے سر گراں کیوں ہو

کشیدہ دل سے ہو کس واسطے اس کی خطا کیا ہے ٭ اثر اپنی کشش کا اس نے تنگ آکر دکھایا ہے
قصور اُس کا ہے جس نے آپ کو خود دور کھینچا ہے ٭ غلط ہے جذب دل کا شکوہ دیکھو جرم کس کا ہے
نہ کھینچو گر تم اپنے کو کشاکش درمیاں کیوں ہو

سوا میرے اگر پیدا کروگے کوئی شیدائی ٭ کہیگا کوئی بازاری تمہیں اور کوئی ہرجائی
یہ کیا سوجھی تمہیں بیٹھے بٹھائے دل میں کیا آئی ٭ کہا تمنے کہ کیوں ہو غیر کے ملنے میں رسوائی
بجا کہتے ہو سچ کہتے ہو پھر کہیو کہ ہاں کیوں ہو

ستم پر تم ستم کرتے ہو ہم ناچار سہتے ہیں + نہ آہیں لب تک آتی ہیں نہ اشک آنکھوں سے بہتے ہیں
مگر اس فکر میں ڈوبے ہوئے ہر وقت رہتے ہیں ٭ یہی ہے آزمانا تو ستانا کس کو کہتے ہیں
عدو کے ہولئے جب تم تو میرا امتحاں کیوں ہو

نشیمن باغ میں ہوتے ہیں ہر اک شاخ پر ہمدم ٭ کہیں طوطی کہیں قمری پہ کی ہوگی نظر ہمدم
جو کہنا ہے وہ کہہ چپ اور نہ مجکو دیکھ کر ہمدم ٭ قفس میں مجھ سے روداد چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

سکئے نالے کچھ ایسے غیر پا کر میری حالت کو ؛ کہ اس کمبخت نے شرما دیا شورِ قیامت کو
غمِ پنہاں سے میرے کر دیا آگاہ خلقت کو ؛ کیا غمخوار نے رسوا لگے آگ اس محبت کو
نہ لائے تاب جو غم کی وہ میرا راز داں کیوں ہو

تمہارا لطف جس ناشاد کی حالت پہ پیہم ہے ؛ نشانہ وہ بلاؤں کا ہے اور اس تو دہ غم ہے
عبث فکرِ آسماں کو فتنہ انگیزی کی ہر دم ہے ؛ یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے ؟
ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو

نفیسؔ آسا جو چاہے دل کی نکلے آرزو غالبؔ ؛ نہ کرنا پھر فریب آمیز ایسی گفتگو غالبؔ
کہیں چالوں سے بھی اپنے ہوئے ہیں خوبرو غالبؔ ؛ نکالا چاہتا ہے کام کیا طعنوں سے تو غالبؔ
ترے بے مہر کہنے سے وہ تجھ پر مہرباں کیوں ہو

نفیسؔ

(حصہ منقول از آگرہ اخبار - ۱۴ اکتوبر ۱۹۲۵ء)

بادۂ سخن

عصارۂ خوشۂ تاک مثل عقدِ ثریا (یعنی الفاظ) چمنستانِ ادب سے خمخانۂ سخن میں آئے ہوئے بادۂ کہن سے جرعہ جرعہ جمع کرتا ہوں - اور ہدیۂ ناظرین صلائے عام کے لئے ایک جام بھرتا ہوں ؛

اِس بات کے ثبوت میں کہ ہر دو عالم جو شہود میں آئے ہوئے ہیں - یہ سب کرشمے سخن کے پھیلائے ہوئے ہیں ؎

سخن دیباچۂ دیوان عشق است ؛ سخن نو بادہ بستانِ عشق است

خلاقِ دو عالم نے قلم کو قدرت عطا فرمائی - قلم نے سرنگوں ہو کر جنبش دکھائی ؛ لفظ "کُن" کا کہنا تھا کہ عرصۂ گیتی رنگا رنگ ہائے صنعتِ کاملہ سے گوناگوں ہو گیا - اور آناً فاناً نیرنگیٔ بہارستانِ

غیب سے باغِ ارض وسما بوقلموں ہوگیا۔ اِس سے سمجھ لیجئے کہ یہہ عالم جو میرے آپکے دیکھنے میں آرہا ہے۔ یہہ سب لُطف سخن ہی دریا بہا رہا ہے۔ دریائے سخن ناپیداکنار ہے۔ مگر روانی میں دو دھارے ہے۔ یعنی نثر و نظم۔ نثر کا پاٹ وسیع و ذخّار ہے۔ نظم کا پھیلاؤ تنگ و کم رفتار ہے۔ ان ہردو کا لکھنا براۓت خداداد ہے۔ ان کا لکھنے والا مستحقِ داد ہے۔ نری نظم لکھنا بھی ہرایک کے بس کا نہیں۔ یہ حصہ ہرکس وناکس کا نہیں۔ ناظم برسوں خون جگر پیتے ہیں۔ جب کہیں ایک دو شعر خراجِ تحسین لیتے ہیں۔ یوں تو تک بندی کرنا اور بات ہے۔ نظم کی ہر جگہ نئی گھات سے بہتے کو دھوبی۔ سقے بھی کھنڈ کہتے ہیں۔ تُکّے بے تُکّے بند کہتے ہیں۔ نشے باز خیال اور مرہٹی بناتے ہیں۔ عوام میں چنگ پر گاتے ہیں۔ پہلوان بانیاں گھڑتے ہیں۔ اپنے فن والوں کے سامنے پڑھتے ہیں۔ کمہار کُنڈلیاں جوڑکرلاتے ہیں۔ اپنی پنچایت کو سناتے ہیں۔ یہ سب اپنے آپ کو شاعر خیال کرتے ہیں۔ اور شاعری کا دم بھرتے ہیں۔ اسے نظم نہیں تو اور کیا کہو گے؟ مگر درحقیقت نظم وہی ہے جو مضامین سے پُر ہو۔ مانندِ سلکِ درہو۔

رہی نثر یہہ اور ہی چیز ہے۔ اس کے لکھنے کی ہرکس وناکس کو کیا تمیز ہے۔ ہیچمدان ناثر نہیں ناظم نہیں۔ نثر لکھنے پر بے باک عازم نہیں۔ پھر بھی اشہبِ قلم کی باگ لی توسنِ خیال کو گدگدایا اور فوراً ہی میدانِ نثر میں لاکُدایا۔ ہرچند ہچکچاتا ہوں۔ مگر جو کچھ زبان پر آتا ہے اپنی ہی زبان میں کہہ سناتا ہوں۔ طبع کا تقاضا ہے کہ رہوارِ کِلک صفحۂ جولانگاہ پر گلریز بنجائے۔ شبنمِ معنیٔ رنگینیٔ فقرات سے عرصۂ قرطاس دامنِ گلشن کی طرح معطّر ہوجائے۔ لیکن اندیشہ ہے کہ نشۂ بادۂ سخن سے قلم لڑکھڑا کر ہاتھ سے چھوٹ نہ جائے۔ تو دیکھتا کا دیکھتا رہ جائے۔ اور عقدہ کشائی رشتۂ معنیٔ دل کش تحریر کی ناخنِ زبانِ قلم سے کرنے بھی نہ پائے۔

کہتے ہیں کہ یہ تعلّی شاعرانہ ہے۔ طبع کہتی ہے نغمہ و ترانہ نہیں اندازِ سخن مستانہ ہے۔ سُناکہ بے وقت دون کی لیتا ہے۔ طبع بولی خاموش کیا کہتا ہے۔ یہ سمجھ کہاں سے پائی۔ کہ سخن آفرینی تعلّی بتائی۔ سخن آفرینِ حقیقی نے وہ سورۃ نازل فرمائی ہے۔ جسکو ہم تم نے امّ الکتاب بنائی ہے۔ اسی نے یہ تعلّی ہمکو سکھائی ہے۔ ماناکہ سب سچ ہے۔ تجھے کس بات کی ہیچ ہے۔ کیوں شور مچایا ہے۔ تیرے ہاتھ کیا آیا ہے۔ اگر رنگینی فقرات داخلِ شور ہے۔

صلائے عام (کچھ مختصر عرض)

اکتوبر کے رسالۂ نگار میں جناب نیاز فتحپوری "ملاحظات" میں لکھتے ہیں:۔

"آپ ملاحظہ فرمائیں گے کہ اس مہینہ تقریباً سارا رسالہ مجھی کو اپنے مضامین سے پُر کرنا پڑا ہے اور ہر چند میں نے کوشش کی ہے کہ اس میں کافی تنوع پیدا ہو جائے لیکن ممکن ہے کہ میری یہ کوشش کامیاب نہ ہوئی ہو اور بعض حضرات اس کو پسند نہ فرمائیں۔ مگر نگار کے دورِ حیات میں یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ اور گزشتہ تین سال ۹ ماہ کے رسالوں کی اگر ورق گردانی کی جائے تو معلوم ہو سکتا ہے کہ ۴۷۰۲ صفحات میں مشکل سے ایک ہزار صفحات مضامین غیر کے ہوں گے اور باقی تقریباً تین ہزار صفحات ادارت ہی کی طرف سے پیش ہوئے ہوں گے"۔

"اس کا ذکر میں نے اس لئے نہیں کیا کہ آپ میری کاوش کی داد دیں۔ یا یہ کہ اس کو اپنی زندگی کا کوئی غیر معمولی واقعہ سمجھ کر آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں۔ بلکہ مقصود اس ضمن میں صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ مُلک میں اچھا لکھنے والے اسقدر کم ہیں کہ اگر اُن کے اعتماد پر کوئی رسالہ جاری کیا جائے۔ تو چند مہینے بھی زندہ نہیں رہ سکتا۔ چنانچہ منجملہ دیگر اسباب کے یہ بھی ایک بڑا سبب رسائل کی ناکامیابی کا ہے۔ جس کو میں نگار کی اولیں اشاعت میں بھی ظاہر کر چکا ہوں۔"

× × × × × × × ×

کم و بیش یہہ دقّت مجھے بھی صلائے عام کے مضامین میں اکثر پیش آتی ہے۔ بلکہ میری غرض اس سے بھی بڑھ کر ہے کہ صلائے عام میں صرف اور ہی مضمون نگاروں کے مضامین

ہوں مجھے ایک حرف نہ لکھنا پڑے ؛

اچھے مضمون نگاروں کی قلت کے ساتھ مجھے پڑھنے والوں کا بھی رونا ہے کہ بہت ہی کم اپنی زبان کی پاکیزہ بیانی اور نازک خیالی کی داد دینے کی طرف متوجہ ہیں۔ خدا کرے میں اس شکایت میں جھوٹھا نکلوں : اس میں میرا جھوٹھا نکلنا مجھے پسند ہے ؛

رسالۂ نگار نے "استفسارات" کی مد کھول کر اپنی جان کو مصیبت لگا لی کہ قبر میں تو فرشتوں کے دو ایک سوالوں کا جواب دیکر رہائی ممکن ہے یہاں دنیا بھر کے جھگڑوں کی حد نہیں۔ وہاں دو ہی فرشتوں سے کام پڑیگا۔ نگار میں ہر شخص کو اختیار ہے کہ قیامت تک پوچھتا رہے ؛ یہہ سلسلہ بہت بڑھ گیا ہے بلکہ مجھسے بھی ایسے سوال ہونے لگے ہیں۔ ایک صاحب نے ۱۲ سوال مجھے لکھے ہیں جن کے جواب میں مجھے بارہ برس لگجائیں پھر بھی شاید ہی مجھسے بن پڑیں ؛ لیکن یہہ اچھا ہوا کہ نگار میں جو "استفسارات" کے جواب شایع ہوئے ہیں وہ ایک مجموعی شکل میں نکلیں گے اس سے جناب نیاز کی محنت ٹھکانے لگ جائے گی۔ بلکہ لاہور سے جو اُردو انسائیکلوپیڈیا نکالنے کا ارادہ ہوا ہے اُس بہت مدد ملے گی ؛ اس انسائیکلوپیڈیا کے متعلق میرے پاس بھی ایک تحریر "بحکم خان بہادر مرزا سلطان احمد صاحب" شرف صدور لائی ہے ؛

مجھے پہلے سے اگر یہہ خبر ہوتی کہ ضعف پیری میں مجھے تعمیل احکام اپنی طاقت سے زیادہ کرنی پڑے گی تو میں صلائے عام کا نام نہ لیتا۔ بقول جناب رشید لکھنوی ؎

خبر اس کی پہلے ہوتی کہ نہ آئے گا یہہ ہم کو ؛ تو رشید شعر کا فن نہ ہم اختیار کرتے

بڑھاپے میں اخبار نویسی کا فن شعر کے فن سے بھی مجھے زیادہ مشکل معلوم ہوتا ہے
کہ شاعر کو تو صرف ردیف و قافیہ کا فکر رہتا ہے۔ رسالہ نکالنے والے کا دماغ عمر عیار
کی زنبیل سمجھا جاتا ہے: خاص کر مجھ جیسے ضعیف القویٰ آدمی کے لئے لکھنے پڑھنے کا شغل
اس عمر میں بہت بے تُکا ہے

ناتوانی یہہ بتا دے کس سے چاہوں گا مدد ⁂ گرا اُلجھ کر ہاتھ میں تارِ گریباں رہ گئے

یہہ خوف ہے کہ میں کچھ عرض کر نہیں سکتا
مرے لبوں سے لپٹ جاتی ہے صدا میری

غزل جناب مائل دہلوی

۱۔ رو دھو کے کچھ غبار نکالا تو کیا ہوا ⁂ گر پڑ کے ہمنے دل کو سنبھالا تو کیا ہوا
۲۔ کروٹ نہ لی نصیب نے اے انقلابِ دہر ⁂ ارض و سما ہوئے تہ و بالا تو کیا ہوا
۳۔ اے پیرِ میفروش بڑی شان ہے تری ⁂ گرتے ہوئے کو تونے سنبھالا تو کیا ہوا
۴۔ عاشق کی جان پر تو ہزاروں بلائیں ہیں ⁂ اک ناصحِ غریب کو ٹالا تو کیا ہو
۵۔ مسجد میں بھی ظروف اُٹھاتا ہے شیخ تو ⁂ میں نے کہا کہ جام اُٹھالا تو کیا ہوا
۶۔ کتنا درونِ سینہ ہوں اک خارِ رازِ غم ⁂ کانٹا کوئی کسی نے نکالا تو کیا ہوا
۷۔ اور اُن سے بڑھ کے لاکھ خطا وار آگئے ⁂ آدم کو اے بہشت نکالا تو کیا ہوا
۸۔ کیفیتِ شباب سے مدہوش ہوگئے ⁂ کہنے کو ہمنے ہوش سنبھالا تو کیا ہو
۹۔ پرشان ہیں میں تیری ادائیں نئی نئی ⁂ مینے کہا جو تجھکو نرالا تو کیا ہو
۱۰۔ یہ کم ہے آتے آتے قیامت تو رُک گئی ⁂ اچھی کہی کہ دل کو سنبھالا تو کیا ہوا
۱۱۔ ڈالا مرے کفن پہ نہ رومال یار کا ⁂ ناحق غلاف کعبہ کا ڈالا تو کیا ہوا
۱۲۔ اتنا ہوا ضرور کہ ایمان نظر پڑا ⁂ حُسنِ بتاں سے دل میں اُجالا تو کیا ہوا

جاگو اے مملکتِ عشق کے سونے والو ؎ شب کو دربانِ درِ یار صدا دیتے ہیں

اطلاعِ خاص ۔ اگلے پرچہ یعنی ماہ نومبر سنہ رواں کے صلائے عام میں صلائے عام کے مضمون نگاروں کے اسمائے گرامی لکھنے کا ارادہ ہے ۔ ناموں کے ساتھ جس قدر جامعِ اوراق کو علم ہے اُن کے حالات بھی لکھے جائیں گے : مزید معلومات کے لئے میری التجا ہے کہ جن صاحبوں کو صلائے عام کے مضامین سے تعلق رہا ہے وہ اپنا حال مُختصر لکھ کر مجھے جلد بھیجدیں ؎ میں چاہتا ہوں کہ حتے الامکان کسی صاحب کا نام رہ نہ جائے ۔ بلکہ صلائے عام کے ساتھ صلائے عام کے مضمون نگاروں کے نام یادگار رہیں سے

نہ کیوں کر بے محابہ دامنِ یوسف پکڑ لیتی
گریباں اپنا اک دن چاک کرنا تھا زلیخا کو

Copy of a letter from the Private Secretary to His Honour the Lieutenant Governor of the United Provinces. Dated 11th April 1913.

GOVERNMENT HOUSE, LUCKNOW.

Sir.

I am desired to acknowledge your letter of the 9th forwarding a copy of your Paper (Sala-i-Am) for His Honour the Lieutenant Governor's perusal; and to say that His Honour has put it aside to study and enjoy at leisure

---

Presentation of Mir Nasir Ali Khan Bahadur of Delhi to His Most Gracious Imperial Majesty King Emporer.

Extract from a letter from J P THOMPSON Esqr, I. C S Dated 13th December 1911

Dear Mir Sahib,

" I enclose your invitation card for the Garden Party this afternoon, which had just reached me, from the Private Secretary to His Honour" "Sir Louis Dane hopes to have an opportunity of presenting you to His Imperial Majesty "

Extract from a letter from Sir RICHARD DANE, K C I. E (Brother of His Honour the Lieutenant Governor of Punjab Dated 25th Feb. 1912.

Dear Mir Nasir Ali.

" My brother has told me that you had the great honour of being introduced to His Imperial Majesty the King Emperor "

I am,

Yours Sincerly,

Extract from a letter from Major (Now Lt.-Colonel) J C. C. ANGELO, Deputy Commissioner, Dated 18th December 1911.

My Dear Mir Sahib,

I am very glad you were presented to His Imperial Majesty—it was a fitting ending to the Durbar

Yours Sincerly,

صلائے عام دہلی

ہندوستان کے لیے بڑے فخر کا مقام ہے کہ گورنمنٹ عالیہ ہند نے اردو - ہندی - فارسی عربی میں امتحان و انعام مقرر فرمائے تاکہ حکام و افسران انگریزی مشرقی زبانوں میں کمال و لیاقت پیدا کریں اور صلائے عام کیلیے سب سے زیادہ فخر کی جگہ ہے کہ اردو زبان کے اعلیٰ امتحان میں یہ رسالہ بھی منظور ہوا -

گورنمنٹ عالیہ ہند کے سرکاری حکم کا انتخاب انگریزی میں جسقدر کہ صلائے عام کے متعلق ہے گزٹ آف انڈیا مجریہ ۲ جون سنہ ۱۹۱۴ ء سے ذیل میں نقل کیا جاتا ہے اسکی نسبت زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں کہ یہ انتخاب صلائے عام کی قدر شناسی کیلئے بس ہے -

دلا یہ مکتب الفت ہے دیکھ چپ رہنا * بڑا گناہ ہے یہاں الف سے بے کہنا -

---

Extract from the GAZETTE OF INDIA June 6, 1914 EXAMINATIONS

XVI —The following are the Text Books prescribed for the PROFICIENCY EXAMINATION —

* * * *

URDU—

* * * * *

In addition to the Grammer and Magazine recommended for the proficiency examination —

* * * * *

Magazine,

SALA-I-AM.

* * * *

Appendix B. List of authorised Text Books

The following is a list of Text Books prescribed for the various examination together with places where they may be obtained.

* * * * * *

URDU

SALA-I-AM .... **Delhi.**

* * * *

(Sd.) L. C. PORTER,

Secretary to the Govt. of India.

(See the pages 1091 part 1 of the Gazette of India June 6, 1914.)

Sir Rabindra Nath Tagor, author of GITANJALI writes :—

* * * * "I have no doubt that it (Sala-i-Am) is doing a good service in promoting the cultivation of Urdu Literature,"

* * * * * * * *

Extract from a letter from the Honourable W: MERK, Esq. I L. D, , I. C S., Late Chief Commissioner, N. W. Frontier Province, dated 6th August 1911.

"I thought it (Sala-i-am) a Periodical that might be encouraged with advantage, for instance to be placed in the waiting rooms for native gentlemen calling on Deputy Commissioners.

Extract from a letter from A. L GORDON WALKER, Esq., I C S., Punjab Commission, dated 11th October 1911.

I quite agree with Mr Merk that the (Sala-i-Am) ought to be in the Waiting Rooms of all Deputy Commissioners. Curiously enough I have used it for the purpose myself and always find that the Indian gentlemen who read it are delighted with it.

Extract from a letter from the Deputy Commissioner of Gujranwala Punjab, Dated 4th September 1912.

"I shall be glad to recommend your Paper (Sala-i-Am) to the District Board."

"I like your Paper personally It is always written in chaste and pure, and if I may say so, in classical style."

(NOTE—The officer is now the Commissioner and Political Agent Ambala Division, Punjab)

L. WHITE KING Esqr, L. L. D, C S I, F R. S., Indian Civil Service, retired, writes as follows

"I am delighted with the style of your magazine and am looking forward to the next number.

Dated 5th October 1908

Extract from a letter from L WHITE. Esqr., L L. D, C S I, Indian Civil Service, Retired"

"I was glad to get the last number of the (Sala-i-Am) which I thought excellent. My friend Coloneal Story takes great interest in it."

(NOTE—The gentlemen has since been knighted, Sir Lucas King.)

OPINIONS

Regarding "SALA-I-AM," Delhi.

[illegible]

—:o:—

The Sala-i-Am published at Delhi keeps [illegible] character as a periodical which seeks to promote the cultivation of Urdu literature.

Khan Bahadur Mir Nasir Ali with whom loyalty and learning go hand in hand is [illegible] the [illegible] years of his retirement by devoting himself to the editing and publishing of this Magazine. His style is marked by refinement and culture and his readers should increase in number as the merit of his work becomes disclosed. The Sala-i-Am is particularly well printed and European students of Urdu should find it quite worth reading."

—

[illegible] from a letter from Colonel PHILLOTT, [illegible], Board [illegible]

"I have obtained the opinion of some of the Board on the Sala-i-Am. We think it is the best Urdu Magazine we have yet seen both in appearance and contents. I shall have great pleasure in recommending it to candidates for the High Proficiency and Degree of Honour. In fact, I have been doing so."

—

[illegible] D. C. PHILLOTT, M.A., Ph.D., F.A.S.B. [illegible]

The printing, paper, and contents of the Sala-i-Am make it the best Urdu Magazine for European students of Urdu.

D. C. PHILLOTT, [illegible]
Late Secretary, Board of [illegible], Calcutta

Cambridge
1923

—

Extract from a letter from R. P. Dewhurst, [illegible] I. C. S., [illegible]

"I take this opportunity of saying that I entertain a very high opinion of your Magazine. I will not say that I read every word of every number, but I can say with truth that I read eagerly all the articles proceeding from your own pen beginning to end."

۱۳- چلمن میں کام کر گئی اپنی نگاہِ شوق ؞ غیرت سے اُس نے مُنہ نہ نکالا تو کیا ہوا

۱۴- مائل ہے بادہ نوشی کے در پردہ جا پڑا
واعظ کو میکدہ سے نکالا تو کیا ہوا

صلائے عام۔ مجھے شعروشاعری میں دخل نہیں ہے مگر اچھے کلام کی تعریف کئے بغیر رہا نہیں جاتا۔ اس غزل کے شعروں میں زبان و مضمون دونوں کی خوبیاں ہیں اور بہت صاف ہے زبان کی خوبی اس سے زیادہ کیا ہوگی کہ ۵ رو دھو کے کچھ غبار نکالا تو کیا ہوا ؛ گر گر پڑکے ہم نے دل کو سنبھالا تو کیا ہوا پہلے مصرع میں "رو دھو کے غبار نکالنا" دوسرے میں "گر پڑ کے سنبھالنا"۔ اس زبان کا کیا کہنا! اسی طرح چوتھے پانچویں نویں شعر میں زبان کی خوبی میں کلام نہیں ؛ ساتویں شعر کا مضمون بالکل نیا ہے کہ تھوڑی سی خطا پہ حضرت آدم بہشت سے نکلے مگر اُن سے بڑھ کے بڑے بڑے خطاکار بہشت میں پہونچ جائیں گے ؛ اس شعر میں بھی پاکیزہ مضمون ہے ۵ ڈالا مرے کفن پہ نہ رومال الخ۔ مقطع کا مضمون بھی بے مثل ہے ؛

اشتہار

صلائے عام میں اشتہارات چھپوانے کی اُجرت بشرح ذیل ہے۔ اشتہار خواہ اُردو میں ہوں فارسی میں ہوں۔ انگریزی میں ہوں یا ناگری میں :-

زبانِ اُردو یا فارسی میں ایک صفحہ ایک سال کے واسطے ؏ چھ ماہ کیواسطے ؏ تین ماہ کیواسطے ؏

" " نصف صفحہ " " ؏ " " ؏ " " ؏

" " چوتھائی صفحہ یا اس سے کم " " ؏ " " ؏ " " ؏

" " ایک صفحہ ایک دفعہ کے واسطے ؏۔ نصف صفحہ ایک دفعہ کے واسطے ؏ چوتھائی صفحہ ایک دفعہ ؏

اُجرت ہر حالت میں پیشگی آنی ضرور ہے۔ غیر مہذب اور خلاف شرافت اشتہار چھاپنے سے انکار ہے ؛ ناگری میں چھپوانا ہو تو اُردو سے ڈیوڑھی اُجرت ہے ؛ انگریزی میں چھپوانا ہو تو اُردو سے دوگنی اجرت ہے ؛
یہ خیال رہے کہ اشتہار کا مسودہ صاف ہو ورنہ غلطی کے ہم ذمہ دار نہیں مسودہ انگریزی مہینہ کی اول تاریخوں میں معہ اُجرت آجانا چاہیئے ؛

مہتمم کی طرف سے

اِطّلاع

صلائے عام کی قیمت پیشگی چھہ روپیہ سالانہ ہے۔ قیمت بذریعہ منی آرڈر عنایت فرمائی جائے: مضمون نگار بھی صلائے عام کی قیمت سے بری نہیں۔ نہ یہہ ضرور ہے کہ ہر مضمون خواہ مخواہ شایع کیا جائے ؛ جامع اوراق کو مضمون میں کمی بیشی کا اختیار ہے جو مضمون شایع نہ ہو سکیں ان کے واپس کرنے کا ذمہ نہیں ؛

صلائے عام میں ہر طرح کے مضامین نظم و نثر شایع ہوتے ہیں۔ زیادہ تر نثر کہ اس وقت نثر کی زیادہ ضرورت ہے: اور نثر بھی ایسی جس میں زبان کی خوبی و فصاحت کے ساتھ مضمون کی پاکیزگی و نازکخیالی ضرور ہو یعنی بلسان ع عروسِ جمیل و لباسِ حریر۔ شرط ہے کہ مضمون پاکیزہ اور ادائے بیان لاجواب چاہیئے ؛

اکثر اصحاب نمونہ کا پرچہ مانگتے ہیں۔ اوّل تو ایک پرچہ سے **صلائے عام** کی ساری خوبیوں کا حال معلوم ہونا مشکل ہے دوسرے **صلائے عام** اتنے عرصہ سے جاری ہے کہ اہلِ علم میں شاذ ہی کوئی ایسا ہوگا جو اس سے واقف نہ ہو: پھر بھی اگر کسی کو نمونہ یا سال سے کم کی خریداری منظور ہو تو ایک روپیہ فی پرچہ کے حساب سے لی جائے گی ؛

صلائے عام کا پتہ اسقدر کافی ہے کہ:

دہلی۔ فراشخانہ: مکان میر ناصر علی خاں بہادر

حسب الارشاد میر ناصر علی خاں بہادر مطبع ناصری واقع فراشخانہ دہلی میں باہتمام سید احمد دہلوی چھپا اور شایع ہوا ؛ ۱۹۱۰
Printed and Published by Mir Nâsir Ali Khân Bahâdur (Editor) at the Nâsri Press, Farrâsh Khânâ, Delhi.

Regd. No. L. 1162 SALA-I-AM, DELHI



A high class Monthly Magazine devoted to the cause of Urdu literature the preservation of the old Indian especially Mohammadan culture and refinement, and the assimilation of the best features of the new civilization

فہرستِ مضامین

نمبر ۱۱ جلد ۱۳

بابت ماہ نومبر ۱۹۲۵ء مطابق ربیع الثانی ۱۳۴۴ ہجری

پیرائیہ آغاز

اب کی دفعہ پیرائیہ آغاز میں زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں۔ زیادہ مضامین اگلے پرچہ یعنی دسمبر کے صلائے عام کے لئے رکھ لئے گئے ہیں: ذرا دسمبر آنے دیجئے

امتحاں مدِ نظر ہے جو وفاداروں کا ✤ تم بھی کیا یاد کروگے ہمیں آ لینے دو

اس پرچہ میں نہایت معقول مضمون شوخیِ گفتار ہے (صفحہ) جو جناب خواجہ محمد عبدالروف صاحب عشرت لکھنوی کا بھیجا ہوا ہے۔ اس میں ایک بڑے کام کی بحث چھیڑی گئی ہے کہ پاکیزہ اُردو ہر جگہہ کے باشندے کے بس کی نہیں۔ آپ کی مادری زبان اگر کچھ اور ہے تو آپ کو اہلِ زبان ہونے کا دعوٰے زیب نہیں دیتا

جو میرے نالوں نے ناقوس کے اُڑائے ڈہنگ ✤ کہا بتوں نے کہ منہہ چاہئے فغاں کے لئے

صلائے عام کے مضمون نگار (صفحہ) ان کا مختصر ذکر محض بطرزِ تعارف ہے: مختصر اس لئے کہ تعارف کے وقت لمبی چوڑی تقریر کا موقع نہیں ہوتا ✤

بعض اصحاب ضرور خفا ہوں گے کہ ہمارا حال زیادہ نہیں لکھا گیا۔ پہلے پہل اس سے

زیادہ کی ضرورت نہیں سہ

کیا شکایت اے دلِ بیمار چشمِ یار کی ٭ کب عیادت کی کسی بیمار نے بیمار کی

اُردو کے متروکات کے متعلق (صفحہ) جناب مولوی بشیرالدین احمد صاحب نے بہت خوب لکھا۔ اس بحث میں لکھنے کا آپ کو حق حاصل ہے کہ آپ جناب مولوی نذیر احمد صاحب مرحوم کے صاحبزادے ہیں جو اُردو نثر و نظم میں اُستاد مشہور تھے: نثر کو میں نے نظم سے مُقدّم لکھا کہ حضرت مرحوم کو نثر میں کمال تھا ٭

صلائے عام کے متعلق اب کی دفعہ معمول سے زیادہ کیے بعد دیگرے دو ایک ضروری امور میں ذرا مفصّل لکھا گیا ہے۔ یہ آپ فرصت میں علیحدہ علیحدہ ملاحظہ فرمائیں (صفحہ)

مضمونِ پریشان (صفحہ) وہی معمولی مضمون ہے جس میں نثر کو اینچ کھینچ کر شعر کا جامہ پہنایا گیا ہے۔ یعنی بغیر قافیہ و ردیف اور بحر و وزن کے شاعری کی تقلید ہے یا شاعری کا مُنہہ چڑایا گیا ہے: اور نہیں تو "گندہ بروزہ باخُشکہ اگرچہ گندہ لیکن ایجادِ بندہ" سمجھئے ٭ باقی "ما بخیر شما بہ سلامت" کا معاملہ ہے ٭

مضمون پریشان

اس مضمون کے بدلے اور اس کی تقلید میں میں نے اور اوروں نے بہت زور مارا مگر مضمونِ پریشان کی سی خوبیاں مجھے نصیب نہ ہوئیں۔ آخر پھر وہی سلسلہ چھیڑنا پڑا کہ جب مجھی سے وہ اندازِ بیان ادا نہ ہو سکا تو اور کسی کا کیا گلہ؟ جس طرح غزلِ دل کشی میں زلفِ خوباں کی پریشانی کو تمام دُنیا کی پریشانی آج تک پہونچ نہ سکی اسی طرح مضمونِ پریشان کی ادائے بیان صلائے عام کا حصّہ سمجھئے ؎

ہیں پریشاں جمع کرکے آپ کے اساں ہم ٭ اپنے دل کو جانتے ہیں حشر کا میدان ہم

کہتے ہیں کہ قیامت کے دن عالمِ اسباب کے تمام اجزائے پریشان جو مزاجِ عاشقاں کی طرح ازل سے پراگندہ تھے مشیئتِ ایزدی سے حشر کے میدان میں جمع ہوں گے جمع کرنا تو خدا کی قدرت کے آگے ایسی کوئی بڑی بات نہیں مگر صنّاعِ ہیژدہ ہزار[1] عالم کی بڑی تعریف اس بات کی ہے کہ جہاں سے جو چھوٹے سے چھوٹا اور بڑے سے بڑا جزو جُدا ہوا اور جہاں کا جو ٹکڑا ہے وہیں مل جائے گا + گھڑی کو کھول کر گھڑی کے چھوٹے بڑے پرزے تو آپ کیا میں بھی سمیٹ سماٹ کر ایک جگہ اکٹھا کر دوں گا مگر ہر پرزے کو اپنے اپنے ٹھکانے سے پھر لگانا گھڑی ساز کے سوا اور کسی کے بس کا نہیں ؎

[1] "ہژدہ ہزار عالم" سے کہیں زیادہ بے شمار عالم ہیں۔ میرا مطلب گزشتہ عالم دو عالموں سے ہے +

کیا جوڑتے ہیں آپ دلِ پارہ پارہ کو ؎ معلوم بھی ہے کون سے ٹکڑے کہاں کے ہیں

دل کے ٹکڑے جوڑنے یا ساتھ لینے چاہیئے ؎ میری خاطر جمع ہو جائے کسی تدبیر سے

یہہ کام مضمونِ پریشان کا ہے۔ اب آگے چلئے: فراقِ جسم جان میں جو عزیز واں کی جان پر بن جاتی ہے اس کی تسلی کے لئے **بیدل** نے بڑی دل جمعی کی بات کہی ہے

چہ ضرور است کشی رنجِ وداعم **بیدل** ؎ میروم من بمقامے کہ تو ہم می آئی ؎

میرے دُنیا سے جانے کا رنج کسی کو کیوں ہو جب کہ رنج کرنے والا بھی وہیں جانے والا ہے یہاں کہ میں جا رہا ہوں؟ ہمارے جانے پر عزیزوں کو اتنا رنج ہے کہ بس چلے تو جانے نہ دیں مگر آپ خود جانے کو تیار ہیں؟ فرض کیا کہ میں کشمیر یا کلکتہ جا رہا ہوں اور آپ کو بھی آج نہیں تو کل وہیں جانا ہے تو میرے آپ سے ذرا پہلے پہونچ جانے میں اس قدر قلق کی وجہہ کیا ہے؟ گرمیوں میں کشمیر اور جاڑوں میں کلکتہ جانا کیا بُرا ہے؟ ہر فصل میں جس قدر پہلے پہونچئے اچھا ہے کہ دلی سے نکل کر کشمیر میں گرمیوں میں پنکھے اور خس کی ٹیٹوں کے جھگڑے سے بچ جایئے گا اور کلکتہ میں جاڑوں میں انگیٹھی و لحاف کی ضرورت نہ رہے گی[ل]: اسی طرح دُنیا سے جلدی جانے میں کوئی موسم کیوں نہ ہو بُرا نہیں کہ یہاں سے نکلکر اگر اور کچھ فائدہ نہیں تو یہاں کے جھگڑوں سے چھوٹ جانا ہی کتنی بڑی نعمت ہے؎ رہا اکیلے جانا۔ اکیلے جانے کا کیا کہنا! جہاں ہمیں کوئی جانتا نہ ہو نہ ہم کسی کو جانتے ہوں: غُربت میں یہہ بڑا آرام ہے کہ کسی کو ہمارے قصے جھگڑوں کی خبر نہیں نہ ہمیں کسی کے قصے جھگڑوں سے غرض ہے: ہمارا توسنِ عمر دُلکی چلا یا پاشنہ۔ بھاگا آیا یا آہستہ

لہ سُنا ہے کہ کلکتہ میں جاڑا بہت نہیں پڑتا ؎

قدم قدم ۔ ہم کے جگہہ گرے ؟ چوٹ کہاں آئی ؟ دن کیسے کٹے اور رات کیسی کٹی ؟ رات تڑپ تڑپ کر کٹی یا رات بھر آنکھ نہ کھلی جس طرح سوداگر گھوڑے بیچ کر سوتا ہے ؛ کوئی پوچھنے والا نہیں کہ آپ کا آنا کیسے ہوا ۔ کہاں کا ارادہ ہے ؟ یہہ کہنے والا نہیں کہ آئیے ۔ تشریف لائیے

نہ زخمِ تن کھلا کوئی نہ ٹپکے خون کے قطرے ؛ نہ کوئی ہنسنے والا ہے نہ کوئی رونے والا ہے

پھر یہہ کیا بات ہے کہ انسان کسی حالت میں کیوں نہ ہو ہر شخص کو دُنیا سے جانے کا رنج ضرور ہوتا ہے اور رنج بھی ایسا کہ جاں کاہ ؟ اس کا جواب تھوڑا بہت غالب کے شعر سے ملتا ہے کہ ؎

گو ہاتھ کو جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے ؛ رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

ساغر ہونٹھ تک لے جانے میں اگر ہاتھ کانپے تو کچھ مضایقہ نہیں ۔ شراب حلق سے اترتے ہی ہاتھ کیا تن بدن میں طاقت آجائے گی : اس طاقت کا آجانا بُرا ہے کہ پھر شراب خواری کی عادت چھوٹ چکی ؛ دُنیا کے رنج و آلام برداشت کرنے میں بھی وہ لُطف ہے کہ مرنے کے بعد نعمائے بہشت کی امید میں وہ کیفیت نہیں کیونکہ امید زندگی کے ساتھ ہے زندگی ہی نہیں تو نری اُمید سے کیا کام نکل سکتا ہے ؟ دُنیا کے حسین باوجود بے وفائی کے قاتل و سفاک مشہور ہیں اچھوتی حوروں سے بہتر ہیں کہ جب تک جوانی ہے دُنیا میں حُسن کے پرکھنے والے بہت ہیں جو ہجر و محبّت کے صدمے اُٹھائے ہوئے ہیں ؛ روکھی پارسائی کو عشق و محبت سے بیگانہ سمجھئے کہ زاہدانِ خُشک بہت کم کسی پر مرتے دیکھے

بقول حضرتِ ناسخ لکھنوی ؎

بہت ڈرے ہوئے ملتے ہیں شیخ وزاہد سے ؛ اُٹھا چکے ہیں ہم الزام پارسائی کا ؛

مرنے کے بعد بہشت ملے تو ملے مگر پھر دُنیا نصیب نہیں۔ اور اچھا ہے کہ پھر نصیب نہ ہو؛ کیوں کہ اس کی بنیاد رنج والم پر رکھی گئی ہے جو بہشت میں میسّر نہیں ؎

دیکھا تو خلد میں غمِ عشقِ بتاں نہ تھا ؛ جو کھا کے ہم پلے تھے وہ کھانا یہاں نہ تھا

شبِ ماہ ہو اور لبِ جُو نہ ہو۔ یار ہو اور شوخ نہ ہو۔ گانا ہو اور سُننے والا نہ ہو۔ تو لُطف نہیں؛ ہمارے بعد ہمارے لئے یہہ سرائے فانی نہ صرف خالی سمجھنی چاہئے بلکہ بے کار ہے؛ یہاں کا یہہ حال اور وہاں کا وہ حال کہ آج تک کسی کو معلوم نہ ہوا۔ اب آپ ہی فرمائے انسان کیا کرے ؟ مگر مضمونِ پریشان کی تصویر جرأت کا یہہ شعر ہے کہ ؎

ہمارے سر پہ چھائی ہیں بلائیں شامِ ہجراں کی ؛ وہ اپنے شغل میں ہیں بال ادھر کھولے اُدھر باندھی

میاں کو ہمارے مرنے جینے سے غرض نہیں۔ ہم جئیں یا مریں عالمِ اسباب کی وضع میں کبھی فرق نہ آیا نہ آئے گا ؎

صنعتِ صانعِ قدرت کو کوئی کیا بدلے ؛ یہہ نہ بدلیں گے اگر لاکھ زمانہ بدلے

زمانہ کا رنگ بدلنا جناب رشید نے خوب باندھا ہے ؎

رنگِ عالم کا بدلنا آپ کے صدقہ میں ہے ؛ جمع کر رکھی ہیں پوشاکیں پُرانی آپ کی

میاں کی نئی پوشاک تو غلاموں (عالمِ اسباب) کو کہاں نصیب۔ یہی پھٹے پُرانے کپڑے جو درگاہِ ایزدی سے کبھی کبھی مل جاتے ہیں زمانہ کی کروٹیں سمجھنے کہ

کہ اُن کو بہن بہن کر زمانہ کی گردشیں یل مارتی پھرتی ہیں کہ آج کچھ ہے اور کل کچھ - مگر یہ ہی پرانی باتیں ہیں جو روزِ ازل سے چلی آ رہی ہیں اور اسی طرح چلی جائیں گی - یعنی جب تک گردشِ لیل و نہار رہے نہ خوشی کا اعتبار رہے نہ رنج کا - کرتا کوئی ہے اور پکڑا کوئی جاتا ہے ؎

میرے سجدوں نے مٹایا وہ خفا دربان سے ہیں؛ پوچھتے ہیں کون دروازہ کا پتھر لے گیا

دیکھا جہانِ تنگ کو جس نے نظر سے وہ
آنکھیں وہی ہیں جن کو نشانِ کمر ملا

"اسلامی اٹلس"

یہہ مجموعہ ایسے نقشوں کا ہے جس میں اسلام کی قدیم و جدید سلطنتوں میں جو ملک زیرِ حکومتِ اسلام تھے دکھائے گئے ہیں - یہہ نقشے از روے جغرافیہ و تاریخ بہت ضروری ہیں: نقشے احتیاط سے اچھے کاغذ کی بڑی تقطیع پر چھپے ہیں مسلمانوں کی تاریخ کے محققوں کے لئے بہت بکار آمد ہیں اس میں شک نہیں کہ ان نقشوں کی ترتیب اور تحقیق میں مولف کو بہت محنت پڑی ہوگی کہ اسلام کی تاریخ اور جغرافیہ شروع سے اب تک کا جمع کیا ہوگا - کیوں کہ اس کام کے لئے بہت بڑی معلومات کی ضرورت ہے؛ اس وضع کا مجموعہ نقشوں کا اس سے پہلے میری نظر سے نہیں گزرا؛

"تہدیہ" سے جو آغاز میں ہے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مجموعہ نقشوں کا حضور (ھز اکزالٹڈ ھائینس) فرمانفرمائے ریاست حیدرآباد (دکن) کی خدمت عالی میں پیش کیا گیا؛ حیدرآباد (دکن) میں سب سے پہلے اردو یونیورسٹی کی بنیاد پڑی - یہہ ریاست

صلائے عام مضمون نگار

صلائے عام میں جن اصحاب کے مضامین ہوتے ہیں ان میں سے چند مضمون نگاروں کے اسمائے گرامی ذیل میں لکھے جاتے ہیں: ناموں میں آگے پیچھے کی رعایت نہیں۔ جو نام یاد آتا گیا یاد کے موافق لکھا جاتا ہے ؎

آج معلوم ہوئے دل کے خیالات مجھے
تم سے حال اپنا کہا کرنے نہ دی بات مجھے

خان بہادر پیرزادے جناب مولوی محمد حسین صاحب

آپ نے عہدہ جلیلہ سیشن ججی پنجاب سے پنشن لی ہے۔ دہلی میں اکثر کارہائے نمایاں ہیں آپ کی شہرت ہے: جامع اوراق کو آپ کی خدمت میں نیاز حاصل ہے ÷ عربی میں آپکو بہت بڑی لیاقت ہے۔ ابن بطوطہ کے سفرنامہ کا ترجمہ اردو نہایت پاکیزہ شایع کیا ÷ فارسی و اردو میں شعر اچھا کہتے ہیں اور نثر بہت پاکیزہ لکھتے ہیں ÷ صلائے عام کے لئے آپ مضامین نظم و نثر عنایت فرماتے ہیں۔ آپ کے مضامین بہت متانت کے ہوتے ہیں: مضامین میں اخلاق و نصایح و معلومات کا زیادہ خیال رہتا ہے ÷

جناب مولوی بشیر الدین احمد صاحب رئیس دہلی

آپ شمس العلما جناب مولوی نذیر احمد صاحب ایل ایل ڈی کے صاحبزادے ہیں۔ ریاستِ حیدرآباد (دکن) میں آپ تعلقدار تھے یہہ مرتبہ سرکار انگریزی میں کمشنری کے برابر ہے۔ ریاست سے آپ کو معقول پنشن ملتی ہے۔ اپنے والد ماجد کی طرح آپ رات دن تصنیف و تالیف میں مشغول رہتے ہیں۔ بہت کتابیں لکھ چکے ہیں اور لکھ رہے ہیں۔ نظم و نثر دونوں میں اچھی لیاقت ہے۔ خصوصاً آپ کے مضامین نثر بہت پاکیزہ ہوتے ہیں اور لطف یہ ہے کہ مشکل مشکل مضامین ایک ہی نشست میں لکھ ڈالتے ہیں۔ صلائے عام کے لئے بہت توجہ و محبت سے مضامین لکھتے ہیں۔ صلائے عام کے بڑے قدردان ہیں۔ اس کے تمام پرچے جلد بندھوا کر احتیاط سے جمع رکھتے ہیں۔

خان صاحب جناب مرزا محمد علی خاں صاحب

آپ دلی کے قدیم رئیسوں میں ہیں۔ ریاستِ ٹونک میں آپ جوڈیشل ممبر تھے۔ وہاں سے پنشن لیکر اپنے وطن (دلی) میں تشریف فرما ہیں۔ یہاں رات دن مشاغل علمی میں مصروف رہتے ہیں۔ عربی فارسی میں بہت بڑی لیاقت ہے۔ فارسی و اُردو میں شعر خوب کہتے ہیں۔ صلائے عام کے لئے تاریخ و تحقیق اور معلوماتِ علوم و فنون کے متعلق بڑے مرتبہ کے مضامین عنایت فرماتے ہیں۔ آپ کے مضامین کی بہت تعریف ہے کہ جس مضمون کو لیتے ہیں اُس کی تحقیقات و معلومات میں کوئی دقیقہ باقی نہیں رہتا۔ "اتالیق الامرا" نامی ایک

مضمون بہت زور کا صلائے عام میں لکھا تھا جسکی بہت تعریف ہوئی ؛

جناب مرزا عرفان علی بیگ صاحب ایم - ایس - او

آپ آگرہ کے نامور رئیسوں میں ہیں۔ صوبہ یوپی کی ڈپٹی کلکٹری سے پنشن پاکر اپنے وطن میں آنریری مجسٹریٹ ہیں اور بہت نیک نام ہیں ؛ شروع اجرا صلائے عام سے اس پرچہ کی قدر کرتے ہیں۔ اس میں آپ کے مضامین زیادہ ہوتے ہیں ؛ مضمون نگاری میں آپ کو یدطولے ہے ؛ برخلاف اور مضمون نگاروں کے مضمون کے لئے آپ سے تقاضے کی نوبت نہیں آتی۔ جس طرح شعر میں "آمد" و "آورد" کا امتیاز ہے کہ "آورد" سے "آمد" کو ترجیح دی جاتی ہے آپ کے مضامین کی تشبیہہ "آمد" سے ہو سکتی ہے کہ آپ کے مضامیں سے بہت بے تکلفی ٹپکتی ہے ؛

جناب ضیاؔر دہلوی

یہہ صاحب دراصل دلی کے رہنے والے ہیں مگر عرصے سے ریواڑی جا رہے ہیں شعر بہت اچھا کہتے ہیں : آپ کا ایک شعر مجھے یاد ہے جو سفر میں سُنایا تھا ؎

جفائے چرخ سے ہم کیا ڈریں گے عاشق ہیں ؛ ستمگروں میں کٹی عمر قاتلوں میں رہے ؛

آغاز میں آپ کو صلائے عام میں لکھنے کا بہت شوق تھا۔ نثر میں آپ جامع دراق کا تتبع پسند کرتے ہیں ؛ چند روز سے معلوم نہیں کہاں ہیں ؟

خان بہادر جناب مرزا سلطان احمد صاحب

آپ گورنمنٹ پنجاب کے ذی مرتبہ ہندوستانی افسروں میں بہت نامور رہے۔ اب سنا ہے کہ پنشن لے کر اپنے وطن میں تشریف رکھتے ہیں۔ آپ صلائے عام میں اکثر مضامین بھیجتے تھے۔ بہت پُرمضمون مضامین لکھتے ہیں: جس طرح شاعری میں نیرنگوئی خاص ہنر ہے یہی خوبی آپ کے مضامینِ نثر میں دیکھی گئی۔ آپ صلائے عام کے بڑے قدردانوں میں ہیں۔

جناب نواب شمشیر بہادر

آپ کا قریبی تعلق ریاست اجیگڈہ سے ہے۔ شاعری میں آپکا مرتبہ بہت بڑھا ہوا ہے: پہلے اخگر تخلص تھا اب کسی بزرگ کی ہدایت سے برتر تخلص اختیار کرلیا ہے۔ صلائے عام میں اپنا کلام نظم اور مضامین نثر اکثر بھیجتے ہیں۔ نثر بھی بہت خوب لکھتے ہیں۔

جناب مولوی سبحان اللہ صاحب رئیس گورکھپور

آپ مضمون کم لکھتے ہیں مگر جب لکھتے ہیں بہت خوب لکھتے ہیں۔ آپ نے صلائے عام میں جہاں گیر و نورجہاں کی سیر ودریا لاجواب لکھی تھی۔

جناب نواب حیدر یار جنگ بہادر طباطبائی پروفیسر نظام کالج حیدرآباد (دکن)

سے صلائے عام کے لئے نہایت پاکیزہ مضامین بھیجا کرتے تھے۔ جن پر جامع اوراق جس قدر ناز کرے تھوڑا ہے ؛

جناب افسر میرٹھی کی "رات کی سرگزشتیں" جو صلائے عام میں شایع ہوئیں بہت مقبول ہوئیں ؛ جناب دل گیر اکبرآبادی پہلے صلائے عام میں نہایت پاکیزہ مضامین لکھتے تھے۔ جب اپنا رسالہ نقاد نامی نکالا صلائے عام میں لکھنا چھوڑ دیا ؛ جناب نیاز فتحپوری نے بھی جب سے اپنا رسالہ نگار نامی نکالا صلائے عام میں لکھنے کی فرصت نہیں ملتی ؛ جناب خواجہ عشرت لکھنوی نے از راہ کرم پھر صلائے عام کے لیے مضمون بھیجنے کا وعدہ کیا ہے ؛ جناب اثر لکھنوی نے پچھلے صلائے عام میں "متروکات" کے متعلق بہت خوب لکھا +

آپ کو تعجب ہوگا کہ اعلے حکام انگریزی میں ایک صاحب نے جو اودھ کمیشن میں سیشن جج تھے اور ولایت میں علوم شرقی کے نامور علماء میں ہیں صلائے عام کے لئے ایک بڑے معرکہ کا مضمون شاعری کے اوزان و بحور کے متعلق لکھا تھا جس صاحب مضمون کی معلومات پر مجھے حیرت ہوئی کہ اس تحقیق کا مضمون میری نظر سے اب تک نہیں گزرا +

نامور شعرا میں لسان الملک حضرت ریاض ہمیشہ سے صلائے عام کے

R. P. Dewhurst, Esquire, I. C. S., now Retired.

بڑے قدر دانوں میں ہیں۔ نثر میں بھی بہت خوب لکھتے ہیں: مگر اب لکھنا کم کر دیا ہے ؛

جناب مائل دہلوی کے کلام کا کیا کہنا۔ آپ اپنا کلام صلائے عام میں زیادہ بھیجتے ہیں ؛ جناب سائل بھی ازراہ کرم اپنا کلام صلائے عام میں شائع ہونے کے لئے عنایت کرتے ہیں ؛ اسی طرح جناب گرامی بھی کبھی اپنا کلام صلائے عام میں بھیج دیتے ہیں۔ حضرت گرامی کے فارسی کلام کی تعریف ہو نہیں سکتی ؛

مگر سب سے زیادہ احسان جناب نواب صاحب بہادر فرماں فرمائے ریاست لوہارو کا ہے کہ آپ اپنا کلام خاص طور پر صلائے عام کے لئے عنایت فرماتے ہیں ؛ آپ نے گو ابھی حال میں شعر کی طرف توجہ فرمائی مگر بہت جلد اچھے شاعروں کی سی مشق و قدرت پیدا ہو گئی ؛ ان دنوں آپ نورجہاں و جہانگیر کے حالات کی مثنوی لکھ رہے ہیں ؛ یہ زبان اُردو کی خوش نصیبی ہے کہ والیانِ ملک اردو لٹریچر کی طرف متوجہ ہیں ؛

گو صلائے عام کی پالیسی زیادہ تر مضامین نثر کی ترقی سے متعلق ہے مگر شعر و سخن کا مشغلہ اُردو لٹریچر کا بڑا جزو ہے۔ اس لئے شاعری کی داد بھی صلائے عام پر واجب ہو گئی ؛

یہ فہرست صلائے عام کے مضمون نگاروں کی ناقص سمجھئے کہ بعض کے نام ہیں بھول گیا۔ بعض کا پتہ مجھے معلوم نہیں۔ بعض کے حالات پیچھے سے معلوم ہوں گے۔ بعض کو موت نے صلائے عام سے جُدا کر دیا۔ جن کو موت نے جُدا کر دیا

اُن میں یہہ لوگ مجھے اپنے مرحوم یاد رہیں گے :-

گورکھپور کے ایم مہدی حسن صاحب (مہدی)۔ سیّد امجد علی صاحب اشہری نواب اکبر علی خان صاحب رئیس دہلی۔ آگرہ کے مسٹر فانتوم صاحب۔ جناب مولوی اشرف حسین صاحب دہلوی :۔ کرنیل آر اسٹوری صاحب (آیرلینڈ)۔ جناب شوکت اڈیٹر اخبار شحنۂ ہند میرٹھ۔

جناب ایم مہدی حسن اُردو لٹریچر کے بڑے مُربّی و نقّاد تھے۔ جناب اشہری نے صلائے عام میں بہت مضمون لکھے۔ صلائے عام کا آغاز جناب نواب اکبر علی خاں صاحب رئیس دہلی کے ہاتھ سے ہوا تھا۔ مسٹر فانتوم صاحب انگریزی کے مضامین لکھتے تھے :۔ جناب مولوی اشرف حسین صاحب دہلوی زبانِ اُردو کے بڑے انشاپرداز تھے :۔ جناب شوکت میرٹھی صحتِ الفاظ اور تحقیق السنہ میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے :۔ اِن اصحاب کمال سے صلائے عام کو بڑی مدد تھیں :۔ جامع اوراق کو وہ زمانہ رہ رہ کے یاد آتا ہے جب یہہ ذی کمال صلائے عام کے لئے کس شوق سے مضمون لکھا کرتے تھے ؎

اے حضرتِ دل آنے لگی یاد جوانی کو
ہر بار نہ افسانہ بیاں کیجیے جب کا

صلائے عام (مختلف سیاسات و رائیں)

(۱۔ مسلمانوں کا تعلق عیسائی مذہب سے ۔ ۲۔ تذکرہ شعرائے زبان اُردو ۔ ۳۔ اخبار ستارہ صبح لکھنؤ ۔
۴۔ رسالہ جادو ۔ ۵۔ انتخاب لاہور)

مسلمانوں کا تعلق عیسائی مذہب سے

آغازِ اسلام سے مسلمانوں کا تعلق عیسائی مذہب سے زیادہ رہا۔ ۲۳۔ اکتوبر سنہ رواں کے اخبار پائنیر میں ولایت کی خبروں میں یہہ مضمون تھا کہ مینچسٹر کے کتب خانہ کے صاحب اسسٹنٹ ڈاکٹر منگانا نے ایک قدیم سند شام کی زبان میں دریافت کی ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ مسلمان عیسائی مذہب والوں کے حامی و محافظ رہے ہیں۔ خلفاء عباسیہ کے خلیفہ دہم مُکتفی باللہ نے نسطوریوں کی کلیسا کے عیسائیوں کی حفاظت و حمایت میں سنہ ۱۱۳۸ء میں جو فرمان جاری کیا تھا یہہ سند اُس فرمان کا ترجمہ ہے۔ فرمان مین لکھا ہے کہ خلیفہ مکتفی اُس قاعدہ کی پابندی میں یہہ سند عطا کر رہے ہیں جس کا دستور اور خلفاء قدیم کے زمانہ سے چلا آتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ عیسائیوں کی حمایت خُلفاء اسلام کا شعار قدیم سے رہا ہے۔

سلاطین مُغلیہ میں جن کی سلطنت ہندوستان میں قریب تین سو برس کے

ہیں۔ ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں نے یورپ کے خاص کر انگلستان کے سفیروں اور سوداگروں کے ساتھ بہت رعایتیں جاری رکھیں۔ عیسائی مذہب کے پادریوں کے ساتھ بہت سلوک کئے۔ پادریوں کے خانقاہوں میں یہہ فرمان اور سندیں کثرت سے موجود ہیں۔ دو چار فارسی کے ایسے فرمان میری نظر سے بھی گزرے ہیں جن میں پادریوں کے ساتھ رعایت کی تاکید ہے: اس پر پادری صاحبوں کو بھی ناز ہے۔ وہ فرمان شاہی بڑے احتیاط سے خانقاہوں میں رکھے ہوئے ہیں۔

۲۔ تذکرہ شعرا زبان اردو

تاریخ کا اطلاق بادشاہوں اور ملکوں کے حالات پر ہوتا ہے۔ اولیا اللہ اور بزرگوں کے ذکر ملفوظات کے نام سے مشہور ہیں۔ کسی نامور ذی کمال کا حال لکھا جائے تو انگریزی لب ولہجہ کی تقلید میں اُسے حیات وزندگی کہتے ہیں کہ حیاتِ غالب یا حیاتِ سعدی: شعرا کے حالات کے لئے تذکرہ کا لفظ خاص ہوگیا۔

تذکرہ‌ں کا رواج زیادہ تر فارسی میں ہے۔ فارسی کے تذکرے زیادہ معتبر و مستند سمجھے جاتے ہیں کہ فارسی میں تذکرہ نویسی کا منصب اُسی کو زیب دیتا ہے جو اچھا شعر کہتا ہو اور سمجھتا ہو۔ جب تک اچھے و معمولی کلام میں تمیز نہ ہو اُس سے تذکرہ کا حق نہیں ادا ہو سکتا۔ فارسی تذکروں کے مصنّف خود بڑے مستند شاعر تھے جن کہ کلام کے انتخاب میں کسوٹی کی طرح کھوٹے کھرے کی پرکھ تھی۔

دلّی میں سب سے بڑا تذکرہ لالہ سری رام صاحب ایم اے عرصہ سے

لکھے ہیں۔ یہ تذکرہ کئی جلدوں میں ختم ہوگا؛ ختم ہونے کے بعد اس کے حُسن و قبح پر رائے قایم ہو سکتی ہے؛ رسالہ حُسن ادب (لکھنؤ) میں اگست سنہ رواں سے تذکرۂ شعراے ہند شروع ہوا ہے۔ اس کا دیباچہ جناب خواجہ محمد عبدالرؤف صاحب عشرت لکھنوی کا لکھا ہوا مجھے بہت پسند آیا۔ دوسرے انتخابِ کلام بہت معقول ہے۔ تیسرے۔ اس میں موجودہ زمانہ کے شعرا کا ذکر ہے: اس کی زیادہ ضرورت تھی کہ تذکرہ نویس جہاں تک ہو سکے اپنے زمانہ کے شاعروں کا حال لکھ جائے جو تذکرہ نویس اپنے وقت کے شاعروں کا حال اور اپنی راے لکھ جائے گا وہ مسالہ آیندہ کے لئے بہت کام آئے گا۔ سچا تذکرہ وہی سمجھا جائے گا جو ہمعصر لکھے؛ اپنے زمانہ سے پہلے کا ذکر تبرکاً و تیمناً برا نہیں مگر بہت بکار آمد نہیں کہ پچھلا حال سب ایک دوسرے سے نقل کرتے ہیں اور تذکرہ طوالت میں شبِ ہجراں کا جواب ہو جاتا ہے؛ اس تذکرہ میں جو زیرِ بحث ہے حالات تو اس قدر مفصّل نہیں ہیں جس قدر کہ چاہیئے۔ مگر انتخابِ کلام کا میں قایل ہوں؛

جناب فصاحت لکھنوی کے ان اشعار کا کیا کہنا:-

؎ اک نامہ گم کیا ہے ترے نامہ بر نے آج ؛ کہتا ہے مجھ سے آپ کے خط کا جواب تھا

(اس سے بہتر کیا اس قدر پاکیزہ زبان کی خوبی پیدا کرنی مشکل ہے)

؎ ثبوتِ ذبح محشر میں سزا پر بحث اتنی ہے ؛ وہ کہتے ہیں چُھری پھیری تھی میں کہتا ہوں خنجر تھا

(کیا زبان و مضمون ہے!)

ع نہیں معلوم کہاں دونوں ہیں دُنیا کے سوا ؛ دہنِ یار بھی معدوم ہے عُنقا کے سوا

ع کم سنی ہے تو نزاکی ہیں ضدیں بھی اُن کی ؛ مجھُسے فرماتے ہیں ہم درد جگر دیکھیں گے

جناب آرزو ع

اک یادگار چھوڑ گئے بعدِ مرگ ہم ؛ تھوڑا سا درد بازوے قاتل میں رہ گیا

یہہ مضمون نازک خیالی میں جناب غالب کے مشہور شعر کے مضمون سے بازی لے گیا ع

نظر لگے نہ کہیں اُن کے دست و بازو کو ؛ یہہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں ؛

مضمون تو یہہ بھی لاجواب ہے مگر زیادہ پہلوانی کی تعریف ہے۔ جناب آرزو کے مضمون نے نزاکت کی تصویر کھینچ دی۔ یار کے لئے پہلوانی سے نزاکت کی زیادہ ضرورت ہے ؛ جناب آرزو کی اسی غزل کا۔ ایک شعر اور بھی مجھے پسند آیا ع

ہم جب سے اُٹھ کے آئے ہیں بیدل ہیں آرزو ؛ ایک یار ساتھ کا اُسی محفل میں رہ گیا ؛

(بیدلی کا ثبوت بہت معقول ہے ؛)

۳۔ اخبار شطرنج لکھنؤ

اس اخبار کا ایک خاص نمبر نہایت تکلّف کا ذرا عرصہ ہوا صلائے عام کے دفتر میں آیا تھا۔ وہ نمبر نہایت دھوم کا تھا کہ اِس اہتمام کا اور کوئی رسالہ یا اخبار میری نظر سے نہیں گزرا۔ مضامین اُردو ہندی وانگریزی کے بہت اچھے اچھے تھے جن کا موضوعؔ حکومت اور ہندوستان بہت مناسب تھا اس کے ساتھ تصویریں

کی اس قدر افراط کسی اور پرچہ میں دیکھنے میں نہیں آئی ۃ شطرنج کا وہ نمبر ہمیشہ کے لئے رکھنے کے لایق ہے ۃ میں نے رکھ چھوڑا ہے ۃ

اہل کاران دفتر و مطبع صلائے عام اخبار شطرنج کے ایڈیٹر صاحب کے بہت ممنون ہیں ۃ

۴۔ رسالۂ جادو | اتفاق سے یہہ رسالہ میری نظر سے اب گزرا۔ اس کی پیشانی پر لکھا تھا کہ "صوبۂ بنگال کا واحد اُردو ماہوار رسالہ" : بڑی خوشی ہوئی کہ بنگال میں بھی اُردو کا شوق ہے : مضامین سے ثابت ہوا کہ نہ صرف معمولی اُردو بلکہ بہت اچھی پاکیزہ اُردو ۃ اگست سنہ رواں کے پرچہ میں پہلا مضمون جناب نواب صدر یار جنگ بہادر کا حضرت خیال کے جواب میں لکھا گیا لاجواب ہے ۃ قاموس المشاہیر کا تبصرہ (از جناب احسن) تنقید کی جان ہے ۃ ایسے دو مضمون ہزار دو ہزار معمولی مضمونوں پر بھاری ہیں ۃ

۵۔ انتخاب نامی ایک رسالہ لاہور سے ابھی نکلا ہے۔ اس کا اہتمام بہت عمدہ ہے : پورے ایک صفحہ میں اس کے اسٹاف کے نام آئے ہیں اور مضامین کے لئے دس روپیہ سے تیس روپیہ تک انعام کا اشتہار ہے ۃ دو چار پرچے نکل لیں تو رسالہ کا ریویو مفصّل لکھا جائے۔ پہلا ایک پرچہ دیکھکر زیادہ لکھنے میں مجھے اندیشہ ہے کہ میری نظر نہ لگ جائے۔ ریویو کا ترجمہ اخباری زبان میں تبصرہ ہے تبصرہ کے ساتھ نظر کا کھٹکا واجبی ہے۔ اکثر رسالے زیادہ عمر کو نہیں پہنچتے : انتخاب میں تصویروں کا انتظام بہت اچھا ہے۔ اس کی تعریف نہ کرنا بعید از انصاف ہے کہ ہندوستانی رسالوں میں ایسی تصویریں بہت کم دیکھنے میں آئیں ۃ

صلائے عام ۲۱ نومبر

صلائے عام (بطرز ریویو)

مجھ سے میرے دوست آشنا اس بات کے شاکی ہیں کہ میں صلائے عام کے مضمون نگاروں کے مضامین کی اور تصانیف کی جو بغرض ریویو آتی ہیں پوری داد نہیں دیتا۔ یہہ شکایت کچھ درست ہے کچھ ناواجب ہے۔ مضامین کی بڑی داد یہی ہے کہ صلائے عام میں شایع ہو جاتے ہیں اور پڑھنے والے پڑھ کر خوش ہوتے ہیں۔ رہے رسالے اور مختلف تصانیف جو بغرض ریویو آتی رہتی ہیں اُن کی نسبت عرض ہے کہ انگریزی میں ریویو سے غرض عیب و ہنر دونوں کا ذکر کرنا ضرور ہے۔ اور محبت میں دوست کے عیب نظر نہیں آتے۔ رہے ہنر "مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار گوید"۔ مرغانِ خوش الحان کی نغمہ سرائی کا مدار اس بات پر نہیں کہ سننے والے واہ واہ کریں۔ آپ اگر سنیں بھی نہیں تو بھی خوش الحانی سے باز نہیں آئیں گے۔ کوئی داد دے یا نہ دے اپنا کام کئے جائیں۔ پھر بھی چونکہ اخبار نویسی میں ریویو کا طرز رائج ہو گیا ہے۔ مجھے بھی اس رسم کی تقلید میں کچھ نہ کچھ لکھنا چاہیئے۔

پہلے میں خان بہادر پیرزادہ محمد حسین خاں صاحب ایم اے سابق سیشن جج رئیس دہلی کا شکریہ عرض کرتا ہوں کہ آپ نے قصیدہ بُردہ شریف کے تمام اشعار عربی بحر و قافیہ و وزن اور لفظی رعایۃ۔ و انداز بیان کے ساتھ فارسی و اُردو میں نظم کر دئے گویا صاحب قصیدہ خود اگر فارسی یا اُردو میں لکھتے تو اتنا ہی کمال دکھاتے۔ از روئے تبحر علمی یہہ کمال مشکل ہے۔

عربی قصیدہ میں ۱۶۱ شعر ہیں۔ اُردو میں ایک شعر زیادہ ہے وہ یہہ ہے

ہم مصنف ہم مترجم عارف ِ بہجور را ۔ شد پوشش ، از عدل زیرِ دامنِ عفو کرم

شروع میں قصیدہ بُردہ شریف کی مختصر تاریخ ہے اور آخر میں عرض مترجم۔ یہہ عرض عقیدتمندانہ ہے جس میں شاعری سے زیادہ اظہار عقیدت ہے ؛ لیکن اظہار عقیدت کے ساتھ قصیدہ کی قیمت آٹھ آنا کر دیا ہوتا بھی تو خوب

لُغاتِ اُردو | عرصہ سے مجھے اُردو کے لغات کی تلاش تھی۔ تلاش کیا شکایت تھی کہ اور معتبر زبانوں کی طرح زبانِ اُردو کی فرہنگ ابتک نہیں لکھی گئی ؛ ارادہ تو کئی دفعہ ہوا مگر پورا نہ ہوا ؛ جناب امیر اللغات ۔ فرہنگِ آصفیہ اور چند ایسی ہی اُردو کی فرہنگ کی تصانیف شروع ہوئیں مگر ناتمام رہ گئیں ؛ بلکہ ڈاکٹر فالن صاحب کی ہندوستانی ڈکشنری جس غرض سے لکھی گئی تھی رائج ہو گئی۔ غرض سے میری مُراد معمولی عوام کی زبان کی تحقیق و تشریح کہ اکثر الفاظ کی سند عوام کی امثال سے لی گئی۔ مگر پھر بھی غنیمت ہے ؛

اندنوں مولانا خواجہ محمد عبدالروف صاحب عشرت لکھنوی کی عنایت سے میں نے اُن کی لُغت اُردو دیکھی جو چار جلدوں میں ہے۔ یہہ محض فرہنگ نہیں ہے بلکہ صرف و نحو کی بھی اچھی خاصی تعلیم ہے کہ مصادر مفردہ اور مصادر مرکبہ معاون افعال و حروف و روابط کا مفصّل بیان ہے ؛ میں ابھی چاروں جلدیں اچھی طرح نہیں دیکھ سکا مگر تیسری جلد واقعی "زبان اُردو کی نئی ٹکسالی" لُغت ہے۔ اس میں مُصنّف نے معلومات کا بڑا ذخیرہ بھر دیا ہے ؛ الفاظ کے لغوی و اصطلاحی معانی و محاورہ اور صرفِ با محل کی مثالوں میں لغت اُردو بہت کارآمد ہے ؛

رسالہ شمع | اس رسالہ میں بہت اچھے اچھے مضمون نکل رہے ہیں۔ خاص کر شاہان مالوہ والا مضمون

والا مضمون مصحفی کی مثنوی بحر المحبت کا موازنہ میر کی مثنوی دریائے عشق نامی سے ۔ اکبر کی عیسائی بی بی ۔ ایسے مضمون لٹریچر کی جان ہیں : نہ صرف لٹریچر بلکہ حاصلِ تحقیق و تاریخ ہیں۔ اکبر کی عیسائی بی بی کی نسبت یورپ کے مورخوں کو دھوکا ہے کہ محض (حضرت) مریم کے نام کے نام والی کو عیسائی سمجھ لیا ۔ اکبر کے مذہبی عقائد میں اس زمانہ کے پادریوں نے غلطی کی کہ محض اس خیال سے کہ بادشاہ نے اُن کی خاطر مدارات کی اکبر کو آدھا تہائی عیسائی مشہور کر دیا۔ حالاں کہ اکبر پہلے تو صوفیا رکرام کا اسقدر معتقد ہوا کہ جہانگیر کی پیدایش حضرت شاہ سلیم چشتیؒ کی دعا کا نتیجہ سمجھا۔ اجمیر شریف پیادہ پا زیارت کو حاضر ہوا۔ پھر غیر مذاہب کی طرف متوجہ ہوگیا کہ اسلام کے رسوم واحکام بالائے طاق رکھ دے۔ ڈاڑھی کا رکھنا عیب میں داخل ہوا۔ آفتاب کی پرستش ہونے لگی۔ یہاں تک کہ آخر خود اپنے تئیں پرستش کا مستحق قرار دیا ۔ جہاں ابو الفضل و فیضی سے آزاد خیال والوں کا اثر ہو وہاں عقائد کی پابندی خیریت ہے ۔

اچھے رسالوں میں جو آج کل میری نظر سے گزرتے ہیں رسالہ شمع۔ رسالہ نگار۔ رسالہ پیمانہ از روے اہتمام و مضامین دونوں طرح بہت اچھے ہیں۔ رسالہ شمع کا ابھی ذکر کر چکا ہوں رسالہ نگار میں "استفسارات" کی مد ہر طرح کی معلومات کے لئے عمر عیار کی زنبیل کا جواب ہے ۔

اُردو زبان کے متروکات اور مشمولات پر ایک نظر

وہ زبان ہی رہی نہ وہ اُردو ؛ دل میں باقی گمان ہے گویا
جو زبان ہے بچی کچھی باقی ؛ کوئی دن میہمان ہے گویا (ظہیر)

اُردو زبان کی سوانح عمری اُس کا اُتار چڑھاؤ جسے دیکھنے کا شوق ہو وہ مولانا آزاد کی تصنیف آبِ حیات نامہ دیکھے۔ اس مضمون میں اتنی گنجایش نہیں کہ زبانِ اُردو کے جزر و مد کا نقشہ پیش کیا جائے۔ مختصر یہ کہ اُردو زبان دراصل عربی سنسکرت اور لیٹن کی طرح کوئی مستقل بالذات اور قدیم زبان نہیں بلکہ اس مُلک کی اصلی اور قدیم بولی بھاکا تھی جو کچھ اب بھی بدل بدلا کر نواح متھرا میں بولی جاتی ہے اور جس طرح مسلمانوں میں عربی کی قدر و منزلت ہے۔ اس مُلک کے اصلی باشندے جو ہندو ہیں سنسکرت کی عزت کرتے ہیں۔ غرض اُردو اصلی بولی ہندوستان کی نہیں ہے لیکن ہندوستان ہی میں اس نئی بولی نے جنم لیا ہے اور اپنی ہردلعزیزی اور قابلیت کی بدولت اب سارے ہندوستان کی لنگوا فرینکا (Lingua Franca) عام اور مستند زبان ہے ؎

گر گل کو کہوں گل تو ترے رو کو کیا کہوں ؛ بولوں نگہ کو تیغ تو ابرو کو کیا کہوں

اُردو کے معنی ہیں لشکر۔ درحقیقت یہ بولی لشکر کی بولی ہے۔ اکبر بادشاہ (۱۵۵۶-۱۶۰۵ء) کے عہد میں جو لشکر تھا اُس میں مختلف مُلکوں کے لوگ تھے اور اُن کو رعایا سے ملنے کی ممانعت تھی اس واسطے کہ جب لشکر کے سپاہی رعایا سے گھل مِل جاتے اور اختلاط پیدا کرتے ہیں تو اُن کو خاص شہر سے اُنس ہو جاتا ہے۔ پھر اُن کا دل باہر جانے اور لڑنے مرنے کو نہیں چاہتا۔ اکبر نے اپنے لشکر والوں کو رعیت سے ملنے نہ دیا۔ اُس لشکر میں رفتہ رفتہ یہ اُردو بولی پیدا ہو گئی تھی۔ اس بولی میں ہر مُلک کے لفظ ہیں۔ عربی۔ سنسکرت۔ ترکی۔ کشمیری۔ چینی۔

اِی؟

مرہٹی وغیرہ وغیرہ۔ ہر بولی اس میں پائی جاتی ہے اور سب بولیاں گڈ مڈ ہوکر یہ زبان پیدا ہوگئی۔ غرض چوں کہ بادشاہانِ وقت کی زبان فارسی تھی۔ ہر ایک کو فارسی کا شوق ہوا جیسا کہ ان دنوں انگریزی زبان کا (الا یعرف لیا) ہے۔ اُردو زبان محتاج ہے دوسری زبانوں کی۔ چوں کہ اردو میں زیادہ تر فارسی کے الفاظ ہیں اس لئے اگر ہم فارسی نہ جانیں تو اردو کی تکمیل نہیں ہوسکتی اور عربی نہ جانیں تو فارسی ادھوری رہ جاتی ہے اور درجۂ کمال کو نہیں پہونچ سکتی (کسب کمال کن کہ عزیز جہاں شوی) کیوں کہ فارسی میں بھی کثرت سے عربی کے الفاظ ہیں۔ یہہ ہوا اردو زبان کا مختصر خاکہ۔ ہمارا بحث دو امور پر محتوی ہے۔ ایک متروکات دوسرے مشمولات۔ جیتا دریا وہی ہے جس میں اور چھوٹے موٹے دریا۔ نالے۔ ندیاں۔ کثرت سے ملتی جائیں۔ گنگا کو لیجئے ہردوار جہاں سے وہ نکلی ہے بالکل مختصر ہے۔ جوں جوں بڑھتی گئی دوسرے معاونوں کی وجہہ سے تازہ دم ہوکر اُس کا پاٹ پھیلتا گیا اور سمندر میں پہونچتے پہونچتے تو ایک عظیم الشان دریا ہوگیا۔ بجنسہ یہی حال ہر زبان کا ہے۔ اگر اُسے بیرونی امداد نہ ملے تو وہ ٹھٹھر جائے بلکہ انجام کار کو مُردہ زبان ہوجائے یعنی ترقی کے پایہ سے گر کر فنا ہوجائے۔ دوسری مثال خزانے کی ہے۔ جس خزانے میں آمدنی نہ ہو وہ کب تک کفاف کرے گا۔ پس بقائے حیات کے لئے ضرور ہوا کہ زبان کے سرمایہ میں توفیر ہوتی رہے۔ ہماری زبان ابھی پوری طرح پنپنے بھی نہ پائی تھی کہ اسے دو مُہلک امراض لاحق ہوگئے ایک تو متروکات یعنی ہم پُرانے لفظوں کو بے وجہہ چھوڑتے چلے جاتے ہیں یعنی خزانے کو لگاتار خالی کئے چلے جارہے ہیں ؎

ہم کہیں گے کبھی نہ اُس کو غریب ؛ جس کو ملتی ہو اک حقیر رقم
اصل میں وہ غریب ہے جس کا ؛ خرچ زاید ہو اور آمد کم

دوسرے مشمولات یعنی غیر زبانوں کے الفاظ کے لینے میں بخل کرنا۔ جب دو طرف کی مار ہے تو بتلائے کہ ایسے مریض کے جاں بر ہونے کی کیا توقع ہے۔ متروکات کی نسبت اگست کے صلائے عام میں مرزا محمد بشیر صاحب نے نہایت معقول مضمون لکھا ہے کہ متروکات نے

ہماری اور ریڑھ ماردی۔ ع چلتی گاڑی میں دیا عشق نے روڑا اٹکا۔ سر منڈاتے ہی اولے پڑے۔ آمدنی مسدود خرچ بدستور۔ دوسری زبان کا لفظ لیتے نہیں۔ جو کچھ ہے اُسے بھی اپنی گرہ سے کھو رہے ہیں۔ ع بریں عقل و دانش بباید گریست۔ ؎

ہست برمردم عالی گُہر ٭ بُخل ز اسراف پسندیدہ تر

گرچہ عطا در ہمہ جا دل کش است ٭ ہرچہ بہ ہنجار بود آں خوش است

مرزا صاحب لکھتے ہیں اور بجا لکھتے ہیں کہ ”اب ایسی میٹھی میٹھی باتیں۔ سیدھے سادے الفاظ۔ دلکش انداز اور نرالی بندشوں کے سننے کے لئے کان ترس جاتے ہیں الخ“ میں حسب حال عرض کرتا ہوں ؎

اُٹھ گئی ہیں سامنے سے کیسی کیسی صورتیں ٭ روئیے کس کے لئے کس کس کا ماتم کیجئے

اس پر ہمارے حامی و ناصر حویلی کے نبّاض سخن دانی منشیٔ بے بدل ولاثانی۔ نظم کے گرویدہ و شیفتہ اُردو کے قالبِ مُردہ کی روح و رواں میر ناصر علی خاں فرماتے ہیں اور کیا خوب طلاقتِ لسانی کی گوہر افشانی کرتے ہیں کہ ”رہا یہ مسئلہ کہ ان کے ترک کرنے سے زبان کو فائدہ ہوا یا نہیں ہوا یہ دوسری بات ہے (بس یہی تو بات ہے اور یہیں تو پانی مرتا ہے) جب یہ مسلّم ہے کہ اُردو میں الفاظ کی کمی ہے یہاں تک کہ اکثر الفاظ غیر زبانوں کے بہ لاچاری اس میں لانے پڑتے ہیں۔ تو خود اُس کے الفاظ کیوں ترک کئے جائیں؟ دوسرے جس لفظ سے کثرتِ استعمال کی وجہ سے جو اثر ہوتا ہے وہ نئے لفظ میں پیدا نہیں ہوتا (نیا نیا ہی ہے پُرانا پُرانا ہی ہے۔ ہر کہ شک آرد کافر گردد) متاخرین نے جن الفاظ کو ترک کیا۔ کوئی معقول دلیل ترک کرنے کی نہیں لکھی (ع ہمارا کیا اجارہ تھا نکالا تم نے ہم نکلے) محض عند یا ”ایجادِ بندہ“ کوئی دلیل نہیں ٭ ناسخ نے متروکات کی طرف زیادہ توجہ کی مگر ترک کرنے کی دلیلیں نہیں لکھیں (سب سے بڑی دلیل تو یہ ہے کہ وہ اسم با مسمیٰ تھے) اپنے شاگردوں کو حکم دیدیا کہ فلاں لفظ ترک کردو وہ متروک ہوگیا۔ شعراء قدیم کے شعروں میں زیادہ زور اس وجہ سے پیدا ہوجاتا ہے کہ جو لفظ اُس زمانہ میں زیادہ اثر رکھتا تھا وہی کام میں لائے۔ ترک کرنے سے وہ

اثر نہ رہا۔ اس لئے متاخرین کے کلام میں مضمون کی خوبی کے عوض صرف زبان کی خوبی کی تعریف رہ گئی۔ میر کہا رہے ناقص (کامل) میں متروکات سے زبان کو بہت فائدہ نہیں ہوا (صاف کہئے کہ نقصان ہوا) مانگے تانگے کے سامان سے گھر کا اپنا پُرانا سامان کام میں لینا بہتر ہے الخ"

اکتوبر کے صلائے عام میں جناب نواب جعفر علی خاں صاحب اثرؔ نے ایک بااثر مشرح اور مدلل مضمون اسی عنوان پر لکھا ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ "متروکات الفاظ کو اُن کے حال پر چھوڑ دینا چاہئے"۔ آپ بھی اُردو کو ایک ستنجی زبان بتلاتے ہیں "جو سنسکرت - ہندی - فارسی - عربی - ترکی - انگریزی (توبہ توبہ) پُرتگالی - اور نہ معلوم کتنی زبانوں کے الفاظ اس میں داخل ہیں اور اُن کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا جاتا ہے (اور ہونا چاہئے) مگر افسوس کہ ہم میں تحقیق کا مادہ نہیں (جو پُرانی لکیر کے فقیر ہیں اُن کے ڈر کے مارے تحقیق اور تدقیق کا نام لینا بھی مشکل۔ ع عقل چہ گتیت کہ پیش مرداں آید) میں کہتا ہوں کہ زبان کی قلمرو سے کوئی خارج البلد نہ کیا جائے - جس طرح اور جس موقع پر جو لفظ استعمال ہوتا ہے ہونے دیجئے خواہ وہ پرانے فیشن کے لباس میں ہو یا یہ کہ کچھ کاٹ چھانٹ کے بعد نکھر گیا ہو۔ مثلاً تلک کی جگہ تک وغیرہ وغیرہ - جن الفاظ کا نعم البدل اُن کا وجود مغتنم ہے اور جو الفاظ دودھ کی مکھی کی طرح نکال کر پھینک دیئے گئے اور اُن کا بدل بھی نہیں جیسے ٹک اُن کو اپنی ذات میں ملا لینے سے کچھ قباحت نہیں ؎

اندازِ دل نشین ہے بصد شکوہ و ادا ٭ لیلےٰ کی طرح پردۂ محمل میں بیٹھ جائے

بہتر نشانہ بازو ہی ہے جو سوچ کر ٭ ایسی درست بات کہے دل میں بیٹھ جائے

ایک زمانہ وہ تھا کہ لوگ انگریزی پڑھنے ہی کو سرے سے حرام سمجھتے تھے - یہ سر سید علیہ الرحمۃ ہی کی جوتیوں کا صدقہ ہے کہ مسلمان اپنی غلطی پر متنبہ ہوئے اُن کی وہ جھجک جاتی رہی - جس زمانے میں ترکِ موالات کا بڑا زور شور تھا اور ایڑی چوٹی کا زور لگایا جا رہا تھا اور انگریزوں کی کوئی ادا پسند نہ آتی تھی۔ ع (رہیں دریا میں اور مگر سے بیر) اُس زمانے میں انگریزی کپڑا تک پہننا حرام تھا اور اسی طرح انگریزی کے الفاظ اُردو کے پہلو بہ پہلو نکالنا اس قابل تھا کہ اُس شخص کی زبان کاٹ ڈالی

جائے۔ اب وہ ترکِ موالات تو الیسی گئی جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ مگر اب بھی بعض بعض بزرگ اُردو زبان میں انگریزی الفاظ کو "مخفی مداخلت بے جا یا نقب بوقتِ شب" فوجداری کا سنگین جرم سمجھتے ہیں۔ میں مانتا ہوں کہ بے ضرورت انگریزی کے الفاظ اردو میں بولنا پسندیدہ نہیں۔ خصوصاً جب کہ ٹھیٹ اردو میں بھی ہم معنی اور مترادف لفظ موجود ہو۔ مگر یہ کہ جو الفاظ اُردو کا جزوِ لاینفک ہو گئے اور ہمارے خوان میں مل گئے ہیں اور زبان پر چڑھے ہوئے ہیں اور بوجہ کثرتِ استعمال کے عام فہم ہیں اُن کا بولنا گناہ نہیں کفر نہیں۔ کیوں آپ ہمارا گلا گھونٹتے اور زبان کے دائرہ کو تنگ کرتے ہیں۔ اُردو میں دوسری زبانوں کے استعمال کی نسبت مولینا آزاد فرماتے ہیں کہ "جو کچھ اس میں (یعنی اُردو میں غیر زبانوں کے الفاظ کا شامل ہونا) ہوا کسی کی تحریک یا ارادے سے نہیں ہوا بلکہ زبانِ مذکور کی طبیعت ایسی ملنسار واقع ہوئی ہے کہ ہر زبان سے مل جل جاتی ہے (اور اب ہم مغائرت کرنے لگے) سنسکرت آئی اُس سے مل گئی۔ عربی فارسی آئی اُسے بسم اللہ خیر مقدم کہا۔ اب انگریزی الفاظ کو اس طرح جگہہ دے رہی ہے گویا اس کے انتظار میں بیٹھی تھی۔ اس زبان کو ریختہ بھی کہتے ہیں کیوں کہ مختلف زبانوں نے آ سے پختہ کیا ہے۔ جیسے دیوار کو اینٹ۔ مٹی۔ چونا۔ سفیدی وغیرہ سے پختہ کرتے ہیں یا یہ کہ ریختہ کے معنی گری پڑی پریشان چیز۔ چوں کہ الفاظ پریشان جمع ہیں اس لیئے اسے ریختہ کہتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ اس میں عربی۔ فارسی۔ ترکی وغیرہ کئی زبانوں کے الفاظ شامل ہیں اور اب انگریزی داخل ہوتی جاتی ہے۔ ایک وقت ہوگا کہ عربی فارسی کی طرح انگریزی زبان ہو جائے گی (بشرطیکہ سوراج نہ ملے)

غرض انگریزی کی رَو کسی کے روکے رُکنے والی نہیں۔ ایسی حالت میں انگریزی کے الفاظ کے شمول کو مہمانِ ناخواندہ یا دخل درمعقولات سمجھنا زمانے اور لیل و نہار کی رفتار کے صریح خلاف ہے اور اس پر معترض ہونا مُنہ کی کھانا ہے۔ یہ حال کچھ غریب اُردو ہی کا نہیں ہے۔ ہر زبان میں اس قسم کی فطرتی کشش اور قوتِ جاذبہ ہے۔ انگریزی کو لیجیئے۔ بیس پچیس برس پہلے کی ڈکشنری کو آج کے تازہ دم لغت سے ملایئے۔ آسمان و زمین کا فرق پایئے گا۔ سدہا بلکہ ہزارہا نو وارد الفاظ نظر آئیں گے جن کو انگریزی نے بے تکلف آغوشِ محبت میں دو قدم آگے بڑھ کے لیا ہے۔ خدا معلوم

اردو ادبی

اُردو اب ایسی بیگانہ وار اور الگ تھلگ کھڑی کیوں ہوتی جاتی ہے۔ یہ بیگانگی زبان کی ترقی کے لئے سمِ قاتل ہے۔ باوجود اس روک تھام اور تخل کے بھی ہم دیکھتے ہیں کہ انگریزی الفاظ گھُسے چلے آتے ہیں۔ زبان پر چڑھے جاتے ہیں اور بے اختیار نوکِ زبان ہوتے چلے جاتے ہیں۔ میں چند الفاظ انگریزی کے لکھتا ہوں جو اردو میں ایسے داخل ہوگئے ہیں کہ اب اجنبی بھی معلوم نہیں دیتے اور شیر و شکر ہوگئے ہیں۔ ان کا نکالنا ناخن سے گوشت کا جُدا کرنا یا تن سے روح کا بے تعلق کرنا ہے اور میری رائے میں اس قدرتی یورش کا اندفاع یا کم سے کم اس کی روک تھام بھی قریب قریب ناممکن کے ہے۔

انگریزی کے چند الفاظ جو روزمرّہ اُردو میں شامل ہوکر زبان پر چڑھے ہوئے ہیں۔

ڈپٹی کمشنر۔ کلکٹر۔ ریل۔ سٹیشن ماسٹر۔ گارڈ۔ بریک۔ ٹکٹ کلکٹر۔ انجن۔ پلیٹ فارم۔ لگیج (سامان) پیسنجر (مسافر) بنک۔ ایجنٹ۔ ڈرافٹ۔ ایکسچینج۔ کمیشن۔ منی آرڈر۔ کوپن۔ پارسل۔ وی۔ پی۔ سیونگ بنک۔ نوٹ۔ ساورن۔ ٹکٹ۔ کارڈ۔ فارم۔ رجسٹری۔ پیڈ۔ بیرنگ۔ نوٹس۔ وارنٹ۔ سمن۔ ڈگری۔ ڈکری۔ لفٹنٹ۔ سٹامپ۔ کورٹ فی۔ رسیور۔ انکم ٹیکس۔ موٹر۔ ٹیلیفون۔ کپتان۔ جرنیل۔ کرنیل۔ پلٹن۔ فیر (بندوق چھوڑنا) کارتوس (کارٹرج) پستول (پسٹل) روالور (طمنچہ) لیسن۔ (لیسنس) گلاس۔ کنٹر۔ ٹریم۔ کرکٹ۔ ٹینس۔ بیٹ۔ بال۔ وکٹ۔ پولو۔ ہاکی۔ بٹن۔ بک۔ سیفٹی پن۔ کوٹ۔ واسکٹ۔ بنیان۔ جاکٹ۔ سویٹر۔ اوورکوٹ۔ بلینکٹ۔ کالر۔ نکٹائی۔ مفلر۔ پتلون۔ بوٹ پمپ شو۔ سلیپر۔ سکول۔ کالج۔ پرنسپل۔ پروفیسر۔ ہیڈ ماسٹر۔ ڈائرکٹر۔ انسپکٹر۔ بورڈ۔ (تختہ) بورڈنگ (دارالاقامہ) کلاس (جماعت) فیس۔ رجسٹر۔ بلاٹنگ۔ کاپی۔ پنسل۔ فونٹین پن۔ آلپین۔ ربر۔ نوٹ پیپر۔ پاکٹ بک۔ اٹلس۔ گورنمنٹ۔ گورنر۔ پنشن۔ گزٹ۔ رپورٹ۔ بجٹ۔ کونین۔ لمپ۔ لالٹین۔ چمنی۔ فلالین۔ سرج۔ ٹوئیڈ۔ لانگ کلاتھ۔ ساٹن۔ بل۔ پبلک۔ یونیورسٹی۔ ڈگری۔ ڈپلوما۔ پاس (کامیاب) فیل (ناکامیاب) ٹیپ۔ ٹیپ رائٹر۔ لیتھو۔ ہوٹل۔ بسکٹ۔ ڈبل روٹی۔ کیک۔ آئس کریم۔ سوڈا۔ لمنیڈ۔ لیم جوس۔ کلب۔ سوسائٹی۔ لکچر۔ سپیچ۔ سٹیج۔ ووٹ۔ چیرز۔ کانفرنس۔ کانگریس۔ ممبر۔ پارلمنٹ۔ پارٹی۔ ایٹ ہوم۔ ڈنر۔ سگرٹ۔ میونسپلٹی۔

کونسل - بیرسٹر - مجسٹریٹ - پولیس - ہیڈ محرر - رپٹ - چالان - سوپرنٹنڈنٹ - پروگرام - ڈاکٹر - ہسپتال کمپونڈر - ڈیسر - لکچر - اپریشن - (عمل جراحی) پلیگ - انفلوانزا - تھرمامیٹر (مقیاس الحرارت) - بوتل (بائل) کونین (دوا دافع بخار) کلوروفارم (دوائے بے ہوشی) لاٹ (لارڈ) لیڈی - ایڈیٹر - مینجر - نمبر (تعداد) فیشن - پریڈ (قواعد پریڈ) پلول (پیٹرل) چین - (گھڑی کی زنجیر) لاکٹ - پمپ بکس - تھیٹر - وقس علی ہذا - ایسے اور بہت سے الفاظ پیش کئے جاسکتے ہیں - یہ خصوصیت کچھ اردو ہی زبان کی نہیں ہے بلکہ انسانی فطرت کا اقتضا اور سوشل لیف (تمدن) کا اسلوب ہے کہ ایک زبان دوسری زبان کے الفاظ کو کھینچتی ہے - انگریزی کو لیجئے کہ اُس میں خود مختلف زبانوں - لیٹن - گریک - ہیبرو - اسپینش وغیرہ وغیرہ کے الفاظ بکثرت شامل ہیں - اسی طرح اردو زبان کے بعض الفاظ بھی انگریزوں نے لے لئے ہیں - اور اسی وجہ سے اُن کی زبان برسر ترقی ہے - چنانچہ اس عظیم الشان یورپ کی جنگ میں بہت سے الفاظ بہ ضرورت گھڑ لئے گئے ہیں - وہ دوسری زبانوں کے الفاظ کو اپنی زبان میں اس طرح بخوشی ملالیتے ہیں جیسے کوئی مہمان کو خاطر مدارات کے ساتھ اپنے گھر میں اُتار لیتا ہے -

اُردو کے وہ چند الفاظ جو انگریزی میں کثرت سے مستعمل ہیں

(کچا) *Kutcha* (پنکھا) *Punkah* (نالا) *Nallah* (میدان) *Maidan*
(ڈولی) *Doolie* (پردہ) *Purdah* (قلی) *Coolie* (پکا) *Pucca* (بازار) *Bazaar*
(جنگل) *Jungle* (کافی - قہوہ) *Coffee* (گاڑی) *Gharry* (ایکدم) *Ekdum*
(دربار) *Durbar* (کھاٹ - چارپائی) *Cot* (پیسہ) *Pice* (پائی) *Pie* آنا *Anna*
(روپیہ) *Rupee* (رعیت) *Ryot* (مخزن) *Magazine* (الجبرا) *Algebra*
(اقلیدس) *Euclid* -

یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ ہم اپنے سرمایہ کو متروکات سے کیوں گھٹا رہے ہیں ایک طرف تو ہم اپنا یہ صریح نقصان کر رہے ہیں اور دوسری طرف دوسری زبانوں

ئے الفاظ سے کراہت کرتے اور مغایرت برتتے ہیں۔ میری رائے میں زبان کے ذرایع کو ہر طریقے سے وسعت دینا لازم ہے اور حتی المقدور متروکات کی تعداد کو بڑھانا اپنے پاؤں میں آپ کلہاڑی مارنا ہے سہ

انچہ ما کردیم بر خود ہیچ نابینا نہ کرد ٭ در میانِ خانہ گم کردیم صاحب خانہ را ٭

یہ کوئی بات نہیں کہ ہم موجودہ الفاظ کو بلاوجہ خارج کر دیں حسنو صاحب کہ اُن کا نعم البدل بھی ہمارے ہاتھ نہ ہو سہ

سوختم خود را و طرز سوختن ٭ شمع را پروانہ را آموختم ٭

ہم کو اس قسم کی بے باکانہ جرأت سے بالکل احتراز کرنا لازم ہے سہ

شدیم خاک ولیکن ز بوئے تربت ما ٭ تواں شناخت کزیں خاک مردے خیزد

یہ تو آج کل کے مولویوں کے فتوے ہوئے کہ جس کو چاہا کافر بنا کے دائرۂ اسلام سے خارج کر دیا۔ اسی طرح غیر زبانوں کے الفاظ کو فراخ دلی اور کشادہ پیشانی سے لینا چاہئے یہ سمجھ کر کہ یہ ہمارے خزانے کی توفیر اور ہماری زبان کی توقیر بڑھاتے ہیں۔

برسوں کے بعد ہوگی مری داستاں تمام
یا سب کو سنئے غور سے یا کچھ نہ پوچھئے

خاکسار بشیر

(مولوی بشیر الدین احمد صاحب رئیس دہلی)

غزل۔ جناب شاد عظیم آبادی

ہزار مجمعِ خوباں ما سرد ہو گا ٭ نگاہ جس پہ ٹھہر جائے گی وہ تو ہو گا ٭ لہو شہیدوں کا ہو رائیگاں معاذ اللہ
چمن میں پھول۔ تو پھولوں میں رنگ تو بو ہو گا ٭ محیطِ عشق کو ہم دیکھکر یہ سمجھے تھے ٭ بہت بہت ہوا گہرا تو تا گلو ہو گا
جو ہمیں تلاش میں تیری نہیں یہ سمجھاوے ٭ جہاں یہ بند ہو رستہ وہیں پہ تو ہو گا ٭ محبت مے و میخانہ حد سے جب بڑھ جائے
تو نام اس کا تعصب نہیں۔ غلو ہو گا ٭ پکارتا ہے یہ پیری میں اپنا جامہ تن ٭ ہزار ٹکڑے ہوں جس کے وہ کیا رفو ہو گا

از رسالہ نگار (بھوپال)

شوخیٔ گفتار

میں آپ سے پہلے اپنی شوخیٔ گفتار کی معافی مانگتا ہوں۔ بات صرف اتنی ہے کہ سچی بات ہمیشہ کڑوی معلوم ہوتی ہے اس سبب سے کہ مختلف امزجہ کے موافق نہیں ہوتی۔

کہنے والا اس خوف سے سچی بات نہ کہے تو نقصان ہوتا ہے اور نقصان کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک یہ کہ صرف آپکا نقصان ہو تو ایسے نقصان پر خاموشی بہتر ہے دوسرے یہ کہ قوم کا نقصان ہو تو ایسے نقصان پر چشم پوشی گناہ ہے۔

آجکل زبان کا معاملہ ایسی پیچیدگی میں پڑا ہوا ہے کہ اگر درگزر کر جائیں تو آیندہ بہت خطرہ نظر آتا ہے۔

غریب اُردو جس کا کوئی والی وارث نہیں ہے۔ جن بادشاہوں کی گودیوں میں اسنے پرورش پائی ہے وہ تو قبرستان میں آرام فرما رہے ہیں۔ جن ریاستوں نے اسکی خدمت کو اپنا فرض سمجھا تھا وہ عرش آشیاں خلد مکان بنے ہوے ہیں۔

موجودہ دور میں اسکا مقابلہ انگریزی سے ہے ÷ اس میں شک نہیں کہ ابتدا زمانہ میں انگریزوں نے اسکی بہت خدمت کی اسکے لئے محکمے تیار کئے۔ اچھے اچھے زباندان جمع ہوئے۔ جدید کتابوں کی تصنیف کا سلسلہ شروع کیا۔ حاکموں کے لئے اسکا سیکھنا فرض قرار دیا گیا۔ یہ سب اسلئے کہ ہندوستان میں انگریزی سمجھنے والے نہ تھے اسکا شکریہ جہاں تک ہم کریں کم ہے۔

کچہریوں میں اُردو نے جگہ پائی۔ ضرورت تو آدمی کو مجبور کرتی ہے اُسوقت انگریزی جاننے والے اسقدر نہ تھے لہذا اُردو کے بغیر ملک کا کام نہ چلتا تھا۔

اسکے بعد ایک زمانہ آیا کہ کالجوں، سکولوں کی بدولت ملک میں خاطر خواہ انگریزی سمجھنے والے انگریزی بولنے والے تیار ہو گئے رفتہ رفتہ اسکا قدم اُکھڑنے لگا۔

کچہری کے بہت سے دفتر جو سابق میں اُردو تھے انگریزی میں قائم ہو گئے۔ حکّام کو انگریزی بات چیت کرنے والے ہندوستانی ملگئے۔ کچہریوں میں انگریزی داں وکلا کی کثرت ہو گئی اور سچ تو یہ ہے کہ سوراج کی بھی بانی کار تعلیم انگریزی ہی تھا ہے۔ اب غریب اُردو عضو معطل سمجھے جانے لگے۔ اور انگریزی تعلیم نے اپنا اثر اتنا پھیلا دیا کہ لوگ اپنی زبان کو بھی بھول گئے۔

موجودہ حالت میں اُردو جو کچھ ترقی کر رہی ہے وہ اپنی قوت اپنی طاقت سے۔ آسان اسقدر ہے کہ لوگ سال بھر میں بات چیت کرنا سیکھ لیتے ہیں۔

اسکا عنوان بتا رہا ہے کہ کسی وقت میں یہ زبان دُنیا کی متحدہ زبان بن جائیگی۔ اس میں ہر ملک کے الفاظ کو اپنی ذات میں ملا لینے کا مادّہ موجود ہے۔ ہندوستان کی بیسوں مختلف زبانوں کے الفاظ اس میں پائے جاتے ہیں جنکی تفصیل کی اس مختصر مضمون میں گنجایش نہیں ہے لیکن ایک تشویش ہے جو اُردو کی آیندہ خراب ہونے کی

خبر دیتی ہے۔ اسکا علاج تمام ملک کے ہاتھ میں ہے ایک آدمی کچھ نہیں کرسکتا۔

اس میں شک نہیں کہ اسوقت تمام ہندوستان کے لوگ یہی چاہتے ہیں کہ اُردو ترقی کرے عثمانیہ یونیورسٹی کی بنیاد اسی خیال پر قائم ہے۔ کہ زندہ دلان پنجاب اسی کوشش میں ہیں کہ مشرق مغرب شمال جنوب سے یہی آواز چلی آتی ہے۔ امریکہ۔ جرمن۔ انگلستان میں اسکی تعلیم شروع ہوئی ہے ہم ان سب کے شکرگذار ان سب کے احسان مند ہیں مگر ایک خیال آجکل لوگوں کو ایسا پیدا ہوگیا ہے جو آئندہ سخت مشکلات کی خبر دیتا ہے۔

وہ یہ ہے کہ ہر شخص یہ کہکر کہ اُردو ہماری زبان ہے اس میں خلاف تلفظ اہل زبان اور اصول مفروضہ زبان اُردو ایسے جملے ایسے الفاظ غیر مانوس شامل کرتا جاتا ہے اور ایسی ترکیبیں بناتا جاتا ہے جو اُردو کے لئے غیر مفید اور اسکے بقا کے لئے مضر ہیں اور یہ ہوا سارے ہندوستان میں چل رہی ہے۔

اس سے اُردو کا نقصان یہ ہے کہ اسکے محاورے اسکے قواعد مٹتے جاتے ہیں اور ہر شہر کی ایک دوسری زبان ہوتی جاتی ہے۔

اور جب تک ہم ایک خاص مرکز زبان کا تسلیم نہ کرلیں اُسوقت تک ہم تمام ہندوستان کی ایک زبان نہیں بنا سکتے۔

غلط فہمی اسطرح پیدا ہوگئی ہے کہ جب لوگ کہتے ہیں کہ دہلی اور لکھنؤ والے اہل زبان ہیں اور باقی سب زبان داں ہیں تو عام لوگ جو دوسرے شہروں میں بستے ہیں وہ بُرا مانتے ہیں اور کہدیتے ہیں کہ ہم لکھنؤ اور دہلی کو نہیں مانتے لکھنؤ اور دہلی کا بائیکاٹ کرنے میں اسکی تقلید ہم پر واجب نہیں یہ ایسی ایک چڑھ کی بات ہے جسکا نام سُنکر لوگوں کو بخار چڑھتا ہے وہ کہتے ہیں کہ ہندوستان کے ہم بھی رہنے والے ہیں اور اُردو ہندوستان کی زبان ہے تو پھر کیا حق ہے کہ ہم دہلی اور لکھنؤ کو اپنی زبان پر فوقیت دیں۔ اس غلط فہمی کے سبب اُردو بیچاری کا خون ہو رہا ہے اور اسکے قواعد و ضوابط مٹ رہے ہیں۔ یہ تو آپ کو معلوم ہے کہ اگر لوگ دہلی یا لکھنؤ کی تقلید زبان کریں گے تو دہلی اور لکھنؤ کو اس سے کچھ فائدہ حاصل نہیں ہوسکتا دہلی اور لکھنؤ کے اور اہل زبان اور زبان داں اسی زبان کے حاصل کرنے میں جس حالت کو پہنچ گئے ہیں وہ بھی لوگوں پر پوشیدہ نہیں ہے۔ اگر وہ اُردو زبان کی تحقیق اور اسکے ضوابط اور قواعد یاد کرنے میں اپنی عمریں صرف نہ کرتے اور کوئی صنعت یا دستکاری حاصل کرتے تو آج عیش سے اُنکی زندگی بسر ہوتی۔ مگر خدا کو ایسے لوگوں سے اُردو کی خدمت لینا منظور تھی جو اُنکو اسی کام کا شوق پیدا ہو تو اس سے اُنکو کسی مالی اغراض کی امید نہ تھی بلکہ غرض یہی تھی کہ اُردو

زبان اپنے مفروضہ قواعد کے ساتھ ترقی کرے اور ایک مرکز پر قائم رہے۔

اب جو لوگ پامال کرکے ان کے اصول کو توڑنا چاہتے ہیں اس سے بھی ان کا کوئی ذاتی نقصان نہیں ہے مگر ہندوستان کا نقصان کثیر ہے۔

کیونکہ ہندوستان ایسا ملک ہے جہاں اب بھی صوبے صوبے کی مادری زبان جداگانہ ہے۔

پنجاب کی مادری زبان پنجابی ہے اور وہ پیدا ہوتے ہی پہلے اپنی ماں کی زبان سیکھتے ہیں اور وہی بولتے ہیں۔ بنگال میں کی مادری زبان بنگالی اور وہ آنکھ کھولتے ہی وہی زبان بولتے ہیں۔ گجرات مدراس کی زبان مرہٹی ہے اور اسی زبان میں بات چیت کرتے ہیں۔

حیدرآباد میں کئی مختلف زبانیں تلنگو وغیرہ ہیں وہ اسی میں بات کرتے ہیں۔

اسیطرح ہر ایک صوبہ کی ایک ایک زبان جداگانہ ہے۔ اگر یہ لوگ اردو زبان سیکھکر اردو کے اہل زبان بنجائیں اور اسکی اصلاح کے مدعی بنیں تو یہ مثال ایسی ہے کہ جیسے ہم بنگالی زبان یا پنجابی زبان سیکھکر اسکے اہل زبان ہونے کا دعوے کریں اور اسکی اصلاح کے مدعی بنیں۔ اسکے محاورات کا فیصلہ اپنی مرضی کے موافق کریں آپنے کبھی پنجابیوں کو اپنے خاندان سے گفتگو کرتے ہوئے سنا ہوگا بھلا کیلئے سچ بتائے کہ کوئی بھی لفظ آپکی سمجھ میں آتا ہے۔

پھر ایسے لوگ برس دو برس کی اردو حاصل کرکے کہیں زبان پر لعنت بھیجو۔ لکھنؤ کو بھاڑ میں جھونکو اردو زبان تو ہماری ہے جیسا جی چاہے گا ہم بولیں گے۔ اور وہی صحیح اردو ہے۔ اور دو چار اردو کتابیں چھاپ کر اور اخبار نکالکر اردو کے صحیح مالک بنجائیں اور اردو کے محاورات قواعد ترکیب زبان کو پس پشت ڈالدیں تو انصاف سے فرمائے کہ جن لوگوں نے اسکے سنوارنے میں اپنی عمریں صرف کیں ہیں اور جو پشتہا پشت سے اسکو استعمال کر رہے ہیں انکو قلق ہوگا یا نہ ہوگا۔

کیونکہ وہ دیکھتے ہیں کہ اس بحث میں اردو کے ہزار ہا ٹکڑے ہوجائیں گے۔

پنجاب کی اردو پنجاب کے لب لہجہ کے موافق ہوگی اور بنگال کی اردو بنگالیوں کی مرتبہ ہوگی۔ مدراس کی اردو مدراس کے اصطلاحات کے موافق ہوگی۔

اور دکن کی اردو دکھنی اردو ہوگی۔ کوئی کلابی اردو ہوگی کوئی پیازی اردو ہوگی۔ کوئی عنابی اردو ہوگی کوئی پیلی اردو ہوگی۔ اور ایک کی بولی ایک سمجھنے سے قاصر رہے گا۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ ہماری اردو زبان جسکی ترقی میں صدہا برس سے اپنا لہو پانی کر رہے ہیں اسطرح برباد ہوکر خاک میں ملجائیگی۔ اور پھر وہی ہندوستان کی تین سو چھتیس زبانیں قائم رہیں گی۔

... وقت یہ بہالت کے دریا میں ڈوب کر مرجائیں گے

اور ہندوستان پر انگریزی زبان قبضہ کرلیگی۔ کیونکہ آجتک تو انگریزی نے بہت زور لگایا کہ ہندوستان کی مادری زبان بنجائے اور دلی کا سہارا بھی اسی میں تھا لیکن اردو سے جیت نہ سکی۔ اس لئے کہ اگلے بزرگان پنجاب اور روشن لان بنگال اور زبرکان مدراس۔ اور خداوندان دکن منصف مزاج تھے اور وہ زبان کی خوبی اور اسکی مرکزی قوت کا اعتراف کرتے تھے جو کچھ کہتے تھے اہل زبان کی سند سے کہتے تھے اور دائرہ سے قدم باہر نہ رکھتے تھے اسلئے اردو ترقی کررہی تھی۔

آج کل کے نوجوان اس تقلید کو باعث حقارت سمجھتے ہیں اور اردو کے مرکز سے سرتابی کرتے ہیں دہلی اور لکھنؤ کا مضحکہ اڑاتے ہیں۔ اور اردو کے بذات واحد مالک بننے کو تیار ہوجاتے ہیں اور انکی سرکشی حد سے سوا بڑھتی جاتی ہے خاموش بیٹھے رہنے کا اب وقت نہیں رہا کیونکہ ہم آپ سب ایک ہی کشتی میں سوار ہیں اگر یہ ڈوبی تو ہم سب ڈوبیں گے۔

میں نے سنا ہے کہ والئ حیدرآباد کو بھی کچھ ایسا دھوکا دیا گیا ہے۔ کہ حیدرآباد کی زبان کے محاورے دہلی و لکھنؤ کی تقلید میں نہوں بلکہ حیدرآباد کے لحاظ سے ہوں اس بدعنوانی نے ایک ایسا کو ہ بد ہمکو دکھایا ہے کہ پٹنہ عظیم آباد جو کبھی دہلی کے شہزادوں کا مسکن رہا ہے وہاں کی زبان اردو ہے اور سب عام و خاص بے تکلف اردو بولتے ہیں اور لکھنؤ کی تقلید کے موافق محاورات و زبان کا استعمال کرتے ہیں گورمنٹ نے وہاں کی مادری زبان ہندی تسلیم کرلی اور کچہری میں نوشت خواند ہندی میں ہوتی ہے اس سبب سے وہاں کے باشندے ایک مصیبت میں پڑے ہوئے ہیں انکو نوشت و خواند میں سخت دقت ہوتی ہے۔

میں ہندی کا مخالف نہیں ہوں اور میرا خیال ہے کہ ہندی زبان کی ترقی اردو کو کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتی کیونکہ اردو کے عطر کی بنیاد ہندی کے صندل کے مادہ پر ہے جتنی ہندی کی ترقی ہوگی عین اردو کی ترقی ہے کیونکہ اردو میں تمام مصادر ہندی ہیں تمام افعال ہندی ہیں اور الفاظ بھی جہانتک ہندی ملتے ہیں اردو میں صرف کئے جاتے ہیں بہتر اردو وہی ہے جس میں زیادہ الفاظ ہندی کے ہوں لیکن ہندی تحریر اور ہندی حروف کے مخالف ہوں اور اسلئے مخالف ہوں کہ ہندوستان کا نقصان ہے۔ ہندی کی لکھاوٹ میں عمر نوح صرف ہوجاتی ہے۔ اور پھر اسکا پڑھنا عذاب جان ہوتا ہے۔ میں نے ہندی لکھتے ہوئے بھی دیکھا ہے اور پھر اسکو پڑھتے ہوئے بھی سنا ہے۔

جب ایسی ایسی ناکامیوں کا سامنا اردو کو ہو رہا ہے تو اگر بہی خواہان اردو ایسے وقت میں زبان اردو کے اصول معینہ پر ٹھنڈے دل سے عمل پیرا ہوں اور اسکے مرکز کی مخالفت نہ کریں اور اردو میں نئی نئی ترکیبیں

خلاف اصول اُردو سے نئے لفظ ایجاد کرکے اسکی خوبیوں کو نہ مٹائیں تو اونکا احسان ہوگا اور اس میں انکی کوئی توہین نہ ہوگی۔ اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ تمام ہندوستان میں ایک ہی اُردو رائج ہوگی اور ہم سب کے ایک ہی محاورے ہونگے اور زبان اپنے قاعدہ کے موافق رواج پائیگی۔

میری زبان میں تو اب اثر نہیں رہا اس بارہ میں اور بھی ہمدردانِ اُردو کو مدد کرنا چاہیئے اور اسکے نتائج پر غور فرمانا چاہئے ضد اور ہٹ دھرمی سے کام کرنے میں کھیل بگڑ جائیگا۔

اگر ہمارا یہی قصور ہے کہ ہم اہل دہلی اور اہل لکھنؤ کے زبان دانوں کو اہل زبان کہتے ہیں اور دوسرے لوگوں کو زبان داں کہتے ہیں اور اسی سبب سے لوگ ہم سے خفا ہوتے ہیں تو ہم اسپر بھی راضی ہیں کہ انکو آج سے اہل زبان نہ کہیں سب کو اہل زبان کہیے بلکہ اہل دہلی اور اہل لکھنؤ کو بے زبان کہیں تاکہ اُردو زبان جسکو کس مشکل سے اگلے بادشاہوں نے پرورش کیا ہے اپنی خوبیوں کو کھو بیٹھے۔ ہمارے یہاں تو زبان کی حفاظت کا اسقدر اہتمام بلیغ کیا جاتا ہے کہ ایک لفظ ایک ایک ترکیب کی مخالفت پر برسوں مباحثہ رہا ہے اور نہ ہونے پر دو فریق بن جاتے ہیں ایک کے معتقدین ایک کا ساتھ دیتے ہیں اور دوسرے کے دوسرے کا۔ اور انتہا یہ ہے کہ وہ ترکیب مادہ لفظ جسپر یہ اختلاف رونما ہوا ہے مختلف فیہ بنجاتا ہے پھر جو لوگ زبان کی خدمت میں ایسا انہماک رکھتے ہیں انکو زبان کے اصول و قواعد مٹنے کا کیونکر غم نہو۔ ورنہ انکو کوئی دولت اس سے دہلی لوٹ لیتی ہے نہ لکھنؤ کچھ فائدہ حاصل کرتا ہے۔ لکھنؤ کے ثقات اہل کمال میں جو کبھی کبھی نزاع واقع ہوتی ہے وہ نزاع لفظی ہے اسی تحقیق کے اختلاف پر یہ کاوشیں پیدا ہوتی ہیں اور صاحب سلامت میں فرق آجاتا ہے جب اصلی سبب دریافت کیجئے تو یہی نزاع لفظی ہے کبھی خیال نہ فرمائیے کہ لکھنؤ یا دہلی کی سرزمین کو یہ شرف حاصل ہے بلکہ دہلی مراد ہے خان بہادر میر ناصر علی خاں کے مسلک عام سے اور ایسے ہی اکمال دانوں سے جو اُردو کے کیل کانٹوں سے واقف ہیں اور اس راستے میں پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہیں۔ لکھنؤ مراد ہے دس میں ثقات اہل کمال سے جو زبان کی خدمت کو بغیر کسی معاوضہ کے انجام دیتے ہیں۔ یہ سب لوگ جہاں جمع ہو جائیں وہی دہلی اور لکھنؤ ہے۔ اسکو خشت خم سمجھئے جہاں خشت خم رکھدی وہیں میخانہ بنا ہو سکتا ہے۔ بقول لسان الملک جناب ریاض ؎

جہاں ہم خشت خم رکھدیں بنائے کعبہ پڑتی ہے +
جہاں ساغر ٹپک دیں چشمۂ زمزم نکلتا ہے +

لکھنؤ نے جو مستند ہونے کی برکت حاصل کی اسکا سبب یہ نہیں تھا کہ وہاں کے لوگوں نے زبردستی یا دہلی والوں کی مخالفت کرکے زبان کو تصنیف لیا بلکہ دہلی جن لوگوں سے مراد تھی انکو اپنے یہاں جمع کیا انکی عزت کی اُن کے مرتبے

بڑھاے اُن کے ناز اُٹھاے اور وہ سب معہ اہل عیال لکھنو چلے آے دہلی خالی ہوگئی اُسوقت لکھنو نے اپنی سیوا کا میوا کھایا -

میری غرض اس کہنے سے یہ ہے کہ لکھنو نے حدت سے عظمت حاصل کی ہے - یہہ چیز کسی ملک کو زبردستی نہیں ملسکتی نہ سینہ زوری سے کام چلتا ہے زبان کے بارہ میں دہلی کی اولیت ہمیشہ قائم رہیگی - لکھنو نقش ثانی ہے - اب اگر کوئی نواب آصف الدولہ بہادر جیسا فیاض حاتم ثانی پھر پیدا کرے تو وہ نقش ثالث بھی بنا سکتا ہے -

میں چاہتا ہوں کہ اس نزاع کا فیصلہ **صلائے عام** کے ذریعہ سے ہو جائے اور دونوں میں سے جو غلطی پر ہو وہ اعتراف کر کے سیدھا راستہ اختیار کرے -

خواجہ محمد عبدالرؤف عشرت (از لکھنو)

صلائے عام جناب عشرت لکھنوی نے یہہ مضمون بڑے کام کا لکھا ہے - کوئی کچھ کہے جائے اُردو کی ٹکسال دہلی و لکھنو ہے اور رہیگی ان کے سوا جو اس زبان کا ہو اُسے ٹکسال باہر سمجھیئے ؛ صاحب مضمون سے مجھے ایک بات میں اختلاف ہے کہ اب ہندوستان کے لیئے انگریزی زبان سے واقفکاری بھی ضرور ہے کہ جسطرح شاعری میں زبان کی خوبی کے ساتھ مضمون کی خوبی بھی پسندیدہ ہے ہر طرح کی معلومات کے لیئے انگریزی زبان کا سیکھنا ضروری ہے زبان تو آپ اپنی ہی رکھیں لیکن انگریزی سے واقفکاری معلومات علوم و فنون کیلیئے نہایت بکار آمد ہے - جب تک آپ کی زبان اور مستند زبانوں کے مرتبہ کو نہ پہونچے کسی نہ کسی معتبر زبان کا سہارا پکڑنا پڑیگا - فارسی و ہندی کا سہارا اب تک کام آیا - عربی و سنسکرت کا پایا تو نکا کیا کہنا - لیکن سنسکرت اب مردہ زبانوں میں داخل ہے اور عربی مشکل ہے اِس زمانہ میں نگاہ جاتی ہے تو انگریزی پر کہ مناسب وقت ہے کہ خاصی رائج ہو رہی ہے اور روز بروز ترقی پر ہے ؛

آپ اپنی انگریزی دانی پر ناز تو نکریں کہ موقع و بےموقع انگریزی لب لہجہ بگھاریں مگر انگریزی سے لاعلمی معلومات علمی کے لیئے نقص میں داخل ہے ؛

رہا ہر کس و ناکس کا دعوئے اُردو کی زبان دانی کا یہہ اس لایق نہیں کہ اسپر توجہ کیجائے ؛

ع باتوں باتوں میں دھر لیا ہمکو

دعا

کر خدا راستی عطا ہمکو — کجروی سے سدا بچا ہمکو
اے غفور الرحیم اے ستار — در گذر بخش دے خطا ہمکو
یا الٰہی تو رحم کھا ہم پہ — اور ضلالت سے کر رہا ہمکو
سارا اندھیرا ہے تبھی وی — سب نظر آوے مرض ہمکو
صبح سے لیکے ہر گھڑی تا شام — ورد رہتی ہے یہ دعا ہمکو

ناریاں اور دھوتیاں اتنی تو — اڑتے دیتے ہیں کیا ہوا ہمکو
ہندو تم جامہ کہن اپنا — نقل بیجا نہیں بجا ہمکو
کچھ دنوں گاڑی تھی ہوا آئی — کچھ نہیں لگتا تھا بھلا ہمکو

ہندو مسلمان

ملک میں جا بجا بنائی گئی — رفع شر کو امن سبھا ہمکو
ہندو کہتے ہیں مسلماں ہیں بد — ہندو مسلمان لگے کہنے برا ہمکو

گاندھی

انقلاب زمانہ دیکھ چکے — کب ملی امن کوئی جا ہمکو
دیکھے لیڈر تمہارے گاندھی جی — چیز لگی سر پہ اک بلا ہمکو
کوئی انصاف سے ذرا دیکھے — ایسے لیڈر سے کیا ملا ہمکو
خالی چرخہ کا تنا ہی نہیں — اور نہ کھدر کا پارچہ ہمکو
اس سے زیادہ کریہ تر ہے — ملگیا لڑنا بر ملا ہمکو
اقربا میں بھی ہے یہ بے لطفی — چھوٹا کہتا نہیں بڑا ہمکو
کچھ بھلا بھی ضرور گاندھی نے — اسنے کچھ تو سکھا دیا ہمکو
معشرت معیشت کے طرز و نہیں — فرق بین بتا دیا ہمکو
زندگانی کا طرز اور انداز — جینے مرنے پڑھا دیا ہمکو
انکساری کے ساتھ رہنے میں — اسکا کہنا بہت بھلا ہمکو
اب کفایت کی سوجھتی ہے ضرور — خرچ کچھ تو بچا دیا ہمکو
کوٹ پتلون ہیٹ کیوں پہنو — اسکا پاجامہ کیا برا ہمکو
سر پہ ٹوپی عمامہ یا پگڑی — اچھی اچکن ہو اور قبا ہمکو

ہم انہیں ملیچھ بتاتے ہیں — وہ بتاتے ہیں ناروا ہمکو
مسلماں کہتے ہیں انہیں کافر — ایسا کہنا ہے کب روا ہمکو
رات دن جنگ جاری کرتی ہے — کوئی بتلائے کیا دوا ہمکو
کہتے ہیں کچھ لیا دیا تھا ہمیں — کہو کسنے دیا لیا ہمکو
باتیں طرفین سے بگڑتی ہیں — کیوں نہ افسوس ہو بڑا ہمکو
بغض و کینہ کبھی نہیں چلتا — ایک ملنساری ہے روا ہمکو
لڑنے بھڑنے سے کیا چلا کام — کوئی اسکا تو دے پتہ ہمکو
ہو نہ تم چھوٹے اور نہ وہ چھوٹے — اسمیں کیا چھوٹا اور کیا بڑا ہمکو
ہندو بھائی بھی کچھ برس پہلے — کہتا بھائی تھا یا پتا ہمکو
اب محبت نہیں رہی باقی — یہ زمانہ ہے پر جفا ہمکو
زندگانی کا لطف تو جب ہے — با محبت کرے خدا ہمکو
ہندو اپنے ہم ان کے ہو جائیں — جیسے شیر و شکر ملا ہمکو
کیسے مل جل کے ہم رہیں اب بھی — راستہ دے کوئی بتا ہمکو

ہم نہیں کہتے کہ گندی ہے ۔۔۔ وہ نہیں کہتے ہیں صفا ہمکو
اپنے کھانے میں چھوت انکو ہی ۔۔۔ انکا کھانا ہے بدمزا ہمکو
ہندو بھائی ہم انکے بھائی ہیں ۔۔۔ عمدہ کھانا ہے اور روا ہمکو
کھانا سب پاک کھاتے ہیں بیشک ۔۔۔ کچھ تکلف نہیں ذرا ہمکو
سیکڑوں سال اب تو بیت گئی ۔۔۔ کھاتے پوری کی پڑا ہمکو
یہ تو ہندو خواہ مخواہ کی ہے ۔۔۔ گندہ پکوان کیوں لگا ہمکو
کراہت ذرا بھی کرتے ہیں ۔۔۔ لوگ کہو ینگے پیٹ بھرا ہمکو
سارے انسان اسکو کھاتے ہیں ۔۔۔ اس ہی پرہیز کیا رہا ہمکو

ایسا پرہیز تو ہے دق ہر
بس خدا دیوے گا شفا ہمکو

شدھی وارتداد

شدھ کرتے ہیں وہ جو مسلم ۔۔۔ یہ نظر میں تو ہے برا ہمکو
ہوے وہ تو مجاز ہیں بیشک ۔۔۔ گو برا ہیں بھلا ہمکو
اسپہ ہم کیوں لڑائیاں لڑیں ۔۔۔ گو وہ کرتے رہیں خفا ہمکو
قوم اپنی گھٹیگی شدھی سے ۔۔۔ دل میں یہ وہم ہے جما ہمکو
ہے یہ سارا خیال سلسلے نام ۔۔۔ کب تھی وہ قوم باصفا ہمکو
کریں شدھی وہ شوق سے ہرجا ۔۔۔ نہ چلا دیں دست و پا ہمکو
قوم اپنی کبھی نہیں گھٹتی ۔۔۔ اس میں گھاٹا نہیں پڑا ہمکو
شدھی اور ارتداد نے ناحق ۔۔۔ دونوں جانب دبا دیا ہمکو
گروہ مرتد ہوں ہوں شدھ دونوں ۔۔۔ جھلجھلاہٹ نہیں روا ہمکو
ہندو او مسلمان بھائی کی ۔۔۔ دل سے بھاتی ہیں ادا ہمکو
مذہبی بحث سے غرض کیا ہے ۔۔۔ نیک توفیق دے خدا ہمکو
یہ زمانہ کی چال ہے عارف ۔۔۔ باتوں باتوں میں دھر لیا ہمکو

(راقم مرزا عرفان علی بیگ بی-اے-ایل ایل-بی-اوراز آگرہ)

صلائے عام (متعلق باشتہارات)

اور ذریعوں کی بہ نسبت رسالوں میں اشتہارات کی شہرت زیادہ ہوتی ہے رسالوں کا اگر شوق بھی ہو تو بھی اکثر پڑھنے والے خرید کر پڑھنا حرام سمجھتے ہیں جہانتک ہو سکے مانگ تانگ کر انکو بجائے کرایہ ادھر ادھر سے پھر اکر جسطرح ہو سکا پڑھ پڑھا لیتے ہیں۔ اس حساب سے صلائے عام کے پڑھنے والوں کی تعداد بہت زیادہ سمجھیے یعنی جسکے ہاتھ ایک پرچہ لگتا ہے دس پندرہ آدمیوں تک پہنچ جاتا ہے ✤ بہادر شاہ بادشاہ کے مقدمہ میں چند اخبار پیش ہوئے جن کی اشاعت بہت کم بیان کی گئی عذر یہ تھا کہ ایسی قلیل تعداد کے اخباروں کے مضامین کا اثر کیا ہوتا ہوگا جواب میں کہا گیا کہ ہندوستان میں اخباروں کی اشاعت خریداروں کی تعداد پر منحصر نہیں ہے۔ خریدار کم ہی سہی مگر دیکھنے والے اور پڑھوا کر سننے والوں کی تعداد زیادہ ہو جاتی ہے یہ سب مل ملا کر زیادہ اثر کر جاتے ہیں ✤ میں نے دیکھا کہ جن لوگوں کے نام صلائے عام کے خریداروں میں نہیں ہیں ان میں اکثر صلائے عام کے مضامین کی تعریف کرتے ہیں۔ مجھے تعجب ہوتا ہے کہ انکا نام تو خریداران صلائے عام کے رجسٹر میں درج نہیں پھر انہیں صلائے عام کے مضامین کی کیسے خبر ہوئی معلوم ہوا کہ کسی اور کے پاس کوئی پرچہ دیکھا تھا ✤

صلائے عام (متعلق بہ انتظام سال آئندہ)

اگلے مہینہ کا صلائے عام سنہ رواں کا اخیر پرچہ ہوگا۔ میں چاہتا ہوں کہ اگلے مہینہ میں ۱۹۲۵ء کا حساب بالکل بے باق ہو جائے: اس لئے اطلاع دیجاتی ہے کہ جن اصحاب کے ذمہ ۱۹۲۵ء کی قیمت باقی رہ جائے گی وہ آئندہ صلائے عام کا انتظار نہ کریں۔

۱۹۲۶ء کے سالانہ چندہ کے لئے میں ایک منی آرڈر کے کوپان کی جو اس مہینہ یعنی نومبر سنہ رواں میں وصول ہوا بجنسہ نقل کرتا ہوں:۔

× × × × × ”مبلغ چھ روپیہ چندہ سالانہ صلائے عام بابت سال آئندہ ۱۹۲۶ء پیشگی ارسال ہے تاکہ رسالہ جاری رہے“ × × × × × × × × ×

یہہ آخر کا مختصر فقرہ جس پر خط کھچا ہوا ہے ”تاکہ رسالہ جاری رہے“ صلائے عام کے خریداروں کے لئے اشارہ اور میری طرف سے التماس ہے کہ ۱۹۲۶ء کا سالانہ چندہ پیشگی اگلے مہینہ میں آجائے تو آپ کو اور مجھے اطمینان رہے کہ رسالہ کے جاری رہنے میں کسی طرح شبہہ کی گنجایش نہیں۔ صلائے عام کے دیکھنے والوں میں اکثر اس رسالہ کو ستہ ضروریہ میں سمجھتے ہیں اگر اس کے اجرا میں فرق آئے تو گویا خونِ ناحق میں میری گردن پر رہ جائے۔ خاصکر مضمون نگار صلائے عام کے لئے اس محبت و محنت سے مضمون لکھتے ہیں جن کو رنجیدہ کرنا میری شرافت و وضعداری

کے خلاف ہے۔ حضرت رشید لکھنوی کا شعر ہے ؎

بخشدوں خون ابھی داورِ محشر اپنا ؛ وہ یہہ کہہ دیں اسے مارا ہے سمجھکر اپنا

یہہ رسالہ میرا نہیں۔ آپ کا ہے ؛

اس پرچہ میں صلائے عام کے چند مضمون نگاروں کے نام اور مختصر حالات لکھے گئے ہیں۔ مختصر اس لئے کہ جس قدر صلائے عام سے مضمون نگاری کا تعلق ہے اُسی قدر لکھا گیا : یہہ ذکر تھوڑا بہت اس غرض سے کیا گیا کہ لکھنے والوں کے مرتبہ سے آپ کو آگہی ہو جائے اور میری طرف سے شکر گزاری کا موقع نکل آئے ؛ اب اگر میری طرف سے مضامین میں کوتہی بھی ہو جائے تو صلائے عام کے مضمون نگار اس مرتبہ کے ہیں کہ صلائے عام کے لئے محنت کرنے میں دریغ نہیں کریں گے ؛

اس پرچہ میں زیادہ گنجایش نکالنے کے خیال سے اب کی دفعہ کہیں کہیں دو کالم کر دئے ہیں کہ دو کالم میں عبارت زیادہ آجاتی ہے۔ یہہ ضرورت اس لئے ہوئی کہ مضامین زیادہ آتے ہیں اور عدم گنجایش کی وجہ سے رہ جانے کا اندیشہ رہتا ہے۔ یہہ اندیشہ اگر پورا مٹ نہ سکے گا تو کم ضرور ہو جائے گا ؛

× × × × × × × ”صلائے عام جاری ہے یہہ مژدہ سن کر نہایت دل خوش ہوا۔ خدا آپ کو اس کے سر پر سلامت رکھے : یہہ رسالہ اپنی نوعیت میں فرد کامل ہے اور حقیقت میں صلائے عام مراد ہے آپ کے نثر مضامین کا۔ جس کے دیکھنے اور سننے کا ہر شخص مشتاق رہتا ہے“ ؛ × × × × × × × × × ×

عشرت (لکھنوی)

اشتہارات

صلائے عام میں اشتہارات چھپوانے کی اُجرت بہ شرح ذیل ہے۔ اشتہار خواہ اردو میں ہوں فارسی میں ہوں انگریزی میں ہوں یا ناگری میں :-

زبانِ اُردو یا فارسی میں ایک صفحہ ایک سال کے واسطے ۔ عہ - چھہ ماہ کیواسطے عہ تین ماہ کیواسطے عہ

" " نصف صفحہ " " عہ " " عہ " " " عہ

" " چوتھائی صفحہ یا اس سے کم " " عہ " " عہ " " عہ

" " ایک صفحہ ایکدفعہ کے واسطے عہ ۔ نصف صفحہ ایکدفعہ کیواسطے عہ - چوتھائی صفحہ ایکدفعہ عہ

اجرت ہر حالت میں پیشگی آنی ضرور ہے۔ غیر مہذب اور خلاف شرافت اشتہار چھاپنے سے انکار ہے ؛ ناگری میں اشتہار چھپوانا ہو تو اُردو سے ڈیوڑھی اُجرت ہے ؛ انگریزی میں چھپوانا ہو تو اُردو سے دُگنی اُجرت ہے ؛

یہ خیال رہے کہ اشتہار کا مسودہ صاف ہو ورنہ غلطی کے ہم ذمہ دار نہیں ۔ مسودہ انگریزی مہینہ کی اوّل تاریخوں میں معہ اُجرت

The Punjab Spectacles Co. Delhi.

پنجاب اسپکٹکل کمپنی دہلی

عینکوں کے استعمال سے صرف یہ غرض نہیں کہ آپ ہر چیز کو آسانی سے دیکھ سکیں بلکہ عینک آپکی بینائی کو ہمیشہ قایم رکھتی ہے اور آنکھوں کی طاقت میں کمی نہیں ہونے دیتی۔ آپ جب کام کرتے کرتے تھک جاتے ہیں یا زیادہ کام کرنا پڑتا ہے تو آپ کو مددگار کی ضرورت ہوتی ہے۔ عینک آپ کی سب سے بڑی مددگار ہے، جو ہر وقت آپکی خدمت بغیر کسی معاوضہ کے کرتی ہے۔ آپکو اپنی بینائی قایم رکھنے کے لئے کسی ہوشیار ڈاکٹر یا عینک والے سے مشورہ کرنے کی ضرورت ہے۔ اس لئے ہم آپکی اس خدمت کیلئے تیار ہیں اگر آپ خود تشریف لاوینگے تو ہم آپکی آنکھوں کا امتحان کرکے آپکے لئے ایک عمدہ عینک تجویز کر دیں گے۔ ورنہ آپ کسی ڈاکٹر سے معائنہ کراکے ہمکو لکھ دیں ہم بموجب نسخہ کے اعلیٰ درجہ کی عینک آپکے لئے تیار کر دیں گے جو کہ ہمیشہ آپکی نظر کو قایم رکھ سکے ؛

المشتہر

شیخ لطیف الرحمٰن - پروپرائٹر - پنجاب اسپکٹکل کمپنی - چاندنی چوک - دہلی -

Copy of a letter from the Private Secretary to His Honour the Lieutenant Governor of the United Provinces, Dated 11th April 1913.

GOVERNMENT HOUSE, LUCKNOW.

Sir,

I am desired to acknowledge your letter of the 9th forwarding a copy of your Paper (Sala-i-Am) for His Honour the Lieutenant Governor's perusal; and to say that His Honour has put it aside to study and enjoy at leisure

---

Presentation of Mir Nasir Ali Khan Bahadur of Delhi to His Most Gracious Imperial Majesty King Emperor.

Extract from a letter from J P THOMPSON Esqr, I. C S.
Dated 13th December 1911.

Dear Mir Sahib,

" I enclose your invitation card for the Garden Party this afternoon, which had just reached me, from the Private Secretary to His Honour" "Sir Louis Dane hopes to have an opportunity of presenting you to His Imperial Majesty "

Extract from a letter from Sir RICHARD DANE K C I. E (Brother of His Honour the Lieutenant Governor of Punjab Dated 25th Feb. 1912

Dear Mir Nasir Ali.

" My brother has told me that you had the great honour of being introduced to His Imperial Majesty the King Emperor."

I am,
Yours Sincerly,

Extract from a letter from Major (Now Lt.-Colonel) J C C. ANGELO, Deputy Commissioner, Dated 18th December 1911.

My Dear Mir Sahib,

I am very glad you were presented to His Imperial Majesty—it was a fitting ending to the Durbar

Yours Sincerly,

صلائے عام دہلی

ہندوستان کے ایک بڑے فخر کا مقام ہے کہ گورنمنٹ عالیہ ہند نے اردو - ہندی - فارسی
عربی میں امتحان و انعام مقرر فرمائے تاکہ حکام و افسران انگریزی مشرقی زبانوں میں
کمال و لیاقت پیدا کریں اور صلائے عام کیلئے سب سے زیادہ ناز کی جگہ ہے کہ اردو زبان کے
اعلی امتحان میں یہ رسالہ بھی منظور ہوا -

گورنمنٹ عالیہ ہند کے سرکاری حکم کا انتخاب انگریزی میں جستجو کہ صلائے عام کے
متعلق ہے گزٹ آف انڈیا مطبوعہ ۶ جون سنہ ۱۹۱۴ ع سے ذیل میں نقل کیا جاتا ہے اسکی
نسبت زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں کہ یہ انتخاب صلائے عام کی قدر شناسی کیلئے بس ہے -

دلا یہ مکتب الست ہے دیکھ چپ رہنا * بڑا گناہ ہے یہاں الف سے بے کہنا -

---

Extract from the GAZETTE OF INDIA June 6, 1914 EXAMINATIONS

XVI.—The following are the Text Books prescribed for the PROFICIENCY EXAMINATION —

* * * * *

URDU—

* * * * * *

In addition to the Grammer and Magazine recommended for the proficiency examination —

* * * *

Magazine,

SALA-I-AM.

* * * * *

Appendix B. List of authorised **Text** Books

The following is a list of Text Books prescribed for the various examination together with places where they may be obtained.

* * * *

URDU

SALA-I-AM . . . . **Delhi.**

* * * * * * *

(Sd.) L. C. PORTER,

Secretary to the Govt. of India.

(See the pages 1091 part 1 of the Gazette of India June 6. 1914.)

Sir Rabindra Nath Tagor, author of GITANJALI writes:—

* * * * "I have no doubt that it (Sala-i-Am) is doing a good service in promoting the cultivation of Urdu Literature,"

* * * * * * * *

Extract from a letter from the Honourable W. MERK, Esq. I L. D, I. C S., Late Chief Commissioner, N W. Frontier Province, dated 6th August 1911.

"I thought it (Sala-i am) a Periodical that might be encouraged with advantage, for instance to be placed in the waiting rooms for native gentlemen calling on Deputy Commissioners.

Extract from a letter from A L GORDON WALKER, Esq., I C S., Punjab Commission, dated 11th October 1911.

I quite agree with Mr Merk that the (Sala-i-Am) ought to be in the Waiting Rooms of all Deputy Commissioners. Curiously enough I have used it for the purpose myself and always find that the Indian gentlemen who read it are delighted with it.

Extract from a letter from the Deputy Commissioner of Gujranwala Punjab, Dated 4th September 1912.

"I shall be glad to recommend your Paper (Sala-i-Am) to the District Board."

"I like your Paper personally It is always written in chaste and pure, and if I may say so, in classical style."

(Note—The officer is now the Commissioner and Political Agent Ambala Division, Punjab.)

L. WHITE KING Esqr, L L. D, C S I, F R.S., Indian Civil Service, retired, writes as follows

"I am delighted with the style of your magazine and am looking forward to the next number.

Dated 5th October 1908

Extract from a letter from L WHITE Esqr, L L. D, C S I, Indian Civil Service, Retired"

"I was glad to get the last number of the (Sala-i-Am) which I thought excellent. My friend Coloneal Story takes great interest in it."

(Note—The gentlemen has since been knighted, Sir Lucas King.)

OPINIONS

Regarding "SALAAM," Delhi.

[illegible]

The [illegible] ... Englishman [illegible] ... India [illegible]

[illegible] ... Europe [illegible] ... world [illegible]

[illegible]

"... the Salaam ... [illegible] ... In fact I have been doing so."

[illegible]

The [illegible] of the Salaam make it the [illegible] Urdu Magazine of European [illegible]

D. C. PHILLOT (Lieut. Colonel)
Late Secretary Board of Examiners Calcutta.

(Cambridge)
1923

Extract from a letter from R. P. Dewhurst Esquire, I. C. S. Session Judge, dated [illegible] 191[illegible]

"I take this opportunity of saying that I entertain a very high opinion of your Magazine. I will not say that I read every word of every number, but I can say with truth that I read eagerly all the articles proceeding from your own pen beginning to end," o o o

انجمن پنشن خواراں

گزشتہ انجمن پنشن خواران کے جلسہ میں جس قدر صاحبان شریک ہوئے اُن کی تعداد ایسی خاصی تھی جس سے اس انجمن کا مستقبل نہایت اُمید افزا ہے پھر فرداً فرداً یہ ہستیاں اپنی اپنی جگہ کوہ کے مثال ہیں۔ اگر اس انجمن کے ہر ایک ممبر کے اوصاف کو ایسا جانتا کہ جس جاننے کی مجھے آرزو ہے تو میری مشکل ایسی دقیق نہ ہوتی کیونکہ مجھے ممبروں کی علیحدہ علیحدہ مذاق کا علم نہیں ہے اس واسطے معافی کا خواستگار ہونا پڑیگا۔ یہہ ابتدائی مشکل ہے اور افسوس کا مقام ہے کہ باوجود اس کے کہ ایک ہیٹ فارم پر ہیں لیکن ایک دوسرے سے بیگانہ ہیں لیکن میں سے جو نکلا بادل گرجا اور اس انجمن میں جو داخل ہوا چمکین کا۔ ہر فن کے چوٹی کے آدمی خان بہادر۔ کپتان حبیب الرحمن سی۔ آئی۔ ای وغیرہ وغیرہ۔ جناب مولینا بشیر الدین احمد خاں جیسے صاحبِ قلم۔ جناب سائل جیسے سخن گو۔ جناب ساحر جیسے شاعر۔ خان بہادر میر ناصر علی جیسے ماہر زبان۔ غرض نورتن نہیں بلکہ چہل تن گنوائے جا سکتے ہیں۔ لیکن اونکا عذر لنگ قصر پر مجبور کرتا ہے۔ سب کے گیت تو اُسی وقت گائے جا سکتے ہیں کہ جب انجمن پنشن خواران سے محبت کریں تاکہ ایک دوسرے کے آشنا ہوں۔ انجمن کی کیا ضرورت ہے ؎ پیدا ہونا اور مرنا دو نوا ختیاری نہیں ہیں ؎ لائی حیات آئے قضا لیچلی چلے اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے ؞ ان دونوں ناشدنی امور کے درمیان کا زمانہ جسے زندگی کے نام سے تعبیر کرتے ہیں اس وقت سے شروع ہوتا ہے۔ زندگی کیا ہے چاروں عناصر کا باہم ہوجانا۔ موت کیا ہے انہی چاروں کا پریشان ہونا۔ چار چیزیں ملکر حیاتِ انسانی کا باعث ہوتی ہیں اور چار زندگیاں ملکر حیاتِ قوم کا۔ زندگی بڑی پیاری چیز ہے۔ اس کا گزارنا تجربہ بتلاتا ہے کہ اپنے اور صرف اپنے اختیار میں ہے۔ چاہے اسے ہنس کر گزار دے۔ چاہے اسے رو کر گزار دے۔ زندگی میں بچپن بیفکری اور جوانی بڑے جوبن کا ہوتا ہے۔ جوانی سے متصل پکے پن کا وقت بڑے کام کا ہے اس وقت کو غنیمت جاننا چاہیئے۔ انسان اسی عمر میں اپنے اور اپنے ابنائے جنس کی مطلب براری کے قابل ثابت ہوتا ہے۔ اس سے ملا ہوا زمانہ وہ ہے جب انسان کے قوا میں زوال شروع ہوجاتا ہے۔ جواٹل ہے۔ اس کے آنے سے پہلے پہلے جو کچھ ہو سکتا ہے کرلینا چاہیئے

جوانی کی منڈ

جوانی کی اُمنگ کو یہ وقت اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔ جوانی رونے دھونے سے بھی مُڑ کر نہیں آتی۔
اب رہا مدعائے حیات۔ عبادت۔ ریاضت۔ سب کی تہ میں ایک چیز کا حصول ہے۔ یعنی خوشی۔ زندگی بغیر اس کے بے سود ہی نہیں بلکہ اپنے لیے زندگی وبال اور ابنائے جنس کے لئے مُضر۔ بیدل آدمی سوسائیٹی کو مُتنغص ہی نہیں کرتا دوسروں کی ہمت بھی توڑتا ہے۔ خوشی کی تلاش میں لوگ بڑے بڑے پاپڑ بیلتے ہیں۔ جان پر کھیلتے ہیں۔ جرائم جس قدر واقع ہوتے ہیں سب کی تہ میں خوشی کی تلاش ہے حدودِ سوسائیٹی سے باہر تمام افعال جرائم ہیں۔ سوسائیٹی کو رونق دینا اس کے قواعد کی پابندی سے وقت کاٹنا خوشی کے اسباب واسباق کو حاصل کرنا منتہائے زندگی ہے۔ تنہا کتاب بینی اور تاریخ کا مطالعہ ضرور عقل میں اضافہ کرتا ہے لیکن اتنی جلدی نہیں جتنی ایک پڑھے لکھے انسان کی صحبت۔ تھوڑے عرصہ میں باہمی تبادلِ خیال سے دماغ روشن ہو جاتا ہے۔ اس کی مثال پانی میں پیر کر پار ہونے سے پل پر سے گزرنا آسان اور نفع بخش ہے۔ سوسائیٹی میں ایک اور ایک دو نہیں ہوتے بلکہ گیارہ۔ اس کی کوئی وجہ نہیں کہ پنشن کے بعد پنشن خوار اپنے آپ کو مُردہ تصوّر کرلے۔ پچپن سال سے یہ مراد نہیں کہ آپ کا جسم و دماغ بیمار ہو گئے۔ اگر بیمار نہ ہوں اور تو یہ وقت کام کا ہو۔ جب جسم اور دماغ سے ایک اچھی مقدار کام کی آقا کو مل چکی تو پنشن آرام کی خاطر عوضِ خدمت ہے۔ یورپ میں اور دیگر ولایات میں اسی عمر کے انسان انتظام کی باگ ہاتھ میں لینے کے قابل سمجھے جاتے ہیں۔ اگر پنشن خوار صاحبان مُستقل خوشی کے مُتلاشی ہیں کو کچھ کام کرکے دکھائیں۔ جوانوں کے لئے ہدایت۔ بوڑھوں کے لئے سہارا۔ اولاد کے لئے ایک سے زیادہ وسیلے انجمن کے باعث پیدا کریں۔ اچھا شہری بن کر حقوق حاصل کرنے میں کوشاں۔ پنشن دینے والے آقاؤں کی مزید باعثِ ناز ہوں۔ پبلک کی خدمت اپنا منتہائے نظر قرار دیں ؂

راقم شریف حسن۔ (خانصاحب ڈاکٹر شریف حسن)

حسب الارشاد میر ناصر علیخاں بہادر مطبع ناصری واقع فراشخانہ دہلی میں باہتمام میر احمد چھپا اور شایع ہوا ؂
Printed and Published by Mir Nâsir Ali Khan Bahadur (Editor) at the Nâsri Press, Farrâsh-Khânâ, Delhi.

REGISTERED No. L. 1462

صلائے عام دہلی

صلائے عام

SALÂ-I-ÂM, DELHI.

A high class Monthly Magazine devoted to the cause of Urdu literature, the preservation of the old Indian, especially Mohammadan culture and refinement, and the assimilation of the best features of the new civilization.

حسب الارشاد میر ناصر علیخاں بہادر مطبع ناصری واقع فراشخانہ دہلی باہتمام میر احمد چھپکر شائع ہوا

فہرست مضامین

جلد ۱۳ | بابت ماہ دسمبر ۱۹۲۵ء مطابق جمادی الاول ۱۳۴۴ ہجری | نمبر ۱۲

پیرایۂ آغاز

پیرایۂ آغاز کا مضمون جو ہر پرچہ میں پہلے ہوتا ہے اس کے بعد کے مضمونوں کے لئے گویا نشان کا ہاتھی سمجھا جاتا ہے جس کے پیچھے سواری کا سارا لشکر ہوتا ہے۔ میری کاہلی کی وجہہ سے اب کی دفعہ پیرایۂ آغاز بہت مختصر ہے گویا نشان کا ہاتھی لشکر کے تزک کے لائق نہیں۔ اس سے اچھا تو اور سواریوں کا ساز و سامان ہے۔ اس لئے اُمید ہے کہ اس مضمون کی کسر اور مضمونوں سے نکل جائے گی : بقول جناب سالک دہلوی ؎

تیرا چُپ چُپ یہہ بیٹھنا سالک ؛ اک طرح کا بیان ہے گویا

مضمونِ پریشان تو (صفحہ ۵) وہی معمولی پُرانا مضمون ہے۔ مگر جہاں گیر و نور جہاں والا مضمون (صفحہ ۹) بالکل نیا ہے : آپ کچھ ہی کیوں نہ کہیں۔ اِس طرز پرائیہ تک یہہ بحث پہلے نہیں چھڑی ؛ اِس مضمون میں پوست کندہ بیان کا شائبہ

ملاحظہ ہو [illegible]

بمقابلہ رائج الوقت انسانوں کے زیادہ ہے مجھے اندیشہ ہے کہ جو کان تحقیق اور واقعی و دقوعی حال کے جاننے کے عادی نہیں ان کے لئے یہہ مضمون شاید بہت خوش کن نہ نکلے؛

اس پرچہ میں بیگمات کے متعلق اور بھی دو ایک مضمون ہیں: صلائے عام کی ڈاک میں جناب مولوی بشیر الدین احمد صاحب نے چند بیگموں کی اعلےٰ لیاقت کا ذکر نام بنام کیا ہے (صفحہ ۲۵)۔ اس کے مقابلہ میں عورتوں کی اعلےٰ تعلیم کی نسبت جو مضمون ایک اعلےٰ درجہ کی تعلیم یافتہ بیگم صاحبہ نے رسالہ عصمت (دہلی) میں لکھا پڑھنے کے لایق ہے (صفحہ ۲۵)؛ فریدہ نامی عورت کا حال جو رسالہ حُسن ادب (لکھنؤ) سے نقل کیا گیا بہت دلچسپ ہے (صفحہ ۳۲)۔ یہہ حال خُلفاء عباسیہ کے زمانہ کا ہے عورتوں کے مُتعلق اور بھی مضامین آئے ہیں جو پھر شایع ہوں گے؛

داد کی داد (صفحہ ۱۴) حضرت مائل دہلوی کے کلام کی داد جو صلائے عام میں کبھی کبھی دی گئی اُس داد کی داد میں مجھے جناب مائل نے ایک مختصر تحریر بھیجی۔ اس کے ساتھ اُن کی غزل بھی ہے؛ گو صلائے عام کو نثر سے زیادہ تعلق ہے مگر نظم بھی جب لاجواب ہو چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا؛ اتفاق سے اس پرچہ میں کلام نظم معمول سے ذرا زیادہ ہے۔ جناب آغا صاحب شاعر دہلوی کی الوداع نہایت پاکیزہ ہے جو رسالہ شاداں سے نقل کی گئی (صفحہ ۱۰)؛ خاں بہادر جناب حضرت شاد کی غزل (صفحہ) بہت اچھی ہے؛ دلی کے دُکانداروں کی شاعری (صفحہ ۲۲) گو شاعرانہ نہیں مگر دلی کے سوا اور کہیں دُکانداری کا یہہ طرز دیکھنے میں نہیں آیا۔ اگر ہو بھی تو شاید لکھنؤ میں ہو جناب انیس و دبیر کے کلام کے مُتعلق اچھا مضمون ہے (صفحہ ۱۸)؛ ع کچھ مشغلہ ضرور ہے آخر برائے دل

(صفحہ ۳۶) جناب مرزا عرفان علی بیگ صاحب کا مضمون ہے؛ آخر میں صلائے عام کی شرح کے نیچے مختلف دگراد کا ہیں جن میں چند رسالوں کا مختصر ریویو ہے؛ (صفحہ ۴۰)

مضمون ہیں

مضمون پریشان

دُنیا ہرگز بُری نہ تھی اگر لازوال ہوتی۔ بذاتہٖ تو یہہ لازوال ہے مگر میرے اور آپ کے لئے زوال پذیر ہے: نشۂ مے کا کیا کہنا اگر اس کا نشہ قیامت تک نہ اُترے۔ مگر نشہ جلد اُتر جاتا ہے اور خمار کی تکلیف نشہ کے سرور سے کہیں زیادہ پیدا ہو جاتی ہے ؎

شرابِ شوق کی قیمت ہے نقدِ جانِ عزیز ٭ اگر یہہ باعثِ کیفِ دوام ہو جائے

دین دُنیا دونوں کا ساتھ مشکل ہے۔ اگر ساتھ ہوا تو دونوں میں سے ایک کا لُطف کم ہو جائے گا یا دونوں کا لُطف نہ آئے گا: جس طرح انگریزی چھاپے خانے والے تاکید کر دیتے ہیں کہ عبارت کاغذ کے ایک طرف لکھی جائے۔ اور پتھر کے چھاپے کی کاپی ایک ہی طرف لکھی جاتی ہے: کاغذ اگر پتلا ہے تو دونوں طرف لکھنے سے نہ اُدھر پڑھا جاتا ہے نہ اُدھر۔ بقول جناب شرف لکھنوی ؎

دو طرفہ تم نے خط میں اسے شرف تحریر کیا کیا کی ÷ اِدھر لکھا تو کیا لکھا اُدھر لکھا تو کیا لکھا ÷

مجھے تعجّب ہے کہ انسان کی ہستی کے کہنے کو دو حصّے ہوئے جنہیں "کونین" کہتے ہیں۔ یعنی دُنیا و عاقبت: مگر یہہ دونوں حصّے برابر کیوں نہ رکھّے گئے؟ ہمیں دُنیا میں اتنی مُدّت کیوں نہ رکھا جتنی مدّت عاقبت کی بتائی جاتی ہے؟ یا ہماری ہستی عدم کے برابر کیوں نہ بنائی گئی؟ اِس کی مصلحت از روے عدل و انصاف مکتب کے مُلّانوں کو معلوم ہو تو ہو۔ بہتوں کو علم نہیں ؎

اک تیر دل پہ ایک جگہ پہ لگائیے ÷ حصّہ لگائیے تو برابر لگائیے

دُنیا ہم سے چھوٹ نہیں سکتی۔ اور زبردستی جو چھوڑنی پڑتی ہے تو عاقبت کا سہارا غنیمت ہے: لیکن دونوں کو سنبھالئے تو کسطرح سنبھالئے؟ ؎

ہیں جاں بلب قفس میں ہمیں آشیاں سے کیا ÷ قصّہ یہاں تمام ہے مطلب وہاں سے کیا

دُنیا کا اشارہ ہے کہ ؎

مفتیٔ شہر ہو یا شیخ حرم کوئی ہو ÷ جو نہ ہو مست نکالو اُسے میخانے سے

اب آپ ہی فرمایئے اس اُلجھن میں انسان کیا کرے؟ اور کچھ کئے بغیر بنتی بھی نہیں: لاچار دُنیا و دین دونوں کو راضی کرنے کی ترکیب شاعرانہ یہہ رہ گئی کہ ؎

ذرا سی بات میں دونوں کو کرلیا راضی ÷ بتوں کو سجدہ کیا بندۂ خدا ہو کر ÷

الناس ناز

انسان نہ تارک الدنیا بنے نہ دنیا میں مبتلا رہے۔ نہ رات دن آرام میں پڑا رہے۔ نہ تمام عمر صبح سے شام تک مارا پھرے۔ پیادہ نہ چلا جائے تو سواری پہ چلے۔ ہر حال میں شکر نہ کر سکے تو شکایت بھی نہ کرے۔ نیکی کر سکے تو کیا کہنا! مگر بُرائی ہرگز نہ کرے۔ بُرائی سے بچنا خود بڑی نیکی ہے۔ دنیا اگر خراب نہ جائے تو آخرت کے اچھے ہونے میں شک نہیں ؎

کہیے گا گنہگاروں کو کس طرح سے ماخوذ　＊　توبہ کا تو بند آپ سے در ہو نہیں سکتا

جب دروازہ کھلا رہے تو آنے جانیوالے کو کس طرح روکا جائے؟

دنیا میں بُرائی اور بھلائی میں امتیاز مشکل ہے۔ بُرائی کبھی بھلائی کا سبب ہو جاتی ہے اور بھلائی کا نتیجہ ہمیشہ بھلائی ہی نہیں ہوتا۔ جو چیز ایک کے لئے بھلائی کی ہے دوسرے کے لئے بُرائی کا باعث ہے۔ آفتاب تمام دنیا کیلئے روشنی کا سبب ہے۔ مگر شپرہ (چمگادڑ) کو آفتاب کے چھپنے کے بعد دکھائی دیتا ہے۔ یہودا اسکریوطی کا حضرت عیسٰے علیہ السلام کو دغا سے گرفتار کروانا گرفتار کروانے والے کی روسیاہی کا گو سبب ہوا مگر بموجب عقائد عیسوی دنیا کی نجات کا ذریعہ سمجھا گیا۔ اور بموجب ارشاد حضرت شیخ سعدیؒ بدوں کے ساتھ نیکی نیکوں کے ساتھ بدی کرنیکے برابر ہے۔ مگر یہ غنیمت ہے کہ بھلائی کا اثر دیرپا ہے اور آخر میں عالم اسباب کے لئے بُرا نہیں۔

لیکن جب دنیا میں نہ بھلائی کو قیامت تک قیام ہے نہ بُرائی کو تو لاچار مرنے کے بعد سہارا ڈھونڈھنا پڑا ؎

تاکا تھا موت نے ترے بیمارِ عشق کو　＊　جب سے مریض تھا نظرِ گورکن میں تھا

انسان کو جب سے ہوش ہوا اس کے ساتھ موت کا کھٹکا لگ گیا۔ بلکہ ہوش ہونے سے پہلے بھی موت کا

بقیہ ۱۲ دیکھو

جھگڑا دیکھ لیجئے: معصوم بچے جو زندگی و موت میں امتیاز نہیں کرسکتے موت سے نہیں بچتے۔ اور دیوانے جن کو زندگی کا ہوش نہیں مرتے دیکھے۔ مر کے پھر پیدا ہونا۔ روح غیر فانی سہی مگر جسم کے بغیر جان کو کیا کیجیے لیلےٰ محمل بغیر گھر چھوڑ کر کالے کوسوں قیس کو دیکھنے بیابان میں کیسے آئی؟ ع لیلےٰ سمیت ہم تو محمل کو دیکھتے ہیں:

نایاب چیزوں کی نمایش کا طریقہ دُنیا میں گو اکثر دیکھنے میں آیا مگر مرنے والوں کو بطور نمایش بھی عالم اسباب نے آج تک نہ دکھایا: بقول جناب شرف ؎

مٹنے والوں کی نمایش نہ کبھی کی اُس نے ÷ جن کو نا پید کیا پھر اُنہیں پیدا نہ کیا

مسافر تھک کے مرجاتا ہے کیوں شہرِ خموشاں کا
غریب آفت زدہ منزل بمنزل کیوں نہیں آتا

مرنے کے بعد زندگی کے سارے اسباب بیکار ہو جاتے ہیں۔ تناسخ کا مسئلہ گو ظاہر سوسائیٹی کو نیکی کی طرف بہ جبر مائل رکھے لیکن از روئے سائینس سمجھ میں بہت نہیں آتا۔ اسیطرح سعی سفارش کا ذریعہ ؎

کبھی کسی نے سفارش سُنی نہ بُلبُل کی ÷ ہزار بار گلوں سے کہا صبا سے کہا

مرنے کے بعد صرف خدائے لایزال سے کام پڑتا ہے ؎

کسی کو دوست نہ سمجھے نہ کچھ وصیّت کی ÷ جو نزع میں ہمیں کہنا تھا وہ خدا سے کہا

یہہ خیال گو معمولی ہیں مگر اس طرز پر بہت کم سُننے میں آئے۔ خیال تو تمام دُنیا کے یہی ہیں مگر ادائے بیان غیر معمولی ہے: اس سے کسی کو اجنبی معلوم ہو تو ہوں ÷

کُڑھتی تھی لیلےٰ تو یہہ کہہ کہہ کے سمجھاتے تھے لوگ
خار اک سنبل میں ہے مجنوں سلاسل میں نہیں

جہانگیر و نورجہاں

مہرالنساء بیگم کا خطاب نورجہاں بہت مناسب ہوا کہ جہانگیر بادشاہ کا نام نورالدین تھا۔ دونوں۔ دونوں عالم یعنی دین و دنیا کے نور سمجھے گئے ؛ جہانگیر بادشاہ کا حال از روے تاریخ بہت لکھا گیا ہے۔ اور نورجہاں بیگم کا نام افسانوں کے طور پر ؛ افسانہ کے لئے حُسن و عشق کی ضرورت ہے۔ حالاں کہ مہرالنساء بیگم (نورجہاں) جب محلِ شاہی میں داخل ہوئیں انکی عمر ایسی نہ تھی جو ہندوستان کے معیارِ حُسن میں حسین سمجھی جاسکے ؛ شیر افگن خاں سے مہرالنساء بیگم کے اولاد تھی۔ اور بیوہ کے ساتھ شادی حُسن و عشق کی غایت نہیں ؛ خاص کر بادشاہ کے لئے ؛

مگر بات یہہ ہے کہ اکبر بادشاہ کے اولاد نہ تھی بڑی منتوں۔ اور درویشوں کی دعاؤں سے شاہزادہ سلیم (جہانگیر) پیدا ہوا۔ ایسے اللہ آمین کے بچے ضرورت سے زیادہ نازوں میں پلتے ہیں جس کا نتیجہ یہہ ہوتا ہے کہ معمولی شائستگی سے گر جاتے ہیں۔ یہہ وجہہ تھی کہ ابوالفضل سا مدبر و زمانہ شناس شاہزادے سلیم سے خوش نہ تھا اور اکبر بادشاہ سے شاہزادہ کی شکایت کیا کرتا تھا۔ اس پر جہانگیر نے اپنی شاہزادگی میں ابوالفضل کو مروا دیا : ابوالفضل کی موت اکبر بادشاہ کے مرنے کا سبب ہوئی ؛ اکبر کہا کرتا تھا کہ سلیم بابا اگر تجھے بادشاہی درکار تھی تو مجھے مارا ہوتا ابوالفضل بیچارے کو ناحق مارا ؛

سلہ زیادہ تر اُس وقت کے ایک سیاح کی زبانی ؛

کہتے ہیں کہ ابوالفضل کے مرنے کا اکبر کو اس قدر غم ہوا کہ بادشاہ جاں بر نہ ہوسکا۔ یہہ جہانگیر کی آوارہ مزاجی کا نتیجہ تھا کہ وہ لاجواب زندگیاں خاک میں مل گئیں۔ پھر شیرافگن کے ہاتھی اور شیر سے مروانے کے لئے وہ تدبیریں کیں جو شایانِ مردانگی نہ تھیں۔

اس کے بعد نورجہاں بیگم کے ہاتھ میں ساری عنانِ سلطنت دے دینی کونسی عقلمندی تھی؟ نورجہاں خاندانِ شاہی میں نہ تھی۔ اُس زمانہ کا ایک ڈچ سیاح (ملک ہالینڈ کا سوداگر) پلسیارٹ نامی اپنی رپورٹ میں جو ابھی حال میں ترجمہ ہوکر شایع ہوی لکھتا ہے[۱]

جہاں گیر امورِ سلطنت سے غافل ہوکر بالکل ایک چالاک چھوٹے خاندان کی عورت (نورجہاں) کے ہاتھ میں ہے۔ عورت نے موقع کو غنیمت جان کر اتنا بڑا عروج حاصل کرلیا ہے کہ بادشاہ محض برائے نام رہ گیا۔ نورجہاں کے آوردوں کو بڑا اقتدار ہے۔ اس کے عزیز اقارب بڑے بڑے منصبوں پر ہیں۔ نورجہاں اور نورجہاں کے بھائی آصف خاں کے ہاتھ میں ساری سلطنت ہے۔ یہہ دونوں مل کر جو چاہتے ہیں کرتے ہیں۔ بادشاہ بھی اگر کچھ کیا چاہے تو جب تک ان کی طرف سے یقین نہ ہو بادشاہ کا حکم بے کار ہے۔

گو ان دونوں (بہن بھائی) کو دُنیا کا بڑا عروج و اقبال حاصل ہے مگر پھر بھی رات دن اسی کوشش میں رہتے ہیں کہ اور بھی عروج زیادہ ہو۔ × × × × × × × × ×

× × × جہان گیر نے گو زنجیرِ عدل لٹکا رکھی ہے اور فریادیوں کی عرض معروض بھی سُنی جاتی ہے مگر ہاں۔ نہیں جواب کچھ نہیں ملتا: اتنا حکم ہوتا ہے کہ آصف خاں کے پاس جاؤ۔ اور

[۱] کم بیش ماخوذ از ترجمہ انگریزی کار رپورٹ پلسیارٹ سوداگر سیاح باشندہ ہالینڈ جس نے جہانگیر کے زمانہ کے حالات اپنے بادشاہ کی اطلاع کے لئے لکھے۔ اسکا ترجمہ انگریزی میں اس سال ۱۹۲۵ء میں بنام ذیل شایع ہوا: *Jahângîr's India.*

آصف خاں بغیر اپنی بہن کی صلاح کے کچھ نہیں کرتا۔ نتیجہ یہہ ہے کہ جس کا کام نکلتا ہے وہ جہانگیر کا شکر گزار نہیں ہوتا بلکہ نورجہاں اور آصف خاں کا احسان مانتا ہے ☆ × × × × × × ×

× × × × شام کو بادشاہ جب شکار سے واپس آتا ہے تو غسل خانہ میں نشست ہوتی ہے۔ یہاں اور اُمرا بھی جمع ہوتے ہیں اور ایک پہر سوا پہر رات گئے تک یہہ مشغلہ رہتا ہے کہ بادشاہ مے کے ۳ جام بہ اندازۂ وقت یکے بعد دیگرے پیتا ہے۔ جب آخر جام ختم ہوتا ہے سب رخصت ہوتے ہیں اور بادشاہ خواب گاہ میں جاتا ہے ☆ خواب گاہ میں ملکہ (نورجہاں) اپنی خواصوں اور کنیزوں کے ساتھ حاضر ہوتی ہیں۔ اور بادشاہ کو سہ درے میں نیند کا غلبہ ہو جاتا ہے اُس وقت نورجہاں جو چاہتی ہیں سب منظور کرا لیتی ہیں۔ شاذ ہی کوئی بات نامنظور ہوتی ہے ☆ نورجہاں بیگم کی زبان اوائے مطلب میں اپنا جواب نہیں رکھتی۔ بادشاہ شکار میں مصروف رہتا ہے۔ سلطنت کے سارے کاروبار نورجہاں کے اختیار میں ہیں ☆

یہہ حال کم و بیش پلسیارٹ سیاح کی رپورٹ سے اس خیال سے لکھا گیا کہ نورجہاں بیگم کے افسانے نثر میں تو بہت لکھے گئے ہیں۔ ان دنوں ملکۂ نورجہاں کے حال کی ایک مثنوی نظم میں جناب نواب صاحب بہادر فرماں فرمائے ریاست لوہارو لکھ رہے ہیں ☆ اس وقت مضمون نگار کو کلام کی خوبیوں سے تعلق نہیں اتنا عرض کرتا ہے کہ نورجہاں بیگم کے حال کی مثنوی لکھنی اور اس طرح کہ واقعی و وقوعی باتیں لکھی جائیں از روئے شاعری ذرا مشکل ہے۔ مثنوی میں رزم و بزم کے مضامین کی ضرورت ہے اور ساتھ ہی حسن و عشق کے افسانے

رزم و بزم

رزم میں تو سوائے شیر افگن خاں کی مروانے کی تدبیروں کے اور کوئی مسالہ نہیں - بزم کیا خاک ممکن ہے کہ ایک عمر رسیدہ عورت اپنے شوہر کے مرنے کا باعث ہوکر گھر میں آئی جس کو عرصہ تک کسی نے نہ پوچھا ؛ رہا جوشِ عشق : اس میں عشق کا جوش اس قدر نہیں جس قدر کہ بادشاہ کے نشہ کا اثر تھا : نشہ نے جہاں گیر بادشاہ کو امورِ سلطنت کی طرف سے غافل کر دیا تھا - یہہ غفلت نور جہاں بیگم کے عروج کی وجہہ ہوگئی ؛ نور جہاں بیگم کا انجام جس طرح کہ چالاکیوں کا مقتضے تھا اطمینان سے کٹ نہ سکا - اپنے پہلے شوہر کی اولاد کو سلطنت دلانے میں غلطاں بیچاں رہیں اور جہاں گیر بادشاہ سے جو اولاد تھی اُس کو محروم الارث کرنے میں جان لڑا دی ؛ یہہ حال پوست کندہ ہے ؛

مذہب کے معاملہ میں نور جہاں کے عقاید اثنا عشری تھے - سُنّی و شیعہ عقاید کی بحث میں "شہیدِ ثالث" حضرت مولانا شوستری ایران سے بُلائے گئے — یہاں کے مولوی بھی جمع ہوئے - دربار میں بحث ہوئی : دربار میں نور جہاں بیگم جہاں گیر بادشاہ کے پیچھے بادشاہ کی پیٹھ پر ہاتھ رکھے بیٹھا کرتی تھیں ؛ مذہبی معلومات میں عُلماء اثنا عشری عموماً زیادہ دخل رکھتے ہیں - بحث میں اثنا عشری عقاید کو فروغ نظر آیا - نور جہاں بیگم کا اشارہ تھا ؛ اتنے میں سُنّت جماعت کی طرف حضرت مولانا شوستری سے کسی نے سوال کیا کہ درحق حضرتِ سلیم شاہ چشتی رح چہ می فرمائی ؟ مولانا نے ایران میں شاید ان کا نام بھی نہ سُنا ہوگا ذرا اہانت سے لاعلمی ظاہر کی ؛ جہاں گیر اب تک تو غافل بیٹھا تھا - حضرت سلیم شاہ چشتی رح کے نام کے ساتھ سوء ادبی کے اظہار سے نہایت

غصہ میں آگیا اور اسی وقت حکم دیا کہ ملا شوستری کا سر توڑ دیا جائے ؛ جہاں گیر نے ایک بے گناہ عالم کا خون اپنے سر لیا ؛ اس نقل کو عقاید سے واسطہ نہیں۔ نہ کسی کے حق و باطل سے تعلق ہے ؛

مجھے افسوس ہے کہ غیر زبان سے اُردو میں یہ مطلب ادا کرنے میں امتیازی الفاظ کی بہت پابندی مجھسے نہ ہو سکی۔ تاریخ و تحقیق میں جہاں پوست کندہ لکھا جائے دستور الانشا کے لمبے چوڑے القاب و آداب کی بہت گنجایش نہیں ہو سکتی ؛ یہ فارسی کی انشا پردازی کا نقص ہے کہ بلاضرورت بیکار لفظ جن کو نفسِ مطلب سے تعلق نہیں نفسِ مطلب سے کہیں زیادہ لکھ دیتے ہیں جس سے مطلب دب جاتا ہے +

لاہور میں بادشاہ جہاں گیر کے مقبرہ پر فاتحہ پڑھ کر میں نے نور جہاں بیگم کی قبر تلاش کی۔ ریلوی سڑک سے اُتر کر ایک جگہ قبر پر سنگ مرمر کا کتبہ دیکھا جو معلوم ہوا کہ حکیم صاحب حافظ اجمل خاں صاحب رئیس دہلی نے بطور یادگار لگوا دیا ہے +

داد کی داد

× × × × × × × × × × × ×

× × × × × "آپ فرماتے ہیں کہ لوگ مجھسے داد کے کیوں خواہاں ہوتے ہیں؟"

× × × × × "اس لئے ہوتے ہیں کہ شعر میں جو جوہر ہوتے ہیں اُن کو آپ ہی جانتے ہیں۔ اور آپ ہی کی زبان اُن کو ادا کر سکتی ہے۔ جن الفاظ میں آپ داد دیتے ہیں میرا ہی دل جانتا ہے۔ یا اشعار میں جان ہوتی تو وہ آپ کو داد دیتے۔ داد کیا دیتے بلکہ اپنا افتخار سمجھ کر اتراتے پھرتے۔ جب آپ لب ہلانے میں تامل فرماتے ہیں دل افسردہ ہو جاتا ہے"۔ × × × × × × ×

یہ اقتباس جناب مائل دہلوی کی تازہ تحریر کا ہے۔ شعرگوئی سے میری طبیعت کو لگاؤ نہیں۔ سبب یہ کہ اساتذہ قدیم کے کلام کو تو آپ جانتے ہیں کہ از روئے مضمون کوئی خوبی اُن سے رہ نہیں گئی۔ زبان کی خوبی جناب داغ۔ جلیل و ریاض جیسے شعر کے حصے میں آگئی۔ اب شعر میں کیا بات باقی رہ گئی جو دکھائی جائے۔ یعنی ہر شخص شعر کہنے کا ارادہ کرے۔ ہر شخص سے مراد راقم الحروف۔ لیکن جب اچھا کلام سننے میں آتا ہے۔ بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ داد دینے میں میں صرف کلام پر نظر رکھتا ہوں۔ شاعر (فلاں ابن فلاں) سے غرض نہیں۔ اور داد بھی تقاضی اور تاکید سے نہیں بلکہ خود خوش ہو کر۔ کہ رسم شرافت کی رو سے ضرور ہے کہ خوش ہونے کا عوض بھی ہو سکتا ہے کہ کسی کی محنت کی داد دی جائے۔

اول تو جناب مائل دہلوی کا کلام لاجواب ہے دوسرے آپ اپنا کلام صلائے عام میں خاص پابندی کے ساتھ ہر پرچہ کے لئے بھیج دیتے ہیں۔ جب یہ حال ہو تو داد کس طرح نہ دی جائے؟

غزل ۔ جناب مائل دہلوی

(۱) سکندر بن مشیت پہ جو پینا آبِ حیواں ہے ÷ بھروسہ خضر پہ رکھنا یہ ناکامی کا ساماں ہے
(۲) ترا دامن جو دیکھا پردہ پوشِ اہلِ عصیاں ہے ÷ اُٹھا کر اپنے فتنہ کو قیامت بھی پشیماں ہے
(۳) جنابِ نوح روتا میں تو رحمت جوش پر آتی ÷ ڈبو دینے کا عالم کے مری آنکھوں پہ طوفاں ہے
(۴) یہی رنگِ زمانہ ہے تو اک کانٹے پہ کھٹکے گی ÷ ہمارا اور مجنوں کا شراکت میں بیاباں ہے
(۵) اگرچہ شیخ مفلس ہے مگر ساقی ہے دریا دل ÷ مثل سچ ہے غریبوں کا خدا خود میر ساماں ہے
(۶) نہیں ہے خاک گو اتنی کہ ڈالوں چشمِ وحشت میں ÷ مگر کہنا پڑا یہ ہی بیاباں پھر بیاباں ہے
(۷) ترے سر سے نہ جائے گا کبھی سودا محبت کا ÷ تری دستار اے مجنوں مرا تارِ گریباں ہے
(۸) دلِ دیوانہ ڈرتا ہوں کہیں گھٹ کر نہ مر جائے ÷ نہیں دنیا بھی تنگ اتنی کہ جتنا تنگ زنداں ہے
(۹) پلا دو شیخ کو اتنی قیامت تک نہ ہوش آئے ÷ شرابِ ناب کا منکر ہے اور ناخواندہ مہماں ہے
(۱۰) ہوائے تندِ ہجراں سے نہیں بجھتا نہیں بجھتا ÷ چراغِ عمرِ عاشق کیا تمہارے زیرِ داماں ہے
(۱۱) مری میت پہ سچا ہے مرے احباب کا رونا ÷ مرا روزِ وصال آیا اور اُن کا روزِ ہجراں ہے
(۱۲) مقدر جب بگڑتا ہے تیمم کو نہیں ملتی ÷ غلط سمجھے ہیں جو سمجھے کہ دنیا خاک ساماں ہے
(۱۳) یہ ادنےٰ سا کرشمہ ہے کسی نقشِ کفِ پا کا ÷ جو دن ہو مہرِ رخشاں ہے جو شب ہو ماہِ تاباں ہے
(۱۴) خدا رکھے قیامت تک تجھے اے پیرِ مے خانہ ÷ کہ اب دنیا میں تو ہی یادگارِ بزمِ عرفاں ہے
(۱۵) دکھاتا میکدہ اپنا جو رضواں آ نکلتے تم ÷ تو یہ کیا جنت میں جنت ہے یہ کیا ساماں میں ساماں ہے
(۱۶) جسے جانا جسے سمجھا اسی کو بھول جاتا ہوں ÷ نہ سمجھا کوئی دانا ہے نہ سمجھا کوئی ناداں ہے
(۱۷) اگر نکلوں بھی گھر سے میں کہاں جاؤں کدھر جاؤں ÷ نہ ہیں آباد میخانے نہ دورِ جامِ عرفاں ہے
(۱۸) نبی سے حضرتِ موسےٰ کہ غش پر ٹل گئی اُن کی ÷ مرے حق میں تو جلوہ کا یہ پردہ آفتِ جاں ہے

صلائے عام ۔ (۲) "ترا دامن" الخ ۔ اس میں دوسرا مصرع بہت پاکیزہ ہے ۔ ع
اُٹھا کر بیٹھنے فتنہ کو قیامت بھی پشیماں ہے ؂
(۳) "جناب نوح" الخ ۔ اس میں بھی دوسرا مصرع مزا نہیں ع ڈبو دینے کا عالم ہے مری آنکھوں پہ طوفاں ہے ۔
"طوفاں" اچھا لفظ ہاتھ آیا ؂
(۴) یہ شعر بے مثل ہے ؎ یہی رنگِ زمانہ ہے تو ایک کانٹے پہ کھٹکے گی ؂ ہمارا اور مجنوں کا شراکت میں بیاباں ہے
مضمون بالکل نیا ہے اور بہت صاف ۔ مثل مشہور ہے "ساجھے کی ہنڈیا چوراہے میں پھوٹتی ہے" ؂
(۷) "ترے سر سے نہ جائے گا" الخ ۔ اپنا تارِ گریباں دستارِ محبوب بنا ہے ؂ (۸) زنداں کی تنگی کا مقابلہ زمانہ کی تنگی سے خوب کیا
(۱۴) ۔ نہایت شاعرانہ مضمون ہے ۔ اسی طرح (۱۵) دونوں میں زبان کی خوبی ہے ؂
(۱۶) یہ شعر غضب کا ہے ۔ دانائی و نادانی دونوں کو اکٹھا کر دیا اور ثبوت کے ساتھ کہ ع جسے جانا جسے سمجھا اسی کو بھول جاتا ہوں ؂ یہ اندازِ جنوں اچھا نکالا ؂ لیا پہچان گو دیکھا نہ بھالا ؂
(۱۸) ع "نبی تھے حضرتِ موسیٰ کہ غش پہ ٹل گئی ان کی" ؂ لاجواب مضمون ہے ۔ لاجواب اس لئے کہ یہ مضمون نہایت کثرت سے باندھا گیا ہے ۔ پھر بھی اس میں ایک نئی بات پیدا ہو گئی ؂

رسالۂ کوکب ہند (آگرہ)

یہ رسالہ گو ایک خاص غرض سے نکلتا ہے اور مذہبی بحث مباحثہ میں نہایت شائستگی سے کام لیا جاتا ہے ۔ مگر **قادیانی** عقائد پر زیادہ زور نظر آتا ہے ؂ صلائے **عام** میں کسی خاص عقیدے سے تعلق نہیں ۔ مگر ان دنوں عقاید یعنی **قادیانی** اور **بہائی** میں اس قدر اختلاف جو خود بخود پیدا ہو رہا ہے تعجب سے خالی نہیں ؂ اس لئے مناسب ہے کہ دونوں عقیدوں کے عالم ایک جگہ جمع ہو کر ایک دوسرے کے اختلاف کا تصفیہ کر لیں تاکہ اختلاف کی وجہ سے جو عقاید میں تکرار ہے وہ رفع ہو جائے ؂

الوداع!

الوداع! یارانِ شباب الوداع!

اے سرِ پر غرور رخصت ہو
چشم و ابرو تمہیں بھی اپنا سلام
لب و دنداں زبان کام دہاں
ترش و شیریں و تلخ کیا کیا کچھ
زندگی کا تھا بس تم ہی پہ مدار
سِلکِ گویائی کے یہ پڑتے تھے
اب نہیں طاقتِ کمال مقال
کون اب یہ بلا لگائے پھرے
ان کو جنبش بھی اب نہیں چڑھتی
جنکو سیلوں نہیں تھی دشواری
اس تنِ نازنیں کو دم پہ دم
داغ دھبے سے جی بُرا ہوتا
دی ندا کاتبِ شبستانِ احق

دونوں آنکھوں کے نور رخصت ہو
آخری گھونٹ ہے اُٹھا لو جام
خوب لوٹے مزے جہان کے ہاں
تمنے بھوڑی کہیں بھی دنیا کچھ
الوداع دوستانِ دانش کار
بات کرتا تھا پھول جھڑتے تھے
طوقِ گردن ہے شامتِ اعمال
گندگی کا گٹھڑ اٹھائے پھرے
منھ کی مکھی تلک نہیں اُڑتی
دو قدم چلنا اب انہیں بھاری
کس تکلف سے آہ رکھتے تھے ہم
گرد اُڑتی تو دم فنا ہوتا
ہے بقا کے لئے فنا مطلق

غمِ سجدہ جبین و پیشانی ہو
ناک۔ نقشے کی اب ضرورت کیا
تم بھی رخصت کہ وقت آخر ہے
رات دن وقف کار تھے رخصت
جیتے جی ہر طرح کا ساتھ تھا
سب یہ خواب خیال ہے اب تو
شکم و سینہ بدقرینہ ہیں
دست و بازو کبھی تھے طاقتور
غش کی نوبت سی رہتی ہے طاری
ہائے افسوس طرفہ حال ہے اب
خوشبوؤں سے اسے بساتے تھے
اب خدا جانے حال کیا ہوگا؟
صبح ہوگی ملے نہ پھر کوئی شام

تم بھی رخصت کہ ہو گرانجانی
دفترِ زندگی تمام ہوا
دم کوئی دم کا ہی مسافر ہے
تم بھی مطلب کے یار تھے رخصت
ایک آتا تھا ایک جاتا تھا
زندگانی وبال ہے اب تو
گوشت خواری کا ایک فینہ ہیں
توڑ ڈالے ہیں جن کا سر سر
پاؤں چلنے سے ہو گئے عاری
دل کو رہ رہ کے یہ ملال ہے اب
عطر مل مل کے ہم نہاتے تھے
عاقبت کیا۔ مآل کیا ہوگا؟
کیڑے کھا جائیں گے یہ ہڈا نجام

آغا شاعر قزلباش دہلوی

(منقول از رسالہ ساداں)

صلائے عام - جناب آغا شاعر دہلوی کے کلام کا میں مدت سے قائل ہوں۔ ان کی غزل لاجواب ہوتی ہے۔ جس طرح اور متاخرین ذی کمال شعرا کی: لیکن غزل سے سیکڑوں دیوان بھرے پڑے پڑے ہیں اور کم و بیش سب کے رنگ ایک ہی وضع و طرز کے دیکھنے میں آئے۔ اسی وجہ سے آج کل کے انگریزی خوانوں کی نگاہ میں ہماری زبان کی شاعری کی بہت قدر نہیں: میری دانست میں ہماری زبان کی شاعری میں نئے نئے خیال اور نئی نئی رنگ پیدا کرنا چاہئے۔ خاصکر وسعتِ خیال کی زیادہ ضرورت ہے: صرف اتنا خیال رکھا جائے کہ جدتِ مضمون ٹکسال باہر نہ ہونے پائے: اس "الوداع" میں نظم کی سُرخی بالکل نئی ہے اور ادائے بیان بہت دلکش اور اصول [illegible]

ایڈیٹر

انیس و رشید

انیس وہ بلبل تھا جس کے دم سے چمن ہرا بھرا تھا اور رات دن رونق برستی تھی۔ جس کی ہر ادا پر گل فدا تھے اور شاخیں نثار۔ وہ جب بولنے پر تل جاتا تو ایک عالم کو محو کر دیتا۔ دلوں کو تسخیر کر لیتا۔ دنیا پکار اٹھتی "خدا نظرِ بد سے بچائے" مگر اے موت! تو سفاک ہے۔ بے رحم ہے۔ ستم گر ہے۔ تیرے ظالم ہاتھوں نے بہت جلد اس کو ہم سے چھین لیا اور ایسا چھینا کہ ہمیشہ کے لئے۔ بقول میر علیہ الرحمۃ ؂

کیا کہیے کہ خوباں نے اب ہم میں ہے کیا رکھا ÷ ان چشم سیاہوں نے بہتوں کو سلا رکھا

انیس سے جدائی ہوتے ہی چمن پر اداسی چھا گئی۔ ہر چہرہ سے غم و اندوہ عیاں ہو گیا۔ دل اب وہ دل نہ رہے۔ مگر نہیں۔ قدرت معاون ہے۔ رحیم ہے۔ سخی ہے۔ اس نے ایک ایسے بلبل خوش الحان کو پیدا کیا جس نے انیس کی تقلید کی اس کے قدم بقدم چلا۔ دنیا اس کا دم بھرنے لگی اور اس کو "رشید" "رشید" کہنے لگی۔ اس کو انیسِ زماں کہنا حق بجانب ہے۔ کیوں کہ اس کا مقولہ ہے ؂ مشتاق کلام انیس کا مجھ سے سنیں ÷ "گویا ہے زبان انکی دہن میں میرے" ÷

انیس اور رشید میں بس فرق اتنا ہے کہ انیس اگر چاند تھا تو رشید اس کا عکس۔ انیس اگر خورشید تھا تو رشید چاند۔ مگر یہ دونوں بلبلیں اس غضب کی تھیں کہ جس نے ایک بار انکا چہکنا سنا جیتے جی اس کے دل سے نہ اترا۔ رشید نے بہت ایسے مضامین باندھے جن میں انیس کی زبان نے کرشمہ دکھلا کر اس کے نشیب و فراز سے ہم کو خبردار کر دیا تھا۔ گو کہ رشید کا اندازِ بیان وہی ہے۔ سلاستِ زبان وہی مگر جس چیز کو وہ بیان کرتا ہے اس کی انوکھی اداؤں سے تصویر کھینچ دیتا ہے۔ ابھی صبح کی بات ہے کہ جب نسیم سحر کے جھونکے آنے لگے اور تاروں کی

انجمن برخاست ہوئی۔ رشید کی نگاہ اُن پر پڑی اور انہی کی استمدیہ۔ اُس کے مُنہ سے بے ساختہ نکلا ؎

آشنا بحرِ سماوات کے سارے ڈوبے ✤ موج زن نور کا دریا ہوا تارے ڈوبے

میر انیس کی نگاہیں بھی انہیں تاروں سے [illegible] تھیں۔ مگر انھوں نے کچھ اور فرمایا تھا ؎

یوں گلشن فلک سے ستارے ہوئے رواں ✤ چُن لے چمن سے پھولوں کو جس طرح باغباں ✤

آئی بہار پہ گلِ مہتاب کی خزاں ✤ مُرجھا کے گر گئے ثمرِ شاخِ کہکشاں

دکھلائے طور [illegible] سحر نے سموم کے

پژمردہ ہو کے رہ گئے غنچے نجوم کے

شب نے کروٹ بدلی۔ سویرا نظر آیا۔ انیس نے انگڑائی لی۔ آنکھیں کھولیں۔ اس کے حسن سے ایسے متاثر ہوئے کہ بول اُٹھے ؎

وہ سرخیٔ شفق کی اِدھر چرخ پر بہار ✤ وہ بارور درخت وہ صحرا وہ سبزہ زار

شبنم کے وہ گلوں پہ گہر ہائے آب دار ✤ پھولوں سے سب بھرا ہوا دامنِ کوہسار

نافے کھلے ہوئے وہ گلوں کی شمیم کے

آتے تھے سرد سرد وہ جھونکے نسیم کے

رشید بھی سحر کی انہیں اداؤں کا بسمل ہو گیا اور یوں پکار کر کہا ؎

وہ ہوا سرد وہ سامانِ سحر چار طرف ✤ اوس کھائے ہوئے شاخوں میں ثمر چار طرف

وہ نہائے ہوئے سارے گُلِ تر چار طرف ✤ شب کے بھیگے ہوئے شبنم سے شجر چار طرف

جس نے جس جا کا کیا قصد وہیں پر پہونچا

کثرتِ گُل سے نہ اک قطرہ زمیں پر پہونچا

پھر نظر اُٹھائی اور فرمایا ؎

مُنہ نقابوں سے ہیں سب اہلِ حیا کھولے ہوئے ✤ گُل ہوا کھا رہے ہیں بند قبا کھولے ہوئے ✤

اُسی دم یہ بھی کہا ؎ سُرخ پھولوں سے عیاں خون ٹپکنے کو ہے ✤ ساغرِ گُل سے مئے رنگ چھلکنے کو ہے ✤

انیس مرحوم فرماتے ہیں ؎

وہ صبح نور اور وہ صحرا وہ سبزہ زار ÷ تھے طائروں کے غول درختوں پہ بیشمار
چلنا نسیم صبح کا رہ رہ کے بار بار ÷ کوکو وہ قمریوں کی وہ طاؤس کی پکار
واتھے دریچے باغِ بہشتِ نعیم کے
ہر سو رواں تھے دشت میں جھونکے نسیم کے

رشید نے ہنسکر کہا ؎

پھول کھلنے لگے بلبل کی صدا آنے لگی ÷ کہ نظر باغ کی صحرا میں فضا آنے لگی
غنچے گل ہونے لگے بادِ صبا آنے لگی ÷ ٹھنڈی ٹھنڈی لبِ دریا سے ہوا آنے لگی
بچے ہر مرتبہ آقا کی طرف مڑنے لگے
زلفیں ہلنے لگیں دامانِ قبا اڑنے لگے

ایک جگہ فرماتے ہیں ؎

جب ہوا آئی جھٹکنے لگا زلفیں سنبل ÷ ٹھنڈی ٹھنڈی وہ نسیم اوس میں ڈوبے ہوئے گل

یہ شعر کیا غضب کا کہا ہے ؎

حسن اور عشق کا ہر ایک جو ہے دیوانا ÷ کثرتِ گل یہ ہے مشکل ہے خزاں کا آنا

ذرا اس بند پر غور فرمایئے گا ؎

کچھ عجب صورتیں غنچوں کی ہیں بھولی بھولی ÷ جو فقیر آگیا بھر لی زرِ گل سے جھولی
منع بلبل نے کیا چیز کسی نے جو لی ÷ بولی نرگس تجھے کیا بحث ہے تو کیوں بولی
بات جاتی رہے یہ حسنِ بیاں کھل جائے
کہیں ایسا نہ ہو سوسن کی زباں کھل جائے

انیس فرماتے ہیں ؎

چھپنا وہ ماہتاب کا وہ صبح کا ظہور ÷ یادِ خدا میں زمزمہ پردازے طیور

رشید کیا ۱۲

رشید کہتے ہیں۔ آمدِ صبح تھی اللہ کی قدرت کا ظہور ٭ تو تھے طاعتِ معبود میں سب وحش وطیور
صبح کا ایک منظر اور دیکھئے۔ کہتے ہیں ؎

آتش افروز کوئی چیز نہ تھی پانی میں ٭ رنگِ گل کا جو کٹا آگ لگی پانی میں ٭

آفتاب نے نقاب اُٹھا کر دنیا کی فضا کو بدل دیا۔ وہ رات سے بہت بدظن تھا۔ اس کا چہرا غصہ سے آگ بگولہ ہو رہا تھا۔ انیس کو یہ منظر بھا گیا اور اُنہوں نے فرمایا ؎

تھا چرخِ اخضری پہ یہ رنگ آفتاب کا ٭ کھلتا ہے جیسے پھول چمن میں گلاب کا

رشید نے بھی اس کو دیکھا دل سے پوچھا کہ اس کو کیا کہیں کیونکہ ع ناطقہ سر بہ گریباں کہ اسے کیا کہئے
دل نے کہا یوں کہو ؎

تاجِ زریں سے ہوا جب سرِ گردون پُرنور ٭ خضر نے چاہا کہ ہو قلزمِ خضرا سے عبور
رنگ وہ چرخ کا وہ مہر کا مشرق سے ظہور ٭ شیر کا چہرہ نظر آتا تھا سبزے میں دور

گویا معشوق بصد شوکت و ناز آتا ہے
سرخ بیرق ہے سمندر میں جہاز آتا ہے

غرض یہ کہ وہ بلبلیں چہکیں اور خوب چہکیں مگر ایسی گھڑی سے جدا ہوئیں کہ پھر ملنے کے لالے پڑ گئے۔ گو کہ ہم ان کے لئے شب و روز آہ و زاری نہیں کرتے۔ مگر دل سوگوار ہیں اور غم سے بھرے ہیں۔ اور روئیں بھی ہم تو کیوں کر روئیں۔ بقول سودا مرحوم ؎

فکرِ معاش ذکرِ بتاں یادِ رفتگاں
اس زندگی میں اب کوئی کیا کیا کیا کرے

مرزا محمد بشیر (از ریاست دتیا)

دلّی کے دکانداروں کی شاعری

دلّی کے سودا بیچنے والوں کی آوازیں مشہور ہیں نہایت سُریلی اور موزوں آوازیں لگاتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ شاہجہاں بادشاہ کے زمانہ میں ایک مغل ولایت سے سیب بیچنے لایا تھا سیب راہ میں بگڑ گئے: مغل کا بہت نقصان ہوا؛ مغل نے داغ دار سیب جس قدر کہ سڑنے سے بچ گئے تھے قاشیں کر کے چاندنی چوک کی پٹری پر یہہ آواز لگا کر بیچنے شروع کر دئے ع من قاش فروشِ دلِ صدپارۂ خویشم ؛ بادشاہ نے اس سے پہلے ایک مصرع کہا تھا کہ ع لختے بر دو از دل گزرد ہر کہ ز پیشم ؛ اس کے دوسرے مصرع کی تلاش تھی مغل کے آواز والے مصرع کی خبر حضور میں ہوئی۔ بادشاہ کا شعر درست ہوگیا ؎

لختے بر دو از دل گزرد ہر کہ ز پیشم ؛ من قاش فروشِ دلِ صدپارۂ خویشم

مُغل کو بہت انعام اکرام عطا ہوا کہ سیبوں کے نقصان کا بڑا عوض ہوگیا؛

میں نے دیکھا کہ دلّی کے بازاروں میں خاص کر جامع مسجد کے آس پاس کی بہار و کافی کی دکانوں میں اکثر خوش خط شاعرانہ تختیاں لگی ہوئی ہیں جن میں سے چند یہاں نقل کیجاتی ہیں ؛

قدر دانی کیجیے کچھ مہرباں ؛ ہے یہ ہوٹل آپکی گویا دکاں ؛ حلوہ گاجر کا ہے لبسکٹ بھی نفیس ؛ کیک انڈے جاء ہے ایسی کہاں

موسمِ سرما کا میوہ ہے یہی ؛ یہہ بنا دیتا ہے بڈھوں کو جواں ؛ وصف میں کوئی کسی سے کم نہیں ؛ الغرض ہر چیز ہے اعلیٰ یہاں

آئیے تشریف جلدی لائیے ؛ کیجیے اکبار کھا کر امتحاں

اسی دکان کے قریب کی دکان پر یہ تختہ لگا ہوا ہے ۔

یوں تو ہر شخص کو دعویٰ ہے زباں دانی کا ؛ گرم بازار ہے نقارۂ لسانی کا ہر سو

پر کسوٹی پہ کھرے کھوٹے کی ہوتی ہے تمیز

لب کو آتا ہے مزہ دودھ کا اور پانی کا

ایک اور چار کافی کی دکان کی تختی پر یہ شعر لکھا ہوا ہے ؎

مریضانِ محبت کو ہماری چار کافی ہے ؛ صدا دیتی ہے یہ پیالی ہو الله شافی ہے

دوسرے مصرع میں مجھے شبہ تھا کہ پیالی کی صدا سننے میں نہیں آئی ۔ جب ایک بزرگ فرمانے لگے کہ **جل ترنگ** کی پیالیاں آپ نے نہیں دیکھیں جن میں پانی بھرا ہوتا ہے اور کیسی دل کش آواز پیدا ہوتی ہے ؛ جناب **جوش** فرماتے ہیں ؎

آتا لب ریزِ وفا روح کا پیمانہ ہے ؛ اب تو ہر سانس مری آپ کا افسانہ ہے

حضرت **غالب** نے "ظرفِ قدح خوار خوب باندھا ہے ؎

گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلی نہ طور پر ؛ دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

برف کی دکان پر یہ شعر مجھے بہت پسند آیا ؎

برف ہے یا کسی معشوق کے گھر کی سل ہے ؛ لگ کے سینہ سے یہ کرتی ہے کلیجہ ٹھنڈا

برف والے برف کی من من بھر کی سلوں کو "سلیاں" کہتے ہیں اور یار کے گھر کی سل کا کیا کہنا +

کسی نان بائی کی دکان پر یہ تختی لگی ہوئی ہے ؎

اک چپاتی لے

اک چپاتی کے ورق میں سب ورق روشن ہوئے ؛ اک رکابی میں ہمیں چودہ طبق روشن ہوئے

نظیر اکبر آبادی کے اکثر شعر دکانداروں کے کام کے ہیں ؛

کباب والے کی دکان پر یہہ شعر کتنا موزوں ہے ؎

کباب سیخ ہیں ہم کروٹیں ہر سو بدلتے ہیں ؛ جو جل اُٹھتا ہے یہہ پہلو تو وہ پہلو بدلتے ہیں

خوش معاملگی اور قرض دینے سے انکار کے اظہار میں یہہ شعر اکثر دکانوں پر تختی پر لکھا ہوا لٹکا دیکھنے میں آیا۔ جو عربی کے مشہور مثل کا پورا ترجمہ ہے کہ القرض مقراض المحبت ؎

آپ سے ترک محبت ہمیں منظور نہیں ؛ قرض دینے کا ہمارے یہاں دستور نہیں

چند اشعار

پہلے تو تڑپنے کا سبب پیار سے پوچھا ؛ پھر دیکھ لیا اپنی جوانی کی ادا کو

تمہیں بتاؤ کہ شرمندگی کیسے ہوتی ؛ اگر خلیل علیہ السّلام جل جاتے

رہو دل ہی میں ورنہ عالم کہے گا ؛ کہ یہہ اپنے گھر سے نکالے ہوئے ہیں

مارا پتھر مجھے اک ایک تماشائی نے ؛ سب کو دیوانہ بنایا ترے سودائی نے

لاکھ جانیں مری قربان ہوں اس رونے پر ؛ آپ آنسو نہ بہائیں مرا حال اچھا ہے

تماشا دیکھنے مرنے کا کیوں بیٹھے ہو بالیں پر ؛ تمہارے سامنے کیوں کر نکل سکتا ہے دم میرا

نکلتا ہے یہاں دم اور وہ خاموش بیٹھے ہیں ؛ عجب کیا فکر ہو اک باوفا ہوتا ہے کم میرا

صلائے عام کی ڈاک

یہ مد میں نے عرصہ سے کم کر رکھی ہے لیکن بعض تحریریں ایسی آجاتی ہیں جن کا ذکر چھوڑ دینا ظلم ہے ۔ جناب مولوی بشیر الدین احمد صاحب رئیس دہلی (خلف جناب مولوی نذیر احمد صاحب قبلہ مرحوم) نے ایک پوسٹ کارڈ اپنی تحریر کے ساتھ جو درج ذیل ہے میرے پاس بھیجا ۔ پہلے میں مولوی صاحب کی تحریر یہاں نقل کرتا ہوں :۔

نظارہ کروں دہر کی کیا جلوہ گری کا ۔ یاں عمر کو وقفہ ہے چراغ سحری کا

"مخدوم مکرم بندہ جناب خاں بہادر صاحب قبلہ ۔ تسلیم ۔ لوگ واویلا کرتے ہیں کہ طبقۂ نسواں تعلیم سے بے بہرہ ہے ۔ میں مانتا ہوں کہ تعلیم یافتہ مستورات کی کمی ضرور ہے مگر یہ بات کہ سرے سے کوئی ہے ہی نہیں غلط ہے ۔ پردہ کے رسم و رواج کی وجہ سے گھروں کا حال کسے معلوم ہو سکتا ہے کہ کیسے کیسے دریکنوں اور قابل قدر جواہر گھروں کی چار دیواری کے اندر بند ہیں ۔ مرد ہر طرح آزاد اور باہر کے پھرنے والے اگر ترقی کر جائیں تو کوئی تعجب کی بات نہیں ۔ تعجب ہے تو ان پر جو ڈیوڑھی کے باہر قدم نہ دھریں اور باایں بے سر و سامانی گھر میں بیٹھے بیٹھے لایق اور قابل فخر ہوں ۔ میں اس وقت کئی مخدرات عصمت کے نام پیش کر سکتا ہوں جو علم و فضل میں سرمایہ ناز ہیں ۔ مبارک ہیں وہ گھر جن میں ایسی بیٹیاں ہوں آگے چل کر ایسی مائیں بنیں گی جو قوم کی افراد میں لایق سے لایق وجود پیدا کریں گی ۔ جو بچے ایسی ماؤں کی آغوش محبت میں پلیں گے میں کیسے کہوں کہ وہ لایق نہ ہوں گے ۔ چوں کہ یہ مخدرات عصمت پردے [redacted] ان کی قابلیت پر بھی ناگزیر پردہ پڑا ہوا ہے ۔ اس سے کوئی یہ نتیجہ نہ نکالے کہ میں پردہ کا مخالف ہوں ۔ ہرگز نہیں میں تو پردے کو فرض عین اور لازمی شرط سمجھتا ہوں ۔"

مرد اور ایسی بیٹیاں

نازو جمیلہ

تاتوانم بہ کسے روئے تو دیدن نہ دہم ٭ گوش را نیز حدیث تو شنیدن نہ دہم

مجھے یہ دکھانا ہے کہ پردہ ترقی و تحصیل علم میں سدِّراہ نہیں۔ ع شوق در ہر دل کہ باشد رہبرے درکار نیست
میں شہزادی بیگم صاحب کا اصل کارڈ آپ کے ملاحظہ کے لئے اس واسطے بھیجتا ہوں کہ اُس میں
صلائے عام کا اور آپ کا ذکر خیر ہے۔ پہلے تو آپ خط کو ملاحظہ فرمائیں کہ کیسا خوب صورت رواں
او. نوک پلک سے درست ہے۔ ایسے خوش خط مرد بھی کم نکلیں گے دوسرے یہ دیکھئے کہ املا کی غلطی
کہیں نہیں۔ عبارت سلیس اور شگفتہ اور مربوط ہے یہ صاحب زادی قصبہ گرگانوں ضلع پٹنہ کے ایک معزز
خاندان کی چشم و چراغ ہیں۔ بہار اور بنگال کی اردو مستند نہیں اُن کی بولی کھڑی ہے۔ کوئی دلّی یا لکھنؤ کی
بی بی اگر ایسی اردو لکھے تو عجب نہیں کہ وہ اہل زبان ہیں اردو اُن کی گھٹی میں پڑی ہے مگر بہار والی اور پھر عورت
ذات کی ایسی صاف ستھری اور شستہ زبان ضرور ایک غیر معمولی بات ہے۔ یہ کارڈ مختصر ہے مگر یہ صاحب
زادی قلم برداشتہ لکھتی ہیں۔ میں نے ان کے طول طویل خطوں میں بھی آج تک نہ کوئی لفظ بد املا دیکھا نہ
خلاف محاورہ پایا۔ طرز عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو فارسی میں بھی کافی درک ہے مجھے بڑی
حیرت ہے کہ دہ میں رہ کر شہریوں کی زبان کیسے آئی کیونکہ عموماً اہل دیہہ کا لہجہ کرخت اور زبان
سخت ہوتی ہے۔ اسی کارڈ میں کلیجہ بلّیوں اُچھلنا۔ جان میں جان آنا۔ چیک۔ کسک۔ کج خُلقی۔
خُشک مزاجی۔ کھُلم کھُلا۔ سرپرستی و ادارت۔ بے نظیر اسلوب بیان۔ پاکیزہ خیالات
ایچ میرز۔ سوء ادبی۔ مستغنی و بے نیاز اور ایسے ہی بہت سے الفاظ کا برجستہ اور باموقع استعمال
کیا ہے۔ ایسی پاکیزہ تحریر لکھنے والیاں دلّی اور لکھنؤ میں بھی کم نکلیں گی۔ چہ جائے کہ بہار اور بنگالہ
میں سے۔ ایں سعادت بزور بازو نیست۔ تانہ بخشد خدائے بخشندہ۔

شہزادی بیگم آپ کے رسالہ کی پرانی خریدار ہیں۔ آپ کے رسالے میں بڑے بڑے
مشاہیر اہل زبان مضامین لکھتے ہیں لیکن کسی [redacted] کے مضمون میں نے آج تک نہیں دیکھا
کیا اچھا ہو کہ شہزادی بیگم صاحبہ۔ بلقیس جہاں بیگم صاحبہ حیدرآباد دکن۔ صغریٰ ہمایوں مرزا بیگم صاحب اڈیٹر
النساء حیدرآباد دکن۔ زاہدہ بیگم صاحبہ فیض آباد۔ اشرف جہاں بیگم صاحبہ مصنفہ نغمانِ اشرف دہلی۔ اور ایسی ہی

دس پانچ چوٹی کی بیویاں اس رسالے میں گاہے ماہے اپنے بیش بہا خیالات کا اظہار فرمائیں تو ہم خرما ہم ثواب - کسی طرح طبقہ نسواں کی صدا بھی مردوں کے گوشِ حق نیوش تک پہونچے اور وہ ان کے حوصلے اور ہمت کو بڑھائیں اور آفرین ، تحسین اور ستائش کی داد سے ان کا دل خوش کریں - نہ کہ خلق پہ چڑھ جاتے ہیں ، سے کی طرح ✤ خاکساروں کو ذرا صاحب نزدیکھیں تو

خاکسار - بشیر

(مولوی بشیر الدین احمد صاحب رئیس دہلی)

× × × × × × × × × ×

پوسٹ کارڈ کا اقتباس "ایک عرصہ کے بعد صلائے عام - کے ورق پر نظر پڑی - پہلے میرے ہاں بھی یہ پرچہ آتا تھا - مگر درمیان میں اس کی اشاعت بند ہوگئی تھی جب سے پھر میرے ہاں نہیں آیا : غالباً اب بھی جناب میر ناصر علی خاں بہادر صاحب کی سرپرستی و ادارت میں ہی شایع ہوتا ہوگا ✤ خداوند کریم ان کی عمر دراز کرے - واقعی بڑے خوبی کے بزرگ ہیں : آپ کے مضامین اور آپکی فلسفیانہ اور شاعرانہ نازکخیالیاں خوب ہوتی ہیں" ✤

× × × × × × × × × × × × × ×

پوسٹ کارڈ بہت خوش خط پاکیزہ عبارت کا تھا - زیادہ اس خیال سے نقل نہیں کیا کہ مضمون کا تعلق کم و بیش ربخ کی باتوں سے تھا ✤

رہ گیا یہ مسئلہ کہ بیگمات میں پاکیزہ مضامین لکھنے والیاں بہت اچھی لیاقت : ایسی ہیں - اس میں "ہر کہ شک آرد ..... کافر گردد" : ان کے سامنے مجھ جیسے اگلے وقت کے مکتب کے پڑھے ہوئے کیا خاک لکھنے پڑھنے کا دعوے کریں ✤ میں دیکھتا ہوں کہ عورتوں کے اہتمام سے جو رسالے نکلتے ہیں انمیں بڑی لیاقت کے مضامین ہوتے ہیں - اور اہتمام میں از روئے لیاقت ایسے ایسے مرتبہ کی بیگمیں ہیں جو مجھے کیا اکثر معمولی مردوں کو نصیب ہونا آسان نہیں : مثلاً رسالۂ سہیلی کی لوح پر جن باکمال خاتونوں کے اسم مبارک ہیں وہ ایم - اے - ایم - او - ایل - گولڈ میڈلسٹ

[illegible]

قمر دہلوی

عورتوں کی اعلیٰ تعلیم

تعلیم نسواں کی نسبت اسقدر عرصہ اور اس زور سے بحث ہو رہی ہے کہ اس گفتگو کو صلائے عام میں چھیڑنا بے کار سا معلوم ہوتا ہے۔ اس وقت ہندوستان میں اعلیٰ درجہ کی تعلیم یافتہ عورتیں کثرت سے موجود ہیں: بلکہ ضرورت سے ذرا زیادہ نظر آتی ہیں + یہہ میں پہلے سے اقرار کرتا ہوں کہ اپنی پیرانہ سالی کی وجہہ سے مجھے بیگمات کے حالات سے بہت کم آگہی ہے۔ اور جو کچھ سُنا سُنایا ہے وہ مردوں کی زبانی: خود عورتوں سے اس بحث میں گفتگو کرنے کا موقع نہیں ملا + حسن اتفاق سے رسالۂ عصمت میں ایک بیگم صاحبہ کا خط جناب مولانا راشد الخیری صاحب کے نام میری نظر سے گزرا۔ اسے میں بہت غنیمت سمجھا کہ عورتوں کے معاملے عورتیں ہی خوب سمجھ سکتی ہیں + اس خط کا اقتباس میں یہاں اس نظر سے لکھتا ہوں کہ پڑھنے والے خاصکر اور تعلیم یافتہ بیگمات کو سلطان بیگم صاحبہ (خط لکھنے والی بیگم صاحبہ) سے کس قدر اتفاق یا اختلاف رکھتی ہیں + میرا مطلب ایک یہہ بھی ہے کہ اس پرچہ میں جناب مولوی بشیر الدین احمد صاحب رئیس دہلی کی تحریر جو صلائے عام کی ڈاک (صفحہ ۲۵) میں اعلیٰ تعلیم یافتہ بیگمات کی نسبت شایع ہوئی ہے اُسکا جواب شاید اس خط سے ہو سکے +

× × × × × × × × × × × × × × ×

× × × × × "آپ کو اچھی طرح معلوم ہے کہ گذشتہ چند سال کی چیخ پکار نے چند تعلیم یافتہ لڑکیاں

پیدا کردیں۔ تعلیم یافتہ سے میرا مقصد اس تعلیم سے ہے جو آج کل اعلیٰ تعلیم سمجھی جاتی ہے یعنی میٹرک یا اس کے بعد۔ اس قابل قدر جماعت سے فراغت تعلیم کے بعد والدین کی جس قدر بھی توقعات قائم ہوئیں یا ہیں وہ بجا اور درست ہیں لیکن کیا میں بصد ادب یہ سوال کر سکتی ہوں کہ ان میں سے کتنی لڑکیوں کی شادیاں ہوئیں؟ اور ان شادیوں میں والدین یا ورثا کو ان لڑکیوں کے مقابلہ میں جو تعلیم یافتہ نہ تھیں شادی کرنے میں آسانی ہوئی؟ یعنی ایک تعلیم یافتہ لڑکی کے خواستگار کس قدر کثرت سے آئے تھے اور ایک غیر تعلیم یافتہ لڑکی کے بر میں کس قدر دقتیں پیش آ رہی تھیں یوں سمجھ لیجئے کہ ایک باپ کی دو لڑکیاں ہیں ایک خاصی پڑھی لکھی اور ایک اعلےٰ تعلیم یافتہ۔ ضرورت تھی کہ جو دقت خاصی پڑھی لکھی کے بر تلاش کرنے میں ورثا کو پیش آئی۔ اس کا عشر عشیر بھی اعلےٰ تعلیم یافتہ کی شادی کے وقت باقی نہ رہتا۔ کیا ایسا ہی ہوا؟ کیا ایسا ہی ہو رہا ہے؟

یہہ سوال آپ سے بھی ہے اور ان حضرات سے بھی جنھوں نے اپنی لڑکیوں کو اعلےٰ تعلیم دی ہے۔ اجازت دیجئے کہ میں بھی اس کا جواب دوں۔ اس کا سبب اور وجہہ آپ جو کچھہ فرمائیں مگر میں تو یہ عرض کروں گی کہ دقت اور آسانی کو طاق میں رکھئے اعلےٰ التعلیم یافتہ لڑکیوں کو معمولی تعلیم یافتہ لڑکیوں کے مقابلہ میں شوہر ہی میسر نہیں ہوتے۔ یہ رائے نہیں حقیقت ہے۔ واقعات ہیں۔ تجربہ ہے۔ سُن رہی ہوں دیکھہ رہی ہوں اور افسوس و رنج کے ساتھہ کہتی ہوں کہ بھگت رہی ہوں۔ اب آپ ہی فرمائیے کہ جب ان کی عمریں نکل گئیں اور جو کام کرنے کا وقت تھا وہ میکہ کی پٹ پٹ میں بسر ہو گیا۔ ماں باپ اور بھائیوں کی دست نگر ہیں تو یہ تعلیم ان کے واسطے کس حد تک مفید ہوئی گھر میں بیٹھی ہوئی اس تعلیم کو چاٹا کریں اور بدنصیب ماں باپ کا ان کو دیکھہ دیکھہ کر خون خشک ہو ٭

اب دوسرا قدم آگے بڑھائیے اگر شادیاں ہو بھی گئیں بر میسر آ گئے تو کیا آپ ایک وسیع نظر ڈال کر یہ فرما سکتے ہیں کہ چند خاص خاص لڑکیوں کو چھوڑ کر اعلیٰ تعلیم یافتہ جوڑے اوسط درجہ کے تعلیم یافتہ میاں بیوی سے زیادہ خوش ہیں؟ یہاں بھی آپ کے جواب دینے سے قبل میں کچھہ عرض کرنے کی جرأت کرتی ہوں۔ افسوس ہے کہ میرا تجربہ قطعی اس کے خلاف ہے۔ میری ملنے والیاں دونوں قسم کی بیبیاں ہیں اور میں دعوے سے کہہ سکتی ہوں کہ تعلیم یافتہ میاں بیوی سے زیادہ میں نے غیر تعلیم یافتہ میاں بیوی کو خوش پایا۔ بتنا

ضرور ہے کہ تعلیم یافتہ کچھ اپنی سمجھ داری سے یا سنجیدگی سے خاموش ہیں اور اندرونی کیفیت کا پتہ نہیں لگنے دیتے۔ میں اس وقت ایک بی بی کی نہایت مختصر کیفیت کہتی ہوں جو ہندوستان کی مشہور نامہ نگار ہیں۔ شوہر بیچارے تمام تنخواہ ان کے ہاتھ میں دے دیتے ہیں مگر دن دن بھر اور رات رات بھر میں شاید میاں بیوی دو چار باتیں کر لیتے ہوں گے۔ کیا اس زندگی کا نام خوشگوار زندگی ہے اور کیا تعلیم نسواں ایسے ہی جوڑے پیدا کرتی ہے؟

میں آپ سے پہلے اس کی وجہ بیان کر دینی مناسب سمجھتی ہوں۔ واقعہ یہہ ہے کہ مسلمان لڑکا ماں کی گود سے یہ یقین لیکر جوان ہوتا ہے کہ مرد عورت کا خدائے مجازی ہے۔ میری رائے میں یہہ یقین غلط نہیں ہے۔ یہہ قرآن اور حدیث کا فیصلہ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ عورت کا احترام اسلام میں بہت کچھ ہے اور وہ کنیز نہیں ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ عورت مرد کی فوقیت ہی کو غارت کر دے۔ حقوق نسواں کے حامیوں نے یہ غضب ڈھایا کہ اس برتری ہی کو اڑا دیا مگر یہ خیال ایسا نہ تھا کہ مسلمان اس کو تسلیم کر لیتے اگر دو چار یا دس پانچ آدمی یہ کہتے ہیں تو نقارخانہ میں ان کی صدا سنتا کون ہے۔ بڑی خرابی آن کر یہ پڑ گئی کہ تعلیم نے لڑکیوں کے ذہن سے وہ خیال قطعاً نکال دیا اور ان کو یہ یقین ہو گیا کہ کارزار حیات میں عورت اور مرد برابر کے شریک ہوں یہ یقین تعلیم سے ہوا معاشرت سے ہوا صحبت سے ہوا مشاہدہ سے ہوا۔ انہوں نے مدرسہ میں جب انگریزی کتابیں پڑھیں تو ان سے وہ اسی نتیجہ پر پہونچیں۔ استانی صاحب کو دیکھا تو وہ اسی یقین کی پابند تھیں۔ دوسری استانیوں سے ملیں تو وہاں بھی یہی رٹ سنی اور باہر نظر ڈالی تو وہاں بھی اسی قسم کی باتیں دیکھیں اور سنیں۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد جب شادی کا وقت آیا تو لڑکے والے اچھی طرح جانتے ہیں کہ دلہن بیگم تعلیم یافتہ ہیں اور ان کی رائے میں شوہر کوئی فوقیت نہیں رکھتا نتیجہ جو کچھ ہو گا وہ ظاہر ہوا اور ہو رہا ہے۔ یہ وہ چیز ہے جس نے اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکیوں کی شادی ہونے میں رکاوٹیں پیدا کیں۔ اگر شادی ہو گئی تو شوہر قبل از شادی تو اس خیال سے بہت خوش ہے کہ مجکو تعلیم یافتہ بیوی مل رہی ہے اور ہم ایک دوسرے کے ہر طرح سے مددگار ۔

خیال

مگر یہ خیال دودہ کا جوش تھا۔ چند روز بعد جب بیوی شوہر کو اکیلا چھوڑ کر اپنے کمرہ میں خط لکھنے چلی گئیں تو حضرت کو معلوم ہوا کہ ایسی پڑھی لکھی بیوی سے تو جاہل ہی اچھی۔ یہ انسانی فطرت ہے کہ وہ فوقیت کا خواہش مند ہے میں اس موقعہ پر شوہر کو کچھ زیادہ قابلِ الزام نہیں سمجھتی پر وہ دوسری چیز ہے جس نے شادی کے بعد تعلیم یافتہ جوڑوں کو جاہلوں کے مقابلہ میں خوش نہ رہنے دیا۔

یہہ چند سطریں جو میں نے لکھیں صرف میرا خیال ہے جو یقیناً میری رائے میں تو صحیح مگر آپ کی رائے میں غلط ہونگی۔ لیکن غلط ہیں یا صحیح ان سوالات کا جواب عنایت فرمائے اور بتائیے کہ تعلیم نسواں نے مسلمانوں کو کیا فائدہ پہونچایا؟

خاکسار۔ سلطان بیگم۔ ہمشیرہ اشرف حسین صاحب ایم۔ اے۔

از رسالہ عصمت (دہلی)

تقریظ

جناب مرزا عرفان علی بیگ صاحب آئی۔ ایس۔ او۔ نے آگرہ سے قصیدہ بُردہ شریف کی تقریظ مجھے ایسے وقت میں بھیجی ہے کہ دسمبر ۱۹۲۵ء کا صلائے عام قریب الاختتام ہے۔ یہہ تقریظ اُس قصیدہ کی ہے جو خان بہادر پیرزادہ محمد حسین صاحب نے اپنے فارسی و اردو ترجمہ کے ساتھ شایع فرمایا۔ جناب مرزا صاحب نے تقریظ فارسی نظم میں لکھی ہے جو عدم گنجایش کی وجہہ سے اس پرچہ میں چھپنے سے رہ گئی لیکن امید ہے کہ اگلے مہینہ کے صلائے عام میں شایع ہو گی۔ یہہ اطلاع بطور معذرت ہے۔

فریدہ

نامی ایک گانیوالی کا حال جو خلفائے عباسیہ کے آخر زمانہ میں فن موسیقی میں بہت مشہور ہوئی رسالہ **حسن ادب** (لکھنو) سے نقل کیا جاتا ہے - یہ زمانہ خلیفہ **واثق باللہ** کا تھا جو واثق کے ندیم خاص **محمد بن حارث** کی زبانی ہے **محمد بن حارث** کا بیان ہے کہ میں واثق کی صحبت عیش میں شریک ہوا کرتا اور میرے واسطے ہفتہ میں حیدر روز مخصوص تھے جن کے سوا اور کسی دن نہ میں جاتا اور نہ بلایا جاتا ایکدن گھر میں بیٹھا تھا اسلئے کہ یہ میری باری کا دن نہ تھا ناگہاں دروازہ پر کچھ شور و ہنگامہ سنا باہر نکلا تو دیکھا کہ ایوان خلافت کے چوبدار اور ہرکارے کھڑے ہیں اور کہہ رہے ہیں " چلیئے آپکی یاد ہوئی ہے " میں نے کہا آج تو میرا دن نہیں ہے - یاد کیسے ہوگی؟ تمہیں دھوکا ہوا ہے " اُنہوں نے کہا اِن باتوں میں دیر نہ لگایئے ہمیں تاکید ہے کہ فوراً آپکو لیجا کے حاضر کریں - لہذا ہم آپکو بے لئے نہ جائیں گے "

اب میں دل میں ڈرا اور طرح طرح کے اوہام گذرنے لگے - بار بار دل کہتا تھا کہ معلوم ہوتا ہے کسی نے کچھ لگا دیا - یا خود امیرالمومنین کے دل میں کوئی بدگمانی پیدا ہوگئی بہرحال آج خیریت نہیں ہے "مگر مجبور تھا - گرتا پڑتا اُن لوگوں کے ساتھ ہولیا - قصر خلافت میں پہونچ کے اُسطرف چلا جدھر میرے ٹھیرنے کی جگہ مقرر تھی مگر چوبداروں نے پکڑ کے کہا " ادھر نہیں اودھر چلیئے " اور محل کے ایک ایسے راستے پر لیچلے جدھر کبھی میرا گذر نہیں ہوا تھا - اب مجھے موت سامنے کھڑی نظر آتی تھی - کانپتا ہوا کمروں کے بعد کمرے اور مکانوں کے بعد مکان طے کرتا چلا جاتا تھا تھوڑی تھوڑی دور پر چوبدار اور خدام بدلتے جاتے - ایک گروہ اپنی حد تک پہونچا کے دوسرے گروہ کے حوالے کر دیتا پھر وہ بھی اپنی حد ختم کر کے تیسرے گروہ کو مجھپر مسلط کر دیتا کشاں کشاں قصر خلافت کے ہفتخوان طے کر کے ایک نہایت نفیس مکان میں پہونچے - جو اپنے تکلفات اور شاہانہ سامان آرایش سے شداد کی جنت معلوم ہوتا تھا - کمخواب کا فرش تھا دیواروں پر طلائی نقش و نگار بنے تھے - دروازوں اور محرابوں پر زربفت کے پردے لٹک رہے تھے - اب لوگ مجھے اس مکان کے ایک کمرے کی طرف لے چلے جو سب جگہ سے زیادہ آراستہ و پیراستہ تھا -

دور ہی سے میری نظر اُس کمرے میں گئی تو دیکھا کہ سونے کے ایک مرصع تخت پر جواہرات کی مسند زرنگار بچھا ہے مرصع تکئے لگے ہیں - اوسپر واثق لباس فاخرہ پہنے بیٹھا ہے - اور اُسکے

بادی یا فریدہ ہے جو دولھن بنی ہوئی ہے۔ اسکے جواہرات نظر کو خیرہ کئے دیتے ہیں۔ ایک سرود اسکی گود میں ہے۔ اور اُسکو چھیڑ رہی ہے میری صورت دیکھتے ہی واثق نے کہا ” واللہ خوب آئے۔ آو بیٹھو“ کہکر میں نے ادب جوکر عرض کیا ” کہ امیرالمومنین خیرت تو ہے؟ “ کہا خیریت ہے، دیکھتے نہیں کہ اِس بزم عیش میں ایک تیسرے زندہ دل ندیم صحبت کی ضرورت ہے! تم سے زیادہ بامذاق امین صحبت مجھے اور کوئی نظر نہیں آیا اسلئے بُلا بھیجا خیر پہلے جا کے کچھ کھا پی لو“ عرض کیا ” امیرالمومنین میں خوب سیر ہوں اور پی بھی چکا ہوں“ یہ سُنکر کہا تو خیر بیٹھو“ ساتھ ہی کنیزوں کی طرف جو دست بستہ کھڑی تھیں اشارہ کیا اور اُنہوں نے مئے ارغوانی کا ایک رطل گراں لا کے میرے سامنے پیش کردیا اور میں پینے پر مجبور تھا۔

اب فریدہ نے سرود چھیڑ چھیڑ کے مجنوں کے دو شعر گائے اُسکی آواز اور سکے نغمے اور اُسکی سرود نوازی سے خدا کی قسم یہ معلوم ہوتا تھا کہ جیسے وہ مجھپر جادو کر رہی ہے اور میں لحظہ بلحظہ زیادہ مسحور و ازخود رفتہ ہوتا چلا جاتا ہوں اور اِدھر واثق کی یہ حالت تھی کہ بیتاب تھا۔ اور شوق کی بیخودی میں بار بار اُسکو اپنے آغوش کی طرف کھینچتا اور جھنجھوڑتا اور وہ زیادہ جوش لُطف کے ساتھ تانیں لگاتی اور دلکو پاش پاش کئے ڈالتی تھی۔

فریدہ نے گانے کا سلسلہ باندھ دیا۔ ایک نغمہ ختم ہوتا تو دوسرا شروع کر دیتی اور پہلے سے زیادہ دلکش ہوتا۔ درمیان درمیان میں کبھی بیخود ہو کے میں بھی تانیں لگانے لگتا۔ غرض یہ ایسی صحبت طرب تھی کہ مجھے زندگی بھر نہ بھولیگی۔ اور ایسا لُطف عیش کبھی نصیب ہوا تھا۔

اِن لذتوں سے لُطف اُٹھاتے اُٹھاتے کیا دیکھتا ہوں کہ ناگہاں واثق نے اپنا پاؤں اُٹھایا اور اس زور سے کس کے فریدہ کو ایک لات ماری کہ وہ لُڑھکتی اور قلابازیاں کھاتی ہوئی تخت کے نیچے جا پڑی۔ اُسکے جا بجا چوٹ آئی۔ سرود بالکل پاش پاش ہو گیا اور وہ زمین پر گر کے زار و قطار رونے لگی۔ ساتھ ہی میری یہ حالت ہوئی کہ تن سے جان نکلگئی۔ اس صحبت میں کئی بار میں نے فریدہ کو اور اُسنے مجھکو دیکھا تھا۔ مجھے یقین ہوگیا کہ اس برہمی کا باعث یہی واقعہ ہے۔ نہ ہم ایک دوسرے کو دیکھتے اور نہ ایسا ناز میں پر ظلم ہوتا۔

دیر واثق نے سر جھکایا تو بڑی دیر تک کسی فکر میں رہا۔ اور میں بھی سر جھکائے منتظر تھا کہ اب میرے قتل کا حکم ہوتا ہے۔ اتنے میں واثق نے سر اُٹھا کے میری طرف دیکھا اور کہا ” محمد! بھلا تم نے کبھی اس سے زیادہ حیرت ناک ماجرا دیکھا تھا؟ “ عرض کیا ” امیرالمومنین غلام کا تو دم ہی نکلگیا اور خدا لعنت کرے

مجھپر اگر میں نے اِس حوروش نازمین کو آنکھ بھر کے بھی دیکھا ہو مگر اتفاقًا نظر پڑ گئی تو اُس میں کسی قسم کی ادنےٰ بدنیتی بھی ہو۔" اُسنے کہا نہیں نہیں۔ اسکا تو بخدا مجھے ذرا بھی خیال نہیں ہے۔ مجھے اسوقت بیٹھے بیٹھے یہہ خیال آیا کہ جیسے میرا بیٹا جعفر (متوکل علی اللہ کے لقب سے اُسکے بعد خلیفہ ہو) میری جگہ اسی تخت پر بیٹھا ہو اور فریدہ اُسکے پہلو میں بیٹھی یوں ہی نغمہ سنجی کر رہی ہے اس خیال کو میں برداشت نہ کر سکا۔ اور مجھسے ایسی حرکت سرزد ہو گئی۔" یہ خیال رکھنا چاہئے کہ واثق اپنے ولیعہد جعفر متوکل سے نہایت بدگمان اور اُسکا دشمن تھا اور آخر اوسی بدگمانی کے وہم میں مبتلا رہ کے مرا)

محمد بن حارث کہتا ہے۔ واثق کا یہ خیال سُنکر میں نے دست بستہ عرض کیا۔ امیرالمومنین اسکا خطرہ دل میں نہ لائیں۔ خدا نے چاہا تو ناخلف جعفر قتل ہوگا اور حضور ابدالآباد تک زندہ و اقبالمند رہیں گے۔" پھر میں نے زمیں بوس ہو کر عرض کیا۔" امیرالمومنین! اللہ اللہ! بھلا ایسی نازمین گل اندام کے ساتھ ایسا سلوک ہونا چاہئے تھا! حضور اُسکے حال پر رحم فرمائیں اور پھر پیار سے اپنے پہلو میں بٹھالیں۔"

میری اس التجا پر اُسنے خادم کنیزوں کو حکم دیا کہ فریدہ کو لا کے میرے برابر بٹھاؤ۔" حکم ہوتے ہی فریدہ کو دوسرا زرنگار جوڑا پہنا کے واثق کے برابر بٹھادی گئی۔ اور واثق نے کھینچ کر اُسے گلے لگا لیا اب دوسرا سرود لا کے اُسکی گود میں رکھا گیا مگر فریدہ کی آنکھوں سے ابتک آنسوؤں کا سیلاب جاری تھا۔ اُس سے بھی زیادہ پھوٹ پھوٹ کے خود واثق رو رہا تھا۔ اور اُن دونوں کو روتے دیکھکر میرا بھی دل بھر آیا بے اختیار رونے لگا۔

اب فریدہ نے کہا۔" پہلے میرا قصور بتائیں آخر کس جرم پر میرے ساتھ یہ سلوک ہوا؟"

واثق نے جو وہم و خیال مجھپر ظاہر کیا تھا اُسپر بھی ظاہر کر دیا مگر کہتا جاتا تھا اور روتا جاتا تھا۔ واثق کا یہ بیان سُنکر فریدہ نے رو رو کے کہا۔" تو امیرالمومنین میں آپکو خدا کا واسطہ دلاتی ہوں کہ مجھے اِسی وقت قتل کرڈالئے تاکہ آپکے دل سے یہ اندیشہ دور ہو۔ اسطرح مجھے بھی آیندہ کی فکروں سے آزاد کر دیں گے اور اپنے دل کو بھی مطمئن کر لیں گے۔" اُسکی اِس درخواست پر واثق اور میں زار و قطار رونے لگے اور دیر تک روتے رہے۔

اِس کے بعد محمد بن حارث کہتا ہے کہ زمانہ بدلا۔ اور متوکل علی اللہ تخت خلافت پر بیٹھا۔ اور میں جسطرح واثق کا مصاحب تھا متوکل کے ندیموں میں بھی شامل کیا گیا۔ اب بھی اِسی طرح

میری باری کے دن مقرر تھے۔ لیکن ایک روز جبکہ میرا گھر میں رہنے کا دن تھا۔ غل سنکر باہر آیا تو قصر خلافت کے چوبداروں اور ہرکاروں کا نرغہ دیکھا۔ جنہوں نے صورت دیکھتے ہی کہا "چلئے آپکی یاد ہوئی ہے"۔ وہ لوگ کشاں کشاں مجھکو لے گئے اور قصر کے اندر اُن ہی راستوں سے ہو لیتے ہوئے مجھکو اُسی کاشانۂ عیش میں پہونچایا۔ وہاں کیا دیکھتا ہوں کہ وہی کمرہ ہے، وہی تخت جواہر نگار رکھا ہے، وہی ساز و سامان ہے اور اسی طرح فریدہ سرود گود میں لئے بیٹھی ہے۔ مگر اُسکے پاس واثق کی جگہ متوکل ہے۔

میری صورت دیکھتے ہی متوکل نے کہا۔ "محمد تم نہیں دیکھتے کہ میں کس آفت میں مبتلا ہوں؟ کل سے اسوقت تک فریدہ سے اصرار کرتے گذری کہ گاؤ۔ مگر یہ نہیں مانی تمہیں سمجھاؤ"۔ میں نے فریدہ سے کہا "سبحان اللہ یہ کونسی ضد ہے کہ انکا کہنا نہیں مانتیں جو آپکے اور ہم سب کے آقائے نامدار اور تمام بنی نوع بشر کے سردار ہیں! امیر المومنین ہی کی جان کی قسم دلا کے کہتا ہوں کہ گائیے"۔

میرے کہنے پر فریدہ نہ راہ پر آئی۔ سرود چھیڑا اور دو شعر گائے جو عالم کی بے ثباتی اور موت کی حسرت ناکی پر تھے۔ لیکن انکا خود اُسپر اثر پڑا کہ کمال طیش کے ساتھ سرود کو اس زور سے زمین پر پٹکا کہ چور چور ہو گیا اور خود تڑپ کے جو تخت پر سے گری تو دور تک لوٹتی چلی گئی۔ مرغ بسمل کیطرح تڑپتی تھی۔ اور چلاتی تھی کہ "ہائے میرے آقا! ہائے میرے آقا!"

متوکل نے یہ حالت دیکھکر پوچھا "آخر یہ ماجرا کیا ہے؟" میں نے عرض کیا "بخدا میں نہیں جانتا"۔ اُس نے پوچھا "تو پھر تمہاری رائے میں مجھے کیا کرنا چاہیئے" میں نے کہا "غالباً یہ میری صورت دیکھ کے زیادہ پریشان ہوتی ہیں۔ لہذا میری رائے تو یہ ہے کہ حضور مجھے رخصت کرکے کسی اور کو اس صحبت میں بلائیں۔ جس سے شاید زیادہ مانوس ہوں۔ غالباً میرے چلے جانے کے بعد یہ حضور امیر المومنین کی مرضی پر چلیں گی"۔ اُس نے کہا "اچھا تو جاؤ۔ خدا حافظ"۔ اجازت ہوتے ہی میں اپنے گھر آیا۔ اور خدا جانے وفادار محبوبۂ فریدہ پر کیا گذری۔

لیکن دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ فریدہ کسیطرح نہ گائی آخر متوکل نے کمال بیحسی اور ناخلفی سے ایک خادمہ کو حکم دیا کہ "جبتک یہ گانے پر آمادہ نہو اس کے سر پر دھولیں مارتی رہو"۔ آخر زندگی سے تنگ آ کے اُسنے سرود اٹھا کے متوکل کے سامنے یہ شعر گایا۔

فَلَا تَبْعُدَنْ کُلُّ فَتًی بِثَبَاتِیْ ✕ عَلَیْہِ الْمَوْتُ یُطْرَقُ اَوْ یُغَادِیْ

دور نہ جاؤ ہر نوجوان کو جو ثابت قدم ہے موت آئیگی ✕ صبح آ کے یا شام کو آ کے

ع کچھ مشغلہ ضروری ہے آخر برائے دل

یہ تو انسانی عقل مان چکی ہے کہ بے شغل زندگی اکارت ہے بلکہ صحیح تر یہ ہے کہ بغیر کسی شغلہ کے انسان زندہ نہیں رہتا۔ کچھ نہ کچھ ضرور کئے جاتا ہے۔ اور اس میں پابندی کسی مذہب کی بھی نہیں ہے مشغلہ ہونا چاہئے خواہ وہ دین سے تعلق رکھتا ہو یا دنیا سے۔ اچھا ہو یا بُرا ہو۔ اچھا مشغلہ اگر اختیار کیا گیا ہے تو سارا جہان واہ واہ کرے گا اور اگر بُرے مشغلہ سے سابقہ پڑا ہے تو خلق اللہ بُرا کہیگی اور جگ ہنسائی ہوگی۔ بہت سے شغل ایسے بھی ہوتے ہیں کہ نیکی کرو اور بدی لازم آوے اور کہیں ایسا رد و بدل بھی ہوتا رہتا ہے کہ ع عدو شود سببِ خیر گر خدا خواہد۔ ابھی تو کچھ زیادہ زمانہ نہیں گزرا ہے کہ سہ

محمد علی اور گاندھی کی باتیں ✣ ہوئیں کتنے دن اور گئیں کتنی راتیں ✣ وہ شوکت علی خاص بی اماں والے ✣ بہت چل گئے ہر طرح ہی کماتے

ہوا کیا کوئی اُن سے اتنا تو پوچھے ✣ کدھر ہیں وہ جلسے کہاں وہ براتیں

الغرض ان کے مشغلے بھی کچھ دن خوب چل گئے۔ خلافت کے کیل و پُرزے بھی سب خوب ہل گئے سنگٹھن اور شدھی کی دھوم بھی جا بجا مچی۔ آجکل ارتداد اور تبلیغ بھی ہر جگہ رنگ لا رہی ہے۔ اب مولوی اور علماء کے جلسے اِدھر اُدھر ہو رہے ہیں۔ کوئی ساعت اور کوئی جگہ ایسی نہیں ہے جس میں کچھ نہ کچھ کھچڑی نہ پکتی ہو۔ گزشتہ شب کو مجھے ایک ریلوے اسٹیشن پر ایک آریوں کے بڑے عالم اور معزز ایسے وقت میں ملے جب کہ حضرت شاہ صوفی رحمۃ اللہ علیہ کے عُرس کی تقریب میں آدمی پر آدمی چلا پڑتا تھا اور فیروز آباد کا ٹکٹ درگاہ تک جانے کو خریدتا چلا جاتا تھا۔ ریل کے جانے کا وقت قریب تھا اس قدر مُہلت نہ تو مجکو تھی نہ اُن بزرگ کو تھی کہ گفتگو پورے طور پر ہو سکے یا بحث کرنے کا اچھا موقع میسر آوے مگر اُن بزرگ نے لوگوں کو جوق جوق ریل پر چڑھتا دیکھ کر اور میری طرف مخاطب ہو کر یہ فرمایا کہ "یہی اسلام ہے جس نے بُت شکنی کی تعلیم دی تھی اب وہ اُلٹی بُت پرستی سکھا رہا ہے"۔ اُن کا منشا اس کہنے سے خاص یہ تھا کہ درگاہ پر عُرس کرنے جو لو

جاتے ہیں قبر کو پوجیں گے۔ میں صرف اسی قدر ان سے عرض کرنے پایا تھا کہ اس میں اسلام کا کیا قصور ہے اگر کچھ ایسا ہو بھی تو جہلا کی عقل کا فتور ہے کہ اتنے میں ریل چھوٹ گئی اپنی اپنی گاڑیوں میں بیٹھکر چلدیئے پھر تو نہ اُن کی خبر مجھکو رہی نہ میری اُن کو خدا جانے وہ کہاں جا اُترے اور میں تو فیروز آباد اُتر کر سید صاحب حضرت صوفی رحمۃ اللہ علیہ کی درگاہ پر جا پہونچا اور آسمان کے تارے ہتی جمنا میں جا دیکھے۔ اور صبح ہوتے ہی فاتحہ پڑھکر اپنے گھر کا میں نے سیدھا راستہ لیا۔

لیکن مجھے اس موقع پر یہ کہنے کا بحیثیت ایک حنفی المذہب ہونے کے حق حاصل ہے کہ یہ طعنہ زنی دیگر اقوام کی خواہ مخواہ نہیں ہے۔ کچھ نہ کچھ سفیدی میں سیاہی وہ پاتے ہیں تو کہتے ہیں اور ان کا کہنا بیجا نہیں ہے۔ جب ہم کو علانیہ بدعات کا پُتلا پاتے ہیں تو چوں کہ ہم حامل دین اسلام ہیں وہ لوگ اسلام کو دھبہ لگاتے ہیں۔ کیوں کہ وہ ہم کو جامۂ اسلام پہنے ہوئے اور ایسی نئی حرکتیں کرتے دیکھتے ہیں جن کو بحیثیت ایک بدعت ضالہ ہونے کے کبھی اسلام جائز نہیں رکھتا۔

یہ تو ظاہر ہے کہ بدعت ایک خبیث گناہ ہے اور ہم خوب سمجھتے ہیں کہ دین کا عمدہ ہونا کثرت عبادات پر موقوف نہیں ہے بلکہ بدعتوں سے متنفر رہنے میں ہے۔ جب تک کوئی سکہ کھرا نہ ہو اُس کے چلنے کی کسی بازار میں امید نہیں ہوسکتی کیوں کہ ہر شخص سکہ کی کھوٹ پر نظر دوڑا دیگا۔ اور اس وجہ سے سکے کو ہاتھ بھی نہیں لگا دیگا۔ بدعت دراصل اُس طریقہ کے تبدیل کردینے کو کہتے ہیں جو شرع نے جاری فرمایا ہو اور وہ طریقہ آئین مسنون سے محفوظ ہوا ہو۔

اکثر لوگ بدعت کے سمجھنے میں مغالطہ کھاتے ہیں اور بعض اپنی اختراعات اور گھڑت کو بدعتِ محمود سمجھتے ہیں حالاں کہ جو کام اصول شرعی اور موافقتِ احکام رسول اللہ سے کئے جائیں یا کئے جاتے ہیں صرف وہی بدعتِ حسنہ میں داخل ہو سکتے ہیں اور جو کام خلافِ شرع اور خلافِ سنّت رسول ہوں گے یا ہوتے ہیں وہ بدعتِ ضلالت میں شمار ہیں۔ بدعتیں صرف دو ہی قسم کی ہیں ایک حسنہ اور ایک ضلالت۔ ہم کو اُن بدعات ضالہ کا ذکر کرنا منظور ہے جو عوام میں حسنہ سمجھی جاتی ہیں اور انکا وقوع ایسے ہی مواقع پر ہوتا ہے جیساکہ عرس بزرگاں و زیارت قبور میں اور عوام الناس کی غلط فہمی ایسے ہی مواقع پر دین

اسلام کو بدنام کراٹھتی ہے۔ جیسا کہ اُس آریہ بزرگ نے نیک نیتی کے ساتھ اِلّا طعنہ آمیز کلام میں عرس کے متعلق صاف صاف کہہ سنایا۔ میں مناسب سمجھتا ہوں کہ اس جگہ **سفینۃ النجات** سے اس کے متعلق کی تھوڑی سی عبارت نقل کردوں اور اس عبارت کو حضرت غلام محمد غوث صاحب مدظلہٗ حنفی المذہب ساکن ترچناپلی صوبہ مدراس نے اپنی کتاب سلسلۃ المرجان میں بھی نقل فرمایا ہے اور وہ یہ ہے۔

"و از منکرات فعلیہ اعراسِ بزرگاں است کہ در یں زمانہ شیوع دارد از افروختن چراغہائے ابیات و نواختن نوبت و استعمال مزامیر و کوفتن دف و مالیدن صندل و بردن آں مع غلاف بہ تبرک تمام و مُجرا کردن بہ قبور و بوسیدنش بلب و سجدہ کردن بعضے عوام نادان و مانند آں از منکرات قبیحہ و بدعات شنیعہ اند کہ بعضے ازاں کبائر و کفر باشد"

اسی قسم کی بدعات تعزیہ پر مہندی چڑھانا سہرا اور کنگنا باندھنا۔ بدّھی پہنانا اور چوٹی کسی کے نام کی رکھنا۔ رنگ کھیلنا۔ قبروں پر سلام کی غرض سے تعظیماً جھکنا۔ پنجہ اور جھنڈا کھڑا کرنا۔ پتھر پر چادر یا غلاف چڑھانا اور فاتحہ اُس پر پڑھنا۔ طوق یا بیڑی پہنانا وغیرہ بہت سی باتیں ہیں جو ضلالت میں بالیقین داخل ہیں ایسے سارے کام فی الواقع بدعات شنیعہ ہیں اور جب ہم ان کاموں کو کر اٹھیں تو آریہ بھائی ہم پر کیوں نہ ہنسیں۔ وہ سچ کہتے ہیں کہ یہ بت پرستی کر۔

اب تو قلم ہمارا گھس گیا اور کاغذ بھی تھوڑا سا باقی ہے پس ہم تھوڑا سا اور لکھکر مضمون کو ختم کئے دیتے ہیں اور وہ یہ کہ زیارت قبور سے اپنی موت ضرور یاد آتی ہے ورنہ ہم کاہکو موت کو یاد کرتے کیوں کہ وہ ہماری ایسی دشمن ہے کہ اس کے آگے ہماری ساری شیخیاں کرکری ہو جاتی ہیں اور کوئی بھی بس نہیں چلتا جب حضرت عزرائیل آ کھڑے ہوتے ہیں تو ہم بے کان ہلائے اُن کے ساتھ ساتھ چلے جاتے ہیں۔ پس قبر ہمکو جب موت کی یاد دلاتی ہے تو خدا کا ڈر بھی ساتھ ساتھ سما جاتا ہے۔ دل نرم پڑ جاتا ہے۔ اور دُنیا سے رغبت جاتی رہتی ہے۔ دیکھو جب ہم میں سے کوئی مرتا ہے تو وہ ایسا محتاج ہو جاتا ہے کہ ہماری رحم دلی کا منتظر رہتا ہے۔ بس ہمارا فرض یہہ ضرور ہے کہ جب ہم قبر کی زیارت کریں تو مدفون کے واسطے دعائے مغفرت کریں اور بس فقط

راقم مرزا عرفان علی بیگ ای اس آو از آگرہ

مضمون ختم کر دینے پر جب سرخیٔ مضمون دیکھی تو خیال آیا کہ میں مضمون شعلہ پر لکھ رہا تھا۔

آریہ بھائی

آریہ بھائی کے درمیان میں آجانے سے کہیں کا کہیں ہو رہا۔ مگر پھر بھی میں ناظرین کی خدمت میں عرض کروں گا کہ عرس بھی تو مشغلہ بازی ہے اور جو کچھ کرتوت اس میں ہوتے ہیں وہ سب کے سب مشغلے ہیں حتیٰ کہ بدعت بھی تو مشغلہ ہی ہے۔ مگر ہم کو اس پر نظر رکھنا لازم ہے کہ ہمارا مشغلہ اس بدعت اس بدعت کی حد تک تو نہیں پہونچا جس کو شرع اسلام قبیح و ناجائز قرار دیدے ؎

اے کہ حکم شرع برار دے گئی ؛ رہ باطل میری دیگئی ؛ چوں تو بدکردی بدی یابی جزا ؛ پس بجا جملہ با خود مے کنی۔ مگر تبرک جاکر مدفون کی قدر و منزلت ہرگز نہ کھونا چاہیے ؎ بہر زیارت چو روی قبر + قدر بزرگیش تو منظور دار۔ بس اسی قدر جواز ہے فقط

(عرفان علی)

غزل۔ خان بہادر جناب شاد عظیم آبادی

سبو اپنا اپنا ہے جام اپنا اپنا + کئے جاؤ مے خوار کام اپنا اپنا + نہ پھر ہم نہ افسانہ گوئے شب غم سحر تک ہے قصہ تمام اپنا اپنا + جو ذوق شہادت ہے اے مرنیوالو تو لکھواؤ دفتر میں نام اپنا اپنا جناں میں ہو زاہد ترے در پہ ہم ہیں ؛ محل اپنا اپنا مقام اپنا اپنا ؛ شب ہجر آتی ہے اے غم کے مارو ٹھکانا کرو تا بہ شام اپنا اپنا ؛ حبابوں ہم اپنی کہیں یا تمہاری ؛ بس اک دم کے دم ہے قیام اپنا اپنا وہ ہوتے ہیں خمیازہ کش پی کر ساغر + سنبھالیں جگر خاص و عام اپنا اپنا ؛ کہاں نکہت گل کہاں اُن کی خوشبو صبا کیا اجارہ مشام اپنا اپنا + غریب ایک بلبل ہو اور چار جانب + بچھائے ہیں صیاد دام اپنا اپنا

سمجھتا ہے اس دور میں کون کسکو + کریں رند خود احترام اپنا اپنا

اجارہ نہیں **شاد** اس پر کسی کا ؛

زبان اپنی اپنی کلام اپنا اپنا

صلائے عام (بطرز ریویو ۔ مختلف)

میرے پاس اکثر رسالے" برائے ریویو اور تبادلہ"[ف] آتے ہیں۔ بعض کے ساتھ یہہ فرمایش بھی ہوتی ہے کہ رسالہ کا اشتہار بھی صلائے عام میں چھاپ دینا : اشتہار کی عبارت صاحبان رسالہ جات خود تجویز کر کے بھیجدیتے ہیں :۔ بنے بنائے اشتہار سے گو مجھے زیادہ آرام ہے لیکن جو چیز مجھے پسند آئے اس کی تعریف میں بغیر تقاضے خود کیا چاہتا ہوں :۔ یہہ اشتہار سے بہتر ہے :۔

رسالہ شمع (آگرہ) میں مضمون نگاروں کی قابلیت تعریف کے قابل ہے۔ اکتوبر ۱۹۲۵ء کے رسالہ میں مضامین مندرجۂ ذیل نہایت تحقیق و تفصیل سے لکھے گئے : لٹریچر میں : (۱) مرثیہ اور اُس کی عہد بعہد ترقی۔ (۲) مُصحفی کی بحر المحبت کی تنقید[ف۲] اور تاریخ و تحقیق میں : (۳) شہزادگان مغلیہ کی تعلیم (۴) مرکزی حکومت اور دکن :۔

ہماری زبان اور معلومات کی ترقی کے لئے ایسے مضامین کی ضرورت ہے +

رسالہ جامعہ ۔ میں بہت خوش ہوا کہ اُردو میں جامعہ کے سے اعلےٰ مضامین کے رسالے نکلنے لگے : یہہ رسالہ واقعی معلومات علمی کا مجموعہ ہے ۔ اس کے مضامین نہایت عالمانہ و محققانہ ہوتے ہیں :۔ زیادہ خوشی مجھے اس بات کی ہے کہ جامعہ دلّی سے نکلتا ہے

ف یہہ درخواست معمولی ہوگئی ہے کہ فلاں رسالہ" بعرض ریویو و تبادلہ" بھیجا جاتا ہے :۔

ف۲ بحر المحبت کا یہہ شعر لاجواب ہے ف کعش میں ایسی کیا کرامت تھی + کعش والی تو میں سلامت تھی :۔

دلی من پرنٹر

دلی میں اس مرتبہ کے مضامین کے رسالہ کی بہت ضرورت تھی ÷ معلومات میں جناب اسلم جیراجپوری کی شہرت ہے ÷ "شذرات" میں مدیر جامعہ نے مسلم یونیورسٹی کی تقریبِ جوبلی میں چند باتیں ایسی لکھی ہیں جس کا جواب مہتممانِ جوبلی جانیں اور مدیر جامعہ

رسالہ نورجہاں - عورتوں کے لئے اب کثرت سے رسالے نکلنے لگے ہیں - تازہ رسالوں میں نورجہاں نامی ابھی نکلا ہے ÷ مجھے تعجب ہے کہ مردوں کے لئے جو رسالے عرصہ سے نکل رہے ہیں اُنہیں کے چلنے نہ چلنے کا رونا ہو رہا ہے عورتوں میں اسقدر رسالوں کی مانگ کا کیا سبب ہے - اس کا سبب یہی معلوم ہوتا ہے کہ تعلیمِ نسواں کی ترقی ہو رہی ہے ÷ یہہ خوش کن صورت ہے ÷ لیکن اکثر رسالوں کے (مردوں کے لئے ہوں یا عورتوں کے لئے) نکلکر جلد بند ہونے کی وجہہ سے مجھے بادلِ ناخواستہ رسالہ نورجہاں کی "محفلِ نور" سے بعض بیگمات کی رائے سے اتفاق کرنا پڑا کہ :- × × × × × × × × × ×

"کہ اگر "نورجہاں" نے بھی بعض موجودہ زنانہ رسالوں کی روش اختیار کی - اور چند پرچے نکال کر اور قیمتیں وصول کر کے[1] رسالہ بند کر دیا - تو زنانہ رسالوں کا رہا سہا اعتبار بھی جاتا رہے گا - اور آئندہ کبھی کوئی کسی رسالہ کو نہیں پوچھے گا" × × × × × ×

خدا کرے یہہ اندیشہ غلط نکلے !

---

[1] اگر رسالہ کی قیمت وصول ہو جایا کرے تو رسالہ بند ہی کیوں ہو ÷

(بابوس)

اس پرچہ کے ساتھ صلائے عام کو تیرہ سال ہوگئے۔ پُرانے رسالوں میں صلائے عام اچھی عُمر کو پہونچا: اس سے پہلے کے رسالوں میں شاید کوئی نہیں رہا۔ اس کے ساتھ کے اکثر رسالے بند ہوگئے: مریضانِ مُحبّت کیطرح اُردو رسالوں کو زمانہ کی ہوا اسس نہیں آتی :: کہتے ہیں کہ نصیری[1] اپنے بچّوں کو پہاڑ کے نیچے پھیک دیتے ہیں کہ اگر حضرت علیؑ کا بندہ ہے تو بچ جائے گا۔ اتفاق سے اکثر بچ جاتے ہیں جس سے اون کا عقیدہ راسخ ہوجاتا ہے: اور واقعی جو بچّہ پہاڑ سے گرکر بچ جائے اُس کے مضبوط ہونے میں کیا شبہہ ہوسکتا ہے؟ اسی طرح جو رسالہ اُردو زبان کی بے قدری میں بھی جاری رہے اُس کے عمرِ نوح کے پہونچنے میں کسی طرح شک ممکن نہیں :: جو رسالے کہ اس زمانہ کی بے قدری میں بھی بند نہ ہوئے اُن کے لئے نیک فال ہے :: یہہ بھی حسینوں کی طرح جن کی تریاہٹ مشہور ہے اسس بات پر اَڑے ہوئے ہیں کہ زمانہ لاکھ کروٹ لے ہم اپنی وضع نہ چھوڑیں گے۔ چنانچہ صلائے عام نے شروع سے جو وضع و رنگ اختیار کیا اُس میں فرق نہ آنے پایا۔ اور خدا نے چاہا تو اس کی وضع میں کبھی فرق نہ آئیگا ؏

شبِ فراق میں تجھسے تو یہہ امید نہ تھی
جو کام کرگئی تو آہِ نارسا ہو کر

---

[1] یہہ کوہستانی قوم ہے جو جناب حضرت علیؑ کو خدا مانتے ہیں۔ خواجہ حیدرعلی آتش فرماتے ہیں ؏ دلسی میں بندہ نصیری کے خدا

بقیہ صفحہ ۹

صلائے عام متعلق

صلائے عام (ناظرین صلائے عام کے نام)

کیا ندجنوں کرتے ہیں ہوتا ہے جو سودا ٭ تحقیق کرو قیس سے فرہاد سے پوچھو ٭

یہہ رسم اخبار نویسی ہے کہ جب سال ختم ہوتا ہے تو آئندہ کے لئے بہت کچھ اُمیدیں اور وعدہ وعید کئے جاتے ہیں۔ یا یار کی طرح جو صبح کو دم رخصت خدا جانے کیسے کیسے وعدے کرے اخبار نویسوں کو بھی دور کی سوجھتی ہے: صلائے عام کے ذہن میں بھی اگلے سال کے لئے ترقی کے سامان جمع ہو رہے ہیں + لیکن اخبار نویسوں سے زیادہ خریداروں سے پوچھنے کی ضرورت ہے کہ آپ کی قدر شناسی کے کیا ارادے ہیں؟ اخبار و رسالے والے تو ہر سال کیطرح اپنی طرف سے کسر نہیں کریں گے۔ لیکن خریداروں کی بیقدری سے اکثر رسالے اور اخبار بند ہو گئے: اور جو چل رہے ہیں اُن کو بھی زیربار ی کی شکایت ہے ؎

دیوانوں نے ہرگز نہ لہو ہونے دیا بند ٭ دم توڑ کے مر مر گئے فصاد سے پوچھو

جنوری ۱۹۲۶ء سے صلائے عام کا اہتمام زیادہ کرنیکا ارادہ ہے۔ اس کے لئے دو باتوں کی ضرورت ہے کہ خریداروں کی تعداد میں ترقی ہو اور خریداروں سے سالانہ قیمت جلد وصول ہو جائے: پھر دیکھئے کہ نہ صرف صلائے عام کے اہتمام میں ترقی ہو بلکہ آپ کی زبان و خیال کا مرتبہ بڑھے۔ آپ ہماری ہمت دیکھیں اور ہم آپ کی قدردانی دیکھیں ٭ جسطرح جوش بہار میں بوئے گل پاکیزہ دماغوں کی تلاش میں باغ سے نکل پڑتی ہے

اسی طرح صلائے عام کو قدردانوں کی جستجو ہے۔ صلائے عام نہ آپ کو چھوڑ سکتا ہے نہ آپکی زبان کو۔ ہمیں آپکی قدردانی پر ناز ہے۔ آپ اپنی زبان پر جسقدر ناز کریں تھوڑا ہے۔ دیکھئے کتنا پاکیزہ کلام ہے ؎

کھو دیا تھا نالۂ مجنوں نے لیلےٰ کا حجاب ؛ چاکِ دامانِ حیا تھا پردۂ محمل نہ تھا

تھکے آپ جانیں اور آپ کی زبان ؛

سنبھالکر دیکھنا آرائشوں کے بعد آئینہ ؛ یہ آئینہ نہیں ہے اب یہ ٹکڑے برابر کی

رسالۂ **تحفہ**۔ یہہ رسالہ اُن رسالوں میں ہے جن کا مجھے انتظار رہتا ہے۔ اب کی دفعہ زیادہ انتظار اس وجہ سے کرنا پڑا کہ ماہ صفر ۱۳۴۴ ہجری کا تحفہ شایع نہیں ہوا۔ صفر و ربیع الاول کا رسالہ یکجائی نکلا۔ یوں تو تحفہ کے اکثر مضمون پاکیزہ ہوتے ہیں اِسکی دفعہ اور بھی بہت پاکیزہ مضمون تھے ؛

توابین کا مضمون علامہ جناب سید علی حیدر نواب حیدر یار جنگ طباطبائی نے بہت خوب لکھا اسلام کی تاریخ میں معرکۂ کربلا کے بعد کا حال لوگوں کو بہت کم معلوم ہے۔ مضمون ذرا مختصر تھا۔ اس کے متعلق جسقدر تفصیل سے لکھا جائے باعثِ احسان ہے ؛ اسی طرح عہدِ ولید میں فتوحات کے اسباب یہہ نہایت محققانہ مضمون تھا۔ ولایت کے محقق مورخوں کے طرز پر لکھا گیا ؛ صرف لفظ "فتوحات" کی صحت میں ایک میرے کرمفرما کو ذرا شبہہ ہے کہ فتح کی جمع فتوح اسکی جمع الجمع فتوحات۔ فتوح فقرا کے محاورے میں جو نذر نیاز بے طلب غیب سے آجائے ؛ میری دانست میں انگریزی لب لہجہ کے موافق "فتوح" غلط نہیں ؛

یوروپین اور انگلو انڈین شعرای اُردو کا مضمون بالکل نیا ہے اور اُردو لٹریچر کے سامان کیلئے بہت ضروری ہے۔ حضرت قطب ہاشمی کے مضمون ہمیشہ اچھے ہوتے ہیں۔ انکی تحقیق اور تحقیق کے نتیجے بیان کرنے کا طرز بہت پاکیزہ ہوتا ہے۔ گارڈن و ماسی کے تذکرہ کی تحقیق لاجواب لکھی ؛ میں تحفہ کے نکالنے والوں یعنی انجمن ارباب اُردو کو مبارکباد دیا جاوے [illegible]

اشتہار

صلائے عام میں اشتہار چھپوانے کی اُجرت بہ شرح ذیل ہے۔

اشتہار خواہ اُردو میں ہوں فارسی میں ہوں۔ انگریزی میں ہوں یا ناگری میں :-

زبان اُردو یا فارسی میں ایک صفحہ ایک سال کیواسطے عنہ ۔ چھ ماہ کیواسطے عہ ۔ تین ماہ کیواسطے شے ۔

" " نصف صفحہ " " عہ ۔ " " لعہ ۔ " " صہ

" " چوتھائی صفحہ یا اس سے کم " " عنہ " " عہ " " للعہ

" " ایک صفحہ ایک دفعہ کیواسطے سے ۔ نصف صفحہ ایک دفعہ کیواسطے عہ ۔ چوتھائی صفحہ ایک دفعہ کیواسطے عہ

ناگری میں چھپوانا ہو تو اُردو سے ڈیوڑھی اُجرت ۔ انگریزی میں چھپوانا ہو تو اُردو سے دُگنی اُجرت ہے ؛

اُجرت ہر حالت میں پیشگی آنی ضرور ہے ۔ غیر مہذب اور خلافِ شرافت اشتہار چھاپنے سے انکار ہے ؛

یہہ خیال رہے کہ اشتہار کا مسودہ صاف ہو ورنہ غلطی کے ہم ذمہ دار نہیں ۔ مسودہ انگریزی مہینہ کی اوّل تاریخوں میں معہ اُجرت آجانا چاہیے ؛

منیجر صلائے عام

Copy of a letter from the Private Secretary to His Honour the Lieutenant Governor of the United Provinces, Dated 11th April 1913.
GOVERNMENT HOUSE, LUCKNOW.

Sir.

I am desired to acknowledge your letter of the 9th forwarding a copy of your Paper (Sala-i-Am) for His Honour the Lieutenant Governor's perusal; and to say that His Honour has put it aside to study and enjoy at leisure

---

Presentation of Mir Nasir Ali Khan Bahadur of Delhi to His Most Gracious Imperial Majesty King Emperor.

Extract from a letter from J P THOMPSON Esqr, I. C S
Dated 13th December 1911.

Dear Mir Sahib

" I enclose your invitation card for the Garden Party this afternoon, which had just reached me, from the Private Secretary to His Honour' "Sir Louis Dane hopes to have an opportunity of presenting you to His Imperial Majesty "

Extract from a letter from Sir RICHARD DANE, K C I. E (Brother of His Honour the Lieutenant Governor of Punjab Dated 25th Feb 1912.

Dear Mir Nasir Ali

" My brother has told me that you had the great honour of being introduced to His Imperial Majesty the King Emperor "

I am,
Yours Sincerly,

Extract from a letter from Major (Now Lt.-Colonel) J. C. C. ANGELO, Deputy Commissioner, Dated 18th December 1911.

My Dear Mir Sahib,

I am very glad you were presented to His Imperial Majesty—it was a fitting ending to the Durbar

Yours Sincerly,

صلائے عام دہلی

ہندوستان کے لیے بڑے فخر کا مقام ہے کہ گورنمنٹ عالیہ ہند نے اردو - ہندی - فارسی
عربی میں امتحان و انعام مقرر فرمائے تاکہ حکام - افسران انگریزی مشرقی زبانوں میں
کمال و لیاقت پیدا کریں اور صلائے عام دہلی سب سے زیادہ بار کی جگہ ہے کہ اردو زبان کے
اعلیٰ امتحان میں یہ رسالہ بھی منظور ہوا -

گورنمنٹ عالیہ ہند کے سرکاری حکم کا انتخاب انگریزی میں حسب ذیل ہے کہ صلائے عام کے
متعلق ہے گزٹ آف انڈیا مورخہ ۶ جون سنہ ۱۹۱۴ء سے ذیل میں نقل کیا جاتا ہے اسکی
ضرورت زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں کہ یہ انتخاب صلائے عام کی قدر شناسی کیلئے بس ہے -

دلا یہ مکمل الست ہے دیکھ چپ رہنا * بڑا گناہ ہے یہاں الف سے بے کہنا -

---

Extract from the GAZETTE OF INDIA June 6, 1914 EXAMINATIONS

XVI.—The following are the Text Books prescribed for the PROFICIENCY EXAMINATION :—

* * *

URDU.

* * *

In addition to the Grammar and Magazine recommended for the proficiency examination :—

* *

Magazine,

SALA-I-AM.

* *

Appendix B. List of authorised Text Books

The following is a list of Text Books prescribed for the various examination together with places where they may be obtained.

URDU

SALA-I-AM . . . . **Delhi.**

* * *

(Sd) L. C. PORTER,

Secretary to the Govt. of India.

(See the pages 1091 part 1 of the Gazette of India June 6, 1914.)

Sir Rabindra Nath Tagor, author of GITANJALI writes:—

* * * "I have no doubt that it (Sala-i-Am) is doing a good service in promoting the cultivation of Urdu Literature,"

* * * * * *

Extract from a letter from the Honourable W. MERK, Esq. I L. D., I. C. S., Late Chief Commissioner, N. W. Frontier Province, dated 6th August 1911.

"I thought it (Sala-i-am) a Periodical that might be encouraged with advantage, for instance to be placed in the waiting rooms for native gentlemen calling on Deputy Commissioners.

Extract from a letter from A. J. GORDON WALKER, Esq., I. C. S., Punjab Commission, dated 11th October 1911.

I quite agree with Mr. Merk that the (Sala-i-Am) ought to be in the Waiting Rooms of all Deputy Commissioners. Curiously enough I have used it for the purpose myself and always find that the Indian gentlemen who read it are delighted with it.

Extract from a letter from the Deputy Commissioner of Gujranwala Punjab. Dated 4th September 1912.

"I shall be glad to recommend your Paper (Sala-i-Am) to the District Board."

"I like your Paper personally. It is always written in chaste and pure, and if I may say so, in classical style."

(NOTE—The officer is now the Commissioner and Political Agent Ambala Division, Punjab.)

L. WHITE KING Esqr., L. L. D., C. S. I., F. R. S., Indian Civil Service, retired, writes as follows

"I am delighted with the style of your magazine and am looking forward to the next number.

Dated 5th October 1908

Extract from a letter from L. WHITE Esqr., L. L. D., C. S. I., Indian Civil Service, Retired"

"I was glad to get the last number of the (Sala-i-Am) which I thought excellent. My friend Coloneal Story takes great interest in it."

(NOTE—The gentlemen has since been knighted, Sir Lucas King.)

OPINIONS

Regarding "SALA-I-AM," Delhi.

The following Critique on the "SALA-I-AM," Delhi was Published by the Pioneer, in its issue of the 3rd November 1909

—ooo—

The Sala-i-Am published at Delhi keeps up high character as a periodical which seeks to promote the cultivation of Urdu literature.

Khan Bahadur Mir Nasir Ali with whom loyalty and learning go hand in hand is filling the leisure hours of his retirement by devoting himself to the editing and publishing of this Magazine. His style is marked by refinement and culture, and his readers should increase in number as the merit of his work become disclosed. The Sala-i-Am is particularly well printed and European students of Urdu should find it quite worth reading."

Extract from a letter from Colonel D. C. PHILLOT, Secretary Board of Examiners, Calcutta dated 20th January 191

"I have obtained the opinion of some of the board on the Sala-i-Am" We think it is the best Urdu Magazine we have yet seen both in appearance and contents. I shall have great pleasure in recommending it to candidates for the high Proficiency and Degree of Honour. In fact, I have been doing so."

From Lieutenant Colonel D. C. PHILLOTT, M. A. Ph. D., F. A. S. B. late Secretary Board of Examiners, Calcutta,

The printing, paper, and contents of the Sala-i-Am make it the best Urdu Magazine for European students of Urdu.

Cambridge }
1923 }

D. C. PHILLOT, (Lieut Colonel)
Late Secretary Board of examiners Calcutta.

Extract from a letter from R. P. Dewhurst Esquire, I. C. S. Session Judge, dated 12th 1911

"I take this opportunity of saying that I entertain a very high opinion of your Magazine. I will not say that I read every word of every number but I can say with truth that I read eagerly all the articles preceeding from your own pen beginning to end," o o o

صلائے عام (متعلق بہ اشتہارات)

اور ذریعوں کی بہ نسبت رسالوں میں اشتہارات کی شہرت زیادہ ہوتی ہے: اخبار تو دو ایک دن کے لئے سمجھئے۔ رسالے ہمیشہ اور آئندہ کے لئے بکار آمد ہیں؛ پڑھنے والوں کو رسالوں کی اگر خریداری منظور نہ ہو کہ قیمت دیکر پڑھنے کی عادت نہیں۔ پھر بھی جہاں تک ہو سکے مانگ تانگ کر دیکھ بھال کر اور سر دوسر پھیر کر جس طرح ہو سکا پڑھ ہی لیتے ہیں؛ اس حساب سے صلائے عام کے پڑھنے والوں کی تعداد بہت زیادہ سمجھئے۔ یعنی بہ قیمت یا بلا قیمت ایک پرچہ جس کے ہاتھ لگ جاتا ہے دس پندرہ آدمیوں تک پہونچ جاتا ہے؛

بہادر شاہ بادشاہ کے مقدمہ میں چند اخبار پیش ہوئے جنکی اشاعت بہت کم بیان کی گئی۔ عذر یہ تھا کہ ایسی قلیل تعداد کی اشاعت والے اخباروں کے مضامین کا اثر کیا ہوتا ہوگا؟ جواب میں کہا گیا کہ ہندوستان میں اخباروں کی اشاعت خریداروں کی تعداد پر منحصر نہیں ہے: خریدار کم سہی۔ مگر دیکھنے والوں اور پڑھوا کر سننے والوں کی تعداد زیادہ ہو جاتی ہے: یہ سب مل ملا کر زیادہ اثر کر جاتے ہیں؛

میں نے دیکھا کہ جن لوگوں کے نام صلائے عام کے خریداروں میں نہیں ہیں اُن میں اکثر صلائے عام کے مضامین کی تعریف کرتے ہیں۔ مجھے تعجب ہوتا ہے کہ ان کے نام تو خریداران صلائے عام کے رجسٹر میں درج نہیں ہیں پھر انہیں صلائے عام کے مضامین کی خبر کیوں کر ہوئی؟ معلوم ہوا کہ کسی اور کے پاس پرچہ دیکھا تھا؛ چند اصحاب جو مجھے کسی تقریب میں مل جاتے ہیں صلائے عام کی بہت تعریف کرتے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ آپ صلائے عام دیکھتے ہیں؟ فرمایا کہ ہاں بڑے شوق سے دیکھتا ہوں: حالاں کہ اُن سے ایک پرچہ کی قیمت بھی کبھی وصول نہ ہوئی؛

صلائے عام میں اشتہار دینے والے اطمینان رکھیں کہ اشتہارات سے غرض شہرت ہے اور زیادہ شہرت کا ذریعہ یہ رسالہ ہے کہ حساب سے کہیں زیادہ ہاتھوں میں پہونچ جاتا ہے؛

مہتمم کی طرف سے

اِطّلاع

صلائے عام کی قیمت پیشگی چھہ روپیہ سالانہ ہے۔ قیمت بذریعہ منی آرڈر عنایت فرمائی جائے: مضمون نگار بھی صلائے عام کی قیمت سے بری نہیں۔ نہ یہہ ضرور ہے کہ ہر مضمون خواہ مخواہ شایع کیا جائے ؛ جامع اوراق کو مضموں میں کمی بیشی کا اختیار ہے۔ جو مضمون شایع نہ ہوسکیں اُن کے واپس کرنے کا ذمہ نہیں ؛

صلائے عام میں ہر طرح کے مضامین نظم و نثر شایع ہوتے ہیں زیادہ تر نثر کہ اس وقت نثر کی زیادہ ضرورت ہے: اور نثر بھی ایسی جس میں زبان کی خوبی و فصاحت کے ساتھ مضمون کی پاکیزگی و نازکخیالی ضرور ہو یعنی لسان ع عروس جمیل و لباس حریر شرط ہے کہ مضمون پاکیزہ اور ادائے بیان لاجواب چاہیے ؛

اکثر اصحاب نمونہ کا پرچہ مانگتے ہیں۔ اول تو ایک پرچہ سے صلائے عام کی ساری خوبیوں کا حال معلوم ہونا مشکل ہے۔ دوسرے صلائے عام اتنے عرصہ سے جاری ہے کہ اہل علم میں شاذ ہی کوئی ایسا ہوگا جو اس سے واقف نہ ہو: پھر بھی اگر کسی کو نمونہ یا سال سے کم کی خریداری منظور ہو تو ایک روپیہ فی پرچہ کے حساب سے لی جائے گی ؛

صلائے عام کا پتہ اس قدر کافی ہے کہ:

دہلی۔ فراشخانہ: مکان میر ناصر علی خاں بہادر

حسب الارشاد میر ناصر علیخاں بہادر مطبع ناصری واقع فراشخانہ دہلی میں باہتمام میر احمد دہلوی چھپا اور شایع ہوا ؛

Printed and Published by Mir Nasir Ali Khan Bahadur (Editor) at the Nasri Press, Farrash Khana, Delhi.